بسلسلہ ایم اے تاریخ
تاریخ پنجاب
قدر آفاقی
3858
شیخ محمد بشیر اینڈ سنز
ناشران و تاجران کتب

# تاریخ پنجاب

قدر آفاقی

شیخ محمد بشیر اینڈ سنز
جلال الدین ہسپتال بلڈنگ
سرکلر روڈ چوک اردو بازار
لاہور
ندیم یونس پرنٹرز لاہور
قیمت 84 روپے

# فہرست



## باب 1



## باب 2

## باب 3

## باب 4



## باب 5

## باب 6

### ہندوستان کے حکمران:



## باب 7

### پنجاب اور سندھ میں عربوں کی حکومت:

## باب 8

## اسلامی سلاطین کا اجمالی ذکر

## باب 9

### سکھوں کا عروج و زوال:



### سینہ بہ سینہ چلا آنے والا پوشیدہ راز:

### بابانانک جی ضلع سیالکوٹ میں دفن ہوئے:



## باب 10

## باب 11



## باب 12

## باب 13



## باب 14



## باب 15

## تحریک پاکستان میں پریس کا حصہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

# پنجاب کی جغرافیائی معلومات

پنجاب کا لفظ پنج اور آب کا مرکب ہے۔ جس کا مطلب ہے پانچ دریاؤں کی سرزمین اور وہ دریا ہیں۔ ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم۔

پہلے وقتوں میں اِس علاقہ کو سپت سندھو بھی کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے سات دریاؤں کی سرزمین، اور دریائے سندھ اور دریائے کابل کو ملا کر سات دریا ہو جاتے ہیں۔ آجکل سندھ کے نام کا اطلاق پاکستان کے جنوبی صوبہ سندھ پر ہی ہوتا ہے۔ جو ایک زمانے میں بمبئی کے ساتھ منسلک تھا۔ تاریخ مخزن پنجاب میں ہے کہ پہلے پنج آب کی بجائے پنج دو آب کا لفظ مستعمل تھا پھر دو محذوف ہو کر پنج آب بن گیا۔

کوننگ (Koening) کا نظریہ یہ ہے کہ سرزمین پنجاب کا قدیم ترین نام "ثَ تَ گو" تھا۔ اور یہ الفاظ کوہ بے ستون کے مشہور کتبہ پر تحریر شدہ ملتے ہیں۔ جسے ایرانی شہنشاہ داریوش کبیر نے کندہ کرایا تھا۔ جس کا دور حکومت 521 قبل مسیح تا 486 قبل مسیح ہے۔ "ثَ تَ گو" کے معنی ہیں یک صد گائیوں کی سرزمین۔ کیونکہ اس علاقہ میں گائے بیل بکثرت تھے۔ گویا پنجاب کا علاقہ ایرانی سلطنت کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اور ایرانی بادشاہ کروش کبیر (550 تا 529 قبل مسیح) کے عہد میں بھی پنجاب ایران کے زیرِ نگین تھا۔ داریوش اول (541 تا 485 ق م) نے کشمیر تا ساحل سمندر اور مشرق میں دریائے ستلج تک کا علاقہ فتح کر کے اسے ولایت ہند کا نام دیا تھا۔ اس سے پہلے 750 قبل مسیح میں فریدوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور اسے مغلوب کر کے اپنی راجدھانی میں شامل کر لیا تھا اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے۔ آجکل کے محقق "ثَ تَ گو" کے معنی "زیادہ آبادیوں (بستیوں) کا علاقہ" کرتے ہیں۔ یا ان کے خیال میں سرسبز و شاداب علاقہ کو "ثَ تَ گو" کہا جاتا تھا۔

سپت سندھو کا رگ وید میں ذکر ہے۔ جو ڈاکٹر ہوگ کے بقول 2400 ق۔م کی تحریر ہے جبکہ اوستا میں "ہپتا ہندو" کی سرسبز وادی کا ذکر ملتا ہے۔ جو 560 تا 330 ق م کے عرصہ کی تالیف

مانی گئی ہے۔

آئین اکبری کے مطابق اکبر نے اسے پانچ دو آبوں کی سرزمین کا نام دیا۔ جن کے نام یہ تجویز کیئے گئے تھے:

1- دو آبہ بست جالندھر۔ (ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ)
2- دو آبہ باری۔ (بیاس اور راوی کا درمیانی علاقہ)
3- دو آبہ رچنا۔ (راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ)
4- دو آبہ چج یا چنبہ۔ (چناب اور جہلم کا درمیانی علاقہ)
5- دو آبہ سندھ ساگر۔ (جہلم اور سندھ کا درمیانی علاقہ)

اکبر کے زمانے میں پنجاب ایک الگ علاقے کے طور پر جانا گیا۔ اور کشمیر کو اس سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ کتاب السند اور تاریخ بیہقی اور تاریخ فیروز شاہی کی رو سے اس صوبے کے مختلف علاقے اپنے مرکزی شہروں کے نام سے موسوم تھے۔ مثلاً صوبہ جالندھر، صوبہ ملتان، صوبہ لاہور، صوبہ دیپال پور، صوبہ سرہند وغیرہ، لیکن اکبر کے زمانے میں غالباً صوبہ پنجاب "صوبہ لاہور" کا دوسرا نام تھا۔

مفتی غلام سرور لاہوری کہتے ہیں کہ سندھ کو چھوڑ کر باقی پانچ دریاؤں کی دھرتی پنجاب کہلاتی کہلاتی ہے، اور بیاس کی بجائے۔ آخری حد دریائے ستلج بنتا ہے۔ منشی گلاب سنگھ کے مطابق پہلے دریائے ستلج اور سندھ کا درمیانی علاقہ پنجاب کہلاتا تھا۔ مگر 1857ء میں اس میں بہت سے دیگر علاقہ جات بھی شامل کر دیئے گئے۔ جو طولاً 800 میل اور عرضاً 650 میل علاقے کو محیط تھے اور رقبہ دو لاکھ مربع میل سے زیادہ تھا۔

## دریاؤں کا جائزہ

<u>دریائے ستلج:</u> اس کی لمبائی آٹھ سو میل ہے۔ یہ دریا جھیل مانسرور اور جھیل راون سے نکلتا ہے۔ اس کے قریب ہی دریائے سندھ اور دریائے برہم پتر کے منابع ہیں۔ یہ دریا پہاڑی علاقے میں جنوب مغرب کے رُخ بہتا ہوا۔ شہر اور بلاس پور میں سے ہوتا ہوا روپڑ کے قریب میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور یہاں سے اس کا رُخ جنوب کو ہو جاتا ہے اور لدھیانہ پہنچنے تک اس کے دو حصے بن جاتے ہیں۔ جو آگے چل کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ ہری کے پتن کے مقام پر دریائے بیاس اس میں شامل ہو جاتا ہے اور فیروز پور سے اس کا رخ جنوب مغرب کو ہو جاتا ہے، اور 270 میل چل کر پنجند کے مقام پر راوی چناب اور جہلم کے مجموعے میں شامل ہو کر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے۔

**دریائے بیاس:** یہ کلو کی پہاڑیوں سے نکل کر ریاست منڈی اور کانگڑے کے علاقوں سے گزر کر ضلع ہوشیار پور کی سرزمین میں میدانی علاقے کا دریا بن جاتا ہے اور ضلع گورداسپور میں سے ہوتا ہوا ضلع امرتسر اور کپورتھلہ کے درمیان سرحد بناتا ہوا 490 میل کا فاصلہ طے کرکے "ہری کے پتن" کے مقام پر ستلج سے جا ملتا ہے۔

**دریائے راوی:** اس کا پرانا نام ایراوتی اور اس سے قدیم تر نام پارشنی بتایا جاتا ہے۔ یہ ریاست چنبہ کی پہاڑیوں سے نکل کر چنبہ شہر کے زیریں علاقہ سے ہوتا ہوا مادھوپور کے مقام پر پہنچتا ہے۔ جہاں سے ایک نہر دریائے راوی سے نکالی گئی ہے۔ اب اس کا رخ جنوب مغرب کو ہو جاتا ہے، اور لاہور کے قریب سے گزر کر اوکاڑہ اور ساہیوال کے اضلاع عبور کرکے ضلع ملتان کا رخ کرتا ہے اور تریموں کے مقام پر دریائے چناب اور راوی میں جا گرتا ہے اس کے کنارے ڈلہوزی مادھوپور، پٹھان کوٹ لاہور۔ صدر گوگیرہ ایسے تاریخی شہر بسے ہوئے ہیں۔

**دریائے چناب:** اسے اشکنی اور چندر بھاگا کے نام بھی ملے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ دو ندیوں چندر اور بھاگا کے ملاپ سے بنا ہے۔ 1870ء کے جغرافیہ پنجاب میں اس کا منبع چین کے پہاڑ سے نکلنے والے نالہ چندر اور تبت سے نکلنے والے نالے بھاگا سے مل کر کشتواڑ کے مقام پر ایک ہو جاتا ہے۔

بعض جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ چینی علاقے میں اس کا منبع ہونے کی بنا پر پرانے وقتوں کے ایرانی لوگ اسے "چین آب" کہتے تھے۔ جو "چناب" کی شکل میں شہرت پا گیا۔ دوسرا خیال یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ ریاست چنبہ کے علاقے سے گزر کر جنوب مشرقی کشمیر سے ہوتا ہوا پنجاب میں داخل ہوتا ہے۔ لہٰذا "چنبہ" کی نسبت سے شاید اس کا نام چنب یا چن۔ آب ہو گیا ہو۔ یا چین یا چن آب کی نسبت کی وجہ سے چنبہ شہر کو یہ نام چنبہ دیا گیا ہو بہرحال پنجاب کے لوگ اسے "چنہاں" کا نام دیتے ہیں۔ یہ ضلع سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں وزیر آباد کے مغرب میں گجرات کے قریب سے گزر کر جھنگ کی طرف بڑھ جاتا ہے، اور مگھیانہ سے آٹھ میل دور تریموں کے مقام پر دریائے جہلم میں مدغم ہو جاتا ہے، اور اس کے آگے راوی ان دونوں میں شامل ہو کر پنجند کے مقام پر دریائے سندھ کا حصہ بن جاتا ہے۔ دریائے چناب کے پانی کو عشق سے گہرا لگاؤ ہے۔ گجرات کی سوہنی اور مہینوال اور جھنگ کی ہیر سیال کا قصہ دریائے چناب کے پانی کی عشقیہ لذت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اور عاشق لوگ اسے "پیر چنہاں" کہتے ہیں۔ گجرات اور جھنگ کے علاوہ اس دریا کے پانی نے کسی اور علاقے کو عشق کی لگن سے شہرت نہیں بخشی۔

**دریائے جہلم:** یہ چشمہ ویری ناگ (کشمیر) سے نکل کر نالے کی شکل میں تیزی سے آگے بڑھتا ہے، اور مختلف مقامات پر اس کے معاون نالے اور ندیاں اسے وسعت دیتی

ہیں۔ یہ سری نگر (کشمیر) کے شہر میں سے بہتا ہوا جھیل ولر میں داخل ہوتا ہے' اور بعد میں پہاڑیوں کی سیر کرتا ہوا 240 میل کا پہاڑی سفر طے کرکے میدانی علاقے میں آتا ہے۔ 250 میل تک میدانی سفر کرکے ترموگھاٹ (تریموں گھاٹ) کے قریب چناب سے مل جاتا ہے۔ جہلم شہر اسی دریا کے کنارے واقع ہے۔ ظاہر ہے کہ جہلم شہر آباد ہونے کے بعد اسے دریائے جہلم کہا جانے لگا۔ ورنہ پرانے وقتوں میں اسے ویداسا (Vedasa) یا ویت بمعنی "وِہن" بھی کہا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک جہلم دریا کا پانی یخ بستہ ہوتا تھا۔ اور جہلم کے معنی بھی یخ بستہ ہیں۔ لہٰذا اس دریا کو جہلم کا نام دیا گیا اور اس کے کنارے پنجاب میں آباد ہونے والا شہر بھی جہلم ہی کہلایا۔

دریائے سندھ: اس کے نام دریائے اٹک' دریائے اباسین' دریائے مہران اور دریائے سندھ ہیں۔ اس کا منبع جھیل مانسرور ہے۔ جو اس کے دہانے سے اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اپنے منبع سے راجن پور تک اس کا نام دریائے اٹک مشہور ہے۔ اس کے کنارے مشہور شہر اٹک آباد ہے۔ راجن پور سے آگے۔ اسے دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ دریا قراقرم (K-2) کے پہاڑی سلسلہ میں سے گزرتا ہوا لداخ' بلتستان' اور گلگت کے چکر لگاتا ہوا صوبہ سرحد میں داخل ہوتا ہے' اور مردان ہزارہ اور اٹک کو عبور کرکے پنجند کے مقام پر پنجاب کے مشرقی دریاؤں کو ساتھ ملا کر صوبہ سندھ سے گزر کر سمندر میں جا گرتا ہے۔ مغرب کی طرف دریائے گلگت' سوات' کابل' کرم' شبوک' ٹوچی اور گومل اور کنار اس میں ملتے ہیں' اور سندھ کے علاقے میں مشرقی دریاؤں کی' مشرقی نارو مغربی نارو' گھاڑ پھلیلی پنجاری' جمانڑو' اور بگھار نامی شاخیں اس میں آملتی ہیں۔ سندھ میں اسے مہران بھی کہتے ہیں' اور سندھ کی وادی کو بھی مہران کہا جاتا ہے۔

## دو آبے

1- دو آبہ بست جالندھر: یہ ستلج اور بیاس کے درمیان واقع ہے۔ اِس کا علاقہ دوسرے دو آبوں کی بہ نسبت بہت کم ہے' لیکن زرخیزی میں بے مثال ہے۔ بارش خوب ہوتی ہے۔ پانی بہت اچھا اور میٹھا ہے' اور پورے پنجاب میں آبادی کے لحاظ سے یہ دو آبہ سب سے گنجان شمار ہوتا تھا۔ اس میں ہوشیار پور' جالندھر' کپور تھلہ' ٹانڈہ' ہریانہ' دسوہہ' مکیریاں' کرتار پور' گڑھ شنکر' پھلور' اور نکودر وغیرہ مشہور شہر و قصبے ہیں۔ یہ ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ہے۔

2- دو آبہ باری: اِس میں گورداسپور' امرتسر' بٹالہ (بھارت) اور لاہور' ساہیوال' اوکاڑہ اور ضلع ملتان کے کچھ علاقے شامل ہیں جسے گنجی بار کہتے تھے۔ یہ راوی اور

بیاس کا درمیانی علاقہ ہے۔

3- دو آبہ رچنا: یہ راوی اور چناب کے درمیان واقع ہے۔ اس میں سیال کوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، فیصل آباد اور جھنگ اور ملتان کے کچھ علاقے شامل ہیں۔ اسے ساندل بار کا نام دیا جاتا ہے۔

4- دو آبہ چج یا چنبہ: چناب اور جہلم کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ہے۔ جس میں گجرات، جلال پور جٹاں، شاہ پور، سرگودھا، جھنگ اور فیصل آباد کے کچھ علاقے شامل ہیں۔

5- دو آبہ سندھ ساگر: اسی دو آبہ میں کوہستان نمک واقع ہے، اور کھیوڑہ کے قریب نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ بارش کی کمی کی وجہ سے پیداوار کم ہوتی ہے۔ زیادہ علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے، اور تھل کہلاتا ہے۔ یہ دریائے جہلم اور سندھ کا درمیانی علاقہ ہے۔

# آبپاشی

پنجاب میں آبپاشی کا ذریعہ نہری نظام ہے۔ جس کی وجہ سے پیداوار خوب ہوتی ہے۔ دریاؤں سے بڑی بڑی نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن کے نام اس طرح ہیں۔

1- اپرباری دو آب
2- لوئرباری دو آب (راوی سے)
3- اپرچناب
4- لوئرچناب (چناب سے)
5- اپر جہلم
6- لوئرجہلم (جہلم سے)

نیز بہت سی دیگر نہریں بھی نکالی گئی ہیں۔ منگلا ڈیم، تربیلا ڈیم اور وارسک ڈیم بنا کر نئے نہری نظام کو مربوط کیا گیا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے کی بڑی نہریں وہی تھیں جن کا ذکر آچکا ہے۔

نومبر 1901ء میں پنجاب کی کمشنریوں اور اضلاع کی تقسیم اس طرح تھی، یعنی:

پنجاب: پنجاب میں پانچ ڈویژن بنائے گئے تھے جن میں مندرجہ ذیل علاقے اور ضلع شامل تھے۔

(1) دہلی ڈویژن، اس میں ضلع دہلی، گوڑ گاؤں، رہتک، حصار، کرنال، انبالہ اور شملہ کے اضلاع شامل تھے۔

(2) جالندھر ڈویژن، اس میں ضلع جالندھر، لدھیانہ، فیروزپور، ہوشیارپور اور کانگڑا شامل تھے۔

(3) لاہور ڈویژن، میں گورداسپور، امرتسر، سیال کوٹ، گوجرانوالہ، منٹگمری (ساہیوال)، اور لاہور کے اضلاع شامل تھے۔

(4) ملتان ڈویژن، میں اضلاع، جھنگ، لائل پور (فیصل آباد)، ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان اور میانوالی شامل تھے۔

(5) راولپنڈی ڈویژن میں ضلع شاہ پور، گجرات، جہلم، راولپنڈی اور اٹک شامل تھے۔ ضلع وار تحصیلوں کی تفصیل۔

| ضلع | تحصیلیں |
|---|---|
| ضلع دہلی | دہلی، سونی پت، بلم گڑھ |
| گوڑگاؤں | گڑگاؤں، پلول، فیروزپور، نوح، ریواڑی |
| رہتک | حصار، بھوانی، ہانسی، فتح آباد، سرسہ |
| کرنال | پانی پت، کیتھل، تھانیسر، کرنال |
| انبالہ | جگادھری، نرائن گڑھ، کھرڑ، روپڑ اور انبالہ |
| شملہ | بھرولی، کوٹ کھائی، شملہ، کوٹ گڑھ |
| جالندھر | نکودر، پھلور، نواں شہر، اور جالندھر |
| ہوشیار پور | ہوشیار پور، گڑھ شنکر، اونہ، دسوہہ |
| کانگڑہ | کانگڑہ، پالم پور، کلو، ہمیر پور، ڈہرہ، نور پور |
| لدھیانہ | سمرالہ، جگراؤں، لدھیانہ |
| فیروز پور | فیروز پور، مکتسر، فاضلکا |
| لاہور | لاہور، شرق پور، قصور، چونیاں |
| منٹگمری | ساہیوال، منٹگمری، پاک پتن، دیپال پور، گوگیرہ |
| گوجرانوالہ | گوجرانوالہ، وزیر آباد، حافظ آباد، خانقاہ، ڈوگراں (قلعہ شیخوپورہ ان دنوں ایک معمولی قصبہ تھا۔ 1922ء میں اسے ضلع بنایا گیا۔) |
| سیالکوٹ | سیالکوٹ، ظفروال، رعیہ، پسرور، ڈسکہ |
| امرتسر | امرتسر، ترن تارن، اجنالہ |
| گورداسپور | پٹھان کوٹ، شکر گڑھ، بٹالہ، گورداسپور |
| ملتان | ملتان، کبیروالا، میلسی، لودھراں، شجاع آباد |
| جھنگ | جھنگ، چنیوٹ، شور کوٹ |
| لائل پور (فیصل آباد) | لائل پور، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سمندری |
| مظفر گڑھ | مظفر گڑھ، سنانواں، علی پور |
| ڈیرہ غازی خاں | راجن پور، سانگھڑ، جام پور، ڈیرہ غازی خان |

| | |
|---|---|
| میانوالی | عیسیٰ خیل، بھکر، لیہ، میانوالی |
| راولپنڈی | راولپنڈی، گوجر خان، کہوٹہ، مری |
| اٹک | اٹک، فتح جنگ، پنڈی گھیپ، تلہ گنگ |
| جہلم | جہلم، پنڈ دادنخاں، چکوال |
| گجرات | گجرات، پھالیہ، کھاریاں |
| شاہ پور | شاہ پور، خوشاب، بھیرہ، سرگودھا |

رنجیت سنگھ کے دورِ اقتدار میں گریٹر پنجاب بنا دیا گیا۔ جس میں پشاور، ڈی۔جی۔خان، ڈی۔آئی۔خان، ہزارہ کشمیر، لداخ، کانگڑہ، منڈی سکیت، کلو کا پہاڑی علاقہ، بہاول پور اور کوہ سلیمان شامل تھے۔

انگریزی دور میں پٹیالہ، نابھہ، جیند، فرید کوٹ، مالیر کوٹلہ، انبالہ دہلی اور حصار کو بھی پنجاب کا حصہ بنا دیا۔ 1912ء میں دہلی کو پنجاب سے الگ کر دیا گیا۔ کیونکہ دہلی کو انگریزوں نے برصغیر کا دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ 1947ء میں ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعہ پنجاب کو تقسیم کر کے بھارت اور پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ بھارتی پنجاب میں سکھوں کا زور توڑنے اور لسانی تعصب کی وجہ سے بھارتی پنجاب کے تین ٹکڑے کر دیئے گئے۔

1- ہماچل پردیش: اس میں شملہ، کلو، کانگڑا، بہاول، سپیٹی اور ضلع ہوشیار پور اور انبالہ کے کچھ حصے شامل ہیں اور رقبہ دس ہزار آٹھ سو پچاس (10,850) مربع میل ہے۔

2- ہریانہ: اس میں حصار، مہندر گڑھ، گڑگاؤں، رہتک، کرنال شامل ہیں اور رقبہ سترہ ہزار چھ سو (17,600) مربع میل ہے۔

3- پنجابی صوبہ: اس میں دس اضلاع ہیں اور رقبہ صرف (47,205) مربع میل ہے۔ جبکہ پاکستان میں شامل پنجاب ایک صوبہ کی حیثیت سے قائم ہے۔ جس میں بہاول پور کے تین اضلاع، بہاول پور، بہاول نگر اور رحیم یار خاں بھی شامل ہیں۔ اور یحییٰ خاں کے دور میں مغربی پاکستان (ون یونٹ) (ONE UNIT) کی تحلیل کے بعد سابقہ صوبوں کی بحالی کے موقع پر ریاست بہاول پور کی بحالی آئینی طور پر ناممکن ہونے کی وجہ سے اس ریاست کو پنجاب میں شامل کر دیا گیا تھا۔

## عام جغرافیائی حالات

ماہرین طبقات الارض کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں پاکستان کا سارا علاقہ ایک گہرا سمندر

تھا۔ پھر سمندر کی جگہ کوہ ہمالیہ نے لے لی' اور اس کے ثبوت کے طور پر وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ 1979ء میں پہاڑوں سے بعض سمندری جانوروں اور وہیل مچھلی کے ڈھانچے ملے تھے' لیکن بعض مسلم ماہرین کا خیال ہے کہ طوفان نوح میں چونکہ پہاڑ بھی سینکڑوں فٹ تک ڈوب گئے تھے۔ اس لئے اس عالمگیر طوفان میں سمندری جانور بہہ کر پہاڑوں میں پھنس گئے اور پانی اُترنے پر وہ پہاڑوں میں پھنس کر رہ گئے اور یہاں ان کے ڈھانچے ہی رہ گئے۔ جو برآمد ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب کے ضلع اٹک میں افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ملنے والے فاسلز کے مشابہ بڑے بڑے دانتوں والے چوہے جیسے جانوروں کے فاسلز ملے ہیں۔

باب 2

# پنجاب کا تہذیبی ورثہ

برصغیر پاک و ہند میں آثار قدیمہ کو محفوظ کرنے میں پہل مسلمان حکمرانوں نے کی۔ ان میں فیروز شاہ تغلق کا نام بڑا نمایاں ہے، پھر انگریزی دور میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے سر ولیم جونز کی سرکردگی میں یہی کام شروع کیا۔ لیکن صحیح اور باقاعدہ تحقیقی کام 1860ء میں شروع ہوا اور 1871ء میں سر الیگزینڈر کننگھم کو محکمہ آثار قدیمہ ہند کا ناظم مقرر کیا گیا۔ جس کا دائرہ عمل صرف شمالی ہندوستان تک محدود تھا۔ تاہم 1874ء میں جنوبی ہندوستان کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ اس نے وسطی اور شمالی ہندوستان کو تیئیس (23) سال تک چل پھر کر کھنگالا اور اپنے تجربات کو تیئیس جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب:

"Archaeological Survey of India Reports"

میں پیش کیا۔ 1881ء میں میجر اے۔ایچ۔کول (Cole) کو قدیم یادگاروں کا محافظ (Curator) بنا دیا گیا۔ جبکہ کننگھم کے بعد ڈاکٹر جیمس برجس (Dr James Burgess) کو ڈی۔جی بنایا گیا 1889ء میں برجس سبکدوش ہو گیا آخر لارڈ کرزن نے برطانوی ماہر اثریات مارشل کو اس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا جو 1906ء سے 1932ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ جس کی کوشش سے مختلف مقامات پر کھدائی کی گئی۔ اس کے بعد مسٹر ھار گریوز (Hargreaves)، رائے بہادر دیا رام ساہنی، میجر بلیکسٹن (Blakistan) اور سر مار ٹیمر وھیلر (Sir Mortimer Whealer) محکمہ آثار قدیمہ کے سربراہ بنے۔ قیام پاکستان کے بعد پنجاب اور مغربی پاکستان میں واقع جو قدیم کھدائی کردہ یادگاریں پاکستان کے حصہ میں آئی ہیں وہ انہی افسروں کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہیں۔

پنجاب میں ہڑپہ ٹیکسلا اور سندھ میں موہنجوڈارو وغیرہ کی کھدائی سر جان مارشل کی زیر ہدایت انجام پائی۔ جس کے نتیجے میں وادی سندھ و پنجاب کی قدیم ترین تہذیب منظر عام پر آئی۔ پنجاب میں حجری عہد کے آثار کا مطالعہ سب سے پہلے ڈی ٹیرا (De-Terra) نے 1935ء میں وادی سوان میں کیا۔

قیام پاکستان کے بعد محکمہ آثار قدیمہ پاکستان نے راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار اور سندھ میں روہڑی کے مقام پر حجری دور کے آثار دریافت کئے۔ 1955ء میں کوٹ ڈیجی (سندھ) کے مقام

پر سندھ کی ابتدائی تہذیب کے آثار دریافت کئے گئے۔ اسی طرح بھنبھور میں کھدائی کی گئی تو یہاں سے اسلام کے ابتدائی عہد کی بہت سی چیزیں ملی ہیں' اور اس طرح تقابلی مطالعہ کے لئے بڑا اہم مواد فراہم ہو گیا ہے۔ یہاں ایک قلعہ بند شہر کا منصوبہ اور بہت بڑی تعداد میں ابتدائی اسلامی دور کے سکے' برتن' کتبات وغیرہ بھی ملے ہیں۔ اسی طرح ٹیکسلا کے قریب سرائے کالا میں ایک اہم مقام دریافت ہوا ہے جس کی کھدائی سے پتہ چلا ہے کہ اس علاقہ کی ثقافت ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ تلمبہ ضلع ملتان' منصورہ ضلع سانگھڑ' (سندھ) تمر گوٹھ' ہڑپہ' نیوگرام اور پن ڈھیری کے مقامات پر کھدائی سے بھی تہذیب و ثقافت کے قدیم آثار ملے ہیں۔ ٹیکسلا' ہڑپہ' بھنبھور' عمرکوٹ اور موہنجوڈارو وغیرہ میں آثار قدیمہ سے متعلقہ عجائب گھر تعمیر کئے گئے ہیں اور ان تہذیبوں کا ایک دوسری سے گہرا تعلق بنتا ہے۔

## پنجاب اور سندھ کا قدیم تمدن اور تہذیب

کسی زمانے میں پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان ایرانی بادشاہوں کے زیر نگیں تھے۔ پنجاب میں ہڑپہ کی کھدائی سے جو قدیم تہذیب برآمد ہوئی ہے اس کے ڈانڈے سندھ میں موہنجوڈارو کے آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہونے والی تہذیب سے ملتے ہیں اور پھر ان کا تعلق بیرون ہند و پاک کی تہذیبوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی یہ تہذیبیں آسوری' بابلی' سبائی وغیرہ تہذیبوں سے بھی کسی نہ کسی طرح جڑی ہوئی تھیں۔ پھر ان بستیوں کے لوگ غالباً آفات زمانہ یا خدائی عذاب کا شکار ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں بعض بستیوں کو الٹنے کا ذکر آتا ہے۔ بہرحال انسانی تہذیب کی قدامت سے پنجاب اور سندھ کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس بارے میں تاریخ تمدن ہند کے مؤلف لکھتے ہیں:

**موہنجوڈرو اور ہڑپہ کا تمدن:** متاخرین حجری عہد سے گذرتے ہی جنوبی عراق اور سندھ کی وادی میں ہماری نظر تمدن کے ایسے آثاروں پر پڑتی ہے کہ ہم ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں۔ ابھی ہم اجتماعی زندگی کی بنیاد پڑنے' بستیاں بسنے' صنعت میں کسی قدر مشق اور صفائی پیدا ہونے کا ذکر کر رہے تھے' اب یک بارگی ہمیں عالی شان شہر دکھائی دیتے ہیں' ان کے مکانات پختہ اور مضبوط' دو' دو تین تین منزل اونچے ہیں۔ ان میں سڑکیں ہیں' بازار ہیں' ان کے باشندوں کی زندگی رواج اور عادت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جنوبی عراق اور سندھ کے وہ آثار جو سب سے زیادہ گہرائی پر ملے ہیں سب سے زیادہ ترقی کا پتہ دیتے ہیں' یعنی جب یہاں کے شہر پہلے پہل بنے تب یہاں کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی اور بعد کو اسے زوال ہی ہوتا رہا۔ جنوبی عراق کی سومیری تہذیب کا جس زمانے سے سراغ لگتا ہے

اس وقت سومیری دھاتوں کی چیزیں بنا لیتے تھے بڑے گنجان شہروں میں بستے تھے، ان کا ایک خاصا پیچیدہ رسم خط تھا اور ان کی سیاسی تنظیم باضابطہ اور مستحکم تھی۔ موہنجوڈرو کے پہلے شہر کی بنیاد پڑی تو سندھ کی تہذیب اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ اسی ایک شہر تک محدود بھی نہیں تھی۔ موہنجوڈرو صوبہ سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ہے۔ ہڑپا پنجاب کے ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں دونوں کے درمیان ساڑھے چار سو میل کا فاصلہ ہے، لیکن دونوں کے تمدن میں حیرت انگیز یکسانی ہے، دونوں کے مکانات ایک طرح کے نقشے پر، ایک طرح کے مسالے سے بنتے ہیں، ان کے اوزار، برتن، ہتھیار، زیور، مہریں، سب بالکل ایک سی ہیں۔ ان دونوں شہروں کی تہذیب ارتقاء کے ایک لمبے سلسلے کی تکمیل تھی، ایک سی طبیعت، مذاق رسم و رواج اور عقیدے رکھنے والے لوگوں کی تہذیب تھی اور وہ انہی دو شہروں کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔

**موہنجوڈرو کے باشندوں کی نسل:** ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتے کہ سندھ کی یہ قدیم تہذیب کس نسل کے لوگوں کی محنت، استعداد اور شوق کا کارنامہ تھی، موہنجوڈرو اور ہڑپا دونوں بہت بڑے شہر تھے، ان میں جو ہڈیاں ملی ہیں دو چار مختلف نسلوں کے لوگوں کی ہیں اور اگر کھوپڑیوں سے نسل کا صحیح تعین کیا جا سکتا تب بھی ان شہروں کے تمام یا اکثر باشندوں کی کھوپڑیاں اسی طرح کی تھیں۔ موہنجوڈرو میں مردوں کو دفن کرنے کے بھی مختلف طریقے رائج تھے، اس لئے یہ ذریعہ بھی کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ جنوبی ہند کے دراوڑوں سے قدیم سندھیوں کی جو تہذیبی قرابت تھی اس کا ذکر آگے کیا جائے گا، لیکن اس قرابت سے نسلی تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ ایک محقق کی رائے میں سومیریا کے قدیم باشندے دراوڑوں سے مشابہ تھے۔ اور ایک کا خیال ہے کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا کے لوگ دراوڑی یا اصل دروواڑی تھے اور ان کو اور کریٹ کے قدیم باشندوں کو ایک ہی نسل کی دو شاخیں سمجھنا چاہئے۔ ہندوستان میں دراوڑوں کا دوسری نسلوں سے بہت میل ہوا ہے اور اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانچ ہزار برس پہلے ان کی شکل صورت ایسی تھی جیسی کہ آج کل ہے اور ایسی نہیں تھی تو پھر کیسی تھی۔ سب سے صحیح یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑ جو ابتدائی زمانے میں مشرقی بحر روم کے گرد آباد تھے اور وہاں سے مشرق کی طرف پھیلے سندھی تہذیب کے بانی ہوں گے، لیکن سندھ اور پنجاب میں اور نسلیں بھی آباد تھیں اور ان کا بھی اس تہذیب میں کچھ نہ کچھ حصہ ہوگا۔

**سندھی تہذیب کا پھیلاؤ اور مذہب:** سومیریا اور بابل میں سندھ کی مہریں اور خاص وضع کے برتن ایسی گہرائی پر ملے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ اور سومیریا کا تعلق بہت پرانا اور بہت قریبی تھا۔ پروفیسر لینگڈن نے سندھی رسم خط پر

غور کر کے پہلے تو یہ رائے قائم کی کہ اس کا سومیری رسم خط سے کوئی تعلق نہیں، پھر جمدت نصر کے مقام پر سومیری رسم خط کے ابتدائی نمونے ملے تو انہوں نے اپنی رائے بدل دی، لیکن سندھی اور ابتدائی سومیری رسم خط دونوں مصر کے قدیم ترین تصویری رسم خط سے بھی مشابہت رکھتے ہیں اور اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تینوں غالباً ایک ہی اصل سے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کا اختلاف بڑھتا گیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مصری پیپرس پر اور سومیری مٹی کی تختیوں پر چوکور نوک کے قلم سے لکھتے تھے سومیری اور مصری تحریریں تو پڑھی جا سکتی ہیں۔ سندھی رسم خط کا بھید ابھی تک نہیں کھل سکا ہے۔ اُر کے مقام پر ایک سندھی مہر دستیاب ہوئی ہے جس پر تحریر سومیری رسم خط میں ہے اور اس سے امید ہوتی ہے کہ کوئی ایسی چیز بھی مل جائے گی جس پر ایک ہی مضمون دونوں خطوں میں لکھا ہو ایسی کوئی تحریر ہاتھ لگی اور سندھی خط پڑھا جا سکا تو بہت سے معمے حل ہو جائیں گے۔ ابھی تک تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھ اور سومیریا ملتی جلتی شہری تہذیبوں کے مرکز تھے، ان کے درمیان تجارت ہوتی تھی، بعض مجسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کا پہناوا ایک سا تھا، اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، ایک محقق کی رائے میں سومیری صورت شکل سے ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ سندھ میں بہت سے مجسمے ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی ایک دھرتی ماتا کی پوجا ہوتی ہے، جیسے کے سومیریا اور ایشیائے کوچک میں، اسی کی ساتھ ایک دیوتا کی پرستش بھی ہوتی تھی جس کی صورت اور علامات سومیریا کے سورما گلگامش سے بہت ملتی ہیں۔ جب تک سندھ کی تحریریں نہ پڑھ لی جائیں گی ہم صحیح طور پر معلوم نہ کر سکیں گے کہ سندھی اور سومیری عقائد کس حد تک یکساں اور کس اعتبار سے مختلف تھے، لیکن جو شبہ ہے وہ تفصیلات میں ہے، اس میں اب اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ تہذیبوں کے اس سلسلے میں جو اٹلی سے چین تک پہنچتا تھا، سومیری اور سندھی تہذیبوں میں جو قرابت ہے وہ انہیں ایک جداگانہ حیثیت دے دیتی ہے۔ سراورل شائن نے، اس بناء پر کہ سندھ سے سومیریا تک قدم تہذیبوں کے آثار ملنا لازمی ہے، جنوبی بلوچستان کے ایک حصے کا دورہ کیا جو دو سو ستر میل چوڑا اور تین سو میل لمبا ہے اور اس علاقے کی وادیوں میں انہیں جگہ جگہ پر پرانی بستیوں کے آثار ملے۔ آج کل یہ سارا خطہ بہت خشک ہے، چوتھی صدی قبل مسیح میں جب کہ سکندر ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے یہاں سے گزرا۔ تب بھی یہ بہت خشک تھا، اس لئے شائن کو یہ مسئلہ بھی طے کرنا تھا کہ اس دور میں جب کہ سندھ اور سومیریا کی تہذیبیں عروج پر تھیں اس علاقے کا کیا حال تھا۔ شائن کو قدیم آبادی کے آثاروں کے ساتھ ساتھ بہت سے بند ملے جو گبر بند کہلاتے ہیں اور بڑے پتھروں سے اور نہایت مضبوط بنے ہوئے ہیں۔ تاریخی زمانے میں جنوبی بلوچستان کے رہنے والوں میں کبھی اتنی دولت تھی نہ اتنی استعداد کہ وہ ایسے بند تعمیر کرا سکتے، اور اس علاقے کی آبادی کو دیکھتے ہوئے بند بنانے کا اہتمام فضول کی دردسری

ہوتی۔ یہ ایسے زمانے کی یادگار ہیں جب یہ علاقہ آج کل کی بہ نسبت بہت زیادہ آباد تھا اور بڑے پیمانے پر آب پاشی کا انتظام کرنے کی ضرورت تھی' یہ بھی ظاہر ہے کہ بند بنائے نہ جاتے اگر بارش پر بھروسا کیا جا سکتا۔ یعنی اس قدیم زمانے میں بھی جب کہ یہ بند بنے اس علاقے میں بارش کم ہوتی تھی' لیکن آج کل کے مقابلے میں بارش بھی زیادہ تھی اور آبادی بھی زیادہ۔

شائن کو جنوبی بلوچستان میں جو آثار ملے ہیں ان پر ابھی کافی تفصیل کے ساتھ غور نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہ صحیح نہیں بتایا جا سکتا کہ بلوچستان کی یہ قدیم بستیاں کس خاص زمانے کی ہیں اور ان کا آس پاس کے تہذیبی مرکزوں سے کتنا اور کیسا تعلق تھا۔ ممکن ہے ان بستیوں کے فروغ کا زمانہ وہ ہو جب کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا عروج پر تھے' ممکن ہے انہوں نے بعد کو فروغ پایا ہو' لیکن یہاں کے آثار کسی ایک اور مختصر دور کے نہیں ہیں۔ بعض مورتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ "دھرتی ماتا" کی یہاں بھی پرستش کی جاتی تھی اور مورتیوں کی وضع بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ موہنجوڈرو میں دیکھی جاتی تھی۔ علم الانسان کے ماہروں نے ان ہڈیوں کو جو یہاں کی بعض قبروں میں ملی ہیں ان ہڈیوں سے مشابہ بتایا ہے جو موہنجوڈرو میں پائی گئی ہیں' اور مردوں کی خاک رکھنے کے برتن یہاں اس کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو جلا کر ان کی خاک کو برتنوں میں دفن کرنے کی رسم یہاں عام تھی۔ مارشل کی رائے ہے کہ موہنجوڈرو کا عام طریقہ یہی تھا۔

(مارشل۔ موہنجوڈرو اور سندھی تہذیب جلد اوّل باب 6)

جنوبی بلوچستان کا دورہ کرنے سے پہلے شائن نے شمالی بلوچستان اور وزیرستان کا دورہ کیا تھا' بلوچستان کے ان دونوں حصوں میں' صوبہ سندھ میں ٹھٹہ کے قریب سے ضلع لاڑکانہ اور اوپر شمال میں دریائے سندھ سے مغرب کی طرف لورالائی' ڈیرہ جات' ژہوب کے علاقوں اور مشرق میں روپڑ تک اس خاص تہذیب کے آثار برآمد ہوئے ہیں جو متاخر حجری عہد اور دھاتوں کے زمانے کی درمیانی کڑی ہے۔ متاخر حجری عہد کے آثار صوبہ سندھ میں بڑی کثرت سے ملتے ہیں اور اسی افراط سے روہڑی کے گرد مول کی وادی میں اور کیرتھر پہاڑیوں میں موجود ہیں۔ ان کے متعلق ابھی تک اتنی معلومات حاصل نہیں کی جا سکی ہیں کہ ان کا موہنجوڈرو کی تہذیب سے سلسلہ واضح طور پر ملایا جا سکے۔ مارشل کی رائے میں مٹی کے برتنوں کی وضع سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تہذیب جس کا نمونہ موہنجوڈرو اور ہڑپا کے شہر ہیں مشرقی بلوچستان' جنوبی وزیرستان' ڈیرہ جات' کلو اور کیچ کی وادیوں میں ضرور پھیلی ہو گی۔ پنجاب میں اس امر کا مرکز ہڑپا تھا جو عظمت اور قدامت میں موہنجوڈرو کا جواب تھا۔ پنجاب کے اور حصوں میں بھی اتنے آثار ہاتھ نہیں لگے ہیں کہ یہاں اس تہذیب کے پھیلاؤ اور اثر کا صحیح اندازہ کیا جا سکے' مگر اس کا پورا امکان ہے کہ جو تہذیب دریافت شدہ آثار کی بنا پر ابھی تک سندھی کہلاتی ہے رفتہ رفتہ ہندی پنجابی تہذیب کہلانے کی مستحق ثابت ہو۔ (مارشل۔

ایضاً باب 7)

مارشل نے یہ رائے قائم کرنے میں بہت احتیاط برتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی بلوچستان کا وہ علاقہ جس میں براہوئی زبان بولی جاتی ہے موہنجوڈرو کے قریب ہے اور ایک زمانے میں سندھی تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ دوسری طرف دکن میں ایسے آثار برآمد ہوتے جاتے ہیں جن سے قدیم دکنی اور سندھی تہذیب کا گہرا تعلق ثابت ہوتا جاتا ہے۔ دکن میں بھی مردے جلائے جاتے تھے اور ان کی خاک خاص قسم کے برتنوں میں رکھ کر دفن کردی جاتی تھی یہاں کے چقماتی اوزار سندھی کے اوزاروں سے بہت مشابہ ہیں اور مسکی، ضلع رائچور میں زیورات ملے ہیں جن میں سے بعض کی بناوٹ بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ موہنجوڈرو کے زیوروں کی، موہنجوڈرو کے سکوں کی ایک بڑی تعداد ضلع کریم نگر، ریاست حیدرآباد، میں دستیاب ہوئی ہے۔ ایک خاص قسم کے منکے جن پر سفیدے کا کام ہے، موہنجوڈرو میں بھی ملے ہیں اور مسکی میں بھی۔ لاجورد کے مثلث نما منکے بھی دونوں مقاموں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ لاجورد دکن میں نہیں ہوتا یہ یہاں باہر سے آیا ہوگا، لیکن مسکی مین منکے جس افراط سے پائے گئے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں یہاں منکوں کا کام بہت کثرت سے ہوتا تھا۔ موہنجوڈرو اور ہڑپا میں جو سونا ملا ہے اس میں چاندی کی آمیزش کے ساتھ سونا کولار (میسور) اور اننت پور (مدراس) کی کانوں میں نکلتا ہے۔ مگر سندھ اور پنجاب سے متصل علاقوں میں کہیں نہیں حاصل کیا جاسکتا تھا۔ مسکی کی بہت سی قبروں میں جو برتن ملے ہیں ان پر وہ تحریریں ہیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا رسم خط کریٹی، ایجیتن، مصری لیبیائی اور لبیائی رسم خط سے ملتا تھا۔ قرابت کی ان تمام دلیلوں کو مجموعی طور پر دیکھیں تو یہ بات یقین کے قابل معلوم ہوتی ہے کہ اگر دکن اور سندھ کے قدیم باشندے ایک نسل کے نہیں تھے تب بھی ان کے درمیان وہ قرابت ضرور ہوگی جو تہذیب کی مشابہت کے ساتھ لازمی سی قرار دی جاسکتی ہے۔

**پنجابی اور سندھی تہذیب کا زمانہ:** سندھی تہذیب کی وسعت اور اس وسعت سے جو نتیجے نکالے جاسکتے ہیں ان پر بحث کرنے کے بعد اب ہم اس پر غور کرسکتے ہیں کہ اس تہذیب کی ابتدا کب سے ہوئی اور یہ کب تک قائم رہی۔ موہنجوڈرو میں تین شہر یکے بعد دیگرے آباد ہوئے اور وہاں عمارتوں کی سات تہیں ملی ہیں جن میں سے ایک بالکل ابتدائی زمانے کی ہے، تین وسطی اور تین آخری زمانے کی ہیں۔ ہڑپا کی سب سے نیچی تہہ موہنجوڈرو کی پہلی تہہ سے زیادہ پرانی معلوم ہوتی ہے اور وہاں کی آخری، یعنی سب سے بعد کی تہوں میں ایسے آثار ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آثار موہنجوڈرو کے آخری زمانے کے بھی بعد کے ہیں۔ موہنجوڈرو اور ہڑپا میں ہر سطح پر جو آثار ملے ہیں ان میں بڑی یکسانی ہے۔ عمارتوں میں جس قسم کی

اینٹیں شروع میں استعمال کی گئی ہیں وہی آخر تک استعمال کی گئی ہیں، مہریں ایک ہی وضع کی ہیں اور اس پر جو کام ہے وہ ایک ہی طرح کا ہے۔ مٹی کے برتن بھی سب ایک ہی طرح کے ہیں، اگر کوئی فرق محسوس ہوتا ہے تو بس یہ کہ آخر دوروں کے جو مکانات ہیں وہ خراب مسالے سے بنائے گئے ہیں اور ان کے نقشوں پر پست حوصلگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس بناء پر مارشل نے یہ رائے قائم کی ہے کہ سندھی تہذیب کی مدت عمر پانچ سو سال کے قریب تھی اور موہنجوڑرو اور سومیریا کے سب سے قدیم آثار کا مقابلہ کرکے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس تہذیب کا آغاز 3250 ق م کے قریب ہوا اور 2750 ق م کے قریب یہ مٹ گئی، یہ موہنجوڑرو اور ہڑپا کے سب سے پرانے آثار، خواہ ہم عمارتوں کو دیکھیں یا مصنوعات کو، اس کا پتا دیتے ہیں کہ اس تہذیب کے عروج کا زمانہ وہی تھا جس کے آثار سب سے زیادہ گہرائی پر ملے ہیں یعنی سب سے زیادہ پرانے ہیں اور ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہے کہ اس کی ابتدائی شکلیں کیا تھیں اور اس نے ترقی کیسے کی۔ سومیریا تہذیب کے متعلق بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہمیں بنی بنائی ملتی ہے اور ایسے آثار اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہو کہ اس کی نشوونما کیسے ہوئی۔ بہرحال اس طرح کی تہذیب بنتے بنتے ہی بن سکتی ہے۔ مارشل نے سندھی تہذیب کی مکمل صورت دیکھ کر اندازہ کیا ہے کہ اس کی نشوونما میں کم ازکم ایک ہزار برس لگے ہوں گے، یعنی اس کی طرح 4250 ق م کے لگ بھگ ڈالی گئی ہوگی۔ 3250 ق م کے قریب یہ عروج پر تھی اور 2750 ق م کے قریب یہ غائب ہوگئی۔

قدامت کا جو اندازہ مارشل نے کیا ہے اس کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ سندھ یا جنوبی عراق میں ایسے آثار نہ ملیں جن سے ظاہر ہو کہ موہنجوڑرو کی تہذیب زیادہ پرانی تھی۔ مارشل کے شرکاء میں سے پروفیسر لینگڈن کے خیال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہذیب زیادہ قدیم ہوگی اور جمدت نصر میں جو مٹی کے برتن ملے ہیں ان سے غالباً یہی نتیجہ نکلے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ ثبوت ہے کہ موہنجوڑرو کا رسم خط تصویری تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، یہ بعد کے سومیری رسم خط سے تو نہیں ملتا ہے لیکن جنوبی عراق کے قدیم اور مصری رسم خط کی درمیانی کڑی ہے۔ یہ غالباً 4000 ق م سے پہلے ہی رائج تھا۔ مارشل نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ موہنجوڑرو میں شیشے کی چوڑی یا اور کوئی چیز نہیں ملی ہے، اگرچہ سومیری اور مصری شیشہ بنانا جانتے تھے اور ان کے یہاں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ بعض تانبے اور پیتل کے اوزار اور ہتھیار، جو شروع زمانے کے نہیں بلکہ بعد کے ہیں، نفاست اور کام کی صفائی کے لحاظ سے دوسری چیزوں سے لگا نہیں کھاتے۔ سومیریا میں تین ہزار ق۔م سے پہلے بھی بہت بہتر برچھے اور خنجر بننے لگے تھے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موہنجوڑرو کے برتنوں اور اوزاروں وغیرہ میں کسی قسم کی آزائش نہیں ملتی۔ برتن رنگے ہوئے ہیں تو بھی ان کے رنگ بھدے ہیں اور نقش و نگار بہت سادہ، لیکن قدامت کی ان تمام علامتوں کے باوجود مارشل نے اپنی

رائے نہیں بدلی اور کسی دوسرے محقق نے اس بارے میں ابھی تک کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

**قدیم پنجابی اور سندھی تہذیب کی خصوصیات:** ہم نے موہنجوڈرو اور ہڑپا کے باشندوں کی نسل، ان کی تہذیب کے پھیلاؤ اور اس کی قدامت پر تفصیل سے بحث اس لئے کی ہے کہ ہم اس تہذیب کو اس کے صحیح پس منظر کے ساتھ دیکھ سکیں۔ اب ہم اس کی خصوصیات پر غور کر سکتے ہیں۔ یہ تہذیب شہری تھی، ملکی اور دیہاتی نہیں تھی۔ ملک اور مملکت کے مظاہر بہت بعد کی چیزیں ہیں، جس زمانے سے ہمیں بحث ہے اس وقت تہذیب کے مرکز وحشت کے بے پایاں ریگستان میں چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کی حیثیت رکھتے تھے، اور موہنجوڈرو اور ہڑپا ایسے ہی نخلستان تھے۔ بڑے شہر ترقی یافتہ صنعت اور ترقی یافتہ تھی اور ان شہروں میں تجارتی مال ایک طرف دکن اور جنوبی ہند اور دوسری طرف جنوبی عراق سے آتا جاتا تھا۔ ہڑپا میں ایک بہت بڑا انبار خانہ ملا ہے جس میں غالباً وہ غلہ جمع کیا جاتا تھا۔ جو شہری لگان کے طور پر ادا کرتے تھے یا جو شہریوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے باہر سے آتا تھا۔ ہمیں ان شہروں میں وہ مہریں تو بڑی کثرت سے ملی ہیں جو تجارتی مال پر لگائی جاتی تھیں۔ مگر ہتھیار بہت ہی کم ملے ہیں۔ ان شہروں کے حاکم بڑی فوجیں نہ رکھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ انہیں صرف اپنے شہر کی حفاظت کرنا تھا۔ کسی ملک پر قبضہ رکھنا اور حکومت کرنا نہیں تھا۔ موہنجوڈرو میں ایک چھوٹے سے قلعے اور شہر کی فصیل کے کچھ آثار برآمد ہوئے ہیں۔ شہروں کے باشندے عام طور پر مارپیٹ سے پرہیز کرتے ہوں گی اور سپہ گری کا ان میں کوئی شوق یا چرچا نہ ہو گا۔ یہ لوگ بہت دولت مند بھی ہوں گے، کیونکہ صرف دولت مند لوگ ہی ایسے مکان بنوا سکتے ہیں اور اپنے آرام کے لئے وہ اہتمام کر سکتے تھے جو یہ لوگ کرتے تھے۔ یہ اصطلاح تو بعد کی ہے، لیکن ہمارا مطلب اس سے واضح ہو جائے گا۔ اگر ہم کہیں کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا ویسی ہی شہری مملکتیں ہوں گے جیسی کہ بابل اور مشرقی بحر روم میں اسی زمانے میں ملتی ہیں اور جیسی کہ فونیقیوں کی بڑی آبادیاں شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے ساحل پر تھیں۔ یہ بڑے شہر ایک دوسرے سے تعلقات رکھتے تھے، لیکن گردوپیش کے دیہات سے جس میں وحشی قبیلے آباد تھے، اور ان کا برتاؤ دشمنوں کا سا ہو گا اور وحشی قبیلے ان کی دولت اور شان و شوکت سے اتنے مرعوب ہوں گے کہ ان کی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتے ہوں گے۔ ہم کو معلوم ہے کہ یونان، ایشیائے کوچک اور کریٹ کے فونیقی تاجر دیہات کے اندر جا کر لڑکے لڑکیاں پکڑ لاتے اور انہیں شہروں میں بیچا کرتے تھے۔ کریٹ کے ایک دیوتا پر قربان کرنے کے لئے یونان سے ہر سال لڑکے لڑکیاں خراج کے طور پر بھیجی جاتی تھیں۔ ایسے برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یونانیوں کی طاقت ذرا بڑھی تو انہوں نے کریٹ کے سب سے عظیم الشان شہر کنوسوس کو جلا کر

خاک کر دیا۔ ہمیں تاریخ سے تو ابھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، لیکن علاوہ سیلابوں کے، جن کا پتا چلایا گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا کی تباہی کا سبب یہ بھی ہو کہ دیہاتی ان کے ظلم سے عاجز آکر ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ موہنجوڈرو میں ایک جگہ کمرے میں اور دوسرے جگہ زینے کے پاس مردوں عورتوں اور بچوں کی ہڈیاں اس طرح پڑی ملی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ سب کسی حادثے میں ہلاک ہوئے یا ایک ساتھ قتل کیئے گئے۔ اگر مارشل کا یہ خیال صحیح ہے کہ موہنجوڈرو پانچ سو سال کے اندر تین مرتبہ نئے سرے سے آباد ہوا اور اس کے آثار میں تین نہیں بلکہ سات تہیں ملتی ہیں تو یہ بات زیادہ قرین قیاس ہو جاتی ہے کہ وہ برباد ہوتا رہا اور بعض حصوں پر بربادی تین نہیں سات دفعہ آئی۔ شہر کو برباد کرنے والے آریہ نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ وہ ہندوستان میں بہت بعد کو داخل ہوئے، کسی ایسی سلطنت کے قائم ہونے کا پتا نہیں چلتا جو موہنجوڈرو جیسے شہر کو فتح کرکے اپنے اندر شامل کر لیتی، خانہ جنگیوں میں شہری ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں مگر شہر کو برباد نہیں کر ڈالتے۔ اس پر ظلم کرتے اور ان کے ہاتھون نقصان اٹھاتے تھے۔(لیکن یہ ماہرین قرآن حکیم سے نابلد ہیں لہٰذا عذاب الٰہی سے ایسی بربادی ان ماہرین کے ذہن میں نہیں آسکی کیونکہ لادین ماہرین قرآن حکیم کی روشنی سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں)(قدر آفاقی)

**شہروں پر مجموعی نظر:** موہنجوڈرو کے موجودہ آثار کا رقبہ 240 ایکڑ ہے، اصل شہر اس سے بہت زیادہ بہت بڑا ہو گا۔ اس کا کچھ حصہ تو دریائے سندھ بہالے گیا ہو گا اور کچھ ایک خاص قسم کی لونی لگ جانے سے گل گیا ہو گا۔ یہ لونی سندھ میں مخصوص بلا ہے اور یہ عمارتوں کو اتنی ہی جلدی مٹا دیتی ہے جیسے دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے، لیکن موہنجوڈرو اور ہڑپا میں جو کچھ محفوظ رہ گیا ہے اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ شہر بہت بڑے پیمانے پر بنے تھے، ترتیب سے بنے تھے، ان کی سڑکیں کشادہ تھیں اور ان میں صفائی اور آمد و رفت کی آسانی کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ خالی بنیادوں اور دیواروں کے نیچے کے حصے کو دیکھ کر ہر عمارت کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا بنیادی مصرف کیا تھا، اور دونوں شہروں میں ایسے بہت سے آثار ہیں جن سے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے کہ وہ کس قسم کی عمارت کے آثار ہیں، پھر بھی اتنی عمارتوں کا نقشہ ذہن میں قائم کیا جا سکا ہے کہ ان شہروں کی معاشرت کا ایک خاکہ بنایا جا سکے۔

موہنجوڈرو اور ہڑپا کی آبادی بہت گنجان ہوگی اور اسی وجہ سے اکثر مکانات دو منزلوں کے ہونگے۔ بعض اس سے بھی زیادہ اونچے ہوں گے۔ عمارتیں پختہ اینٹوں اور اچھے مسالے کی بنتی تھیں، سڑکیں بابل کی طرح یہاں بھی کچی چھوڑ دی جاتی تھیں۔ حمام اور مکانوں میں غسل خانے اس کثرت سے بنے ہیں کہ۔ معلوم ہوتا ہے یہاں کے شہریوں کو جسمانی صفائی کی بڑی فکر رہتی تھی یا پھر غسل کرنا ان کے مذہبی آداب میں شامل ہو گا اور وہ اسے ایک عبادت سمجھتے ہوں گے۔ یہاں کی

سڑکوں پر جگہ جگہ حوض بنے تھے، جن میں گندہ پانی جمع ہوتا تھا اور ان سے نکال کر وہ پھر شہر کے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کوڑے کے لئے بھی جابجا برتن رکھے رہتے تھے، جن میں کہیں تو کوڑا جمع کر کے ڈالا جاتا کہیں مکانوں سے براہ راست نالیوں کے ذریعے آکر گر جاتا۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ شہر کی صفائی کا ذمہ دار کوئی نہ کوئی ہوگا اور اس کے سپرد دوسرے انتظامات بھی ہوں گے جن کے آثار باقی نہیں رہ سکتے تھے۔

**مکانات:** موہنجوڈرو کے مکانوں مین صحن ہوتے تھے، کبھی ایک، کبھی زیادہ۔ مارشل نے ایک بڑے مکان کا نقشہ آثار کے مطابق تیار کرایا ہے۔ اس میں چار خاصے بڑے صحن، دس کمرے، اوپر جانے کے لئے زینے ایک چوکیدار کے رہنے کا کمرہ اور ایک کنواں ہے۔ اس مکان کے رہائش کے کمرے غالباً دوسری منزل پر تھے، اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی ہوگا کیونکہ پانی کی نالیاں اسی حساب سے بنی ہیں۔ مکانوں میں صرف ایک دروزاہ باہر کی طرف کھلتا تھا باقی سب صحن میں۔ کھڑکیاں بھی عموماً اندر کی طرف کھلتی تھیں۔ قریب قریب ہر مکان میں اپنا کنواں ہوتا تھا، اور اکثر مکانوں میں نیچے کی منزل میں اور اوپر بھی غسل خانے ہوتے تھے۔ پانی کی نکاسی کے لئے پکی نالیاں بنائی جاتی تھیں کہ پانی کہیں مرنہ سکے۔ موہنجوڑرو کے وسطی دور کے آثار میں ایک ہال بھی ہے جو 90 فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ اس کی چھت کا وزن سنبھالنے کے لئے پانچ پانچ ستونوں کی چار قطاریں تھیں یعنی کل بیس ستون۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز موہنجوڑرو کا بڑا حمام ہے۔ اس کے بیچ میں ایک صحن ہے اور صحن میں ایک حوض جو 39 فٹ لمبا 23 فٹ چوڑا اور 8 فٹ گہرا ہے۔ حوض کے دو طرف سیڑھیاں ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے جو تیر نہیں سکتے تھے ایک طرف حوض کی گہرائی کم کردی گئی ہے۔ صحن کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور تین طرف برآمدوں کے پیچھے کمرے۔ حوض میں پانی کنویں سے بھرا جاتا تھا اور پانی کی نکاسی کے لئے جو نالی بنی ہے وہ ساڑھے چھ فٹ اونچی ہے۔ حوض کی چاروں طرف چنائی ایسی مضبوط ہے کہ اس میں پانی بالکل جذب نہ ہوتا ہوگا اور اس کی تری سے عمارت کی بنیادوں کو نقصان نہ پہنچ سکتا ہوگا۔

**وضع قطع اور لباس:** موہنجوڑرو ایک ایسا شہر تھا جس میں ہر ملک اور قوم کے لوگ آتے جاتے ہوں گے۔ ان کا لباس اتنا ہی مختلف ہوگا جتنی کہ ان کی صورتیں۔ یہاں جو مورتیں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد چھوٹی ڈاڑھیاں رکھتے تھے، مونچھیں کوئی منڈاتا تھا کوئی نہیں، کوئی پٹے رکھتا کوئی بال بڑھاتا اور پیچھے جوڑا باندھ لیتا۔ بالوں کو روکنے کے لئے سر پر پٹیاں باندھی جاتی تھین، جو معمولی کپڑے کی ہوتی ہوں گی مگر ایسی پٹیاں بھی ملی ہیں جو سونے کی پتیوں سے بنی ہیں۔ مردوں کا عام لباس ایک چادر تھی جو کمر سے لپیٹی جاتی اور دائیں بغل کے پیچھے سے لاکر بائیں کندھے پر ڈال لی جاتی۔ اس چادر کے نیچے کوئی کرتا یا بنڈی پہنی جاتی تھی یا نہیں اس

کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ عورتوں کے لباس کا مطلق کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ وہ بال یا تو کھلے رکھتی تھیں یا پیچھے ڈھیلا سا جوڑا باندھ لیتی تھیں یا اس طرح سے گوندھتی تھیں کہ ایک اونچی نکیلی ٹوپی کی یا ہلال کی یا عمامے کی شکل نکل آتی۔ مورتیوں میں سے کسی میں ایک پٹکے کے سوا اور کوئی لباس نہیں دکھایا گیا ہے، مگر اس سے کوئی نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا۔ مردوں کی بھی ایسی مورتیاں ملی ہیں جن میں سر پر کچھ بندھا ہوا ہے۔ ہاتھ پاؤں اور گلے میں تھوڑا سا زیور ہے اور بس۔

موہنجوڈرو میں زیور پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ناگڑیاں، بالیاں، کیلیں، اور پاؤں میں کڑے صرف عورتیں پہنتی تھیں، ہاتھ اور گلے کا زیور مرد عورتیں دونوں پہنتے تھے۔ زیور بنانے کی صنعت موہنجوڈرو میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی تھی۔

**غذا:** موہنجوڈرو کے لوگ کاشت تو کرتے تھے، اس لئے کہ گیہوں اور جو کے دانے آثاروں میں ملے ہیں لیکن اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ ہل بنا سکتے تھے۔ نیز چکی کے پاٹ بھی نہیں ملے ہیں۔ غالباً اس وقت تک اناج پیسنے کا رواج نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غذا میں اناج کو خاص اہمیت نہ ہو گی اور وہ زیادہ تر مچھلی دودھ، گائے، بھیڑ، بکری اور پرندوں کا گوشت کھاتے ہوں گے، گھڑیال کا گوشت بھی ان کے یہاں کھایا جاتا تھا۔ پالتو جانوروں میں سے بیل، بھینس، بھیڑ، ہاتھی، اونٹ کی ہڈیاں ملی ہیں۔

**کاروبار اور صنعتیں:** ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ موہنجوڈرو والوں کے تعلقات دور افتادہ مقاموں سے تھے۔ ان کی تجارت اس منزل سے گزر چکی تھی جب کہ لین دین زیادہ تر تبادلے کے ذریعے ہوتا ہے۔ ان کے یہاں سکے کا رواج تھا اور موہنجوڈرو کے آثار میں باٹ اس کثرت سے ملے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے تول کر چیزیں دینے کا طریقہ عام تھا۔

موہنجوڈرو کے سکے چاندی کے ٹکڑے تھے جن پر کسی مہر کے ذریعے نشان بنا دیا جاتا تھا۔ اور سکوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ضلع کریم نگر میں ملا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ موہنجوڈرو کے زوال کے بعد سکے جو پران یا کرشاپن کہلاتے تھے ہندوستان میں بڑی مدت تک رائج رہے۔ گوتم بدھ کے زمانے میں یہ چلتے تھے۔ سکندر جب ٹکسیلا پہنچا تو اسے بھی یہی سکے نذر کے طور پر دیئے گئے، ایک زمانے میں ہندوستان کے آغاز مین قدیم ترین یہی سکے سمجھے جاتے تھے، لیکن ان کی اصلیت اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب یہ دیکھا گیا کہ ان پر اسی زبان میں تحریریں ہیں اور ویسے ہی نشانات بنے ہیں جیسے کہ موہنجوڈرو کی مہروں پر۔ اب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ موہنجوڈرو کے سکے ہیں۔ موہنجوڈرو کے آثار مین وہ سانچے بھی ملے ہیں جن سے ان سکوں پر نشانات بنائے جاتے تھے۔

موہنجوڈرو کے باٹ پتھر کے تراشے اور پالش کیئے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ ان میں دو چار اسطوانی ہیں عام طور پر وہ شش پہل ہیں۔ وزن کے اعتبار سے ان کی نسبت 2-4-8-16-32-

64-160-200-320-1600 کی ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اوزان کا سلسلہ مکمل تھا۔ اس کے متعلق مفصل معلومات تبھی حاصل ہو سکیں گی جب موہنجوڈرو کی تحریریں پڑھ لی جائیں گی۔

غالباً موہنجوڈرو کی صنعتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ جوہری کا کام تھا اسی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے جنوبی ہندوستان سے سونا اور قیمتی پتھر جایا کرتے تھے، لیکن سونے چاندی کے برتن، تانبے کے اوزار، ہتھیار، ہانڈیاں وغیرہ بنتیں اور سستے قسم کے زیورات بھی تانبے ہی کے بنتے تھے۔ جن اوزاروں اور ہتھیاروں میں تیز اور مضبوط دھار کی ضرورت ہوتی وہ کانسی کے بنائے جاتے، اور جب کبھی زیوروں یا مورتیوں میں کام کی صفائی مقصود ہوتی تب بھی یہ دھات استعمال کی جاتی، ٹین اور سیسا بھی موہنجوڈرو میں ملا ہے مگر کم غالباً ٹین کی کمی کے سبب سے تانبے کا رواج زیادہ رہا، ورنہ صنعت کے لئے کانسی کو تانبے پر ترجیح دی جاتی۔ اسی سلسلے میں بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ موہنجوڈرو میں ہتھیار قسموں کے اعتبار سے بھی کم ملے ہیں اور تعداد کے لحاظ سے بھی۔ کلہاڑیاں، برچھیاں، خنجر، تیر کمان، گرز اور فلاخن تو دستیاب ہوئے ہیں، لیکن نہ تلوار کا پتا ہے نہ ڈھال کا، نہ خود کا اور نہ زرہ کا۔ جو ہتھیار بر آمد ہوئے ہیں وہ بھی ناقص ہیں۔

موہنجوڈرو میں کاتنے اور بننے کا بڑی کثرت سے رواج تھا۔ افسوس ہے کہ کپڑے کے نمونے محفوظ نہیں رہ سکے! لیکن مٹی اور مسالے کے تکلے اس افراط سے ملے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ امیر اور غریب ہر ایک کے گھر میں چرخے چلتے تھے۔ گرم کپڑے اون کی ہوتے تھے، ٹھنڈے کپڑے سوت کے، اور یہ تیار کر کے سومیریا اور بابل بھیجے جاتے ہوں گے، جہاں ہندوستان کے سوتی کپڑے کی بڑی قدر تھی، اور کوئی پیداوار تھی نہیں جس کی موہنجوڈرو والے اتنے بڑے پیمانے پر تجارت کرتے جتنا کہ ان مہروں کی کثرت سے ثابت ہوتا ہے جو ان کے اپنے شہروں اور عراق کی قدیم بستیوں میں ملی ہیں۔

موہنجوڈرو میں مٹی کے جو برتن ملے ہیں ان میں کوئی خوبی نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کمہار کا کام محض ایک ادنیٰ صنعت تھی جس کی کوئی قدر نہیں تھی۔ کام اور فن کی ساری خوبی اور صفائی مہروں، تعویذوں اور زیوروں میں نظر آتی ہے۔ زیوروں میں جو رنگ آمیزی کی گئی ہے وہ بہت ہی نفیس ہے اور مہروں اور تعویذوں پر جانوروں کی جو شکلیں بنی ہیں ان میں نقاشی کا کمال دکھایا گیا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ بنانے والے کو جانور کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ مورتیوں کو دیکھ کر بھی اہل فن پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ موہنجوڈرو کے کاریگر اناڑی نہیں تھے۔ ہڑپا میں دو مورتوں کے دھڑ ملے ہیں جن میں سے ایک سرخ پتھر کا ہے، دوسرا سرمئی رنگ کے سلیٹ پتھر کا، مارشل کی رائے ہے کہ یہ ایسے نمونے ہیں جنہیں یونان کا کوئی ماہر فن تیار کرتا تو ان پر فخر کرتا۔ مصر

ایسی ہی رائے ایک رقاصہ کی مورت کے بارے میں دیتے ہیں۔ یہ رقاصہ صورت سے حبشی معلوم ہوتی ہے، اس کے اعضا ذرا بھی سڈول نہیں ہیں لیکن اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ سکوت میں حرکت کی کیفیت پیدا کی گئی ہے تو یہ مورت بہت اچھی کہی جا سکتی ہے۔

تہذیب کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا میں کھلونوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملی ہے۔ ان میں آدمیوں اور جانوروں کی شکلیں ہیں۔ جھنجنے ہیں، سیٹیاں ہیں، رنگین گیندیں اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں۔ بعض جانوروں کے سر اور دھڑ الگ بنا کر پھر تاگے سے جوڑے جاتے، تاکہ وہ ہلتے رہیں۔ بعض جانوروں کے تمام اعضاء اسی طرح جوڑے جاتے۔ سیٹیوں کی شکل چڑیوں کی سی ہوتی، جو اندر سے خالی ہوتیں اور ان کے پیٹ میں سوراخ بنا لیا جاتا جس میں پھونکنے سے آواز نکلتی۔ ہڑپا میں ایک کانسی کی بیل گاڑی ملی ہے جس کے اوپر چھت لگی ہوئی ہے اور یہ دیکھنے میں ویسی ہی ہے جیسی کہ آج کل بہلیاں ہوتی ہیں۔ انہیں کھلونوں کے ساتھ بہت سے مہرے اور پانسے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں لوگوں کو جواء کھیلنے کا بھی شوق تھا۔

**عقائد:** جب تک قدیم سندھی زبان پڑھی نہ جائے گی، ہمیں یہ صحیح معلوم نہ ہو سکے گا کہ موہنجوڈرو اور ہڑپا والوں کے عقائد کیا تھے۔ بعض عمارتوں کی نسبت خیال ہوتا ہے کہ یہ عبادت گاہیں ہوں گی لیکن ان میں نہ مورتیں ملی ہیں نہ پوجاپاٹ سے متعلق چیزیں جن سے اندازہ کیا جا سکے کہ عبادت کا طریقہ کیا تھا۔ ہم صرف چند مہروں اور مٹی، مسالے اور دھات کی بنی ہوئی مورتوں کو دیکھ کر قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

ان مورتوں میں زیادہ تر ایک دیوی کی ہیں اور اسی شکل کی مورتیں بلوچستان، ایران، عراق، ایشیائے کوچک، شام، فلسطین، مصر اور بلقان میں ملی ہیں۔ مارشل کی رائے میں اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ موہنجوڈرو کے مذہب کا ان ملکوں کے قدیم مذاہب سے جن میں ایک دھرتی ماتا یا مادر کائنات کی پرستش کی جاتی تھی کوئی تعلق ہو گا۔ خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ملک سب ایک دوسرے سے متصل تھے اور ان کے درمیان تہذیبی تعلقات تھے۔ اس دیوی کے مقابلے میں کوئی دیوتا موہنجوڈرو میں نہ تھا۔ البتہ ایک مہر پر ایک ترمکھی دیوتا کی شکل بنی ہے جو سادھی کے خاص آسن میں بیٹھا ہے۔ اس کی سر پر سینگیں ہیں اور کمر کے نیچے یہ برہنہ ہے، اس کے ایک طرف ہاتھی اور چیتا بنا ہوا ہے، دوسری طرف گینڈا اور بھینس، اس کی نشست ایک تخت پر ہے اور تخت کے نیچے ایک ہرن بنا ہے۔ مارشل کا خیال ہے کہ یہ شیو کی ایک پرانی شکل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شیو کی ترمکھی مورتیں ملتی ہیں، مہادیو کی حیثیت سے شیو حیوانات کا دیوتا مانا جاتا ہے اور ممکن ہے شیو کی سینگیں بعد کو روپ بدل کر ترسول بن گئی ہوں، جو اس کی ایک مانی ہوئی علامت ہے۔ (بحوالہ مارشل موہنجوڈرو اور سندھی تہذیب باب 5)۔ لیکن ان نظریوں کو قائم کرتے ہوئے

مارشل نے بعد کے ہندو عقائد اور دیوتاؤں کا بہت لحاظ رکھا ہے اور ایک ظاہری کو حقیقی کا مرتبہ دے دیا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے سومیریا کے عقائد کو بہت نظرانداز کیا ہے اور موہنجوڈرو کے دیوتاؤں کی سومیریا کے دیوتاؤں سے مشابہت ہے اس سے نتیجے نکالنا احتیاط کے خلاف قرار دیا ہے۔ جس دیوتا کو وہ شیو سے مشابہ بتاتے ہیں اس کی شکل سومیریا کے "سورماگل گامش" سے ملتی ہے۔ سومیریا میں سینگھیں مافوق الفطری قوت کی علامت مانی جاتی تھیں اور ہندوستان میں کبھی یہ علامت اس مقصد سے نہیں اختیار کی گئی۔ موہنجوڈرو کی ایک اور مہر پر آدھے آدمی، آدھے بیل کی ایک شکل ہے اور اسے ایک سینگھ دار شیر سے لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سومیریوں کا عقیدہ تھا کہ آرورز دیوی نے سورماگل گامش سے لڑنے کے لئے ایک دیو پیدا کیا جو آدھا انسان اور آدھا حیوان تھا اور اس کا نام ایابانی یا ان کیدو تھا۔ اِن کیدو گل گامش سے لڑنے کے بجائے اس کا دوست بن گیا اور پھر دونوں نے درندوں اور جنگلی جانوروں سے لڑنا شروع کر دیا۔ ان لڑائیوں کو سومیریا کی مہروں اور تعویذوں پر اکثر دکھایا جاتا تھا۔

یہ خیال قدیم زمانے میں عام تھا اور اب بھی تمام وحشی اور بعض مہذب لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ روحیں درختوں اور جانوروں کے جسموں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ موہنجوڈرو والے بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے اور مختلف درختوں اور جانوروں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ایک مہر پر ایک درخت اور اس میں رہنے والی روح دکھائی گئی ہے۔ ایسی شکلیں بھی مہروں پر ملتی ہیں جو آدھی آدمی اور آدھی بکری یا مینڈھے کی ہیں، یا جن کا ایک حصہ بکری یا مینڈھے، ایک حصہ ہاتھی، ایک حصہ بیل کا سا ہے مگر چہرہ آدمی کا ہے۔ سانپوں کی بھی پرستش کی جاتی تھی اور انہیں کبھی ان کی اصل اور کبھی انسان نما صورت میں دکھایا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک گینڈے سے مشابہ جانور بھی ہے جس کے سامنے ہمیشہ ایک برتن رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مارشل کا خیال ہے کہ یہ خوشبو جلانے کا برتن ہے اور موہنجوڈرو میں اس گینڈے یا ایک سینگھ کے بیل کی پرستش کے ساتھ خوشبو جلانے کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی، مگر یہ محض غالباً ایک قیاس ہے۔

جن درختوں اور جانوروں کی پرستش اس لئے ہوتی تھی کہ وہ روحوں کے مسکن سمجھے جاتے تھے۔ وہ درختوں اور جانورون کی حیثیت سے بھی پرستش کے مستحق مانے جاتے ہوں گے۔ برار کے گونڈ شیر کی پوجا کرتے ہیں، بھیل بھی شیر کو دیوتا مانتے ہیں، کندھ ہاتھی کی پرستش کرتے ہیں اور اسی پر آدمی بھی قربان کرتے ہیں، صوبہ متوسط کے سونبارے مگرمچھ کو دیوتا مانتے ہیں، ہندوؤں میں بندر، سانپ اور پیپل کی حرمت کرنا عام رواج ہے۔ موہنجوڈرو میں لنگم اور یونی کی پرستش بھی کی جاتی تھی اور بعض ہندو فرقوں میں یہ آج تک مقدس علامات مانی جاتی ہیں۔

ہڑپا میں ایک مہر ملی ہے جس میں ایک مرد درانتی لئے ہوئے کھڑا دکھایا گیا ہے اور زمین پر ایک عورت پڑی ہوئی کچھ التجا کر رہی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمیوں کی قربانی کی جاتی تھی، لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ قربانی کس دیوی یا دیوتا کو راضی کرنے کے لئے اور کن موقعوں پر کی

جاتی تھی۔

مردوں کو دفن کرنے کا طریقہ مذہبی رواج میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ موہنجوڈرو میں کوئی قبرستان نہیں ملا ہے۔ ہڑپہ میں چھوٹے بڑے کئی ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دونوں جگہ مردے عام طور پر جلائے جاتے تھے اور پھر ان کی راکھ اور ہڈیاں جمع کر کے اور ایک بڑی ہانڈی میں رکھ کر دفن کر دی جاتی تھیں۔ ایسی ہانڈیاں کہیں بہت سی ایک ساتھ رکھی ہوئی اور کہیں منتشر ملی ہیں۔ ایک رسم یہ بھی تھی کہ مردے جنگل میں ڈال دیئے جائیں، اور جب گدھ اور جانور ان کی ہڈیوں کو بالکل صاف کر دیں تو انہیں دفن کر دیا جائے۔ مارشل کی رائے میں یہ رسم موہنجوڈرو کے زوال کے زمانے کی ہے۔ موہنجوڈرو میں ایسی بھی لاشیں ملی ہیں جو آدھی جلائی اور آدھی ہانڈیوں میں رکھ کر دفن کی گئی ہوں گی۔ اسے بھی مارشل بعد کی رسم قرار دیتے ہیں۔ مردوں کو پورا پورا دفن کر دینے کا رواج بالکل نہیں تھا یا بہت کم۔ موہنجوڈرو میں ایک جگہ پر بہت سی لاشیں ایک ساتھ پڑی ملی ہیں، قرین قیاس یہ ہے کہ یہ لوگ دفن نہیں کیئے گئے بلکہ کسی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ دفنانے کے ان مختلف طریقوں کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کونسا عام رواج کے مطابق ہے کونسا نہیں، کونسی لاش موہنجوڈرو کے خاص باشندے کی ہی، کون سی پردیسی یا کسی غیر مذہب کو ماننے والے کی۔

**آریائی اور سندھی تہذیب کا موازنہ:** سندھی تہذیب کی بعض خصوصیات کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کی ہندوستانی تہذیب سے رشتہ جوڑا جا سکتا ہے، مگر اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ موہنجوڈرو یا ہڑپا والوں کا آریوں سے بھی کوئی تعلق تھا۔ ایک محقق کی رائے ہے کہ رگ وید میں ان لوگوں کا ذکر ہے اور انہیں پنی، یعنی کنجوس کا نام دیا گیا ہے، جو قربانیاں نہیں کرتے، اور دان نہیں دیتے، لیکن اس رائے کو ابھی بھی جانچا نہیں گیا ہے۔ رگ وید میں "دیووں" اور "داسوں" کا ذکر بھی آیا ہے جو "پورون" میں رہتے تھے۔ "دیو" یا "داس" لفظ صرف "عداوت" ظاہر کرتا ہے۔ وہ دیوتاؤں کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں سبھی کے لئے استعمال کیا جاتا اور دشمن آریہ اور غیر آریہ دونوں ہو سکتے تھے۔ "پوری" کے معنی شہر ہو سکتے ہیں یا کوئی بستی جس کی مورچہ بندی کر لی گئی ہو، اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ "پورون" میں رہنے والے "دیو" یا "داس" سے مراد خاص طور پر ہڑپا یا موہنجوڈرو یا ان سے متعلق شہروں کے لوگ ہیں۔

ہڑپا کے سوا پنجاب یا گنگا کی وادی میں کہیں بھی ایسے آثار نہیں ملے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ وہی تہذیب جو سندھ میں تھی ہندوستان کے اس حصے میں بھی پھیلی تھی، البتہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سندھی اور آریائی تہذیب میں گہرا اور بنیادی فرق تھا۔ سندھی تہذیب شہری تھی، آریہ دیہات میں ہوتے اور اسی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ آریوں کے مذہب میں

آگ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، موہنجوڈرو میں اس کا بہت چرچا تھا۔ مردوں کو دفن کرنے کے طریقے بھی مختلف تھے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ آریہ شروع میں نہیں تو ہندوستان میں آباد ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد لوہے کے استعمال سے واقف ہو گئے اور لوہا موہنجوڈرو میں بالکل ملا ہی نہیں ہے، لیکن آریوں نے شمال مغربی ہند کے جن علاقوں کو فتح کیا اور غیر آباد نہیں تھے، یہاں کے باشندے میدان میں اور اپنی بستیوں کی قلعہ بندی کرکے آریوں سے لڑتے رہے۔ گنگیر یا منصوبہ متوسط) راجپور (ضلع بجنور) مین پوری (صوبۂ متحدہ میورئی (ضلع اٹاوہ، صوبۂ متحدہ) فتح گڑھ اور بیتھر (ضلع کانپور، صوبۂ متحدہ) میں تانبے اور کانسی کی مختلف شکلوں کی کلہاڑیاں، برچھیاں، چھینیاں اور تلواریں ملی ہیں۔ اس خاص نمونے کے ہتھیار نہ موہنجوڈرو اور ہڑپا میں ملے ہیں نہ کہیں اور، تلواروں کی ساخت دیکھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ موہنجوڈرو کے زمانے کے بہت بعد کی ہیں اور جن لوگوں نے انہیں بنایا ان کی تہذیب خاصے بڑے عرصے تک قائم رہی ہوگی۔ آریاؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ان لوگوں کو بھگا کر ملک کو اپنے لئے خالی کرا لیتے۔ پنجاب میں آریوں کے ساتھ غیر آریہ قبیلے آباد رہے اور ان سے آریوں کے تعلقات بڑھتے رہے ایک مشہور جنگ میں آریہ اور غیر آریہ قبیلوں کا مل کر دوسرے فریق سے لڑنے کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس میل جول کا آریوں کی تہذیب پر کیا اثر پڑا یہ ابھی قطعی طور پر معلوم نہیں ہے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ لوگوں میں اس طرح کا میل جول ہو اور وہ ایک دوسرے کے علم اور تجربے سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ آریوں کے عقائد اور رواج میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں جن کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ آریہ ان عقائد اور رسموں سے متاثر ہوئے جو ہندوستان کی غیر آریائی آبادی میں رائج تھیں۔ سنسکرت ابجد کے دندانی حروف (ٹ۔ ٹھ۔ وغیرہ) اور کسی ہند جرمانی زبان میں نہیں ملتے، دراوڑی زبانوں میں البتہ پائے جاتے ہیں، اور یہ سنسکرت میں دراوڑی اثر کی بدولت شامل کیئے گئے ہوں گے۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا ماخذ بھی دراوڑی زبانیں ہوں گی، پھر اریوں کو فن تعمیر کا شوق نہیں تھا مگر شہنشاہ اشوک کے زمانے سے فن تعمیر اور سنگ تراشی کے بت اچھے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھیں تو یہ رائے صحیح معلوم ہونے لگتی ہے کہ آریوں کو بس پنجاب اور گنگا کی وادی کے مغربی حصے میں تسلط حاصل ہوا، باقی ملک پر دراوڑی حاوی رہے۔ ان کی اپنی تہذیب تھی، اپنا مذہب تھا، وہ فن تعمیر سے بخوبی واقف تھے اور شہری زندگی بسر کرتے تھے، آریہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھتے تھے تو کیا ان کے آنے کے بعد جو نئی تہذیب پیدا ہوئی وہ ان کی اور دراوڑوں کی تہذیبی کشمکش اور مفاہمت کی پیدا کی ہوئی چیز تھی۔

R.D.Banerji, Prehistoric, Ancient and Hindu India- page- 18 to 22 & 36 to 38)

# ٹیکسلا اور گندھارا آرٹ اور تہذیب

پنجاب میں ٹیکسلا، "گندھارا" ریاست کا صدر مقام تھا۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات آج کی اپنی عظمت رفتہ کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ اس کی کھدائی سے قدیم شہر کے مکانات اور ان کی بنیادیں دریافت ہوئی ہیں۔ ٹیکسلا شروع سے ہی علم و فن کا مرکز تھا اور فوجی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وسطی ایشیا سے اندرون ہند تک جانے والی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس وقت کی مہذب دنیا میں اس کی تجارتی اہمیت کا بھی دور دور تک شہرہ تھا۔ اور ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا' یہاں کا راجہ آمبھی تھا جس کی پورس کے ساتھ کھٹ پٹ رہتی تھی۔ علم و فن کا مرکز ہونے کی وجہ سے طلباء دور دور سے علم کی پیاس بجھانے آتے اور سیراب ہو کر واپس جاتے۔

ٹیکسلا شہر مہابھارت سے بھی قدیم تر مانا جاتا ہے۔ البتہ اس کے دریافت ہونے والے آثار قدیمہ ہخامنشی اور موریہ دور سے قدیم تر نہیں ہیں۔ آثار قدیمہ کی رو سے شہر میں بھنگیوں اور اچھوتوں کا کوئی طبقہ نہ تھا۔ بستی میں کوئی کنواں نہ تھا بلکہ پانی کے لئے قریبی چشمے کام دیتے تھے۔ لوہے کا استعمال عام تھا۔ کھیتی باڑی کے اوزار اور آلات لوہے کے بنے ہوتے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کی تجارت باختر تک تھی۔ کھدائی سے چڑھاوے کی تختیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن پر عورت اور مرد کو برابر اور ساتھ ساتھ کھڑے دکھایا گیا ہے۔ چاندی کے 166 ٹھپہ دار سکے بھی برآمد ہوئے۔ نیز سونے چاندی کے زیورات ایک یونانی بادیہ اور سکندر اعظم کے سر کی مورت بھی ملی ہے۔

**سرکپ اور ٹیکسلا:** ٹیکسلا کی دوسری بستی سرکپ کہلاتی ہے جسے دوسری صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے آباد کیا تھا۔ یہ شہر تین سو سال تک یونانیوں، ساکاؤں، پارتھیوں اور ابتدائی کشنوں کا دارالحکومت رہا۔ اس کے ساتھ ہی بھیڑ کی بستی ہے۔ بھیڑ اور سرکپ کی کھدائی سے سینکڑوں یونانی سکے، زیورات، آلات و اوزار اور عمارتوں کی بنیادیں اور کھنڈرات ملے ہیں۔ البتہ کوئی تحریر دستیاب نہیں ہو سکی۔ ساکاؤں کے عہد کا ایک شاہی محل ملا ہے جس کے آثار کو برصغیر کا سب سے پرانا شاہی محل تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ساخت عراق کے اشوری محلات جیسی ہے۔ دیواریں بالکل سادہ اور سپاٹ ہیں اور ایک عبادت گاہ ملی جو دو منہ والے شاہین کی طرف منسوب ہے۔ دو منہ والا شاہین بابل، ایشائے کوچک اور اسپارٹا میں بھی شاہی اقدار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ علامت ساکاؤں نے اپنائی۔ چنانچہ روس میں انقلاب سے پیشتر زاروں کا شاہی نشان دو منہ والا شاہین ہی ہوتا تھا۔ جرمنی میں یہ علامت دوسری جنگ عظیم سے پہلے تک موجود رہی۔ سرکپ سے سونے کے سکے بنانے کے بیس (20) سانچے بھی ملے ہیں۔ ایک سنگ مرمر کا ستون

سرکپ کی کھدائی سے برآمد ہوا۔ جس پر آرامی زبان میں تحریر ہے کہ یہ ستون ٹیکسلا کے صوبے دار اور پاٹلی پتر کے ولی عہد اشوک کے دور میں فلاں افسر کے اعزاز میں نصب کیا گیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ سرکپ کسی دور میں بھیڑ کی مضافاتی بستی تھا۔ آرامی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ خروشتی رسم الخط آرامی سے ہی ماخوذ ہے۔

سرکپ اور اس کے مضافات کی کھدائی سے سونے چاندی کے زیورات، ترکھانوں، لوہاروں، سناروں، اور جراحوں کے اوزار، پتھر کے باٹ اور اوزان، کھیتی باڑی اور باغبانی کے آلات، بچوں کے کھلونے اسلحہ اوزار، مورتیاں اور مالائیں مہریں سانچے اور دھات کے ٹھپے بھی بڑی تعداد میں ملے ہیں۔ سونے چاندی کے زیورات اور برتنوں کی ساخت یونانی طرز کی حامل ہے۔ البتہ لوہے اور پتھر کی چیزیں مقامی گھڑت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

سرکپ سے ملحق جانڈیا کے مقام پر ایک عبادت گاہ ملی جس کے جوڑ کی عمارت پورے برصغیر میں نہیں ملتی۔ اس کا طرزِ تعمیر خالص یونانی ہے، اور یہ عمارت ایتھنز کی عبادت گاہ پارتھینیاں کا ہو بہو نقشہ پیش کرتی ہے۔ بعض جگہ مٹی کی ابھرواں (Embosed) مورتیاں ملی ہیں۔

گندھارا آرٹ دراصل آریاؤں، یونانیوں، ساکاؤں، پارتھیوں اور کشن تہذیبوں کا نچوڑ ہے۔ جس کا مرکز ٹیکسلا تھا، لیکن اس کی شاخیں پشاور، مردان، سوات، افغانستان، سیدو شریف، حتیٰ کہ وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

## گندھارا آرٹ کی تاریخی تقسیم:

اس کے تین دور ہیں۔

(1) یونانی آرٹ کی نقالی کا دور۔ یہ پہلی صدی عیسوی تک جاری رہا۔

(2) پارتھیوں کے دور میں اس آرٹ کی آمیزش کا رنگ ابھرا، اور یونانی آرٹ کی بدھ مت کے عقائد وغیرہ سے ہم آہنگی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ مٹی کے پیالوں کی جگہ کنول کے پھول تراشے جانے لگے۔ یونانی دیوتاؤں کی جگہ گوتم بدھ کی مورتیاں بننے لگیں، اور یونانی فن کو مقامی آرٹ کے تابع کر لیا گیا۔

گندھارا آرٹ کا دور ساسانیوں کے حملے (230ء) تک برقرار رہا۔

(3) گندھارا آرٹ نے کشنوں کے زمانے میں خوب ترقی کی۔ جگہ، جگہ اسٹوپا اور وہار قائم کئے گئے۔ پشاور کا مشہور اسٹوپا کشنوں نے ہی تعمیر کروایا تھا۔ موہنجوڈارو میں بھی اسٹوپا کا کھنڈر ملا ہے۔ نیز میرپور خاص (کھوجوڈارو) حورو، دسپر، کھنگرو، سدرن جوڈارو، اور جھرک میں بھی اسٹوپوں کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔ گندھارا آرٹ کا یہ دور چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ وحشی ہنوں نے اس دور کے آرٹ کی اینٹ سی اینٹ بجادی اور

گندھارا بستیاں، ان کے فن کار اور گندھارا فن تباہ ہو کر رہ گیا۔ اور پھر اسے زندہ ہونا نصیب نہ ہوا۔

## باب 3

# آریاؤں کی آمد

یورپی محققین کے نزدیک آریاؤں کا اصلی وطن آسٹریا ہنگری تھا۔ بعض مورخین ان کو قطب شمالی کے نزدیک کے رہنے والے بتاتے ہیں۔ ایک یہ خیال بھی ہے کہ آریہ لوگ ہندوستان ہی کے باشندے ہیں اور وہ کہیں باہر سے نہیں آئے۔ بلکہ پنجاب میں ہی رہا کرتے تھے مگر سب سے قوی خیال یہ ہے کہ آریوں کا اصلی وطن وسطی ایشیا میں بحیرہ کیسپین کے گرد و نواح کا علاقہ تھا۔

آریوں کے اصل وطن کا پتا چلانا مشکل ہے۔ اب اکثر محقق اس پر متفق ہیں کہ آریہ نسل کا گہوارہ دریائے ڈینیوب کی وادی تھی۔ یہاں سے اس کے قبیلے اِدھر اُدھر جاتے رہے۔ وہ قبیلے جو ہندوستان پہنچے درہ دانیال سے گزر کر ایشیائے کوچک اور شمالی ایران ہوتے ہوئے آئے، جہاں انہوں نے خاصی بڑی سلطنتیں بھی قائم کیں۔ گویا جب آریوں کی تعداد زیادہ ہو گئی، اور ان کا اصلی وطن ان کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ تو ان میں سے کچھ لوگ یورپ کو چلے گئے اور کچھ کوہ ہندوکش سے گزر کر درہ خیبر کی راہ سے ہندوستان کو چلے آئے۔ جو آریہ لوگ ہندوستان کو چلے آئے انہیں "ہندی آریہ" کہتے تھے۔ آریوں کی آمد تاریخ ہند میں اہم ترین واقعہ ہے۔

**آریوں کی آمد:** آریہ لوگ ہندوستان میں کب آئے۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ سب کے سب ایک ہی دفعہ ہندوستان میں نہیں چلے آئے۔ بلکہ اُن کے مختلف گروہ مختلف وقتوں میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کا پہلا گروہ آج سے تقریباً چھ ہزار سال پہلے ہندوستان میں داخل ہوا۔

**آریوں کا پھیلنا:** آریہ لوگوں نے اول ہی اول پنجاب میں ڈیرے ڈال دیئے، اور یہاں کئی سال آباد رہے، پھر وہاں سے رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے گنگا کے میدان میں جا پہنچے، اور سارے شمالی ہندوستان میں پھیل گئے۔ اس دوران میں انہیں یہاں کے اصلی باشندوں یعنی دراوڑوں کو مغلوب کر کے انہیں دکن کی طرف بھگا دیا۔

(1200 ق م) کے لگ بھگ وہ شمالی ہندوستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ژند اوِستا اور رگ وید کی زبان میں اتنا کم فرق ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان آنے اور رگ وید کے مرتب ہونے کے درمیان بہت زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا۔

انیسویں صدی میں آریوں اور ان کی زبان کے بارے میں جو تحقیق کی گئی اس سے یہ معلوم ہوا کہ مغرب یورپ سے لے کر ہندوستان تک جو زبانیں بولی جاتی ہیں یا پہلے کبھی بولی جاتی تھیں ان میں سے کئی مثلاً یونانی، لاطینی، جرمن، قدیم ایرانی، فارسی، سنسکرت وغیرہ سب ایک اصل سے ہیں اور اس بنیادی زبان کا نام ہندی یورپی یا ہند جرمانی رکھا گیا۔ آریہ جب تک اپنے وطن تھے تب تک وہ یہی زبان بولتے ہوں گے، جب ان کے قبیلے وطن چھوڑ کر ادھر اُدھر گئے تو ان کی زبان میں بہت سے غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے۔ آریوں کے جو قبیلے ہندوستان میں آباد ہوئے ان کی زبان بھی اسی طرح بدلتی رہی۔ رگ وید کے بھجن جس زبان میں ہیں وہ ویدی کہلاتی ہے، اور اس نے بعد کو ترقی کر کے ادبی سنسکرت کی شکل اختیار کی۔ نئے الفاظ قبول کرنے میں مذہبی زبان بول چال کی زبان سے کچھ پیچھے رہتی ہے، محققوں کی رائے ہے کہ رگ وید کے بھجن قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔

(700ق م) کے بعد سے لکھنے کا رواج بھی آہستہ آہستہ شروع ہوا۔ موہنجوڈرو اور ہڑپا کی تحریروں کے بعد رسم خط کے جو نمونے ہمیں ملتے ہیں وہ اشوک کے زمانے کے ہیں۔ اشوک کے کتبات یا تو کھروشٹی قدیم آرامی رسم خط سے اخذ کیا گیا ہے جو 500ق م میں رائج تھا یہ دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا۔ پروفیسر لینگڈن کا خیال ہے کہ براہمی رسم خط موہنجوڈرو کے رسم خط سے اخذ کیا گیا تھا۔ اور آریوں نے اس رسم خط کی علامتوں کو اپنی زبان کی آوازوں اور حروف میں تبدیل کر لیا۔ براہمی ابجد کے 46 حروف کی شکلیں معین کی گئی ہیں اور ان سے دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں طرف لکھنے کا قائدہ بنا۔ غالباً 500ق م تک براہمی ابجد مکمل ہو گئی تھی، قواعد صرف و نحو کے مشہور عالم پانی نی، نے جس کا زمانہ چوتھی صدی ق م تھا۔ اس کو صحیح مانا ہے۔ اس زمانے میں یا اس کے کچھ بعد براہمی رسم خط کی دو شاخیں ہو گئیں، ایک شمالی دوسری جنوبی۔ ناگری شمالی براہمی رسم خط کی ترقی یافتہ شکل ہے، جنوبی ہند کے مختلف رسم خط جنوبی براہمی سے اخذ کیئے گئے۔ پانی نی کے قواعد نے رسم خط کے ساتھ زبان کو بھی ایک معیاری شکل دیدی، اور جو کام کئی سو برس سے آہستہ آہستہ ہو رہا تھا اس کی تکمیل کر دی۔ یہیں پر ویدی زبان کا سلسلہ ختم اور سنسکرت کا شروع ہوتا ہے، بول چال کی زبان اس کے بعد بھی رہیں اور ان کو کچھ نہ کچھ ترقی بھی ہوتی رہی، لیکن پڑھے لکھے، شائستہ لوگوں کی زبان سنسکرت تھی۔

تاریخ ہند میں گوتم بدھ کی وفات سے پہلے کا کوئی سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں اور گوتم بدھ کی وفات کے بارے میں بھی ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس سنہ میں ہوئی، لیکن یہ 480ق م میں اس کے دو تین سال پہلے یا بعد کو ہوئی ہو گی، اور اس سنہ سے ہم ان لمبے دور جب کہ آریوں کی تہذیب پھیلتی ہے۔ دوسرا حصہ، 800ق م سے 600ق م تک، براہمنوں کا

اس کے آخر میں اُپنشد مرتب ہوئے جن کی تعلیم کا اثر گوتم بدھ کے عقائد میں نظر آتا ہے۔ چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح سے سوتروں کا دور شروع ہوا اور اس کے آخری حصے کی یادگار رزمیہ داستانیں، مہابھارت اور رامائن ہیں۔

**معاشرتی تنظیم:** آریہ جب ہندوستان میں آباد ہوئے تو ان کی جماعت قبیلوں پر مشتمل تھی جن کی الگ الگ زمینیں تھیں۔ معمولاً ہر قبیلے میں ایک راجہ ہوتا تھا اور چند ممتاز خاندان جن کا منصب راجہ کے ماتحت حکومت کے کام کرنا تھا۔ میدان جنگ میں فوج کی سرداری راجہ اور انہی چند خاندانوں کے لوگ کرتے تھے۔ راجہ کے بعد سب سے بڑا درجہ پروہت کا تھا۔ جو قبیلے کا مذہبی پیشوا ہوتا اور جس طرح راجہ تلوار کے ذریعے قبیلے میں مذہبی پیشواؤں کے خاندان ہوتے تھے جن کا مخصوص عہدہ دینی فرائض کو انجام دینا تھا۔ راجا، حاکموں اور مذہبی پیشواؤں کے علاوہ جتنے لوگ تھے وہ "جن" یا عوام تھے۔

**آریوں کی طرزِ حکومت:** آریہ لوگ جب ہندوستان میں آئے، تو وہ بہت سے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر ایک قبیلہ کا ایک راجہ ہوتا تھا۔ جس کا کبھی کبھی انتخاب بھی ہوتا تھا، لیکن عام طور پر راجہ کا عہدہ موروثی ہی تھا۔ راجہ رعایا کی حفاظت اور پرورش اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہ مقدموں کا فیصلہ بھی خود کرتا تھا، اور جنگ میں سپہ سالار کے فرائض بھی وہی انجام دیتا تھا۔ انتظامِ سلطنت میں راجہ کی مدد کے لئے رعایا کی منتخب کردہ دو مجلسیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک مجلس کو سبھا اور دوسری کو سمتی کہتے تھے۔ رعایا پر کوئی ٹیکس یا معاملہ نہیں تھا، لیکن لوگ اپنی مرضی سے نذرانے پیش کرتے تھے۔ قوانین اور سزائیں سخت تھیں۔

گاؤں کا انتظام پنچائتیں کرتی تھیں۔ گاؤں کے سردار کو گرامنی کہتے تھے۔

جنگ میں راجہ اور بڑے بڑے سردار رتھوں میں بیٹھ کر لڑتے تھے۔ مگر عام لوگ پیدل ہی ہوتے تھے۔ لڑائی کے ہتھیار تیر و کمان اور بھالے وغیرہ تھے۔

**آریوں کا مذہب:** قدیم آریوں کا مذہب توہم پرستی تھا وہ قدرت کی مختلف طاقتوں مثلاً سورج، ہوا، پانی، آگ وغیرہ سے بڑے متاثر ہوتے تھے، اور ان کو دیوتا مان کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ تاکہ وہ خوش ہو کر ان کی مدد کریں۔ اندر اور اگنی کی پرستش خاص طور پر کی جاتی تھی۔

لیکن آریہ لوگ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اِن طاقتوں سے بھی بالاتر کوئی طاقت ہے۔ جو ان سب کو نظام میں رکھتی ہے۔ اس طرح وہ ایک واحد خدا کی ہستی کے بھی قائل تھے۔ اِن دنوں میں نہ کوئی مندر تھے اور نہ مورتی پوجا کا ہی رواج تھا۔ بلکہ عبادت کھلی ہوا میں ہوتی تھی۔

ان کے ہاں بھجن کہنے کا سلسلہ بہت قدیم زمانے سے جاری تھا، اور ان کے مذہبی پیشواؤں

کو بہت سے بھجن یاد تھے جو ان کے خاندان کے بزرگوں نے پچھلے وقتوں میں تصنیف کیے تھے، لیکن ایسے بھجن بھی تھے جنہیں لوگ بھول گئے تھے اور اس نقصان سے بچنے کے لئے آریوں نے شمال مغربی ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد تمام بھجن یکجا کر لیئے اور اس مجموعے کا نام رگ وید رکھا جو ہند جرمانی تہذیب کی سب سے پرانی یادگار ہے۔

**چار وید بن گئے:** رگ وید کے بھجن اس وقت گائے جاتے جب پوجا کے لئے آگ سلگائی جاتی یا سوم رس نکالا جاتا۔ اس رس سے ایک شراب بنتی تھی جس کا پینا عبادت میں داخل تھا اور اسے آریہ پسند بھی بہت کرتے تھے۔ رگ وید مرتب ہو گیا تو اس کے وہ بھجن جن میں سوم کو مخاطب کیا گیا تھا الگ کرکے ایک نیا مجموعہ تیار کیا گیا جو سام وید کہلاتا ہے۔ چونکہ مختلف رسموں کو جو عبادت سے متعلق تھیں صحیح اور موثر طریقے پر ادا کرنا بھی ضروری تھا' اس لئے ایک اور مجموعہ بھی مرتب کیا گیا جس میں رگ وید کے وہ اشلوک تھے جو کسی رسم کو ادا کرتے وقت پڑھے جاتے اور ان کے ساتھ نثر میں ہدایتیں بھی تھیں۔ یہ تیسرا مجموعہ یجر وید کہلایا ہمیں یجر وید کی دو اشاعتیں ملتی ہیں، جن میں سے ایک "سیاہ" کہلاتی ہے اور دوسری سفید ان تین ویدوں کے علاوہ ایک چوتھا اتھرووید ہے۔ ایک عرصے تک لوگ اسے مقدس ویدوں شمار کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن اسے یہ مرتبہ آخر کار حاصل ہی ہو گیا۔ اتھرووید کا بیشتر حصہ ایسے منتروں اور ٹونوں پر مشتمل ہے جن کا مقصد بیماری، بلا' آسیب وغیرہ کو دور کرنا تھا۔

**وید:** سب سے زیادہ مقدس کتابیں ہیں۔ ہندو انہیں الہامی مانتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ سے چلی آتی ہیں، لیکن یورپ کے عالموں کا اس بارے میں ہندوؤں سے اختلاف رائے ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وید اڑھائی تین ہزار سال قبل مسیح میں لکھے گئے اور رگ وید ان سب میں پرانا ہے۔

1- **رگ وید:** میں زیادہ تر اندر، ورن، اگنی وغیرہ قدرتی دیوتاؤں کی ستائش کی گئی ہے۔

2- **یجر وید:** میں زیادہ تر یگیہ کے لئے منتر درج ہیں۔

3- **سام وید:** کے زیادہ تر منتر رگ وید سے لئے گئے ہیں۔ یہ وید ہندوؤں کے علم موسیقی کا منبع ہے۔

4- **اتھرووید:** میں بیماریوں کے دفعیہ کے لئے۔ دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اور دیگر حصولِ مطلب کے لئے منتر درج ہیں۔ اس کو بہت عرصہ تک لوگوں نے وید ہی تسلیم نہیں کیا۔

اپنشد: اُپنشد ویدک لٹریچر میں فلسفہ کی کتابیں ہیں۔ ان میں اِن اُمور پر بحث کی گئی ہے کہ خدا کیا ہے؟ مادہ کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اُپنشدوں کی عزت صرف ہندوؤں تک ہی محدود نہیں بلکہ کئی غیر ہندو بھی ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں کئے جا چکے ہیں۔ اُپنشدوں کی تعداد تو 200 کے قریب ہے۔ مگر ان میں سے بارہ مستند مانی جاتی ہیں۔ جرمنی کا فلاسفر شوپن ہائر اُپنشدوں کا بڑا مداح تھا۔

6- چھ درشن: ہندوؤں کی فلاسفی کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جنہیں چھ شاستر یا درشن کہتے ہیں۔ اِن درشنوں کے نام یہ ہیں:

1- کپل کا سانکھیہ شاستر: اس درشن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مادہ اور روح ازلی ہیں' اور پرماتما کی ہستی کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

2- پاتنجلی کا یوگ شاستر: یوگ کے معنے ہیں جوڑنا۔ اس شاستر میں بتلایا گیا ہے کہ آتما کا پرماتما سے ملاپ کیسے ہو سکتا ہے۔

3- گوتم کا نیائے شاستر: یہ گوتم، گوتم بدھ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک اور رشی کا نام ہے۔ اس شاستر میں ہندوؤں کے علم منطق کا بیان ہے۔

4- کناد کا ویشیشک شاستر: اس شاستر میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا پرمانوؤں سے بنی ہوئی ہے۔

5- جیمنی کا پورو میمانسا: اس میں کرم کانڈ (یعنی یگیوں اور دوسری رسموں) کا ذکر ہے۔

6- ویاس کا اُتر میمانسا: اسے ویدانت بھی کہتے ہیں۔ اِس میں پرماتما کو عالمگیر روح مانا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام کائنات پرماتما کا ہی ظہور ہے۔ سب کچھ اُسی سے ہی پیدا ہوا' اور اسی میں ہی مل جائے گا۔

بھگوت گیتا: بھگوت گیتا کے لفظی معنی ہیں "پرماتما کا گیت۔" یہ مہابھارت کا ایک حصہ ہے' اور اس میں وہ اعلیٰ درجہ کا اُپدیش درج ہے۔ جو شری کرشن جی نے مہابھارت کی جنگ شروع ہونے سے پہلے ارجن کو دیا تھا۔ جب کہ اُس نے اِس بنا پر لڑنے سے گریز کیا تھا کہ میں اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف کیسے لڑوں۔ اس اُپدیش کا لب لباب یہ ہے کہ روح غیر فانی ہے۔ مرنے والا صرف یہ جسم ہے۔ اِنسان کو چاہئے کہ نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے دھرم پر چلے۔

پران: لفظ پران کی معنی پرانا ہیں۔ یہ ہندوؤں کی قدیم کتابیں ہیں' اور ان میں دنیا کی پیدائش' دیوتاؤں کے کارنامے اور قدیم خاندانوں کے تاریخی حالات درج ہیں۔ چنانچہ ان سے قدیم ہندو ہسٹری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ ان میں کئی بڑے عجیب و غریب اور ناقابل یقین قصے کہانیاں بھی درج ہیں۔

پران تعداد میں اٹھارہ ہیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور شریمد بھاگوت اور وشنو پران ہیں۔

بھاگوت پران میں شری کرشن کی زندگی کے ابتدائی حالات درج ہیں۔

**منو اور اس کا دھرم شاستر:** منو آریوں کا ایک مشہور قانون دان تھا۔ اس نے منو سمرتی نام کی ایک کتاب لکھی۔ یہ ہندو قوانین کی ایک کتاب ہے۔ یورپ کے عالم منو سمرتی کی تصنیف کا زمانہ دوسری صدی عیسوی قرار دیتے ہیں، لیکن ہندو اسے بہت قدیم خیال کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ہر ایک ذات کے فرائض درج ہیں، اور انسانی زندگی کو "چار آشرموں" یا حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- **برہم چریہ آشرم:** یہ پہلے 25 سال تک ہے۔ اِس میں انسان کا فرض تعلیم حاصل کرنا ہے۔

2- **گرہستھ آشرم:** یہ پچیس سے پچاس سال تک ہے۔ اس میں خانہ آبادی اور کنبہ پروری کی ہدایت ہے۔

3- **بان پرستھ آشرم:** یہ پچاس سے پچھتر برس تک ہے۔ اس میں بنوں اور جنگلوں میں رہ کر عبادت میں مصروف رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

4- **سنیاس آشرم:** یہ پچھتر سے سو برس تک ہے۔ اس میں یہ ہدایت ہے کہ انسان مذہبی قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو کر پرچار کا کام کرے۔

اِن آشرموں میں ہندوؤں کے نزدیک گرہست آشرم کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ اسی آشرم کے سہارے پر باقی آشرموں کا وجود ممکن ہے۔

**براہمن اور اُپنشد:** ویدوں کے مرتب ہوتے ہی آریوں کے مذہبی رہنما اپنی رسموں کو صحیح صحیح ادا کرنے کی فکر میں پڑ گئے اور تر ضیحات کے دفتر کھل گئے۔ ویدوں کی بنیاد پر ہدایتوں کے مجموعے تیار ہوئے جو الگ الگ ویدوں سے متعلق تھے۔ یہ براہمن کہلاتے ہیں۔ ان کے مخصوص حصے میں جنہیں "آرن یکونن" یعنی "جنگل کی کتابوں کا نام دیا گیا" کہ ان میں جو تعلیم دی گئی تھی وہ صرف ان منتخب لوگوں کے لئے تھی جو دنیا سے منہ پھیر چکے تھے، جنگلوں میں رہتے تھے اور اپنی زندگی دینی تعلیم کی نذر کر دی تھی۔ ہر "آرن یک" کے ساتھ ایک اُپنشد بھی ہے۔ یہ اُپنشد اس زمانے کے دینی علم کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور تردید بھی، یہ ان لوگوں کی تعلیمات کا خزانہ ہیں، جنہوں نے سب کچھ سیکھ لیا تھا، ہر چھوٹے بھید کو کھول چکے تھے اور آخر میں زندگی اور اس کے مقصد کے بڑے بھید کو کھولنا چاہتے تھے ہر چشمے کا پانی پی چکے تھے، مگر ایسا پانی انہیں کہیں نہ ملا تھا جو ان کی پیاس کو بجھا دیتا۔

**سوتر:** براہمنوں میں آداب اور عبادت، قربانی وغیرہ کی تمام رسموں کی توضیح کر دی گئی تھی۔ سوتروں میں انہیں نئی ترتیب دی گئی اور اس اختصار سے بیان کیا گیا کہ انہیں یاد رکھنا زیادہ

آسان ہو جائے۔ سوتر سے مراد ایک اسلوب بیان ہے۔ اس اسلوب پر جن علوم سے بحث کی گئی ہے وہ چھ ہیں۔ (1) علم الاصوات (2) عروض (3) قواعد زبان (4) علم صرف (5) دینیات (6) علم نجوم۔

## (رزمیہ داستانیں) رامائن اور مہابھارت

مہابھارت اور رامائن کی مشہور رزمیہ داستانیں اپنی موجودہ شکل میں دینی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ان کا اصل مقصد دین داروں کی ہدایت نہیں تھی بلکہ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی تھی۔ ان کا کوئی ایک مصنف نہیں تھا، وہ ساری کسی ایک وقت میں مرتب نہیں ہوئیں۔ مہا بھارت، جنگی کارناموں کا مجموعہ ہے جو بھاٹ حضرات درباروں میں سنایا کرتے تھے۔ 300 ق م کے بعد اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا اور سپاہیوں کے ہاتھ سے نکل کر یہ چیز برہمنوں کے قبضے میں آگئی، جنہوں نے اسے دینی اور اخلاقی تعلیم کا ایک ذریعہ بنا دیا۔ رامائن الگ الگ کارناموں کی داستان نہیں تھی لیکن اس کا مرکزی حصہ 500 ق م سے پہلے کا ہے اور اس میں بہت اضافہ اور ترمیم کی گئی، قصہ اور اسلوب بیان کے لحاظ سے مہابھارت زیادہ پرانی معلوم ہوتی ہے۔

مہابھارت میں خاص طور پر نئی اور پرانی معاشرت، عقائد اور خیالات کی کھچڑی ہے، جس کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ درد پدی پانچوں پانڈو بھائیوں کی بیوی مانی جاتی ہے، اگرچہ یہ بات آریوں کے اخلاقی معیار سے گری ہوئی اور ان کے قانون کے خلاف تھی۔

مہابھارت کورو اور پانڈو راجاؤں لی جنگ کی داستان ہے۔ اصل میں یہ دو الگ قبیلوں کے سردار تھے، کورو زیادہ مہذب، پانڈو زیادہ جنگجو تھے پہلے کورو دب گئے، مگر پھر انہوں نے پانڈو بھائیوں کو جوا کھیلنے کی دعوت دی، جو کچھ وہ سیاست اور جنگ کے میدان میں ہارے تھے وہ سب پانسے کے کھیل میں جیت لیا، اور اس کے علاوہ پانڈوؤں کو بارہ برس کے لئے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پانڈوں کو جوئے میں ہارنے پر اتنا غم نہیں تھا جتنا کہ اس پر غصہ کہ ان کی بیوی کرشنا دروپدی کی بھرے دربار میں بے عزت کی گئی اور جلاوطنی کے زمانے میں وہ بدلہ لینے کا انتظام کرتے رہے کورو خاندان اپنی طرف دوست اور اتحادی تلاش کرتا رہا اور آخر کو کورو کشیتر میں دونوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی، پانڈوؤں کو دوارکا کے راجہ کرشن جی کی مدد حاصل تھی اور انہی کی بدولت انہیں اٹھارہ دن کی جنگ کے بعد کامیابی ہوئی۔

رامائن اجودھیا کے راجہ رام چندر جی کی سوانح عمری ہے۔ یہ راجہ دسرتھ کے لڑکے اور راج کے حقدار تھے، لیکن ان کی سوتیلی ماں رانی "کے کئی" نے راجا دسرتھ کو مجبور کیا کہ انہیں جلا وطن کردے اور راج اس کے بیٹے بھرت کو سونپ دے۔ رام چندر جی نے اپنے باپ کے حکم کو

ماننے میں ذرا بھی تامل نہ کیا اور اپنی بیوی سیتا اور بھائی لشمن کے ساتھ بن باس اختیار کر لیا اسی بن باس کے دوران میں لنکا کا دیو صفت راجا راون سیتا جی کو دھوکے سے پکڑ لے گیا۔ رام چندر جی سراغ لگاتے ہوئے لنکا پہنچے اور ہنومان کی مدد سے راون کو شکست دے کر سیتا جی کو چھڑا لائے۔ بن باس کی مدت پوری ہوئی تو وطن واپس گئے۔ ان کے بھائی بھرت نے، جو اپنے آپ کو صرف ان کا قائم مقام سمجھتے تھے، راج ان کے حوالے کر دیا۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بھگوت گیتا۔ جس میں حق کی مجاہدانہ حمایت کی نہایت موثر طریقے سے تلقین کی گئی ہے، مہابھارت کا ایک حصہ ہے، اور بہت سی ضمنی داستانوں میں سچائی، وفاشعاری اور ایثار کی ایسی مثالیں پیش کی گئی ہیں جنہوں نے ہر ایک کے دل مین اپنی جگہ پیدا کر لی اور جو آج تک محبت اور عقیدت سے دوہرائی جاتی ہیں، رام چندر جی نیکی اور اخلاق کا مجسمہ ہیں، اور ان کی ساری زندگی بہترین عملی کا نمونہ مانی جاتی ہے۔ دونوں رزمیہ داستانوں کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ اور قصہ کہانی، سپاہیانہ کارناموں اور اخلاقی مثالوں سے صحیح زندگی کا ایک خاکہ مرتب کر دیا جائے اور وہ ایک سانچا بن جائے جس میں آئندہ نسلوں کا عمل ڈھالا جاتا رہے۔

**آریوں کا طرزِ معاشرت:** آریوں کا طرزِ معاشرت نہایت سادہ اور اعلیٰ تھا، اور اس وقت کی آریہ سوسائٹی میں ذات پات نہ تھی۔

**خانگی زندگی:** گھر میں باپ سارے خاندان کا سردار ہوتا تھا، اور اسے ہر بات میں پورا پورا اختیار تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو جاتا تھا۔ تو وہ اپنے گھر کا انتظام سب سے بڑے بیٹے اور بہو کے سپرد کر کے خدا کی یاد میں لگ جاتا تھا۔

**عورت کا درجہ:** ویدک سوسائٹی میں عورتوں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ بیوی کی موجودگی کے بنا کوئی یگیہ ٹھیک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتوں میں پردہ کا رواج نہ تھا۔ وہ مردوں کی طرح تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ، وہ شادی کے معاملہ میں بہت حد تک آزاد ہوتی تھیں۔ عموماً مرد صرف ایک عورت سے شادی کرتا تھا۔ بیوہ عورتوں کو شادی کی اجازت تھی، بچپن کی شادی کا رواج نہ تھا۔

**خورد و نوش اور پوشاک:** آریوں کی خوراک بہت سادہ تھی۔ وہ دودھ اور گھی کا بڑا استعمال کرتے، اور زیادہ تر اناج، سبزیاں اور پھل کھاتے تھے۔ وہ سوم رس بھی پیتے تھے۔ جس کے وہ بہت شوقین تھے۔ آریوں کی پوشاک بھی بڑی سادہ تھی۔ وہ سونے اور چاندی کے زیوروں کا استعمال بھی کرتے تھے۔

**آریوں کے پیشے:** آریہ لوگ زیادہ تر کاشت کاری کرتے تھے۔ اور گائیوں کے ریوڑ پالتے تھے۔ ان کی بڑی دولت مویشی ہی تھے، لیکن انہیں صنعت و حرفت میں بھی

بہت کچھ کمال حاصل تھا۔ وہ کپڑا بننے، چمڑا رنگنے اور زیور بنانے میں کافی ماہر تھے، اور بڑھئی، لوہار اور دوسرے دستکاروں کا کام بھی جانتے تھے۔

تفریحات: آریوں کی تفریحات کئی قسم کی تھیں۔ وہ ناچنا اور گانا جانتے تھے، اور مختلف قسم کے ساز بڑی اچھی طرح سے بجا سکتے تھے۔ ہر ایک گاؤں کا اپنا اپنا راگی ہوتا تھا۔ یہ لوگ شکار بھی کھیلتے تھے۔ ایک دوسرے کے مقابلہ میں رتھیں دوڑاتے تھے۔

بستیاں بسانا: آریوں کی بستیاں شروع میں اپنی ضرورتیں آپ پوری کرتی تھیں، بلکہ ہر خاندان کی معیشت ایسی تھی کہ خارجی ذرائع پر کم سے کم بھروسا کیا جاتا تھا۔ کھانے پینے اور لباس کے لئے جو کچھ درکار ہوتا وہ کھیتی باڑی، جانوروں اور شکار سے حاصل کیا جاتا۔ جانوروں کی تعداد دولت کا معیار تھا اور جو چیز خریدنا ہوتی وہ جانوروں خاص طور سے گایوں کے بدلے خریدی جاتی۔ صنعتوں میں صرف لکڑی، دھات اور چمڑے کے کام تھے، اور ان کو جاننے والے بہت کم تھے۔ کاتنے، کپڑے اور چٹائیاں بننے اور سینے کا کام عورتیں گھروں میں کرتی تھیں۔ برہمنوں کے دور میں حالات کچھ بدل گئے تھے۔ بڑی بستیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی، راجے زیادہ وسیع علاقوں پر حکومت کرتے تھے، اونچے طبقے کے لوگ بہت دولت مند ہو گئے تھے، اسی وجہ سے پیشوں اور صنعتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ کئی قسم کے شکاری اور ماہی گیر، مویشیوں سے متعلق مختلف کام کرنے والے، ہل چلانے والے، رتھ بان، رتھ بنانے والے، جوہری، سنار اور سود لینے والے، لوہار، کندہ کار، تیر کمان بنانے والے، دھوبی، رسی بٹنے والے، جلاہے، رنگریز، کشیدہ کاری کرنے والے، بید کی چیزیں بنانے والے، کمہار، کھانے کی چیزوں کے لئے مسالہ لانے والے، باورچی، قصائی کانٹ، سازندے، نجومی، وید، تاجر، ساہوکار، یہ سب کاروبار کی رونق بڑھانے کو پیدا ہو گئے تھے۔ دھاتوں میں ٹین، سونے، چاندی، پیتل اور لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ کوئی سکہ اس زمانے میں بھی نہیں تھا۔ لیکن "نشک" جو غالباً پہلے ایک زیور تھا، اب چیزوں کی قیمت متعین کرنے میں کام آتا تھا۔

راجہ کے لئے ضروری تھا کہ زندگی اور دھرم کا نظام قائم رکھے، قاعدوں کی پابندی کرائے، جان و مال کی حفاظت کرے، مجرموں کو سزا دے، عالموں کی سرپرستی کرے اور حکومت کا کام چلانے کے لئے لگان وصول کرے۔ عام قانون کی حدود کے اندر مختلف قسم کے پیشہ وروں کو اختیار تھا کہ اپنے لئے مخصوص قانون بنائیں۔ تعزیرات کے قانون پر ذات کا خیال بالکل حاوی تھا۔ کوئی شودر چوری کرتا یا قتل کرتا تو اسے موت کی سزا دی جاتی اور اس کی ملکیت ضبط کر لی جاتی، برہمن کوئی سنگین جرم کرتا تو اندھا کر دیا جاتا۔ اس طرح ہر جرم کی برہمن کو سب سے ہلکی اور شودر کو سب سے سخت سزا ملتی۔ ملزموں کے قول کو جانچنے کے لئے مختلف قسم کی آزمائشیں تھیں۔ ایک

آزمائش آگ کی تھی۔ جس میں دہکتا ہوا لوہے کا ٹکڑا ملزم کے ہاتھ پر رکھ دیا جاتا اور اگر اس کا ہاتھ نہ جلتا تو سمجھا جاتا کہ وہ بے قصور ہے۔

**گھریلو زندگی اور چار آشرم:** ہندوستانی آریوں کی خاندانی رسموں میں بعض ایسی تھیں جو خاص ان کی نہیں کہی جا سکتیں بلکہ وہ قدیم ہند جرمانی نسلوں کی مشترک خصوصیات ہیں، مثلاً گھر کے ایک مرکزی مقام پر ہر وقت آگ جلتی رکھنا اور دولہا دلہن کا اس آگ کے گرد چکر لگانا یا عزیزوں کا ان پر اناج نچھاور کرنا۔ اسی طرح جنیو پہنانے کا رواج قدیم ایرانیوں کے یہاں بھی تھا اور اس رسم کی ابتدا اس وقت ہو گئی جب آریہ ایران میں آباد تھے۔ ممکن ہے یہ اس سے بھی زیادہ پرانی ہو۔

لڑکیوں کے لئے صرف ایک بیاہ کی رسم ادا کی جاتی تھی، لڑکوں کے لئے بہت سی رسمیں تھیں جن میں سب سے اہم جنیئو پہنانے کی تقریب تھی۔ اس کے بعد اس کی طالبعلمی کا زمانہ شروع ہوتا اور وہ کسی گرو کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرتا جو دین اور دنیا کا حق ادا کرنے اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر نوجوان شادی کر کے گرہست، یعنی گھر بار والا بن جاتا۔ جب اس کے لڑکوں کی شادی ہو جاتی اور پوتے پیدا ہو جاتے تو اس کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہونے کا وقت آجاتا اور آخر میں مناسب تھا کہ وہ دنیا کو بالکل چھوڑ کر سنیاس اختیار کر لیتا اور جنگل میں رہ کر سارا وقت عبادت اور ریاضت میں گزارتا۔ اس طرح ہر شخص کی زندگی چار حصوں میں تقسیم ہو جاتی جو چار آشرم کہلاتے تھے، ایک دور طالب علمی کا دوسرا گھر بار کا اور دنیا کی ذمہ داریوں کا تیسرا گوشہ نشینی اور چوتھا ریاضت اور بن باس کا۔

خاندانی زندگی کا ایک پہلو تو روزمرہ کا کام ہے، جس کی عام اور موٹی تقسیم یہ ہے کہ مرد محنت کر کے کمائیں اور عورتیں گھر کی دیکھ بھال اور کھانے پینے اور آرام کا انتظام کریں۔ خاندان کی بقا اور مردوں کی تجہیز و تکفین کے لئے اولاد نرینہ کا ہونا ضروری تھا۔ براہمنوں کے دور کا یہ مقولہ تھا "لڑکی اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے، لڑکا ساتویں آسمان کا نور ہے" لڑکیوں کے پیدا ہونے پر بہت خوشی نہیں ہوتی تھی۔ رگ وید کے زمانے میں، جب زندگی سادہ تھی اور دنیاوی اغراض کم تو رفیق زندگی منتخب کرنے کا اختیار لڑکی کو تھا۔ یہ اختیار بہت جلد اس سے لے لیا گیا اور خاندان والے اپنا فائدہ دیکھ کر رشتے جوڑنے لگے۔ اتھروید کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کو جلانے کی رسم کسی زمانے میں برتی جاتی تھی، آریہ جب ہندوستان آئے تو کشتریوں کے سوا باقی تمام ذاتوں نے اسے ترک کر دیا۔

خاندانی زندگی کا دوسرا پہلو وہ تقریبیں ہیں جن میں مرد عورتیں، قریب اور دور کے عزیز سب شریک ہوتے۔ آریوں کے ہاں ایسی تقریبوں میں سب سے اہم پیدائش، جنیئو پہنانے، شادی

بیاہ اور تجہیز و تکفین سے متعلق تھیں۔ لڑکی بیاہنے کے بدلے میں باپ کو کچھ وصول کرنے کا حق تھا۔ جس کی ایک عامیانہ شکل یہ تھی کہ باپ لڑکی کا سودا کرتا، جیسے کسی اور مال کا۔ غالباً شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکیوں کی حیثیت کسی ایک قاعدے یا قانون پر منحصر نہ تھی بلکہ جیسا ان کا خاندان ہوتا اور جیسی رشتے کے خواہشمندوں کی حالت اور تعداد ہوتی ویسی ہی شادی کی شرطیں ہوتیں۔ تقریب سے متعلق جو رسمیں تھیں ان میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا، دولہا کے ساتھ برات ضرور آتی، دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیا جاتا، دونو پوجا کی آگ کے گرد طواف کرتے، ازدواجی رشتے میں استقلال پیدا کرنے کے لئے دولہا اپنی دلہن کو پتھر پر کھڑا کرتا، شام کے وقت اسے گھر کے باہر لے جا کر قطب ستارہ دکھاتا۔

**مردوں کی تجہیز و تکفین:** پہلے مردے کے بال اور ناخن کاٹے جاتے، جلانے سے پہلے مردہ سیاہ ہرن کی کھال پر لٹایا جاتا، برہمن ہوتا تو اس کے ہاتھ میں عصاء کشتری ہوتا تو کمان، ویش ہوتا تو آنکس رکھ دیا جاتا اور پھر توڑ کر چتا پر ڈال دیا جاتا۔ چتا میں آگ لگانا سب سے بڑے لڑکے کا فرض تھا۔ مردے کے ساتھ ایک گائے یا بکری بھی جلائی جاتی تھی۔ جس گھر میں موت ہوتی وہاں عموماً تین دن لوگ زمین پر سوتے اور گوشت کھانے سے پرہیز کرتے۔

**ذاتوں کی تقسیم:** خاندان اور قبیلے کی جو تنظیم آریوں میں پائی جاتی ہے وہ ہمیں روم اور یونان میں بھی ملتی ہے اور کم و بیش ہے ان تمام آریہ اور غیر آریہ قبیلوں کی خصوصیت کہا جاتا ہے جن میں پدری حکومت کا رواج تھا۔ ایران میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مذہبی پیشواؤں کے الگ خاندان تھے اور دینی رسموں ادائیگی انہیں کے ذریعے ہو سکتی تھی، لیکن ذاتوں کو تقسیم جس طرح ہندوستان میں کی گئی اور صدیوں تک اسے جس طرح برتا گیا اس کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔

رگ وید کے زمانے میں نہ کام کی تقسیم ہوئی تھی نہ زندگی کی پوری تشکیل۔ ایک بھجن کا مصنف کہتا ہے کہ "میں بھجن بناتا ہوں، میرا باپ طبیب ہے۔ میری ماں چکی میں اناج پیستی ہے۔ ہم سب الگ الگ کام کرتے ہیں۔ براہمنوں کے دور میں جب کہ آریہ مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کی زندگی کا پیمانہ وسیع ہو رہا تھا حقوق اور فرائض مقرر ہو گئے۔ جو کام پہلے مذہبی پیشواؤں کے خاندان کرتے تھے وہ برہمن ذات کے لوگوں کے سپرد ہو گیا۔ راجا اور اس کی ماتحت حکومت کا کام کرنے والے کشتری ہو گئے۔ کھیتی باڑی صنعت اور تجارت کا کام کرنے والے ویش ہو گئے، اور باقی سب شودر، ذاتوں کے قانون نے برہمن اور کشتری کی پرانی حیثیت کو قائم رکھا۔ مگر ویش جو پہلے کسی سے کم نہ تھے۔ بس عموماً مذہبی پیشوائی اور حکومت کا کام نہیں کرتے تھے۔ گر کر قریب قریب شودروں کے برابر ہو گئے۔ شودر ذات کا دھرم یہ تھا کہ تینوں اونچی ذات کے لوگوں کی ہر طرح

خدمت کرتے۔ برہمن کے لئے حکومت کرنے کا حوصلہ مناسب نہیں تھا، لیکن کسی برہمن کو حکومت مل جاتی تو وہ بالکل کشتری کی طرح اس کے تمام فرائض انجام دے سکتا تھا اور اسے وہ تمام حقوق بھی حاصل ہوتے جو کسی کھشتری حاکم کو۔ مجبوری کی حالت میں برہمن روزی کمانے کے لئے کوئی پیشہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ کھشتری عالم ہو جاتا تب بھی وہ برہمن نہ کہلاتا اور اپنی ذات کے لوگوں میں اس کی خاص آبرو نہ ہوتی۔ برہمن تجارت کرتا تو یہ سمجھا جاتا کہ اس نے اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دیا ہے اور اگر تجارت اس کا خاندانی پیشہ ہو جاتا تو وہ مذہبی پیشوائی کا مستحق نہ رہتا۔ البتہ اگر برہمن کو حکومت مل جاتی تو سمجھنا چاہئے کہ سونے پر سہاگہ تھا۔ مگر برہمنوں میں حکمرانی کی ہوس عام ہوئی نہ کشتریوں میں دینیات کا چرچا ہوا۔

**ذات پات سے مراد:** ہندو سوسائٹی قدیم زمانے سے مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، اور ہر ایک گروہ بیاہ، شادی، کھانے پینے اور روزمرہ کی رسومات میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ ایسے گروہوں کو ذاتیں کہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ تقسیم صرف پیشوں کے لحاظ پر کی گئی تھی اور ایک ذات سے دوسری ذات میں جانا مشکل نہ تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ذات پات موروثی بن گئی۔ یعنی پیدائش پر موقوف ہو گئی اور ایک ذات سے دوسری ذات میں جانا ناممکن ہو گیا۔ آج کل تعلیم کی وجہ سے ذات پات کی پابندیاں بہت کچھ کم ہو گئی ہیں، اور آہستہ آہستہ ان کا زور ٹوٹ رہا ہے۔

**ذات پات کی ابتدا:** یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ذات پات کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی۔ عام خیال یہ ہے کہ ویدک زمانہ میں یعنی جب آریہ لوگ پنجاب میں رہ رہے تھے۔ ذات پات کی کوئی خاص تمیز نہیں تھی۔ صرف اتنا تھا کہ گورے رنگ کے حملہ آور اپنے آپ کو آریہ اور اصلی باشندوں کو جن کا رنگ کالا تھا "دسیو" کہتے تھے۔

لیکن بعد میں جب آریہ لوگ پنجاب سے بڑھتے ہوئے گنگا کی وادی میں آ پہنچے۔ تو ذات پات مضبوطی سے قائم ہو گئی، اور آریہ لوگ مختلف پیشے اختیار کرنے کی وجہ سے چار گروہوں یا ذاتوں میں تقسیم ہو گئے۔

1- برہمن: ان کا کام مذہبی رسوم کی ادائیگی تھا۔
2- کھشتری: ان کا کام لڑنا اور ملک کی حفاظت کرنا تھا۔
3- ویش: یہ لوگ تجارت اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔
4- شودر: اس ذات میں ادنیٰ درجہ کے لوگ شامل تھے، اور ان کا کام باقی ذاتوں کی خدمت کرنا تھا۔

اس کے بعد ذاتوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج کل ہندوستان میں

تقریباً تین ہزار ذاتیں ہیں۔ ذاتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کی کئی وجوہات ہیں، مثلاً:

1- ہندوستان کی اصلی قوموں نے ہندو مذہب میں داخل ہو کر علیحدہ ذاتیں قائم کر لیں۔ مثلاً وسط ہند کے گونڈ اور بنگال کے راج ونشی۔

2- غیر ملکی حملہ آوروں نے بھی اسی طرح علیحدہ ذاتیں بنالیں جیسے گرجر اور ہون۔

3- برادری سے خارج شدہ لوگوں کی علیحدہ ذاتیں بن گئیں۔

4- ایک ہی ذات کے لوگوں کے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کر لینے سے ان کے رہن سہن میں فرق آگیا۔ اور انہوں نے ایک دوسرے سے بیاہ شادی اور کھان پان کا تعلق بند کر دیا۔ جیسے کشمیری برہمن، گجراتی برہمن، پنجابی برہمن۔

**ذات پات کے فائدے:** 1- ذات پات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کرنے لگا۔ چنانچہ بہت سارے علم و ہنر خاص خاص خاندانوں اور ذاتوں کے ورثہ میں آگئے۔ جس سے علم و ہنر نے بہت ترقی کی۔

2- ایک ذات کے لوگوں میں گہری محبت اور ہمدردی ہو گئی اور برادری کا احساس ہو گیا۔ جس سے برادری کے امیر لوگوں نے اپنے غریبوں کی مدد کرنی شروع کی۔

3- اپنی اپنی ذات میں رہنے کی وجہ سے خون کی پاکیزگی قائم رہ سکی۔

**ذات پات کے نقصانات:** 1- ذاتوں کی وجہ سے ہندو سوسائٹی بے شمار حصوں میں بٹ گئی، ہندو ایک مضبوط اور متحدہ قوم نہیں بن سکے۔

2- جو آدمی جس ذات میں پیدا ہوا ہے۔ وہ اسی آبائی پیشہ کا پابند ہے، اور یہ بات بھی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔

3- اونچی ذات کے لوگوں کا سلوک شودروں اور نیچی ذاتوں سے اچھا نہ تھا۔ جس سے چھوت چھات کا مسئلہ شروع ہو گیا۔

4- ذات پات کے سلسلہ نے ہندوؤں میں شادی کے دائرے کو بہت تنگ کر دیا، اور کئی ہندو صرف شادی نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے مذہبوں میں چلے جاتے ہیں۔

5- بہت سے آدمی ذات کے قواعد کی بندش کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے نہیں جا سکتے۔

6- موجودہ زمانے میں ذات پات کا یہ بھی ایک نقصان ہے کہ غیر قوموں کے لئے ہندو مذہب میں شامل ہونا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ انہیں کسی ذات میں بھی مساوات کا درجہ نہیں دیا جاتا۔

**شودر اور ویش میں امتیاز:** ان میں جو فرق تھا وہ دینی حیثیت کا تھا۔ مقدس کتابوں کو ویش پڑھ سکتے تھے اور سن سکتے تھے، تمام مذہبی رسموں کی ادائیگی ان پر

فرض تھے۔ کشتری کا دھرم یہ تھا کہ چاروں ذاتوں کی حفاظت کے انتظام میں اپنی جان کھپائے، اور اس کے معاوضے میں وہ شودر سے خدمت اور ویش سے دولت طلب کر سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ تھی کہ کشتری زمیندار ہوتا تو کاشتکاروں سے لگان وصول کرتا اور حاکم ہوتا تو تاجروں اور صنعت پیشہ لوگوں سے مختلف قسم کے ٹیکس لے سکتا تھا۔ برہمن کا منصب دینی رہنمائی تھا۔ اس کا فرض تھا کہ دینی تعلیم حاصل کرے، مذہبی رسموں کی ادائیگی کے صحیح طریقے سیکھے اور اپنے آپ کو دینی خدمات کے لئے وقف کردے برہمن رسموں کی ادائیگی کے صحیح طریقے سیکھے اور اپنے آپ کو دینی خدمات کے لئے وقف کردے برہمن محنت کرکے روزی کمانے سے معذور قرار دیئے گئے، اس وجہ سے قانون نے باقی ذاتوں پر انہیں اتنی فضیلت دی کہ وہ اپنی حیثیت قائم رکھ سکیں۔ برہمنوں نے اس فضیلت کا اعتراف کرنا دوسروں کی توفیق پر نہیں چھوڑا بلکہ اپنے حقوق کو ہر طرح سے محفوظ کرتے رہے، پھر بھی انہیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ دینی قانون کی کتاب میں لکھا ہے کہ برہمن کے راستے سے راجا کو بھی ہٹ جانا چاہئے۔ رزمیہ داستان میں بیان کیا گیا ہے کہ راجا نے برہمن سے کہا کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور وہ نہیں ہٹا تو اس کے کوڑا مارا۔

**انسان کا تصور:** رگ وید کے دسویں اور سب سے بعد کے حصے میں "پرش کا گیت" ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ برہمن ہوا اور آسمان۔ پرش کے جسم کے ٹکڑے ہیں، اس کے منہ سے برہمن بنے، بانہوں سے راج کرنے والے، رانوں سے ویش اور پیروں سے شودر۔ اس پرش کو ایک دیو بھی کہا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا اور سارا زمانہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرش ایک استعارہ ہے جس کی مدد سے کائنات کی تخلیق کو سمجھانے کی کوشش کی گئی، لیکن اس گیت میں سب سے پہلے انسان کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور شودر کا لفظ بھی سب سے پہلے اس میں ملتا ہے، اسی وجہ سے "پرش کا گیت" ذاتوں کے قانون کا سرچشمہ مانا جاتا ہے، مگر ذات کے لئے خاص اصطلاح "ورن" ہے، جس کے معنی ہیں رنگ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ذات کا رنگت اور صورت شکل سے بھی کوئی تعلق ضرور ہوگا اور آریوں کی خواہش کہ اپنی نسلی خصوصیات کو قائم رکھیں ذاتوں کا قانون بننے کی ایک بڑی وجہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں نسل کا فرق صرف اپنے اور غیر کا فرق تھا، اپنے وہ لوگ تھے جو ایک جداعلیٰ کی اولاد تھے، ایک جگہ یا قریب قریب رہتے تھے، اپنے خاص دیوتاؤں کو پوجتے اور خاص رواج کی پابندی کرتے۔

**زمانہ شجاعت:** زمانہ شجاعت سے مراد بہادری کا وہ زمانہ ہے۔ جب کہ وہ واقعات جن کا ذکر رامائن اور مہابھارت میں ملتا ہے واقع ہوئے تھے۔ اُس وقت آریہ لوگ پنجاب سے بڑھتے ہوئے جمنا اور گنگا کی وادیوں میں پہنچ چکے تھے۔

**رزمیہ نظمیں:** لفظ Epic کے معنی رزمیہ نظم کے ہیں۔ یعنی بہادری کے کارناموں کی ایسی داستان جو نظم میں لکھی گئی ہو۔ رزمیہ نظمیں تعداد میں دو ہیں۔ رامائن اور مہابھارت۔ ان میں قدیم ہندوستان کی لڑائیوں کا ذکر ہے۔

**رامائن:** بالمیک رشی کی تصنیف ہے، اور اس میں اجودھیا کے سورج ونشی راجہ رام چندر کی زندگی کے حالات درج ہیں۔

**مہابھارت:** رشی وید ویاس کی تصنیف ہے، اور اس میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائی کا ذکر ہے۔

یہ صحیح طور پر کہنا مشکل ہے کہ یہ کتابیں کب لکھی گئیں اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی اصلی شکل میں ویسی کی ویسی ہی ہیں، لیکن یہ امر واقع ہے کہ رامائن مہابھارت کی جنگ مسیح سے قریباً تین ہزار سال پہلے ہوئی، لیکن یورپین عالم اس خیال سے متفق نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ جنگ مسیح سے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہوئی۔

رامائن اور مہابھارت زمانہ شجاعت کی تہذیب پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب آریہ لوگ پنجاب سے آگے بڑھ کر جمنا اور گنگا کی وادی میں آباد ہو چکے تھے تو ان کی تہذیب میں بہت کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں۔

1- **مذہبی حالت:** اس زمانے کے مذہب میں ویدک زمانہ کی اعلیٰ سادگی نہ تھی۔ بجائے قدرت کے مناظر کی پرستش کے کئی دیوی دیوتاؤں مثلاً وشنو، شو، برہما کی پرستش شروع ہو گئی تھی۔ مذہبی رسومات اس قدر پیچیدہ ہو گئی تھیں کہ صرف بڑے لائق پروہت انہیں سرانجام دے سکتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ پجاریوں اور برہمنوں کا اقتدار بڑھ گیا تھا۔ لوگ مسئلہ کرم اور آواگون میں ویدک زمانہ کی مانند یقین رکھتے تھے۔

2- **مجلسی حالت:** ذات پات مضبوط طور پر قائم ہو چکی تھی اور برہمنوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ عورتوں کو آزادی حاصل تھی۔ پردہ کا رواج نہ تھا اور وہ علم بھی حاصل کرتی تھیں۔ اعلیٰ حکمران خاندانوں کی لڑکیاں اپنا ور خود تلاش کرتی تھیں۔ اس رسم کو سوئمبر کہتے تھے۔ اگرچہ عام لوگ گاؤں میں رہتے تھے، لیکن بڑے بڑے شہر مثلاً ایودھیا، متھلا، اِندر پرستھ، ہستناپور، متھرا وغیرہ بھی قائم ہو چکے تھے۔

3- **پولٹیکل حالت:** ویدک زمانہ کے قبیلوں کی جگہ اب سلطنتوں نے لے لی تھی۔ رامائن اور مہابھارت میں کئی سلطنتوں کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً پنچال، کوشل، ودیہہ، مگدھ، کاشی، انگہ وغیرہ۔ ان سلطنتوں کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی جمہوری حکومتیں بھی قائم تھیں۔ راجہ کا عہدہ موروثی ہو گیا تھا۔ یعنی ویدک زمانہ کی طرح راجہ کا چناؤ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ

باپ کے بعد تخت بڑے لڑکے کو مل جاتا تھا۔ تاہم ولی عہد کو تخت دینے سے پہلے رعایا کی صلاح ضرور لی جاتی تھی۔ تاجپوشی کے وقت راجہ کو حلف لینا پڑتا تھا کہ وہ ملک اور رعایا کی بھلائی کا خیال رکھے گا، اور قانون کا پابند رہے گا۔ آمدنی کا بڑا ذریعہ زمین کا لگان ہوتا تھا۔ جو کل پیداوار کا 1/2 حصہ ہوتا تھا، اور اکثر جنس میں ادا کیا جاتا تھا۔

## باب 4

# برصغیر کے قدیم مذاہب

## ہندومت

برصغیر پاک و ہند میں ہندوازم یا ہندومت کو یہاں کا قدیم ترین مذہب تسلیم کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں بھی یہ مذہب ایک عرصہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

نیز اس مذہب کے بارے میں ہندو حضرات کی رائے بھی دی جارہی ہے۔

ہندومت 2000 ق م تا 1500 ق م کے درمیانی عرصہ میں رائج ہوا۔ ہندوؤں کے نزدیک خاص خاص دیویاں اور دیوتا ہیں جن کو ازلی اور ابدی اقتدار حاصل ہے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے۔ اُنہیں کے ارادے سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہندو ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں معاشرہ چار ذاتوں میں منقسم ہے۔

1- برہمن۔ مذہبی رہنما اور اجارہ دار طبقہ۔
2- کشتری یا کھشتری۔ فوجی طبقہ۔
3- ویش۔ تاجر اور زراعت پیشہ لوگ۔
4- شودر یا اچھوت۔ خدمتگار طبقہ۔

یعنی شودر مذکورہ بالا تینوں طبقاتِ انسانی کا خدمتگار طبقہ ہے۔

کتابیں: ان کی الہامی کتابیں (بقول ان کے) وید ہیں۔ چار وید مشہور ہیں (1) رِگ وید (2) یجر وید (3) سام وید (4) اتھرو وید۔ ان کے علاوہ اپنشد بھی ان کی بنیادی کتب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کہ بیشتر وید سرزمین پنجاب میں تصنیف کئے گئے۔

رامائن اور مہابھارت بھی ہندوؤں کے نزدیک مقدس کتابیں ہیں۔ ہندو روح کو ابدی مانتے ہیں لیکن تناسخ کے قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی روح مرنے کے بعد اعمال کے مطابق اچھے یا برے روپ میں بار بار جنم لیتی رہتی ہے۔

# ہندومت کے بارے میں
# خود ہندو مصنّفین کی رائے

بنارس ہندو یونیورسٹی کی کورٹ کونسل اور سینٹ کے ممبر مسٹر گووند داس اپنی کتاب "ہندوازم" میں لکھتے ہیں۔

اگرچہ سب سے پہلے اس امر کا متعین کرلینا نہایت ضروری ہے کہ ہندومت کسے کہتے ہیں اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ لیکن جنہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جواب کس قدر مایوس کن ہے۔ ہندو دھرم کی کوئی تعریف (Definition) ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے حدود ہی متعین نہیں۔ یہ باب دراصل علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دے دیا گیا۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند ایک قبائل کے رسم و رواج کو اپنے آغوش میں لے کر یہ آگے بڑھا اور ایک برف کے گولے کی طرح مختلف زمانوں میں لڑھکتے لڑھکتے اپنے حجم میں بڑھتا چلا گیا اور جس قوم اور قبیلہ سے یہ متمسک ہوا اس کے رسوم اور تخیلات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ مذہب محیط کل، ہمہ گیر۔ ہر ایک کو اپنے اندر جذب کرلینے والا، سب کچھ برداشت کرلینے والا۔ ہر ایک کو (اپنی اپنی جگہ) مطمئن رکھنے والا اور ہر ایک کے ارشاد کی تعمیل کرنے والا واقع ہوا ہے۔

ہندو کسے کہتے ہیں؟: مسٹر گووند داس کے نزدیک ہندو ہونے کے لئے:

(1) ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی بھی شرط نہیں۔
(2) بھارت ورش کی حدود کے اندر پیدائش کی بھی شرط نہیں۔
(3) ویدوں پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ گیتا بڑی سختی سے ویدوں کی تکذیب کرتی ہے۔ چارواک بڑے شد و مد سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اور انہیں مسخروں اور پشاچ (رنگین طبع) لوگوں کی تصانیف قرار دیتے ہیں۔ جینی سکھ، اور کئی فرقے ان کی تردید کرتے ہیں۔ ہندومت ویدوں کی تصانیف سے بھی پہلے موجود تھا۔ اس کی فنا یا بقا ویدوں سے منسلک نہیں۔
(4) ذات، پات (یعنی ورنوں کی تقسیم) کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔
(5) گائے کی تقدیس اور برہمنوں کی عظمت کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔ اچھوت گائے کا گوشت بلا اعتراض کھا جاتے ہیں۔
(6) خدا پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کے چھ قدیمی مذاہب فلسفہ میں سے یوگ کے سوا اور کوئی خدا کا قائل نہیں۔

(7) سر کی چٹیا بھی ضروری نہیں۔
(8) زنار کی بھی شرط نہیں۔
(9) کھانے پینے میں حلال اور حرام کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ جو ایک کے نزدیک حلال ہے وہ دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔
(10) کوئی رسم و رواج بھی ایسا نہیں جو جزو لاینفک ہو۔
(11) کرم (جزاو سزا) روح اور او تاروں پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہیں۔
(12) "ہندو لاء" (ہندوؤں کے مروجہ قانون) کا اطلاق بھی ضروری نہیں۔ اس لئے کہ یہ قانون بھی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔ جو ایک کے نزدیک نہایت ضروری ہے، وہ دوسرے کے ہاں یکسر غیر ضروری ہے۔
(13) نسل اور رنگ کا امتیاز بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔ لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جو ہندو کہلانے سے انکار نہیں کرتا۔ یا یوں کہیئے کے جو اقرار کرتا ہے کہ وہ ہندو ہے۔ ہندو قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ہندوازم صفحہ 57-50)

اس باب میں جواہر لال نہرو اپنی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندومت کے دائرہ میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے۔ اور اس میں بقاء کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چاروک تھے۔) لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔"

(میری کہانی۔ جلد اول۔ صفحہ 202)
(بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں از غلام احمد پرویز)

غلام احمد پرویز مرحوم لکھتے ہیں:

1946ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک کتاب (The Discovery of India) شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے ہندوازم کے متعلق مزید تفصیل سے لکھا تھا۔ وہ اس باب میں رقم طراز ہیں:

"ہندوازم بہ حیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم غیر تعین اور بہت سے گوشوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے اس کی تعریف (Defnition) بتانا ممکن نہیں حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں۔

یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی، باہم مگر مختلف بھی حتیٰ کہ ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں اس کا لازمی عنصر غالباً جذبۂ رواداری ہے۔ مہاتما گاندھی نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعریف (Definition) پیش کر سکیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ ہندو مذہب کی تعریف بیان کرو تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ عدم تشدد کے ذریعہ سچائی کی تلاش کا نام ہے ایک شخص خواہ خدا کو بھی نہ مانے لیکن بایں ہمہ وہ ہندو کہلا سکتا ہے۔ ہندوازم نہایت شدت سے سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ہندوازم سچائی کا مذہب ہے۔ سچائی ہی خدا ہے۔ خدا کے انکار سے ہم واقف ہیں لیکن سچائی سے انکار کہیں نہیں سنا گیا۔

گویا گاندھی جی کے الفاظ میں ہمسا اور سچائی ہی ہندو مذہب ہے۔ لیکن بہت سے مشہور اور سچے ہندو یہ کہتے ہیں کہ اہمسا ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔ لہٰذہ باقی صرف سچائی رہ گئی جسے ہم ہندو مذہب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو کوئی تعریف (Defnition) نہیں۔

(Discovery of India page-53)

مہاتما گاندھی اپنے اخبار ہریجن (بابت 15/12/1946ء) کے افتتاحی مقالہ میں "ہندوازم" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"ایک طویل عرصہ کے مصائب اور سخت تجربہ کے بعد، ہندوستان کے مذہبی فرقوں نے مذہبی رواداری کا جو ہر بطور عادتِ عامہ پیدا کیا۔ اگر ہندوازم کی اصطلاح، شومت، ویشنومت، جین مت، بدھ مت، وحدانیت، شرکت، حیوان پرستی، حتیٰ کہ خدا سے انکار جیسے متضاد و متخالف مسالک پر کیا جا سکتا تو ان سب میں قدر مشترک غالباً یہی جذبۂ رواداری (Tolerance) ہے۔"

(ہریجن بابت 15/12/46)

(بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں صفحہ 103)

**لفظ ہندو کی تحقیق:** مسٹر گوونداس کی تحقیق کے مطابق ہندو کا لفظ سنسکرت زبان کی کسی قدیم یا جدید کتاب میں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا سراغ پارسیوں کی ژند اور اوستا میں

ملتا ہے۔(ہندوازم صفحہ 47) باقی رہا باہمی تضاد کا معاملہ، سو خود مہابھارت میں ہے کہ:

ویدوں کے احکام ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح سمرتی کے احکام بھی، کوئی رشی ایسا نہیں جس کی تعلیم دوسرے رشی کی تعلیم کے مخالف نہ ہو۔

(ہندوازم صفحہ 62)

ہندوازم کی تاریخ محفوظ نہیں: اس سلسلے میں (George Sarton) اپنی کتاب (Introduction to the history of Science) میں لکھتا ہے:

وقائع نگاری کے فقدان کی وجہ سے ہندو سائنس کا مطالعہ بہت دشوار ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی بیان کردہ تواریخ اسی صورت میں قابل یقین سمجھی جا سکتی ہیں جب ان کی توثیق غیر ہندی (یونانی، عربی، چینی) مورخ بھی کریں۔

(کتاب مذکور صفحہ 36)

مشہور مورخ الفنسٹن (سابق گورنر صوبہ بمبئی) اپنی کتاب تاریخ ہند میں رقمطراز ہے:

1- جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو اکثر اپنے آباؤ اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب رکھتی ہے تو اس بات پر کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجود یہ کہ ان کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی ہوئی بھی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہو سکتی اور نہ کسی عام واقع کی تاریخ، سکندر کے یورش کرنے سے پہلے کی قائم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات کا ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک کا لکھا جا سکتا ہے۔

(بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں صفحہ 106)

2- مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ "1200ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کوئی قابل تذکرہ کتاب جس کو تاریخ کی کتاب کہا جاسکے یا کوئی ایسی تصنیف جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں۔ اس ملک کے باشندوں یعنی ہندوؤں نے نہیں لکھی۔"

(مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ 105)

مشہور فرانسیسی سکالر ڈاکٹر لیبان کا بیان ہے۔

"ان ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ کے کسی واقعہ کو معین

کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی سہاروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں یہ عجیب خاصیت ہے کہ ان میں ہر چیز کو غلط اور غیرفطری صورت میں دیکھنے کی صورت واضح طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے۔ قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا، اور ہندوستان کے پہلے مورخ مسلمان ہیں۔

(تمدنِ ہند صفحہ 144-147)

پنڈت جواہرلال نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) میں رقمطراز ہیں:

"اہل چین، اہل یونان اور عربوں کے برعکس، قدیم ہندوستان کے لوگ مورخ نہیں تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گزشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعین کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس طرح باہم گڈمڈ ہو رہے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک کتاب (یعنی کلہان کی راج ترنگنی) ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ باقی واقعات کے لئے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے---- یا پھر بیرونی مورخین، مثل اہل یونان، اہل چین اور عربوں کی شہادت پر۔

مثال کے طور پر بکرماجیت سمت کو لیجئے یہ 57 ق م سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس زمانہ کے اِدھر اُدھر ہمیں تاریخ میں کسی بکرماجیت کا اتا پتہ نہیں ملتا۔ ایک بکرماجیت چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے، لیکن یہ چوتھی صدی عیسوی کا بکرماجیت اس سمت کا موجد کیسے ہو سکتا ہے۔ جو 57 ق م سے شروع ہوتا ہے۔ اس بکرماجیت کو اس سمت سے متعلق ثابت کرنے کے لئے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ نے جس طرح تاریخ سے کھیل کھیلا ہے وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ وہ اس بات پر بھی بڑا زور دیتے ہیں کہ یہی وکرم ہے جس نے باہر سے آنے والوں کے خلاف جنگ آزادی کو برپا کیا اور اس بات کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ ہندوستان اکھنڈ رہے اور ایک ہی قومی حکومت کے ماتحت ہو۔ حالانکہ وکرم کی سلطنت شمالی اور وسطی ہندوستان سے آگے نہیں تھی----

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی (یعنی ہندو) اپنی قدیم روایات ہی کو تاریخ تسلیم کر لیتے ہیں، اور نہایت آسانی سے نتائج تک پہنچ جانے کے مسلک کو بالآخر چھوڑنا پڑے گا۔

(کتاب مذکور صفحہ 77-79)

اسی موضوع پر بھائی پرمانند لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں عام طور پر جو تاریخی کتابیں رائج ہیں ان کے تین حصے ہیں' زمانہ قدیم' جو کہ بالکل نامکمل ہے' بدقسمتی سے ہمارے بزرگوں کو اپنے حالات درستی سے قلم بند کرنے کا شوق نہ تھا اور جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کی امداد سے صحیح واقعات تک پہنچنا محال ہے۔ غالباً سوسائٹی کے اندر ایسی تبدیلیاں ہوئی ہی نہ ہوں گی جن کو قلم بند کرنے کا انہیں خیال آتا۔"

(رسالہ زمانہ کانپور' ستمبر و اکتوبر 1914ء
مضمون "تاریخ ہند" کا مطالعہ)

غیر تحقیقی ادعا: سورجا سد ھانتا ہندوؤں کی علم ہیئت کی مشہور کتاب ہے۔ (Sarton) کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے۔ (سارٹن کی کتاب مذکور صفحہ 387) اور پادری بنٹلی صاحب اسے گیارہویں صدی عیسوی کی تصنیف خیال کرتے ہیں' لیکن ہندو اس کتاب کو اکیس لاکھ پینسٹھ ہزار سال قبل کی تصنیف بتاتے ہیں۔ (کلیات آریہ مسافر۔ حصہ اول صفحہ 11) ہندوؤں کے ہاں دنیا کو چار زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی مدت حسب ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| (1) ست جگ | 17,28,000 سال |
| (2) ترت جگ | 12,96,000 سال |
| (3) دراپارہ | 8,64,000 سال |
| (4) کال جگ | موجودہ زمانہ۔ جس کے پانچ ہزار سال گزر چکے ہیں اور جس کی مدت 4,32,000 سال ہے۔ |

ملاحظہ ہو ہندوازم۔ صفحہ 201)

جناب غلام احمد پرویز مرحوم لکھتے ہیں:

مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار راجہ دسرتھ کے متعلق تحریر ہے کہ جب ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی ہوئی تو ان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔ (ہندوازم۔ صفحہ 134) اسی طرح لکھا ہے کہ --- مہارانی سیتا جی کی پہلی اولاد اس وقت ہوئی جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی تھی۔ (ایضاً) اور یہ معلوم ہے کہ سیتا جی کا سوامبر پانچ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ جبکہ رام چندر جی کی عمر بارہ برس کی تھی۔ مہاراجہ رام چندر جی کی عمر کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب سب کچھ ہو چکنے کے بعد سیتا جی زمین میں سما گئی ہیں تو اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی مہاراج برسر حکومت رہے۔ (یہ سب کچھ رامائن کے بیان کے مطابق ہے) اسی طرح راجہ بھارت کی عمر (جس کی

نسبت سے ہندوستان کو بھارت ورش کہا جاتا ہے۔) شاستر میں دس ہزار برس کی لکھی ہے۔
(مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں صفحہ 111 - 110)

**ویدوں کی قدامت:** ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا (پرنسپل سنسکرت کالج، کلکتہ) اپنی مشہور کتاب (A history of Indian Philosophy vol.1) میں لکھتے ہیں:

"ایک مبتدی جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے یہ دیکھ کر پریشانی سے محسوس کرلے گا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں لیکن ان سب کا نام ویدیا سرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لئے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف و جوانب میں اس قدر طویل، عرصہ میں جمع کیا۔ اس لئے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہئے۔"

(صفحہ 12-11)

**رامائن کی قدامت:** اخبار تیج دہلی کے کرشن نمبر مورخہ 7 ستمبر 1939ء میں سوامی انو بھوانند جی لکھتے ہیں:

"ہماری ہندو جاتی میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور متبرک ہستیاں دو ہوئی ہیں۔ ایک مہاراجہ رام چندر والئی اودھ، اور دوسرے بھگوان کرشن والئی دوارکا۔ ہندو تاریخ کے مطابق رام اور راون کی لڑائی کو آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہوئے ہیں۔

جب رامائن کا مذکورہ بالا واقعہ ساڑھے آٹھ لاکھ سال سے زیادہ پرانا ہے تو وید۔ جو بہت پہلے کی تصنیف ہیں۔ اس سے بھی قدیم ٹھہرے، لیکن جدید سکالر ویدوں کی قدامت کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

یعنی بقول مسٹر ہاگ (Haug) ان کا زمانہ تصنیف۔ قریب 2400 ق م قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ملر ویدوں کے عہد کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(1) سوتر لٹریچر 200 سے 600 ق م تک۔
(2) براہمن 600 سے 800 ق م تک۔
(3) منتر 800 سے 1000 ق م تک۔
(4) چھند (رگوید کے آخری حصہ سمیت) 1000 سے 1200 ق م تک۔

(Cambridge History of India Part. I- P. 112)

# بدھ مت اور جین مت

**بدھ مت اور جین مت کا آغاز:** جب ہندی آریہ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ تو انکا زیادہ وقت مقامی باشندوں سے لڑنے بھڑنے میں گزرتا تھا۔ مگر جب انہوں نے گنگا جمنا اور برہم پتر کا میدان اپنے قبضے میں کر لیا، اور وہاں اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔ تو ان کا خیال زیادہ تر مذہب کی طرف ہو گیا۔ "اب برہمنوں کا درجہ اونچا ہو گیا۔ اور یگیہ۔ ہون، وغیرہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ یہ یگیہ ہون کی رسومات رفتہ رفتہ نہ صرف پیچیدہ ہی ہو گئیں۔ بلکہ ان پر زر کثیر صرف ہونے لگا اور جانوروں کی قربانیاں بھی ہونے لگیں۔" اِس کے خلاف کئی لوگوں نے صدائے احتجاج بلند کی، اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں ہندوستان میں کئی مذہبی فرقے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے صرف دو فرقے ابھی تک زندہ ہیں۔ جن کی بنیاد دو شہزادوں نے ڈالی۔ ان میں سے ایک بدھ مذہب ہے جس کا بانی سدھارتھ تھا۔ اور دوسرا جین مذہب جس کا بانی وردھمان مہابیر تھا۔

**گوتم بدھ:** بچپن۔ گوتم ایک کشتری شہزادہ تھا، اور ریاست کپل دستو (واقع نیپال) کے راجہ سدودھن کا بیٹا تھا۔ لڑکپن میں اُس کا نام سدھارتھ تھا وہ 623 ق م میں لمبنی گاؤں میں پیدا ہوا۔ بعد میں یہی سدھارتھ بدھ کے نام سے مشہور ہوا، اور چونکہ وہ شاکیہ قوم سے تھا۔ اِس لئے اُسے "شاکیہ منی" بھی کہتے ہیں۔

**شادی:** گوتم بدھ کی پرورش بڑے ناز و نعمت میں ہوئی اور اسے کشتری راجکماروں کی طرح اعلیٰ تعلیم دلائی گئی، لیکن وہ شروع سے ہی سوچ بچار میں ڈوبا رہتا تھا۔ اور کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بہت اُداس اور بے چین ہو جاتا تھا۔ اس کے باپ نے شہزادہ کی یہ حالت دیکھ کر اس کے خیالات کو بدلنا چاہا۔ چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک خوبصورت شہزادی یشودھرا کے ساتھ کر دی گئی، لیکن اس سے شہزادہ کی سوچ بچار کی عادت کم نہ ہوئی۔

**گھربار چھوڑنا:** کئی ایک موقعوں پر گوتم کو بڑھاپا۔ بیماری اور موت کے دردناک نظارے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس سے اس کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا، اور اس نے سمجھ لیا کہ دنیا دکھوں اور مصیبتوں سے بھرپور ہے۔ چنانچہ اس نے اِس دنیا کی تکلیفوں سے رہائی پانے کا طریقہ ڈھونڈنا چاہا۔ شادی سے دس سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اب اس نے کہا کہ ایک اور بندھن پڑ گیا ہے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ گھر چھوڑ جاؤں۔ چنانچہ انتیس سال کی عمر میں ایک رات وہ گھربار چھوڑ جنگلوں کو چلا گیا۔

پہلے پہل گوتم نے برہمنوں سے تعلیم حاصل کی۔ مگر اُسے تسکین نہ ہوئی، پھر اس نے چھ

سال تک سخت ریاضت کی۔ یہاں تک کہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر وہ شہر گیا کے قریب ایک بڑ کے درخت کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں اُسے ایک خاص روشنی نظر آئی، اور اس نے اپنے خیال کے مطابق دنیا کے دکھوں سے بچنے اور سچی راحت حاصل کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا، اور وہ یہ تھا کہ انسان کے اعمال نیک ہونے چاہئیں۔ اس وقت سے وہ بدھ یعنی عارف کہلانے لگا اس وقت بدھ کی عمر 35 سال تھی۔

**مذہب کا پرچار:** اس کے بعد مہاتما بدھ نے اپنے مذہب کا پرچار کرنا شروع کیا۔ اور بنارس کے نزدیک سارناتھ کے مقام پر اپنا پہلا وعظ کیا۔ وہاں پانچ سادھو اس کے چیلے بن گئے۔ اس کے بعد اس کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی گئی، اور بدھ نے بھکشوؤں کی ایک زبردست تنظیم یا سنگھ کی بنیاد ڈالی۔ جس نے اس مذہب کو دور دور تک پھیلا دیا۔ بدھ اپنی عمر کے بقایا 45 سال ریاست مگدھ اور اس کے گرد و نواح میں اپنے مذہب کا پرچار کرتا رہا۔ اس کے باپ اور تمام خاندان نے بھی اِس مذہب کو قبول کر لیا۔

**وفات:** آخر 80 سال کی عمر میں یعنی 543 ق م میں بدھ نے کشی نگر (واقع ضلع گورکھ پور) کے مقام پر وفات پائی۔

**بدھ کی تعلیم:** 1- بدھ کی تعلیم بڑی آسان تھی۔ اس میں فلسفہ کی کوئی پیچیدہ باتیں بھری ہوئی نہ تھیں۔ بلکہ زندگی میں ڈھالنے والی عملی باتیں تھیں۔ اس کی تعلیم کے چار بنیادی اصول تھے۔ اول۔ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ دوم۔ اِس دکھ کی وجہ خواہشات ہیں۔ سوم۔ ان خواہشات کو مارنے سے دکھ مٹ سکتا ہے۔ چہارم۔ اِن خواہشات کو مارنے کے لئے انسان کو اشٹ مارگ Eight- fold Path پر چلنا چاہئے۔ جو مندرجہ ذیل آٹھ اصولوں پر مشتمل ہے:

1- درست ادراک (سمجھ)

2- درست ارادہ

3- درست گفتگو

4- درست چال چلن

5- درست زندگی

6- درست کوشش

7- درست غور

8- درست راحت

1- اس راستہ کو Middle Path بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ بدھ عیش و عشرت کی زندگی کی بھی ناپسند کرتا تھا اور سخت ریاضت کی زندگی کو بھی۔ وہ ان دونوں کے درمیانی رستہ کی تعلیم دیتا تھا۔

3- بدھ نے اہنسا یعنی جانداروں کو ایذا نہ پہنچانے پر زور دیا ہے۔
4- بدھ مسئلہ کرم اور تناسخ کو مانتا تھا۔ لیکن خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش تھا۔ وہ ویدوں، قربانیوں اور ذات پات کی تمیز کو بھی نہیں مانتا تھا۔

**بدھ مت اور ہندو مت:** بدھ مت اور ہندو مت کئی باتوں میں آپس میں ملتے جلتے ہیں اور کئی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

**مشابہت:**

1- دونوں مذہبوں کا مدعائے زندگی ایک ہی ہے۔ یعنی نروان حاصل کرنا۔ اگرچہ نروان حاصل کرنے کے ذرائع مختلف ہیں۔
2- دونوں مسئلہ تناسخ اور کرم کو مانتے ہیں۔

**اختلاف:**

1- بدھ مت ویدوں کی سند کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی ہندوؤں کی بے رحمانہ قربانیوں، یگیوں اور دوسری مذہبی رسوم کو ہی مانتا ہے۔
2- بدھ مت ذات پات کے امتیاز کو نہیں مانتا۔ جو کہ ہندو مذہب کا ایک بڑا بھاری جزو ہے۔
3- بدھ مذہب ایک تبلیغی مذہب ہے، لیکن ہندو مت اس لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔
4- بدھ مت میں ہندو مت کی نسبت اہنسا پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

**نوٹ:** کنشک کے زمانہ میں بدھ مذہب کے دو فرقے ہو گئے۔ اول مہایان جو بدھ کو ہی خدا تسلیم کرتے ہیں اور اس کی مورتی کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ دوسرے "ہین یان" پرانے بدھوں کی طرح بدھ کو ایک گورو کا درجہ دیتے ہیں اور خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہیں۔

**بدھ مت کی ترقی کے اسباب:** بدھ مت بہت جلدی ہی ہندوستان اور دور دراز ممالک میں پھیل گیا۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:

1- **بدھ کی شخصیت:** بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ کی اپنی زندگی بڑی نیک اور پاک تھی اور اس کی شخصیت میں خاص کشش تھی۔ اس لئے لوگ اپنے آپ اس کی طرف کھچ آئے۔

2- **آسان تعلیم:** بدھ مت کے اصول برہمن مذہب کے پیچیدہ فلسفہ کے مقابلے میں بڑے سادہ اور آسان تھے اور عام لوگ انہیں آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

3- **عوام کی زبان:** بدھ مذہب کا پرچار روز مرہ کی بولی جانے والی زبان میں کیا گیا۔ نہ کہ سنسکرت میں جو کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان تھی، اور جسے عوام بہت کم

سمجھتے تھے۔

4- **ذات پات کا نہ ہونا:** بدھ مذہب میں ذات پات کی کوئی تمیز نہ تھی۔ تمام لوگ برابر تھے اور نروان کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا تھا۔ اِس لئے نیچی ذاتوں کے لوگ جوق در جوق بدھ مت میں داخل ہو گئے۔

5- **برہمن مت سے نفرت:** عوام برہمنوں کی خونی قربانیوں اور قیمتی یگیوں سے تنگ آچکی تھے۔ اس لئے بدھ مت جو نیک اعمال کو ذریعہ نجات ٹھہراتا ہے۔ زیادہ قابل قبول تھا۔

6- **بھکشوؤں کی کوشش:** بدھ نے بھکشوؤں کا جو سلسلہ (سنگھ) قائم کیا تھا۔ وہ بدھ دھرم کو پھیلانے میں ایک زبردست وسیلہ ثابت ہوا اور بھکشوؤں نے دور دراز ملکوں میں اپنے مذہب کو پھیلایا اور تبلیغی کام کیا۔

7- **شاہی مدد:** بدھ مت کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ اشوک نے خود اِس مذہب کو قبول کر لیا۔ اور اس نے اپنی ساری کوشش اس کی اشاعت میں وقف کر دی۔ اس کے بعد کنشک نے بھی اس مذہب کو پھیلانے میں بڑی کوشش کی۔ جس سے اس مذہب کو بہت عروج حاصل ہوا۔

8- **تبلیغی مذہب:** بدھ مت کے پھیل جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا مدمقابل کوئی زبردست مذہب نہ تھا۔ ہندو مذہب آج سے کچھ عرصہ پیشتر تبلیغی مذہب ہی نہیں تھا، اور باقی کے دو تبلیغی مذہب عیسائیت اور اسلام ابھی وجود میں ہی نہیں آئے تھے۔

**بدھ مذہب کے زوال کے اسباب:** بدھ مذہب سترہ صدیوں تک ہندوستان میں رہا۔ لیکن اس دوران میں کئی ایک وجوہات کے باعث یہ مذہب کمزور ہوتا چلا گیا اور آخر کار اپنی جائے پیدائش سے یعنی ہندوستان سے بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے زوال کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:

1- **ہندو مذہب کی پسندیدگی:** ہندو مذہب نے زمانہ کے مطابق اپنے اندر کچھ تبدیلیاں کر لیں۔ ہندوؤں نے بدھ کو بھی اوتار مان لیا۔ اور اہنسا کے اصول کو بھی اپنا لیا۔ جس سے ہندو مذہب پھر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور بدھ مت کمزور ہونا شروع ہوا۔ اور آخر کار ہندو دھرم میں ہی جذب ہو گیا۔

2- **بدھ مت کی تقسیم:** کنشک کے زمانہ میں بدھ مت کے دو فرقے بن گئے۔ اس سے بھی بدھ مت کمزور ہونا شروع ہو گیا۔

3- شاہی مدد کا ہٹ جانا: کنشک کی موت کے بعد شاہی مدد جو اس کی پشت پر تھی اور اس کی اشاعت کا بڑا موجب تھی ہٹ گئی- اس کے برعکس گپت خاندان کے بادشاہوں کی سرپرستی میں ہندو مذہب نے پھر عروج حاصل کرنا شروع کیا-

4- بدھ مت کی پیچیدگی: بدھوں نے ہندو فلسفہ کے کئی مسئلے اپنے مذہب میں شامل کر لئے- جس سے اُن کا مذہب بھی پیچیدہ اور رسومات والا ہو گیا-

5- سنسکرت زبان: گپت عہد میں بدھوں نے بھی اپنی کتابیں سنسکرت مین لکھنی شروع کر دیں- اِس طرح سے یہ مذہب عوام کے لئے سمجھنا مشکل ہو گیا-

6- بھکشوؤں کی اخلاقی گراوٹ: بدھ کے قائم کئے ہوئے سنگھ میں کئی برائیاں آگئی تھیں- خانقاہوں میں دولت کے بڑھ جانے سے بھکشو لوگ عیش پرست اور بد چلن ہو گئے تھے- اس لئے لوگوں کا بدھ دھرم پر اعتقاد کم ہو گیا-

7- راجپوتوں کا زور پکڑنا: بدھ مت اہنسا پر بڑا زور دیتا تھا- مگر راجپوت جو فطرتاً جنگجو اور بہادر تھے- بھلا اس اصول کو کیونکر مان سکتے تھے؟ چنانچہ اُن کے زور پکڑتے ہی بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا-

8- ہندو پرچارک: آٹھویں اور نویں صدی میں ہندو مذہب کے دو زبردست عالموں "کمارل بھٹ" اور "شنکر آچاریہ" نے نہایت سرگرمی سے بدھ مت کا مقابلہ شروع کیا- بدھ مذہب اس مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور رفتہ رفتہ ہندو مذہب میں جذب ہو گیا-

9- اسلامی حملے: بارھویں صدی میں اسلامی حملوں نے بدھ مت کو بہت نقصان پہنچایا اور آخر کار بدھ مت کا سرزمین ہند سے تقریباً خاتمہ ہو گیا-

نوٹ: اس وقت اگرچہ بدھ مذہب ہندوستان سے کافی حد تک نابود ہو چکا ہے- تاہم دنیا کی آبادی کا چوتھا حصہ یعنی اسی نوے کروڑ لوگ ابھی تک اس کے پیروکار ہیں- تبت، چین، منگولیا، سیام، جاپان، لنکا، نیپال، برما، ہند چینی وغیرہ ملکوں مین ابھی تک یہ مذہب رائج ہے-

وردھمان مہاویر: وردھمان مہاویر جین مت کا بانی تھا- اور صوبہ بہار کے ایک کشتری خاندان کا راجکمار تھا- اس کا جنم 599 ق م میں ہوا، اور وہ کافی عرصہ تک بدھ کا ہمعصر رہا- اس کی اوائل عمر بالکل گوتم بدھ کی طرح گزری- تیس سال کی عمر میں اس نے گھر بار چھوڑ دیا، اور پارشوناتھ کے قائم کئے ہوئے سادھوؤں کے فرقہ میں شامل ہو گیا- لیکن اس سے اسے کوئی خاص تشفی نہ ہوئی- اس لئے اس نے اس فرقہ کو چھوڑ دیا- اور بارہ برس تک گھور تپسیا کی- بیالیس برس کی عمر میں اس نے اس فرقہ کی از سرنو تنظیم کی، اور اس کا نام جین مت رکھا- اس کے

بعد مہاویر نے اپنی عمر کے بقایا تینتیس (33) سال مگدھ اور اس کے گرد و نواح کی ریاستوں میں پرچار کیا۔ کیونکہ کئی شاہی خاندانوں سے اس کا تعلق تھا۔ اِس لئے اُسے اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی مدد مل گئی۔ تاہم یہ مذہب بدھ مت کی طرح بہت مقبول نہیں ہوا۔ آخر 527ق م میں مہاویر نے ضلع پٹنہ میں پاوا نامی مقام پر وفات پائی۔

**جین مت کی تعلیم:** جین مت کے اصول کچھ حد تک بدھ مت کی اصولوں سے ملتے جلتے ہیں۔

1- جینیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد نروان حاصل کرنا ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل تین اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے:

1- سچا یقین۔

2- سچا علم۔

3- نیک عمل۔

اِن تین اصولوں کو "تین رتن" کہتے ہیں۔

2- اِس مذہب کا سب سے بڑا اصول اہنسا یعنی جانداروں کو ایذا نہ پہنچانا ہے۔

3- جینی لوگ خدا کی ہستی سے تو انکاری ہیں، لیکن ان کے خیال کے مطابق ہر شے میں روح ہے۔ خواہ وہ چیز جاندار ہو یا بے جان۔

4- جینی لوگ بدھوں کی طرح یگیوں۔ قربانیوں اور دیوی دیوتاؤں میں یقین نہیں رکھتے اور نہ ویدوں کی سند کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔

5- جینی لوگ ہندوؤں اور بدھوں کی طرح مسئلہ آواگون اور مسئلہ کرم کو مانتے ہیں۔

6- جینی لوگ اپنے تیر تھانکروں (نیک ہستیوں) کی جن کی تعداد چوبیس ہے پرستش کرتے ہیں۔

7- جینی بھوکے رہ کر مرجانے اور ریاضت کرنے کو ثواب سمجھتے ہیں۔

**نوٹ:** مہاویر کی موت سے کوئی دو سو سال بعد جین مت کے دو فرقے ہو گئے۔

(1) **شویتامبر:** یہ لوگ سفید کپڑے پہنتے ہیں اور اپنی مورتیوں کو سفید کپڑے پہناتے ہیں۔

(2) **ڈگمبر:** یہ لوگ ننگے رہتے ہیں، اور ننگی مورتیوں اور ننگے سادھوؤں کی پوجا کرتے ہیں۔

**نوٹ:** جینیوں کی تعداد آج کل لاکھوں میں ہے۔ یہ لوگ عام طور پر امیر اور خوشحال ہیں، اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ کوہ آبو پر ان کے بڑے عالی شان مندر ہیں۔

## جین مت اور بدھ مت کا مقابلہ:

**مشابہت:** 1- یہ دونوں مذہب یگیوں اور قربانیوں کے برخلاف احتجاج کے طور پر وجود میں آئے۔ اِس لئے یہ دنوں اہنسا کا پرچار کرتے ہیں۔

2- دونوں ویدوں کی سند کو تسلیم نہیں کرتے۔
3- ذات پات کے امتیاز کو دونوں نہیں مانتے۔
4- آواگون اور مسئلہ کرم میں دونوں کا اعتقاد ہے۔
5- دونوں مذہب پیچیدہ فلاسفی کی بجائے نیک اخلاق پر زور دیتے ہیں۔

اختلاف: 1- دونوں مذہب اپنے اپنے بزرگوں کو پوجتے ہیں۔ بدھ اپنے بدھوں کو اور جینی اپنے تیر تھانکروں کو۔
2- دونوں کی کتب مقدسہ مختلف ہیں۔
3- بدھ مت والے نروان کا راستہ اشٹ مارگ بتاتے ہیں اور جینی تین رتن کو۔
4- بدھ خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہیں جبکہ جینی اللہ کی ہستی کے منکر ہیں۔
5- بدھ سخت مجاہدوں اور ریاضت کے خلاف ہیں۔ جبکہ جینی انہیں پسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ فاقہ کشی سے مرنا ان کے نزدیک کار ثواب ہے۔

تبلیغی کوششیں: بدھ مت کی تبلیغ کے مراکز پنجاب میں ٹیکسلا ضلع راولپنڈی میں بھی قائم تھے۔

رازِ معرفت پانے کے بعد گوتم بدھ نے اپنے بھاگے ہوئے پانچ برہمن سادھوؤں کو تلاش کیا اور ان کو اپنا اپدیش دیا، اور پھر ان کو "بدھ مت" کی تبلیغ کے لئے کہا۔ اس نے تبلیغی مجلسیں قائم کیں جنہیں بدھ سانگا کہتے تھے۔ ان مجلسوں کے مرد مبلغوں کو بھکشو اور خواتین مبلغوں کو بھکشنیاں کہا جاتا تھا۔ ایسی مجالس میں بدھ مت کی تعلیم پالی زبان میں دی جاتی تھی جو لوگوں کو بآسانی سمجھ آ جاتی۔

گوتم بدھ کی وفات کے بعد بدھ مت کے مبلغ ایک جگہ جمع ہوئے اور سب نے مل کر بدھ مت کی تعلیم کے تمام اصولوں کو اکٹھا کیا۔ اور کتابی شکل دینے کی ٹھانی۔ اس مقدس کتاب کا نام "تری پیٹاکا" رکھا۔ جو تین اجزاء پر مشتمل تھی۔

ونایا — اِس میں مبلغین (مرد اور عورتوں) کے نظم و ضبط کے اصول و قواعد تھے۔
سوتا — یہ گوتم بدھ کے ملفوظات تھے۔
ابھیدم — یہ حصہ فلسفیانہ مباحث پر مشتمل تھا۔
کسی معاملہ کو سلجھانے کے لئے مبلغیں مل کر اجتہاد کرتے تھے۔

چار مجالس کا انعقاد: گوتم بدھ کی وفات کے بعد اس کے پیروکار "مہاکاسیپا" نے پہلی مجلس منعقد کرائی۔ جو راج گڑھ میں انعقاد پذیر ہوئی ایسی دوسری مجلس سو سال بعد ویسالی کے مقام پر "لاسوکا" کے اہتمام سے منعقد کی گئی۔ تیسری مجلس راجہ اشوک اور چوتھی

راجہ کنشک کے عہد میں منعقد کی گئی۔

**بدھ مت کی ترقی کے اسباب:** بدھ مت اس کے بانی کی زندگی میں ہی مدھیا پردیش، اوتر پاتھا اور ڈکشنا پاتھا، مگدھ، کوشل، کوسامبھی اور مالوہ میں پھیل گیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد بدھ کے مبلغین نے یہ سلسلہ جار رکھا۔ حتیٰ کہ اشوک، کنشک اور ہرش ایسے راجوں نے اسے سرکاری مذہب قرار دے کر اس کی خوب اشاعت کی اور ٹیکسلا کے مقام پر بدھ خانقاہوں کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔

برصغیر کے علاوہ چین، جاپان، برما، انڈونیشیا اور لنکا کے ملکوں میں بھی بدھ مذہب پھیل گیا کیونکہ۔

1- عوام برہمنوں سے بیزار تھے اور ان کی پیچیدہ اور سنسکرت زدہ تعلیمات عام فہم نہ تھیں جبکہ بدھ کی تعلیم پالی زبان میں تھی جو عوامی زبان تھی۔
2- گوتم بدھ کی زندگی سادگی اور خلوص کا نمونہ تھی۔
3- یہ تعلیمات عمل کے لحاظ سے آسان تھیں۔
4- اس میں انسانی مساوات اور رواداری کا عنصر بہت تھا۔
5- خانقاہیں قائم کر کے باقاعدہ تبلیغی کام انجام دیا جاتا تھا۔
6- اس کے مقابلے میں کوئی اور مذہب اس قدر پر کشش اور تبلیغی اثرات کا حامل نہ تھا۔
7- سرکاری سرپرستی میں یہ مذہب برصغیر سے نکل کر دور دراز کے ملکون تک جا پہنچا۔ راجہ اشوک اس مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا بیٹا مہندر ا اور بیٹی سانگامترا اس کے مبلغ تھے۔ اشوک نے کتبوں پر اس مذہب کے چیدہ چیدہ اصول کندہ کروائے جن کی افادیت صدیوں تک قائم رہی۔

بدھ مت میں اگرچہ خدا کا تصور نہیں، لیکن اس مذہب کی اشاعت بڑے زور سے ہوئی اور اس کی خانقاہیں ہندوستان بھر میں پھیل گئیں۔ گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد اس کے پیروکاروں نے اسے الوہیت کا درجہ دے دیا اور اس کے بت تراش کر ان کی پوجا پاٹھ شروع کر دی۔ حتیٰ کہ اس نئے معبود کی آدھی سے زیادہ دنیا نے پرستش شروع کر دی۔ ہندوؤں نے بدھ ازم کی کامیابی کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی چنانچہ انہوں نے اسے ہندوازم کی شاخ قرار دیا۔ اور گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار مان لیا گیا۔ اس طرح ہندوازم بدھ مت کو بھی اپنے اندر سمونے کا مدعی بن بیٹھا۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں بدھ مت نے بہت ترقی کی۔ گوتم بدھ کپل دستو کے راجہ کے بیٹے تھے۔ جو راج پاٹ چھوڑ کر گیان، دھیان کی طرف مائل ہوئے اور برہمنوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی دلجوئی کے لئے اپنی عمر وقف کر دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ

قرآن حکیم میں بیان کردہ ایک نبی جسے "ذوالکفل" کہا گیا ہے کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ شاید یہ کپل دستو کے راجہ کے بیٹے گوتم بدھ ہی ہوں۔ جن کی تعلیمات پہلے پہل حق پرستی پر مبنی ہوں، لیکن بعد میں ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کو بگاڑ دیا ہو۔

**گوتم بدھ کی تعلیمات:** اپنی تعلیم کو انہوں نے چار حقیقتوں کی شکل میں پیش کیا دکھ کا سبب، دکھ کا استیصال، دکھ کے استیصال کا طریقہ، پیدا ہونا دکھ ہے، بیمار ہونا دُکھ ہے جن چیزوں سے ہمیں محبت ہو ان کا موجود نہ ہونا دکھ ہے جو کچھ ہم اپنے لئے چاہتے ہوں اس کا نہ ملنا دکھ ہے گویا پہلی حقیقت جسے انسان کو ذہن نشین کر لینا چاہئے وہ یہ ہے کہ زندگی سراسر دکھ ہے اگر اس میں اتنی توفیق ہے کہ وہ آپ بیتی اور جگ بیتی سے یہ سبق حاصل کر سکے تو پھر وہ سوچے گا کہ دکھ کا سبب کیا ہے گوتم بدھ نے بتایا کہ دکھ کا سبب وہ خواہشیں اور میلانات ہیں جو انسان کو بار بار گھسیٹ کر اس دنیا میں لے آتے ہیں جو اسے لطف اندوزی کی فکر میں سرگرداں رکھتے ہیں اور زندہ رہنے اور بہتر سے بہتر زندگی گذارنے کے غیر شعوری ارادے کو پختہ کرتے رہتے ہیں ہر برائی کی جڑ ناواقفیت ہے۔

**بدھ متی سنگھ:** نروان حاصل کرتے ہی گوتم بدھ نے اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی اور ان کا منشا تھا کہ جلد سے جلد مبلغوں کی ایک جماعت بنا کر اپنے دھرم کی اشاعت کریں جب ان کے پیروؤں کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہو گئی تو انہوں نے ان کو ہدایت دی کہ دھرم کا پرچار کریں جاؤ بھکشو عوام کے فائدے کے لئے ان کی بھلائی کے لئے رحم کے جذبے سے متاثر ہو کر ادھر ادھر دورے کرو کوئی دو آدمی ایک طرف نہ جاؤ۔ اسی کے بعد یہ قاعدہ بنا کر جب کوئی نئے دھرم کو قبول کرے اور بھکشو بننا چاہے تو وہ سر اور منہ کے بال منڈا دے، زرد کپڑے پہن کر ان بھکشوؤں کی قدم بوسی کرے جن کے ہاتھ پر وہ ایمان لایا ہو اور پھر چار زانو بیٹھ جائے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر سے اوپر اٹھائے اور تین بار کہے کہ "میں پناہ لیتا ہوں بدھ میں، میں پناہ لیتا ہوں دھرم میں، میں پناہ لیتا ہوں سنگھ میں۔" جو لوگ صرف عقیدت ظاہر کرنا چاہتے اور بھکشو نہ بنتے وہ اپاسک کہلاتے ان کے لئے بدھ دھرم اور سنگھ میں پناہ لینے کا کلمہ تین مرتبہ پڑھنا کافی تھا اس کے آگے گوتم بدھ نے سنگھ یعنی اپنے پیروؤں کی جماعت کی کوئی اور تنظیم یا اسے دوسرے فرقوں سے ممتاز کرنے کی کوئی اور تدبیر نہیں کی شاید وہ کوئی ایسی تنظیم کرنا مناسب بھی نہیں سمجھتے تھے ان کی وفات سے پہلے ان سے درخواست کی گئی کہ سنگھ کا کوئی انتظام کرتے جایئے تو انہوں نے پوچھا کہ سنگھ آخر مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں نے دھرم کی تعلیم دی ہے اور اس میں کوئی مخصوص نہیں رکھا ہے عقائد کے معاملے میں استاذ کی طرح میں نے اپنی مٹھی میں کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے اگر تم میں سے کوئی ایسا ہو جس کے دل میں یہ خیال رہتا ہو کہ وہ سنگھ کی رہنمائی کرے گا یا سنگھ اس کا دست نگر ہے تو اسے

چاہئے کہ سنگھ کی تنظیم کے لئے قاعدہ قانون بنائے اس طرح نہ تو سنگھ کا کوئی مرکز قائم ہوا ہے اور نہ اس کے لئے کوئی ایسے عہدہ دار مقرر کئے گئے جو اس کی نگرانی اور اس کی بھلائی کے لئے تدبیریں کرتے بھکشوؤں اور اپاسکوں (یعنی دنیا دار پیروؤں) کے درمیان بھی کوئی باضابطہ تعلق نہیں قائم کیا گیا، اور بھکشوؤں کی ضروریات پوری کرنا بالکل اپاسکوں کی توفیق پر چھوڑ دیا گیا گوتم بدھ یہ چاہتے بھی نہیں تھے کہ ان کے پیروان کی تعلیم کے سوا اور کسی کا سہارا ڈھونڈیں اور ان کی آخری وصیت تھی کہ تم آپ اپنے چراغ بنو آپ اپنی پناہ بنو کسی خارجی چیز کی پناہ نہ لو، دھرم پر قائم رہو کہ وہ تمہارے لئے ایک چراغ ہے دھرم کو سہارا جان کر اسے مضبوط پکڑو۔"

**عورتوں کا سنگھ:** معلوم ہوتا ہے گوتم بدھ کے زمانے میں عورتوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھیں اور وہ زندگی کے تمام مشاغل میں شریک ہو سکتی تھیں۔ بعد کو بدھ متیوں میں بھی عورت ذات کے متعلق حقارت آمیز باتیں کہی جانے لگیں وہ بھی "عورت کی دو انگل چوڑی عقل" اور اس کی گہری چالوں کی شکایت کرنے لگے لیکن گوتم بدھ کا اپنا رویہ سراسر معصولیت پر منحصر تھا عورتیں ان کید ھرم کو بڑی تعداد میں قبول کرتی تھیں مگر کسی کو گھربار چھوڑ کر بھکشنی بننے کی دعوت نہیں دی گئی جب گوتم بدھ سے پہلی مرتبہ عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے انکار کیا لیکن آخر کو ان کے چیلے آنند نے اصولی بحث چھیڑی اور پوچھا کہ کیا آپ کے خیال میں عورتیں اس قابل نہیں کہ راہبوں کی زندگی بسر کر سکیں کیا تہذیب نفس اور نروان ان کے لئے ممکن نہیں تو وہ مجبور ہو گئے اور اپنی سوتیلی ماں مہا پجاپتی کو جنہوں نے یہ سوال اٹھایا تھا عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی اجازت دے دی مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لئے قواعد زیادہ سخت تھے اور ان کی حیثیت ہر لحاظ سے کم قرار دی گئی انہیں انفرادی طور پر دور کرنے یا اکیلے رہنے کی اجازت نہیں تھی وہ بستیوں کے اندر ہی رہ سکتی تھیں میل جول پر بھی بڑی پابندیاں تھیں۔

**بدھ کی خصوصیات اخلاقی ذمہ داری کا احساس:** گوتم بدھ صرف ایک قسم کا معجزہ دکھانا چاہتے تھے اور وہ تھا تعلیم کا معجزہ ان کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ انسان کے اخلاقی حس کو بیدار کریں کہ وہ اس سدا بدلتی ہوئی دنیا کی ناقص اور محدود زندگی سے اپنی ہوس کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ارادہ کر لے اور آزاد اور کامل ہونے کی دھن لگ جائے اس دھن کو خالی ایک شاعرانہ کیفیت نہ ہونا چاہئے بلکہ اصول اور قاعدے کے مطابق ایک اخلاقی اور عملی منصوبہ جسے ہر شخص کو اپنے لئے الگ پورا کرنا چاہئے گوتم بدھ نے موروثی اور روایتی علم کو بغیر جانچے ہوئے تسلیم کرنے اور بزرگوں کی تقلید پر اکتفا کرنے والوں کو اندھوں کی ایک قطار سے تشبیہ دی جس میں نہ اگلا رستے کو دیکھ سکتا ہے نہ بیچ والا نہ پچھلا

بغیر اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ ہر شخص پر یکساں نہیں ڈالا گیا جو لوگ بھکشو بنے انہوں نے گویا اس کا ارادہ کیا تھا کہ اسی جنم میں نروان حاصل کریں گے اور گوتم بدھ سب کے لئے ایک اصول بنانے کے بجائے ہر بھکشو نہیں بن گئے تھے وہ دھرم کے اصولوں کو جس حد تک ممکن ہوتا برتنے کی کوشش کرتے۔ یہ اصول اخلاقی اور روحانی جدوجہد کی ہر شکل پر حاوی مانے گئے ان کی توضیح کی گئی ان کے ماتحت اور اصول مرتب کئے گئے اور اوامرونواہی کی فہرستیں بنائی گئیں بھکشوؤں کے لئے ان کی پوری پابندی لازمی تھی اپاسک اگر جاندار چیزوں کی جان لینے سے پرہیز کرتا جھوٹ نہ بولتا نشے کی چیزوں پر پرہیز کرتا اور حسب حیثیت ان لوگوں کی خدمت امداد یا سرپرستی کرتا جنھوں نے دنیا رج دیا تھا تو یہ اس کے لئے کافی تھا وہ گویا راہ راست پر آگیا تھا اور نیک زندگی بسر کرنے کی اسے توفیق ہو گئی تھی مگر نروان کا منصوبہ اس نے کسی آئندہ جنم کے لئے اٹھا رکھا تھا بدھ متی جانتے تھے کہ مورکھ چاہئے جنم بھر پنڈت کی سیوا کرے اس کو دھرم کا گیان نہ ہوگا جیسے چمچے کو کھانے کا نہیں ملتا وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو لوگ روحانی زندگی بسر نہیں کرتے اور نیک اعمال کی دولت جمع نہیں کرتے وہ اس دنیا کی نعمتوں کی حسرت سے دیکھتے ہیں جیسے بوڑھے بگلے سوکھتے ہوئے تالاب میں سڑی گلی مچھلیوں کو لیکن ان نیک اعمال کی بھی جن کا مقصد وجود کی قید کو توڑنا نہ ہو ان کے نزدیک بڑی قدر تھی جیسے پھولوں کے ڈھیر سے آدمی جتنے ہار چاہے بنا سکتا ہے ویسے ہی ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے بھلائی کے کام کر سکتا ہے اور جیسے کسی شخص کا جو بہت دن پردیس میں رہا ہو اور وہاں سے خوشحال واپس آئے اس کے عزیز دوست اور ہم مشرب خیر مقدم کرتے ہیں ویسے ہی اس شخص کا جس نے نیک کام کئے ہوں مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے نیک اعمال استقبال کرتے ہیں گویا وہ بھی ایک عزیز ہے جو گھر واپس آیا ہے۔

یہ مذہب پنجاب میں بھی خوب پھلا پھولا ٹیکسلا کا علاقہ اس کی تبلیغ کا مرکز تھا جسے بادشاہان وقت کی سرپرستی حاصل تھی گویا پنجاب میں ہندومت کے علاوہ بدھ مت بھی مقبول تھا۔

اشوک کے زمانے میں بدھ متی مبلغ شمال مغربی ہندوستان بھیجے گئے تھے بھکشوؤں کی جماعتوں نے مختلف مقاموں پر اپنے مرکز بنا لئے اور تبلیغ کا کام سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا۔ یونانیوں نے پنجاب پر قبضہ کیا اور ساگلا (سیالکوٹ) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو ان پر ہندوستانی ماحول کا اثر پڑنے لگا ہیلی اوڈورس جس نے بیس نگر میں مینار بنوایا ایسے یونانی کی مثال ہے کہ جو واسیو دیو (وشنو) کا پجاری ہو گیا تھا پنجاب کے یونانی بادشاہ مینانڈر کے بعض سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا پالی کی ایک کتاب ملندا کے سوالات میں بدھ متی عالم ناگ سین اور ایک بادشاہ ملندا کی ایک بحث بیان کی گئی ہے جس کے بعد ملندا حقیقت سے واقف اور بدھ کا پیرو ہو گیا غالباً یہ روایت مینانڈر کے تبدیل مذہب کے متعلق ہے سک نسل کے سرداروں نے پنجاب کی

حکومت حاصل کرنے کے بعد بہت جلد بدھ مذہب اختیار کر لیا ہو گا کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسک کارلی اور جنار کے غار دیونون نے بنوائے تھے یونون سے یہاں مراد یونانی نہیں ہیں بلکہ سک سردار جنہوں نے اس زمانے میں یہاں تسلط حاصل کر لیا تھا- بدھ مذہب کی سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ کشان شہنشاہ کنشک بدھ کا پیرو ہو گیا اس کے زمانے میں بدھ متی عالموں کی ایک بہت بڑی مجلس کشمیر میں ہوئی- اس کا مقصد اختلافات کو دور کرنا تھا اور غالباً بحثوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مہایان تھا صحیح قرار دیئے گئے مجلس کے تمام فیصلے تانبے کی تختوں پر نقش کرا کر ایک اُستوپ میں رکھوا دیئے گئے مگر اس استوپ کے مقام کا ابھی تک پتا نہیں چلایا جا سکتا ہے کنشک کے زمانے میں اور اس کے بعد مہایان فرقے کو بہت فروغ ہوا اور جیسے اشوک کے تبلیغی منصوبوں سے پورے ہندوستان میں بدھ کا چرچا کر دیا تھا کنشک کے عہد میں ان دینی سرگرمیوں کی ابتدائی ہوئی جن کی بدولت بدھ مذہب وسطی، مشرقی اور جنوب مشرق ایشیا کا مذہب بن گیا-

**جین مت کے لئے تبلیغی مساعی:** چھٹی صدی قبل مسیح کے اواخر میں جین مت رائج ہوا- اس کا بانی مہاتما مہاویر تھا یہ مذہب ہندو برہمنوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایک بلند کی گئی آواز تھی- جینیوں کے نزدیک جین مت ازلی مذہب ہے جس کا پرچار مختلف زمانوں میں ترتھنکرز (Tinthankaras) کی معرفت ہوتا رہا ہے- مہاویر سے 250 سال پہلے ایک ترتھنکر آیا تھا- اس سے پیشتر 84000 چوراسی ہزار سال پہلے ایک ترتھنکر پارشوانا تھ آیا تھا- مہاویر کو وہ چوبیسواں ترتھنکر مانتے ہیں جن سے پہلے تیئس ترتھنکر ہو گزرے ہیں اور ہر ترتھنکر کا زمانہ ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے- جین مت میں زور دیا جاتا ہے کہ کسی جاندار کو قتل نہ کرو اور دکھ نہ دو- جین مت کے پیرو منہ پر کپڑا رکھتے ہیں تاکہ ہوا میں موجود جراثیم سانس کے ذریعے بدن میں جا کر ہلاک نہ ہو جائیں- ان لوگوں نے اپنے الگ مندر بنائے- یہ ہندوازم سے الگ مذہب ہے لیکن ہندو اس کو بھی اپنے مذہب میں شامل سمجھتے ہیں جین مت میں خدا کا وجود تسلیم نہیں کیا جاتا البتہ ترتھنکر کو خدا سمجھ کر انکی پوجا کی جاتی ہے- (اے ہسٹری آف انڈین فلاسفی جلد اول صفحہ 180 از سریندر ناتھ داس گپتا سابقہ پرنسپل سنسکرت کالج کلکتہ) سب سے پہلا ترتھنکر ریشابھا (Rishabha) تھا جین مت میں دو فرقے مشہور ہیں سوتمبر یہ سفید لباس پہنتے ہیں اور اپنے دعویٰ کے مطابق مہاویر کی اصل تعلیم کے وہی وارث ہیں-

2- **ڈگمبر:** یہ ننگے رہتے ہیں اور مہاویر کی تعلیم کے اصل عامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن بعد ازاں فرقوں کی تعداد چوراسی تک جا پہنچی-

**مقدس کتب:** جینیوں کے نزدیک شروع میں ان کے ہاں چودہ پرو اور گیارہ انگ مقدس کتابیں تھیں پروکتب کچھ عرصہ بعد کھو گئیں اور اب صرف ایک ہی باقی ہے لیکن ڈگمبر

فرقہ کے لوگوں نے اس سے بھی انکار کیا ہے اور وہ ان کتابوں کو سو تمبر فرقہ کی خانہ ساز کتابیں قرار دیتے ہیں سوامی دیانندار کا بیان ہے کہ جینیوں نے اپنی قوت و شوکت کے زمانہ میں ویدوں کو ضائع کر دیا تھا۔ اور ان کی تعلیم بھی مٹادی تھی (ستیارتھ پرکاش) ان کے ہاں بھی عجیب و غریب اعتقادات ملتے ہیں مثلاً ایک تر تھنکر کا قد مبارک پانچ سو بانس لمبا تھا۔ اور اس کی عمر 84 لاکھ سال تھی پھر دوسرے تر تھنکر کا قد چار سو بانس کے برابر رہ گیا اور اس کی عمر بھی بہتر72 لاکھ سال کی رہ گئی وغیرہ وغیرہ۔

تعلیمات: جین مت میں بہترین زندگی سادھو کی زندگی قرار دی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضروریات زندگی جمع کر کے اپنے پاس نہ رکھے بھیک مانگ کر گزارا کرے ان کی تمام پونجی ستر پوشی کے کپڑے، کمبل کشکول جھاڑو اور کپڑے کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے جس سے وہ اپنا منہ ڈھانپے رکھتے ہیں تاکہ کوئی جاندار کیڑا مکوڑا منہ میں داخل ہو کر موت کی آغوش میں نہ چلا جائے اور تاکہ وہ اس طرح ظلم اور جیوہتیا یعنی جانداروں کو قتل کرنے سے بچ جائیں۔ ڈگمبر فرقہ کے لوگ کپڑوں سے بھی بے نیازی برتتے ہیں ان کی ریاضتیں اور مجاہدے بڑے سخت ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دن رات میں صرف تین گھنٹے تک سونے کی اجازت ہے اس سے زیادہ نہیں ان کے پاس ایسا کوئی ضابطہ حیات نہیں جو زندگی کے سب شعبوں میں انسانی رہنمائی کر سکے اور اس کے ساتھ جدید سائنسی تقاضوں کا بھی ساتھ دے سکے۔ اور جدید علوم و فنون اور دریافتوں کی روشنی میں انسان کے ذہن کو مطمئن کر سکے۔ جین مت کے پیروکار ہندوستان میں مسلم فتوحات کے وقت زمانہ مابعد کی نسبت زیادہ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کا بڑا مرکز گجرات تھا اکبر نے 1582ء میں جینیوں کے ساتھ مذہبی روابط بڑھائے اور پہلے ان کے مذہبی ہیراوجے کو اور بعد میں بھانو چندر کو دربار میں پذیرائی بخشی اور مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سے اکبری فرامین کی توثیق اس کے جانشین جہانگیر نے کی۔

## باب 5

# سکندر کا حملہ (اجمالی ذکر)

**سکندر اعظم:** سکندر ریاست مقدونیہ واقع یونان کے بادشاہ فلپ کا لڑکا تھا۔ وہ بڑا عالی حوصلہ اور بہادر تھا۔ اس کا شمار دنیا کے بہت بڑے فاتحوں میں ہوتا ہے۔ وہ 356 ق م میں پیدا ہوا۔ اس نے اوائل عمر میں ہی اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا لیا تھا کہ وہ تمام دنیا کو فتح کرے گا۔ بیس برس کی عمر میں وہ تخت نشین ہوا، اور اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایشیائے کوچک سے لے کر افغانستان تک کا تمام علاقہ فتح کر لیا، اور پھر 326 ق م میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ وہ سرزمین ہند پر پہلا یورپین حملہ آور تھا۔

**سکندر کے حملہ کے وقت ہندوستان کی پولٹیکل حالت:** جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ تو اس وقت ہندوستان میں کئی خودمختار ریاستیں اور سلطنتیں تھیں۔ جن میں سے بعض جمہوری اور بعض کسی بادشاہ کے ماتحت تھیں۔

**پنجاب میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں:** جو ایک دوسرے سے لڑتی بھڑتی رہتی تھیں، اور سکندر کی کامیابی کا ایک بڑا باعث ان کی باہمی خانہ جنگی تھی۔ اِن ریاستوں میں سے ایک ٹیکسلا تھی۔ جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع تھی۔ یہاں راجہ آمبھی حکومت کرتا تھا اور وہ اپنے ہمسایہ راجہ پورس کا دشمن تھا۔ دوسرے پورس کا علاقہ تھا۔ جو دریائے جہلم اور چناب کے درمیان واقع تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں۔

**جمہوری قبیلوں میں سب سے مشہور ملوئی قوم تھی:** ان کا علاقہ موجودہ ملتان کے آس پاس تھا اور انہیں کے نام پر ملتان کا نام پڑا ہے، لیکن چونکہ یہ تمام ریاستیں آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ اس لئے سکندر کا متحدہ طور پر مقابلہ نہ کر سکیں۔

**سکندر کا حملہ (326 ق م):** 326 ق م میں سکندر نے اوہند کے مقام پر (جو موجودہ شہر اٹک سے کوئی سولہ میل اوپر کو واقع تھا) کشتیوں کا پل بنا کر

دریائے سندھ کو عبور کیا۔ اور ٹیکسلا کی طرف بڑھا۔ ان دنوں ٹیکسلا میں راجہ آمبھی حکمران تھا۔ اور وہ چونکہ اپنے طاقتور ہمسایہ پورس کا دشمن تھا۔ اس لئے اسنے سکندر کا خیر مقدم کیا۔ اور فوج اور روپے سے اس کی مدد کی۔ کچھ روز ٹیکسلا میں قیام کرنے کے بعد سکندر آگے بڑھا۔ اور دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ کے راجہ پورس کو اطاعت قبول کرنے کے لئے پیغام بھیجا۔ لیکن اس نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور دریائے جہلم کے دوسرے کنارے اپنی فوج آراستہ کر کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔

**پورس سے لڑائی:** دریائے جہلم طغیانی پر تھا اور سامنے پورس کی فوج تیار بر تیار تھی۔ اس لئے دریا کا عبور کرنا بڑا دشوار تھا۔ لیکن سکندر نے ایک رات شب کی تاریکی میں کچھ میل اوپر جا کر ایک کم چوڑی جگہ سے دریا کو پار کر لیا۔ اور اچانک ہی پورس کی فوج پر جا گرا۔ کری کے میدان میں زبردست لڑائی ہوئی جس میں اگرچہ پورس کی فوج نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن فتح سکندر کو ہی ہوئی۔ پورس اخیر دم تک لڑتا رہا۔ اور آخر زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ سکندر نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" اس پر پورس نے بڑی بہادری سے جواب دیا۔ "جیسا ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔" اس جواب سے سکندر بہت خوش ہوا۔ اور اس کا علاقہ اسے واپس دے دیا۔

**اِس لڑائی میں ہندوستانی فوج کی شکست کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:**

1- سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سکندر فنونِ جنگ کا زبردست ماہر تھا۔ اور اس کی فوج لڑائی کے داؤ پیچ زیادہ اچھے جانتی تھی۔

2- برسات کی وجہ سے میدانِ جنگ کی زمین پھسلن شروع ہو رہی تھی۔ جس نے پورس کے تیرانداز اپنی لمبی کمانوں کو زمین پر ٹھیک طرح ٹکا نہ سکے۔ اس کے علاوہ بھاری رتھ بھی تیز نہ چل سکے۔

**بیاس تک بڑھنا:** پورس سے مقابلہ کے بعد سکندر آگے روانہ ہوا اور چناب اور راوی کو عبور کرتا ہوا دریائے بیاس تک جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی فوج نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ فوج بہت تھک چکی تھی، اور اسے گھر کی یاد ستا رہی تھی، لیکن یہ بھی اغلب ہے کہ مگدھ کے راجہ مہاپدم نند کی فوجی طاقت کا حال سن کر وہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ چنانچہ سکندر نے مجبوراً واپسی کا حکم دیا۔

**سکندر کی واپسی:** سکندر جس رستے سے آیا تھا۔ اُسی راستے واپس جہلم پہنچا۔ جہاں اس نے کوئی دو ہزار کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کروایا۔ اور دریائے جہلم کی راہ لشکر سمیت

واپس ہوا۔ وہ اپنے فتح کئے ہوئے علاقہ میں راجہ آمبھی کو (سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقہ میں) اور پورس کو (جہلم اور بیاس کے درمیانی علاقہ میں) اپنا قائم مقام بنا گیا اور کچھ یونانی فوج بھی چھوڑ گیا۔ راستہ میں سکندر کو کئی قوموں سے لڑنا پڑا۔ ان میں سے ملوئی یا ملی قوم نے جو موجودہ علاقہ ملتان میں آباد تھی۔ اسے بہت پریشان کیا۔ لیکن سکندر نے سب کو شکست دی اور سمندر تک جا پہنچا۔

یہاں اس نے اپنی فوج کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ تو نیارکس کی سپردگی میں سمندر کی راہ روانہ ہوا، اور دوسرے حصے کو سکندر خود ساتھ لے کر بلوچستان اور ایران سے ہوتا ہوا بابل پہنچا۔ لیکن اس کو واپس وطن پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ بلکہ وہ بابل (ملک عراق میں دریائے فرات کے کنارے) کے مقام پر ہی 323 ق م میں 33 سال کی عمر میں وفات پا گیا۔

# "سکندر اعظم کا حملہ اور پنجاب"

## (تفصیلات)

سکندر فیلقوس کا بیٹا تھا وہ 356 ق م میں پیدا ہوا، اور مشہور یونانی مفکر ارسطو کی شاگردی اور اتالیقی میں تربیت پائی۔ فیلقوس یونان کی ریاست مقدونیہ کا سربراہ تھا جو ان دنوں ایرانی بادشاہ داراب سے شکست کھانے کے بعد ایران کی باجگزار تھی۔ جب سکندر 336 ق م میں اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے ایرانی بادشاہ کو خراج دینا بند کر دیا، اور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ وہ مصر، ایشیائے کوچک، شام، فلسطین کو فتح کرنے کے بعد ایران کی طرف بڑھا اور وہاں کے کیانی تاجدار دارائے سوم کو شکست دے کر اس نے افغانستان اور ترکستان کو فتح کر لیا اور ہندوستان کے وہ علاقے جو ایران کے ماتحت تھے، سکندر ان پر قبضہ کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف بڑھا۔ خصوصاً پنجاب کے راجہ پورس نے دارا کی حمایت کی تھی اس لئے وہ اسے زیر کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

ان دنوں ٹیکسلا کی سلطنت خود مختار تھی جس کا سربراہ راجہ آمبھی تھا اس کے راجہ پورس کے ساتھ تعلقات اچھے نہ تھے۔ ٹیکسلا ان دنوں علم و ادب کا مرکز بھی تھا اور دور دراز کے طلباء وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ یہاں ویدوں اور علم کی اٹھارہ شاخوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ٹیکسلا ان دنوں مختلف مذاہب کے لوگوں کا مرکز بھی تھا یہ تجارتی مرکز بھی تھا اور فوجی لحاظ سے بھی بڑا اہم تھا۔ اور یہ وسطی ایشیا سے ہند میں داخل ہونے کا راستہ بھی تھا۔

سکندر اعظم افغانستان سے جلال آباد پہنچا اور اپنی فوج کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ کو اپنے

دو جرنیلوں ہسپاسین اور ہیرڈیکاس کے ماتحت ہندوستان روانہ کر دیا اور لشکر کے دوسرے حصہ کی خود کمان سنبھالی اور کوہ ہندوکش کو عبور کر کے چترال، باجوڑ اور سوات میں داخل ہوا اور منگلور (منگورہ) میں ڈیرے ڈال دیئے۔ پھر یہاں سے بالا ہی بالا سفر کرتا ہوا قلع ارنوس (رانی گٹ) پر قابض ہو گیا، اور علاقہ یوسف زئی کو روندتا ہوا دریائے لنڈا کے کنارے جا پہنچا اور میساگا کو فتح کر کے فروی 327 ق م میں دریائے سندھ کے کنارے "اوہند" کے مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کے لشکر کا پہلا حصہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سکندر نے اٹک کے مقام سے سولہ میل شمال کی جانب سے دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعے عبور کیا اور ٹیکسلا پہنچ گیا۔ جس کے راجہ آمبھی نے اس کا خیر مقدم کیا اور سکندر کے ساتھ دوستی گانٹھ لی، اور پورس پر حملہ کرنے کے لئے کہا اور اپنی امداد کا یقین بھی دلایا۔ جسے زیر کرنا سکندر کے مقاصد میں پہلے ہی شامل تھا۔

**راجہ پورس سے لڑائی:** پورس کی سلطنت دریائے جہلم اور چناب کے درمیان واقع تھی۔ جس میں جہلم، گجرات، چکوال، خوشاب اور سرگودھا کے علاقے شامل تھے۔ پورس بڑا مضبوط حکمران تھا۔ اس کے فوجی پورس کی طرح ساڑھے چھ فٹ کے قد کے لگ بھگ جوان تھے۔ اس کی فوج میں چار ہزار گھڑ سوار، پچاس ہزار پیادے ایک ہزار جنگی رتھ اور دو سو جنگی ہاتھی تھے۔ سکندر کی آمد اور راجہ آمبھی کی اطاعت کی خبر سن کر پورس نے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ سکندر نے برسات کی طغیانی کے باجود موقع پاتے ہی دریائے جہلم کو عبور کر لیا اور سکندر کی فوج نے جب ہاتھیوں کی فوج دیکھی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے، لیکن سکندر نے حکمت عملی سے کام لیا۔ اپنے فوجیوں کو حوصلہ دیا اور پورس کے بیٹے کی کمان میں حملہ آور دو ہزار سپاہیوں کے دستے کو مار بھگایا جس میں پورس کا بیٹا مارا گیا، پھر یونانی فوجوں نے ہاتھیوں پر ایک دم تیروں کی بارش کر دی۔ جس سے وہ پریشان اور حواس باختہ ہو کر اپنی ہی فوج پر چڑھ دوڑے، اور "پورس کے ہاتھی" کی اصطلاح نے جنم لیا جس سے مراد اپنے ہی لوگوں کو شکست دینا لیا جاتا ہے۔ بہرحال پورس بڑی بے جگری سے لڑا۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس جنگ میں سکندر کا "بیوس فیلس" نامی گھوڑا شدید زخمی ہوا اور چند روز کے بعد مر گیا۔ سکندر کو اپنے پیارے گھوڑے کی موت کا گہرا صدمہ ہوا اور اس کی یاد میں شہر "بیوسلفیا" آباد کیا جبکہ مصر میں اسکندریہ کا شہر بھی آباد کیا گیا۔ پورس جنگ میں گرفتار ہو کر سکندر کے سامنے آیا تو سکندر نے اس کی بہادری کی داد دی اور پوچھا کہ بولو تم سے کیا سلوک کیا جائے۔ پورس بولا۔ مجھ سے ویسا ہی سلوک کیا جائے جیسا کہ بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ سکندر اس کے دلیرانہ جواب سے بڑا خوش ہوا اور اس کی سلطنت پر اُسے بحال کر دیا۔ جس کے بعد پورس سکندر کا حلیف اور مددگار بن گیا۔

**سکندر کی پیش قدمی:** پھر سکندر نے دریائے چناب عبور کیا اور پنجاب کے علاقے میں قائم چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کیا۔ لیکن اُسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں کے لوگ بڑے بہادر ہیں اور مزاحمت کرنے میں لاثانی ہیں۔ یونانی مورخ بھی اہل پنجاب کی بہادری کا اعتراف کرتے ہیں۔ سکندر نے قبیلہ کھبتوئی کی راجدھانی جس کا صدر مقام ضلع گورداسپور میں سانگلہ (سیالکوٹ) تھا، کو فتح کیا پھر قبیلہ آساکانی کی سلطنت جو درہ مالاکنڈ کے شمال میں مساگا کے مقام پر تھی بھی فتح کرلی۔ اس طرح "ابھی سارا" (جہلم اور چناب کے درمیان پہاڑی علاقہ قبیلہ آباد شنوئی (شورکوٹ فیصل آباد اور جھنگ کے علاقوں پر مشتمل)، سمجھوتی (دریائے جہلم کے مشرق میں واقع تھی) اور ملوئی قبیلہ کی ریاستوں کو بھی یکے بعد دیگرے فتح کیا۔ کیونکہ ان ریاستوں کا آپس میں کوئی رابطہ اور اتحاد نہ تھا بلکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتی تھیں۔

جب سکندر دریائے بیاس پر پہنچا تو اس نے ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن یونانی فوج اب تھک چکی تھی۔ اس لئے اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

## سکندر کی واپسی

آخر فوج کی دل شکستگی نے سکندر کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ 326 ق م میں واپسی کے لئے تیار ہو گیا۔ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر سکندر کی فوج نے بارہ ہزار کشتیوں میں بیٹھ کر بہاؤ کے رُخ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ کر بمقام پٹالہ ڈیرے ڈال دیئے۔ یہاں بھی سکندر نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کوئٹہ کے راستے بولان کو عبور کر کے قندھار جا پہنچا اور یونانی مورخین کے مطابق یونانی امیرالبحر نیارکس کی سرکردگی میں سمندر کے راستے خلیج فارس میں دجلہ کے دہانے تک جا پہنچا۔ اور دوسرا حصہ سکندر کی سرکردگی میں مکران کے راستے سوسا اور بابل پہنچ گیا۔

**سکندر کی وفات:** سکندر نے 323 ق م میں 33 سال کی عمر میں بابل میں بخار سے وفات پائی، اور مرنے سے پہلے وصیت کی کہ اس کے ہاتھ کفن سے باہر رکھے جائیں تاکہ دنیا دیکھ لے کہ دنیا کا عظیم فاتح آخر کار خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

**پورس کی شکست کی وجوہات:** (1) یونانی فوجی قواعد میں پنجابی فوجیوں سے بہت بہتر اور زیادہ تربیت یافتہ تھے۔

2- یونانی سپاہی مسلسل فتوحات کے نشے میں بڑے حوصلے سے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے اور کسی مزاحمت کو خاطر میں نہ لاتے تھے کیونکہ ان کا عزم ساری دنیا کو زیرنگیں لانے کا تھا۔

3- یونانی دلیری اور شجاعت میں بھی مشہور تھے' اور انہیں اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔
4- یونانی فوج میں پیادہ اور سوار بڑے منظم تھے جبکہ پورس کی فوج میں زیادہ نفری ہونے کے باوجود نظم و ضبط کا معیار کمتر تھا۔ خصوصاً ہاتھیوں کی حواس باختگی کے بعد پورس کی فوجیں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکیں۔
5- یونانی فوجوں کا جرنیل دنیا کا فاتح تھا۔ جبکہ پورس بہادر تو تھا لیکن اس کی حیثیت مقامی تھی۔
6- اسلحہ بھی یونانیوں کے پاس زیادہ اچھا تھا۔ ہلکے تیر کمان' مگر بڑے مضبوط اور کارگر تھے۔ جبکہ ہندوستانی ہتھیار بھاری بھرکم اور وزنی زیادہ تھے۔ جن کو استعمال کرنے کے لئے زیادہ قوت کی ضرورت تھی۔
7- دلدلی علاقے میں جنگ ہو رہی تھی۔ پورس کی رتھ اور ہاتھی کیچڑ میں دھنس رہے تھے جبکہ یونانی گھڑ سوار پیادہ فوج کیچڑ میں بہتر طور پر لڑ سکتی تھی۔
8- یونانی فوج کے ساتھ مقامی ریاستوں مثلاً ٹیکسلا وغیرہ کے فوجی میں شامل ہو گئے تھے۔ جو "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" کے مصداق رول ادا کر رہے تھے۔

**سکندر کے حملے کے اثرات:** 1- اس حملے سے ہند کے ساتھ رابطے کے چار راستوں کا پتہ چلا۔ تین خشکی کے اور چوتھا بحری۔

2- اس رابطہ سے ہندوستان اور دوسری دنیا کے مابین رابطے کا آغاز ہوا۔
3- یونانی دانشور ہندوستان آئے اور انہوں نے ہندوستان کو تاریخ قلمبند کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔
4- بعض یونانی فوجی -- واپس نہ گئے اور پنجاب وغیرہ میں آباد ہو گئے' اور ان کی تہذیب نے ہندوستان پر گہرے اثرات مرتب کئے' اور چندر گپت موریہ اور اشوک کے عہد میں بھی یہ اثرات نظر آتے ہیں۔
5- سکندر کے حملہ کے بعد ملک گیر سلطنت کی بنیاد رکھنے کا خیال تقویت پکڑنے لگا' اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کی سلطنت عظیم سلطنت بن کر سامنے آتی ہے۔
6- ہندی علوم و فنون اور علم و ادب پر بھی یونانی حملے کے اثرات پڑے۔ یونانی طب کو آج بھی برصغیر میں یاد کیا جاتا ہے حالانکہ یہ اسلامی طب ہے۔ جو اہل اسلام کے ہندوستان پر حملوں کے بعد مروج ہوئی۔ لیکن طب کو چونکہ شروع میں یونان میں فروغ ملا تھا اس لئے طب یونانی کہا گیا۔

**مفتوحہ علاقوں کا انتظام:** سکندر نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو تین صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ (1) گندھارا (2) صوبہ سندھ (3) صوبہ پنجاب۔

سندھ میں سکندر نے اپنے ساتھی فیلپوس کو گورنر مقرر کیا۔ جبکہ پنجاب میں پورس کو

گورنر لگایا گیا۔ اور راجہ امبھی کو ٹیکسلا کی راجدھانی کا سربراہ قائم رکھا۔

**حملے کا اثر:** سکندر کے حملوں کا ہندوستان کی تہذیب پر کوئی فوری اثر نہیں پڑا ہندو مورخین کے بقول اس کی وجوہات کچھ اس طرح تھیں:

1- سکندر پنجاب سے ہی واپس چلا گیا اور اندرون ملک تک پہنچنے ہی نہیں پایا۔ اس کا حملہ تو محض سرحد پر ایک ڈاکے کی طرح تھا۔ جس کا اس زمانے کی کسی بھی کتاب میں ذکر تک نہیں ملتا۔

2- سکندر صرف 19 مہینے یہاں رہا۔ اور اس عرصہ میں بھی وہ جنگ میں ہی مصروف رہا۔ اس کے پیٹھ موڑتے ہی پنجاب میں ایک بغاوت ہوئی اور یونانی فوج تہ تیغ کر دی گئی۔

3- اس وقت بھی ہندوستان میں فلسفہ کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اور ہندوستانیوں کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ کہ یونانی تہذیب سے بھی وہ کچھ سیکھ سکتے تھے۔

لیکن اس حملہ کا اتنا اثر ضرور ہُوا کہ:

1- پنجاب کی خود مختار ریاستیں اور سلطنتیں اتنی کمزور ہو گئیں۔ کہ چندر گپت موریہ کے لئے پنجاب فتح کرنا بہت آسان ہو گیا۔

2- ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔

3- سکندر کی موت کے بعد شمال مغربی سرحد پر کئی یونانی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ جس سے یونانیوں اور ہندوستانیوں میں میل جول ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا سکھایا۔

**یونانی اور ہندوستانی تہذیب کا ایک دوسرے پر اثر:** یونانی اور ہندوستانی تہذیب کا ایک دوسرے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اور جو تھوڑا بہت پڑا بھی وہ سکندر کے حملے کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ سکندر کی موت کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان کی شمالی مغربی حد پر کئی یونانی ریاستیں قائم ہو گئیں تھیں، اور اس سے ہندوستانیوں اور یونانیوں کے درمیان زیادہ میل جول ہو گیا تھا۔ اس میل جول کی وجہ سے مندرجہ ذیل باتوں میں یونانیوں اور ہندوستانیوں کا ایک دوسرے پر اثر معلوم ہوتا ہے:

1- **مذہب:** جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یونانیوں کے مذہب نے ہندوستانیوں پر کوئی اثر نہیں کیا۔ بلکہ ان پر ہندو دھرم کا اثر ضرور پڑا۔ اور ان میں سے بہتوں نے ہندو نام اور مذہب اختیار کئے، اور ہندو رسم و رواج پر چلنے لگے۔

2- **سکے:** سکوں کے بارے میں ہندوستانیوں نے یونانیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستانی کاریگروں کو اعلیٰ سکے بنانے نہیں آتے تھے۔ ان کے سکے بہت بھدے ہوتے تھے۔ انہوں نے یونانیوں سے بہتر سکے بنانے کا طریقہ سیکھا۔

3- فنون: بہ حیثیت مجموعی تو یونانی فن تعمیر کا ہندوستان پر کچھ اثر نہیں پڑا- البتہ کنشک کے زمانہ میں جو عمارتیں تیار ہوئیں- ان میں یونانی فن تعمیر کی جھلک دکھائی پڑتی ہے-
فن تعمیر کی اس ملی جلی طرز کو یونانی بدھ طریقہ کہتے ہیں- کیونکہ بدھوں نے اپنی عمارتین اور مورتیاں بنانے میں یونانی سنگ تراشی کے اصولوں کو استعمال کیا-

4- علم نجوم: نجوم یعنی علم سیارگان ہندوؤں میں تو ویدوں کے زمانے سے موجود تھا- مگر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں نے اس علم میں یونانیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے-

**یونانی ریاستیں اور پنجاب:** 250 ق م کے قریب ہندوکش کے شمال میں سکندر اعظم کے بسائے ہوئے یونانی خودمختار ہو گئے اور اس طرح باختر کی مملکت وجود میں آئی، اس کا دارالسلطنت بلخ تھا- باختر کے بادشاہوں نے دوسری صدی ق م کے شروع میں شمال مغربی ہندوستان پر قبضہ کیا اور اس کے بعد مالوہ اور مگدھ کی طرف بڑھنا چاہا، مگر مملکت کے اندرونی فساد نے ان کو اس منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دیا- اسی فساد کی وجہ سے ان کی مملکت کے دو ٹکڑے ہو گئے- ایک کا مرکز بلخ رہا اور دوسری کا ساگلا (سیالکوٹ) ہو گیا- اس مشرقی مملکت کا سب سے مشہور بادشاہ میناندر تھا، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بدھ کا پیرو ہو گیا تھا-

**پارتھی، سک اور یویہ چی:** اسی دوران میں ایران کی پارتھی سلطنت ترقی کر رہی تھی- پارتھی، بادشاہ مشرق میں یونانیوں سے اور شمال میں خانہ بدوش سک قبیلوں سے برابر لڑتے رہے اور مغربی ہندوستان پر لشکر کشی کر کے انہوں نے سندھ کو فتح کیا- 135 ق م میں سک قبیلوں نے باختر کی یونانی مملکت کا خاتمہ کر دیا اور پھر افغانستان بلوچستان اور سندھ پر قبضہ کر لیا- پہلے سک سردار پارتھی بادشاہوں کے صوبہ داروں کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے، بعد کو خودمختار ہو گئے- شمال مغربی ہند کے یونانی ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور 58 ق م میں سک سردار اور آزیس اول شمال مغربی پنجاب کا بادشاہ ہو گیا- متھرا اور اجین ایک عرصے تک سک حکمرانوں کے مرکز رہے-

سک قبیلے وسط ایشیا میں اپنے وطن کو چھوڑنے پر اس لئے مجبور ہوئے تھے کہ خانہ بدوشوں کی ایک قوم نے جسے یویہ چی کہتے ہیں اور جو چین کے شمالی مغربی صوبہ کان سو میں آباد تھی، ہن قبیلوں سے شکست کھائی (165 ق م) اور نئی چراگاہوں کی تلاش میں گوبی کے ریگستان کا چکر لگا کر سردریا کے شمال میں پہنچی، جہاں سک آباد تھے، اور وہاں سے انہیں نکال بھگایا- پندرہ بیس برس بعد، ؤوسن قبیلے نے، جسے یویہ چی نے مغرب کی طرف آتے ہوئے شکست دی تھی بدلہ لینے کے لئے ان پر حملہ کیا- یویہ چی اس کی تاب نہ لا سکے اور سردریا کی شمالی چراگاہوں کو چھوڑ کر وہ آمودریا

کی وادی میں آباد ہو گئے۔ یہاں کشان قبیلے کے سرداروں نے پوری قوم کو اپنے ماتحت متحد کیا، اور اس تنظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ یو یہ چی نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ کنشک کے عہد میں (78 تا 122 یا 122 تا 162ء) وسط ایشیاء، کشمیر، افغانستان، بلوچستان اور قریب قریب شمالی ہندوستان پر کشانوں کا قبضہ ہو گیا۔ شمالی ہندوستان پر ان کی حکومت کچھ اوپر سو برس تک رہی۔

کنشک کا چینی سلطنت سے بھی مقابلہ ہوا، جس کے انتہائی عروج کا زمانہ یہی تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں چینیوں نے کاشغر اور ختن فتح کیا تھا۔ مگر جب یو یہ چی کی طاقت بڑھی تو انہیں ان علاقوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ 83ء میں چینی سپہ سالار پان چاؤ نے وسط ایشیا پر لشکر کشی کی اور کئی سال تک کشانوں سے لڑتا رہا۔ اسی سلسلے میں چینی فوجیں شمالی ایران اور بحر کیسپین کے مشرقی کناروں تک پہنچیں۔ ایک مقابلے میں جو 100ء کے لگ بھگ ہوا کنشک نے چینی سپہ سالار کے ہاتھوں شکست کھائی اور مجبور ہو کر چینی شہنشاہ کو خراج دینے کا وعدہ کیا، لیکن پان چاؤ کے مرنے کے بعد چینیوں کی تقدیر نے پلٹا کھایا اور کنشک نے کاشغر اور ختن دوبارہ حاصل کر لیا۔

باب 6

# ہندوستان کے حکمران

## خاندانِ موریہ

(322ق م سے 185ق م تک)

ہندوستان کی تاریخ میں موریہ خاندان سب سے پہلے خاندان ہے۔ جس نے ایک بڑی زبردست سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کا بانی چندر گپت تھا اور اس نے اپنی ماں مورا یا مرا کے نام پر اس خاندان کا نام موریہ رکھا۔ چندر گپت ایک زبردست فرمانروا تھا۔ لیکن اس کا پوتا اشوک اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تصور کیا جاتا ہے۔

**چندر گپت موریہ (322 سے 298ق م):** چندر گپت موریہ مگدھ کے نند خاندان کا ایک شہزادہ تھا لیکن اس کی ماں مرا کسی نیچ ذات کی ایک عورت تھی۔ کسی خاص وجہ سے نند خاندان کا آخری بادشاہ چندر گپت سے ناراض ہو گیا اور اسے بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑی۔ اِس جلاوطنی کے زمانہ میں وہ پنجاب میں بھی آیا' اور کہتے ہیں کہ وہاں اس نے سکندر کی واپسی اور موت کے بعد پنجاب میں یونانی حکومت کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہوئی۔ چندر گپت نے اس بغاوت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے لائق اتالیق اور وزیر چانکیہ کی مدد سے ایک لشکر جرار اکٹھا کر کے پنجاب میں مقیم یونانی افواج کو شکست دی اور پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ مگدھ پر حملہ آور ہوا' اور آخری نند بادشاہ (دھن نند) کو تخت سے اتار کر خود بادشاہ بن گیا۔ پاٹلی پتر اس کا پایہ تخت تھا۔ چندر گپت نے اپنی ماں کے نام پر خاندان کا نام موریہ رکھا۔ رفتہ رفتہ اس نے تمام شمالی ہندوستان کی ریاستوں کو زیر کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی' اور اس طرح سے وہ ہندوستان کا پہلا شہنشاہ ہوا۔

**سیلوکس کا حملہ:** سیلوکس سکندر کا ایک جرنیل تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت کے ایشیائی حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ 305 ق م میں اُس نے سندھ پار کر کے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن چندر گپت نے اُسے شکست دی اور آپس میں صلح ہو گئی۔ سیلوکس نے

موجودہ بلوچستان اور افغانستان کا علاقہ چندر گپت کو دے دیا' اور اپنی لڑکی کی شادی بھی اس سے کر دی۔ چندر گپت نے اس کے بدلے میں 500 ہاتھی اس کی نذر کیئے۔ سیلوکس نے ایک یونانی سفیر میگستھنیز کو بھی اس کے دربار میں بھیجا۔

**سلطنت کی وسعت:** اس طرح سے چندر گپت کی سلطنت بنگال سے لے کر ہندوکش تک اور ہمالیہ سے نربدا تک پھیل گئی۔ اس میں موجودہ افغانستان' پنجاب' یو۔ پی' بہار (مگدھ)' بنگال اور گجرات کاٹھیاواڑ کے علاقے شامل تھے۔

## تاریخی ماخذ

چندر گپت کے عہد حکومت کے مندرجہ ذیل تاریخی ماخذ ہیں:

I- **میگستھنیز کی تصنیف:-** میگستھنیز نے چندر گپت کے عہد حکومت کے حالات ایک کتاب میں قلمبند کئے تھے۔ وہ کتاب "انڈکا" تو گم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے بے شمار اقتباسات دوسرے یونانی مورخوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے چندر گپت کے زمانے کا کافی پتہ چلتا ہے۔

2- **کوٹلیہ کا ارتھ شاستر:** چندر گپت کے وزیر کوٹلیہ یعنی چانکیہ نے حکومت کرنے کے طریقوں پر ایک کتاب "ارتھ شاستر" نامی لکھی ہے۔ یہ بھی اس زمانے کا بڑا بھاری ماخذ ہے۔

3- **مُدّرا راکشس:** یہ ایک پولٹیکل ڈرامہ ہے۔ جو پانچویں صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا۔ اس سے نند خاندان کی بیخ کنی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چندر گپت کے زمانہ کے قابل اعتبار ماخذ پہلے دو ہی ہیں۔

چندر گپت کے دربار میں متعینہ یونانی سفیر (Megasthenes) میگستھنیز نے چندر گپت کے انتظام حکومت اور اس زمانہ کی مجلسی حالت کے متعلق لکھا ہے کہ چندر گپت موریہ ہندوستان کا پہلا شہنشاہ تھا۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ اس کا انتظام سلطنت ہے۔ جو اس نے نہایت قابلیت سے سرانجام دیا۔ اس کے عہد میں ملک میں ہر طرح امن وامان رہا۔ کوٹلیہ اس کا وزیر اور صلاح کار تھا جسے چانکیہ بھی کہا جاتا ہے۔

I- **عام حکومت:** چندر گپت کی عام حکومت کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں قابل ذکر ہیں (1) زراعت کی ترقی کے لئے باقاعدہ محکمہ آبپاشی قائم تھا۔ تالاب اور نہریں بنی ہوئی تھیں۔ پیداوار کا 1/4 حصہ لگان لیا جاتا تھا۔ اس لگان کے علاوہ اور بھی کئی ٹیکس تھے۔ جن میں سب سے مشہور فروخت شدہ اشیاء پر محصول تھا۔ (2) سڑکوں کا بھی بہت اعلیٰ انتظام تھا اور ان کے

کنارے میلوں کے نشان لگے ہوئے تھے۔ سڑکوں کی وجہ سے تجارت کو بہت فروغ حاصل تھا۔ (ایک سڑک پاٹلی پتر سے ٹیکسلا تک جاتی تھی۔)(3) محکمہ جاسوسی بڑا زبردست اور منظم تھا۔ اس میں عورتیں بھی کام کرتی تھیں، اور بادشاہ کو سلطنت کے تمام حالات کی خبر ملتی رہتی تھی (4) قانون فوجداری بہت زیادہ سخت تھا۔ معمولی معمولی جرموں پر ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اکثر قصوروں کے لئے سزائے موت دی جاتی تھی، اور جرم کا اقبال کروانے کے لئے ملزموں کو سخت ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں۔

2- صوبجاتی حکومت: سلطنت کئی صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبہ ایک صوبہ دار کے ماتحت تھا۔ جو عام طور پر شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ صوبے ضلعوں اور گاؤں میں تقسیم تھے۔ (ضلع کے اعلیٰ افسر کو ستھانک اور گاؤں کے بڑے آدمی کو گوپ کہتے تھے)

3- پاٹلی پتر کا حال: مگدھ کا دارالخلافہ پاٹلی پتر تھا۔ جو موجودہ شہر پٹنہ کے قریب آباد تھا۔ یہ شہر بڑا عالی شان تھا۔ اور دریائے گنگا اور سون کے مقام اتصال پر واقع تھا۔ اس کی لمبائی نو میل اور چوڑائی کوئی 2/11 میل تھی۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کی ایک مضبوط دیوار تھی۔ جس میں 64 دروازے اور 570 برج تھے۔ شہر کے اِرد گرد ایک چوڑی اور گہری خندق تھی۔ جس میں دریائے سون کا پانی بھرا رہتا تھا۔ شاہی محل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ لیکن خوبصورتی اور شان و شوکت میں لاثانی تھا۔

4- میونسپل انتظام: شہر پاٹلی پتر کے میونسپل انتظام کے لئے تیس ممبروں کی ایک کمیٹی تھی۔ جو چھ بورڈوں میں منقسم تھی۔ ان بورڈوں کے فرائض حسب ذیل تھے:

1- شہر کی صنعت و حرفت اور دستکاری کی نگرانی کرنا۔
2- اجنبیوں کے آرام و آسائش کا انتظام کرنا۔
3- پیدائش اور موت کا حساب رکھنا۔
4- تجارت کا انتظام، تول کے بٹوں اور ماپ کے پیمانوں کی جانچ پڑتال کرنا۔
5- کارخانوں کی دیکھ بھال۔
6- اشیائے فروخت پر دس فیصدی ٹیکس اکٹھا کرنا۔

شہر کے عام انتظام کے لئے مثلاً صفائی، سڑکوں، پانی کی بہم رسانی وغیرہ کے لئے تمام میونسپل کمشنر مجموعی طور پر ذمہ دار تھے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی بڑے بڑے شہروں کا انتظام بھی میونسپل کمیٹیاں ہی کرتی ہوں۔ گاؤں کا انتظام پنچائتیں کرتی تھیں۔

5- **فوجی انتظام:** چندر گپت کا فوجی انتظام بھی بڑا اعلیٰ تھا- کل فوج قریباً سات لاکھ تھی- اس میں چھ لاکھ پیادہ تیس ہزار سوار، نو ہزار ہاتھی اور تقریباً آٹھ ہزار رتھ تھے- تمام فوج کو نقد تنخواہ ملتی تھی- فوج کے انتظام کے لئے تیس ممبروں کا ایک جنگی محکمہ تھا- جس کے چھ حصے تھے- ان کے ذمہ (1) پیادہ فوج (2) رسالہ (3) بحری بیڑا (4) جنگی رتھ (5) جنگی ہاتھیوں اور (6) باربرداری اور رسد رسانی کا انتظام (7) گذرئے اور شکاری تھے-

**مجلسی حالت:** چندر گپت کے زمانہ میں لوگ تندرست اور بہادر تھے- ایک دوسرے پر اعتبار کرتے تھے- تمام عہد و پیمان زبانی ہوتے تھے- گواہ اور رسید کی کوئی ضرورت نہ تھی- مقدمہ بازی کا نام بھی نہ تھا- چوری کی وارداتیں بہت کم تھیں- عورتیں باعصمت اور پاکدامن تھیں اور رعایا خوشحال تھی- لوگ اپنے تیوہار بڑی شان و شوکت سے مناتے تھے- ہندو سوسائٹی سات جماعتوں میں تقسیم تھی (1) فلاسفر یعنی عالم فاضل (2) مشیر یا صلاح کار (3) سپاہی لوگ (4) کاشتکار (5) خفیہ پولیس (6) تاجر اور کاریگر (7) گذریے اور شکاری-

**میگستھینز:** میگستھینز ایک یونانی سفیر تھا- جسے سلوکس نے چندر گپت موریہ کے دربار میں بھیجا- وہ کافی عرصہ پاٹلی پتر میں رہا- اور اس نے چندر گپت کے عہد حکومت کے حالات قلمبند کئے- جو اس زمانہ کی تاریخ کے بہترین ماخذ سمجھے جاتے ہیں- بدقسمتی سے اس کی اصلی تصنیف تو گم ہو چکی ہے، لیکن اس کے کئی اقتباسات دوسرے یونانی مورخوں کی کتابوں میں ملتے ہیں اور ان کے مطالعہ سے اس زمانہ کے حالات کا کافی پتہ چلتا ہے-

**چانکیہ:** چانکیہ چندر گپت موریہ کا اتالیق اور وزیر تھا- وہ ذات کا برہمن تھا اور بڑا زبردست اور اعلیٰ درجہ کا سیاست دان تھا- اس کے دو اور نام کوٹلیہ اور وشنو گپت بھی ہیں- راجہ نند نے ایک بار اس کی بے عزتی کی تھی- چنانچہ اس نے بدلہ لینے کی قسم کھائی- چندر گپت نے اسی کی مدد سے پنجاب فتح کیا اور پھر مگدھ کے نند بادشاہ کو معزول کر کے تخت حاصل کیا تھا- چانکیہ اپنی دھن کا بڑا پکا تھا اور اسے سازش کرنے میں کمال حاصل تھا- اگرچہ اسے عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا ہو سکتے تھے- تاہم وہ غریبانہ زندگی بسر کرتا تھا اور راجہ کے محل کے پاس ایک مٹی کی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا- اس نے علم سیاسیات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے- جس کا نام ارتھ شاستر ہے- اس سے چندر گپت کے عہد حکومت کا پتہ چلتا ہے-

# اشوک ASOKA

## (273 ق م سے 232 ق م)

مہاراجہ اشوک موریہ خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ تھا۔ وہ چندر گپت کا پوتا اور بندو سار کا بیٹا تھا۔ اس نے کوئی چالیس سال حکومت کی۔ بادشاہ بننے سے پیشتر وہ ٹیکسلا اور اوجین کے صوبوں کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ اور اس نے اپنے حسن انتظام اور لیاقت کا سکہ جما دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ اپنے باپ کا سب سے بڑا لڑکا نہ تھا۔ تاہم بندو سار نے اس کو سب سے لائق سمجھ کر اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ اس کی رسم تاجپوشی کسی وجہ سے تخت نشینی کے چار سال بعد ادا ہوئی۔ اس کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ کلنگ کی لڑائی ہے، لیکن اشوک کا نام تاریخ میں بدھ مت کی اشاعت کے لئے ہمیشہ مشہور رہے گا۔ کیونکہ اس کی کوششوں سے یہ مذہب عالمگیر بن گیا۔

**کلنگ کی فتح (261 ق م):** اشوک کی تخت نشینی کے وقت تقریباً تمام ہندوستان پر موریہ حکومت تھی، لیکن کلنگ (اڑیسہ) کا علاقہ جو خلیج بنگال کے ساحل کے ساتھ دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان واقع تھا۔ اشوک کی سلطنت میں شامل نہ تھا۔ اشوک نے اِسے فتح کرنے کے لئے 261 ق م میں اس پر چڑھائی کی اور ایک خونریز جنگ کے بعد جس میں کوئی ایک لاکھ آدمی مارے گئے اور ڈیڑھ لاکھ گرفتار ہوئے۔ وہ اس علاقہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خونریز نظارے کا اشوک کے دل پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ اُس نے آئندہ جنگ سے توبہ کی، اور وہ بدھ دھرم کا پیرو کار بن گیا اور اس کی کوششوں سے بدھ دھرم ایک عالمگیر مذہب بن گیا۔ اس لحاظ سے کلنگ کی لڑائی دنیا کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

**وسعت سلطنت:** اشوک کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ کوہ ہندوکش سے لے کر بنگال تک سارا علاقہ اس کے قبضہ میں تھا، اور جنوب میں اس کی حد میسور تک پھیلی ہوئی تھی۔ غرضیکہ تھوڑے سے جنوبی حصے کو چھوڑ کر سارا ہندوستان اور افغانستان اس کی قلمرو میں شامل تھا۔

**اشوک کا انتظام سلطنت:** اشوک کا انتظام سلطنت یوں تو اپنے دادا چندر گپت کے نظام کی طرح ہی تھا۔ لیکن ایک بہت بڑا فرق تھا اور وہ یہ کہ اس کے طرز حکومت میں نرمی اور رحم دلی بہت زیادہ تھی۔

اشوک اپنی رعایا کے ساتھ پدرانہ سلوک کرتا تھا۔ غریبوں یتیموں اور بیوگان کی پرورش

شاہی خزانہ سے ہوتی تھی۔ مسافروں کے آرام کا خاص خیال تھا۔ کوئیں کھدوائے گئے۔ دھرم شالائیں اور سرائیں تعمیر کی گئیں۔ سڑکوں پر سایہ دار درخت لگوائے گئے اور بے شمار جگہوں پر پانی کا بندوبست کیا گیا۔

اشوک شاید دنیا میں پہلا بادشاہ گزرا ہے۔ جس نے سرکاری خرچ پر نہ صرف انسانوں کے لئے ہسپتالوں بنوائے بلکہ حیوانات کے لئے بھی شفاخانے قائم کئے۔ اشوک نے اپنی رعایا کے اخلاق کو بہتر بنانے کے لئے افسر مقرر کر رکھے تھے۔ جو دیہات میں دورہ کرکے رعایا کو اُن کے فرائض بتلاتے اور ان کے چال چلن کی نگرانی کرتے تھے۔ ان افسران کو مہاماتر کہتے تھے۔ مختصریہ کہ اشوک کا انتظام سلطنت بڑا قابل تعریف تھا۔

**اشوک کا دھرم LAW OF PIETY:** کلنگ کی لڑائی کے چند سال بعد اشوک نے اپنی سلطنت میں جا بجا چٹانوں اور میناروں پر احکام کندہ کرائے۔ ان میں سے کچھ تو سرکاری احکام ہیں اور اکثر دھرم کے متعلق ہدایات ہیں۔ اشوک کے خیال میں دھرم مندرجہ ذیل باتوں پر مشتمل تھا:

1- **بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے مہربانی:** انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ماں باپ و استادوں کی عزت کرے، اور اپنے ماتحتوں، ملازموں اور غلاموں وغیرہ کے ساتھ مہربانی اور شفقت کے ساتھ پیش آئے۔

2- **اہنسا:** یعنی کسی جاندار کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔

3- **سچائی:** یعنی ہمیشہ سچ بولنا چاہئے۔

4- مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ اشوک نے دوسروں کے مذہب کی عزت کرنے اور خیرات کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔

**بدھ مذہب کی اشاعت:** اشوک نے کلنگ کی لڑائی کے بعد بدھ دھرم اختیار کر لیا اور اس کے پھیلانے میں ساری طاقت صرف کر دی۔ اس نے اس کی اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے:

1- **بدھ دھرم شاہی مذہب:** اشوک نے بدھ مذہب کو شاہی مذہب قرار دیا۔ جس سے اس کی رعایا کو یہ مذہب اختیار کرنے کی ترغیب ہوئی۔

2- **مذہبی احکام کندہ کرانا:** اشوک نے بدھ دھرم کے اصولوں کو پتھروں کے ستونوں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر کندہ کروا دیا اور ان ستونوں کو اپنی سلطنت کی مشہور گزرگاہوں اور شاہراہوں پر نصب کروا دیا۔ تاکہ جو لوگ وہاں سے گزریں انہیں پڑھ سکیں۔

3- مہاماتروں کا تقرر: ایک جماعت سرکاری افسروں کی مقرر کی۔ جن کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا کہ وہ لوگوں میں بدھ دھرم کا پرچار کریں اور ان کے چال چلن کی نگرانی کریں۔ ان افسروں کو دھرم مہاماتر کہتے تھے۔

4- مثال قائم کرنا: اشوک نے اپنی مثال قائم کی۔ اس نے خود بھی اہنسا کے۔ اصول کو تقویت دینے کے لئے لڑائیاں بند کر دیں۔ شاہی شکار کا محکمہ توڑ دیا۔ جانوروں کا ذبح کیا جانا قطعاً ممنوع قرار دیا گیا اور ان کی حفاظت کے لئے کئی قانون بنائے گئے۔

5- اشوک کا بھکشو بننا: اشوک خود کچھ عرصہ کے لئے بھکشو رہا۔ اور اپنے گورو (اُپ گپت) کے ساتھ اس نے بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی، اور راستے میں بدھ مذہب کا وعظ کرتا گیا۔ وہ پاٹلی پتر سے روانہ ہوا اور اُس نے لمبنی باغ (جہاں بدھ پیدا ہوا تھا) کپل وستو (جہاں اس نے بچپن کا زمانہ گزارا)۔ گیا (جہاں اسے گیان ہوا)۔ سار ناتھ (جہاں اسے پہلا اُپدیش دیا) اور کشی نگر (جہاں بدھ نے وفات پائی) کی یاترا کی۔

6- وہاریں بنوانا: اشوک نے بدھ بھکشوؤں اور بھکشنیوں کے لئے ملک میں جابجا وہار بنوائے جو بدھ مذہب کی اشاعت کا بڑا بھاری ذریعہ ثابت ہوئے۔

7- بدھ مت کی کونسل: بدھ دھرم میں جو اختلاف آ چکے تھے۔ ان کا فیصلہ کرنے کے لئے اس نے بدھ عالموں کی ایک کونسل پاٹلی پتر میں بلائی۔ اس میں کوئی ایک ہزار بدھ شامل تھے۔ یہ بدھ مت کی تیسری کونسل تھی۔

8- غیر ممالک میں پرچارک: اشوک نے بدھ دھرم کی اشاعت کے لئے غیر ممالک میں بھی اپنے پرچارک بھیجے، چنانچہ، لنکا، مصر، شام اور مقدونیہ وغیرہ میں جاکر بھکشوؤں نے پرچار کیا۔ اشوک کے لڑکے مہندر (جسے بعض مورخ اشوک کا بھائی بتاتے ہیں) اور لڑکی (یا بہن) سنگھمترا نے لنکا میں بدھ مت کا پرچار کیا۔ اور وہاں کے راجہ نے بدھ دھرم اختیار کر لیا۔ اشوک کی اِن کوششوں سے بدھ مذہب ایشیا، افریقہ اور یورپ تین براعظموں میں جا پہنچا۔

اشوک کی عمارتیں: اشوک کو عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کئی شہر، ستوپ، وہاریں اور ستون بنوائے۔ اس نے کشمیر کی راجدھانی سرینگر کی بنیاد ڈالی اور ایک شہر نیپال میں بسایا۔ پاٹلی پتر میں اشوک کا محل نہایت عالی شان تھا۔

اشوک کا تاریخ میں درجہ: اشوک تاریخ میں ایک بہت بڑا بادشاہ ہوا ہے۔ وہ بڑا نیک، پارسا اور رعایا پرور تھا۔ اس کے خیال میں سب سے بڑی فتح دھرم کی فتح تھی۔ وہ بڑا بردبار تھا اور دوسرے مذاہب کو بھی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جہاں اس نے

اپنی رعایا کی بہتری اور بہبودی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ وہاں غریب اور بے زبان حیوان بھی اس کی شفقت سے محروم نہ رہے۔ فی الواقع اشوک تاریخ میں اس لحاظ سے لاثانی ہے کہ کسی اور بادشاہ نے اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے اس قدر کام نہیں کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بدھ مت کو عالمگیر مذہب بنا دیا۔ لیکن اشوک کی اس مذہبی پالیسی نے فوجی سپرٹ کو کمزور کر دیا۔ جس سے موریہ خاندان کا زوال نزدیک آگیا۔

اشوک کی موت کے بعد موریہ خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور آخری کار 185 ق م میں موریہ خاندان کے آخری راجہ برہدرتھ اپنے سپہ سالار پشیہ متر کے ہاتھوں قتل ہوا اور موریہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

## اشوک کے کتبے

## (EDICTS OF ASOKA)

اشوک نے بدھ دھرم اختیار کرنے کے بعد اپنی رعایا اور ملازموں کی ہدایت کے لئے کئی فرمان جاری کئے، اور انہیں چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کروا دیا۔ ان میں اس کی سوانح عمری، دھرم کی تشریح اور عہد حکومت کے کارنامے درج ہیں، اور ان طریقوں کا بھی ذکر ہے۔ جو اس نے بدھ مت کی اشاعت کے لئے اختیار کئے۔ یہ کتبے اشوک کی وسیع سلطنت کے حصوں میں بڑی بڑی شاہراہوں پر ملتے ہیں، اور ان میں سے اس وقت تک کوئی چالیس کے قریب دریافت ہو چکے ہیں۔ شمالاً جنوباً یہ کتبہ جات ہمالیہ سے شروع ہو کر میسور تک اور شرقاً غرباً خلیج بنگال سے شروع ہو کر بحیرہ عرب تک ملتے ہیں اور مختلف علاقوں کی مقامی زبان میں لکھے ہوئے ہیں تاکہ لوگ انہیں آسانی سے سمجھ سکیں۔

**تاریخی اہمیت:** تاریخی لحاظ سے یہ کتبہ جات بڑے اہم ہیں (1) ان سے اشوک کی سلطنت کی وسعت معلوم ہوتی ہے (2) اس کے طرزِ حکومت اور سوانح عمری کا بھی پتہ چلتا ہے، اور (3) یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے بدھ دھرم کی اشاعت کے لئے کیا طریقے اختیار کئے۔ مختصر یہ کہ یہ کتبہ جات اس کے زمانہ کے حالات کے بڑے بھاری ماخذ ہیں، اور اشوک کے یہ کتبے کئی مقامات پر ملے ہیں۔ مثلاً شہباز گڑھی واقع ضلع پشاور میں۔ مانسہرہ واقع ضلع ہزارہ میں۔ کالسی واقع ضلع ڈیرہ دون، میں، گرنار، واقع گجرات کاٹھیاواڑ میں۔ دھولی واقع ضلع پوری میں، سانچی واقع ریاست بھوپال میں۔ بنارس کے نزدیک سارناتھ میں اور میسور میں وغیرہ وغیرہ۔

# کشن خاندان اور کنشک

## (THE KUSHANS AND KANISHKA)

**کشن:** کوئی دو ہزار برس ہوئے کہ مغربی چین میں یوچی (Yeuh-chi) نام ایک خانہ بدوش اور جنگجو قوم آباد تھی۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اس قوم کو چینیوں نے اپنے ملک سے نکال دیا۔ اور یہ لوگ باختریہ اور کابل کی راہ ہندوستان کو چلے آئے۔ اس قوم کی سب سے مشہور شاخ کا نام کشن تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے شروع میں کشن قبیلے نے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر اپنا تسلط جما لیا اور شک قوم کو جو وہاں آباد تھی نکال دیا۔ اس خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک تھا۔

**کنشک 120 سے 163ء:** کنشک کشن خاندان کا تیسرا اور سب سے زبردست فرمانروا تھا۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب تخت نشین ہوا۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ وہ 120ء میں بادشاہ بنا اور کوئی چالیس سال حکمران رہا۔

**کنشک کی فتوحات:** کنشک کو ملک گیری کی بڑی ہوس تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لڑائیوں میں ہی گزارا۔ سب سے پہلے اس نے کشمیر فتح کیا اور پھر چینیوں کے خلاف اس نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ اس کے بعد اس نے ختن، کاشغر اور یارقند کے حکمرانوں کو اپنے زیر کیا۔ اس طرح سے اس کی سلطنت کی حد شمال میں کاشغر اور بخارا سے لے کر متھرا تک اور جنوب میں دریائے نربدا تک جا پہنچی۔

کنشک کا دارالخلافہ پرش پور تھا۔ جسے آجکل پشاور کہتے ہیں۔ یہ شہر کنشک نے ہی بسایا تھا۔

**کنشک کا مذہب:** کنشک کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی مہاراجہ اشوک کی طرح بدھ مذہب کا زبردست پیروکار اور مبلغ تھا۔ اور اس نے بدھ دھرم کو پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اشوک کی طرح اس نے بھی مذہبی اصولوں کا فیصلہ کرنے کے لئے بدھ مت کے عالموں کی ایک کونسل بلائی۔ یہ چوتھی کونسل تھی اور اس کا اجلاس کشمیر میں سری نگر کے قریب ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے دور دراز ممالک میں پرچارک بھیجے۔ جس سے یہ مذہب چین، جاپان اور منگولیا وغیرہ میں بھی پھیل گیا۔ انہیں وجوہات سے بدھ مورخ اسے اشوک ثانی مانتے ہیں۔

**بدھ مذہب کی تقسیم:** کنشک کے زمانے میں بدھ مذہب دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا (1) ہین یان (2) مہایان۔ ہین یان فرقہ کے لوگ پرانے بدھ مت کے پیروکار

تھے۔ وہ بدھ کو صرف ایک گورو کا درجہ دیتے تھے، اور مورتی پوجا کے خلاف تھے، لیکن مہایان فرقہ کے لوگوں نے بدھ کو ایک دیوتا کا درجہ دے دیا۔ اور اس کی مورتیوں کی پرستش شروع کر دی۔ کنشک خود مہایان بدھ مت کا پیرو تھا۔

**علم و ادب:** کنشک بڑا علم دوست تھا، اور وہ عالموں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ آیوروید کا مشہور فاضل رُک اس کا درباری حکیم تھا اور بدھ مت کے مشہور عالم "ناگارجن" اور "اسوگھوش" بھی غالباً اسی زمانہ میں آئے ہیں۔

کنشک کو عمارتیں بنوانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس نے پشاور میں ایک بڑا اونچا مینار بنوایا۔ متھرا اور ٹیکسلا میں بھی کئی ستوپ اور وہاریں بنوائیں۔ گندھارا (موجودہ پشاور اور ٹیکسلا کا علاقہ) کے فن سنگ تراشی کو اس کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

**کنشک کی وفات:** روایت ہے کہ کنشک کی لگاتار جنگوں سے لوگ اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ ایک دن جب کہ کنشک بخار سے بیمار تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کو اس کی چارپائی پر رضائی سے اس طرح لپیٹ دیا کہ اس کا دم گھٹ گیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔

## گپت خاندان اور ہون قوم

**گپت خاندان:** 320ء میں ہندوستان میں ایک نیا خاندان شروع ہوا۔ جس نے ایک زبردست اور مضبوط سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کا نام "گپت خاندان" تھا۔ اس نے قریباً دو صدیوں تک حکومت کی، اور اس عہد میں ہندوستان نے نہ صرف پولیٹکل جاہ و حشمت بہ درجہ کمال پیدا کی بلکہ علم و فن میں وہ شاندار ترقی کی کہ آج تک ہندوؤں کے لئے باعث فخر ہے۔ اسی وجہ سے اس عہد کو ہندو تاریخ کا سنہری زمانہ گنا جاتا ہے۔ اس خاندان کا بانی چندر گپت تھا۔ لیکن سب سے مشہور بادشاہ سمدر گپت اور چندر گپت وکرمادتیہ تھے۔

**چندر گپت اول 320ء سے 330ء:** چندر گپت اول گپت خاندان کا بانی تھا۔ وہ مگدھ میں کسی ایک چھوٹی سی ریاست کا راجہ تھا اس کی شادی لچھوی قوم کی ایک شہزادی (کمار دیوی) سے ہوئی تھی۔ چونکہ یہ قوم بڑی زبردست اور معزز تھی۔ اس لئے چندر گپت کی طاقت میں بہت اضافہ ہو گیا اور اسے اپنی سلطنت کو بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔ اس نے پاٹلی پتر پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ 320ء میں اس نے اپنے نام سے ایک نیا سمت چلایا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سمدر گپت بادشاہ بنا۔

## سمدر گپت (SAMUDRAGUPTA)

(330ء سے 375ء)

سمدر گپت اپنے باپ چندر گپت اول کی وفات پر بادشاہ بنا۔ وہ ہندو راجاؤں میں نہایت نامور اور قابل ہوا ہے۔ اسے جنگ و جدل کا بے حد شوق تھا۔ انگریزی مورخ اس کو انڈین نپولین کا خطاب دیتے ہیں۔ کیونکہ اس بادشاہ نے تقریباً سارے ہندوستان کو از سرنو فتح کیا۔

فتوحات:

1- سب سے پہلے اس نے تمام شمالی ہندوستان کو فتح کر کے ایک مرکزی سلطنت کے ماتحت کر دیا۔

2- اس کے بعد اس نے وسط ہند اور اُڑیسہ کی جنگلی قوموں کو اپنے مطیع کیا۔

3- ان فتوحات سے فارغ ہو کر اس نے دکن پر فوج کشی کی اور وہاں کے بہت سے راجاؤں کو اپنے تابع فرمان بنا کر واپس اپنی راجدھانی پاٹلی پتر کو لوٹ آیا۔ اس نے جنوبی ہند کو اپنی سلطنت میں نہیں ملایا بلکہ صرف وہاں سے خراج لینا منظور کیا۔ دکن کی فتح اس کے عہد کا نہایت شاندار کارنامہ ہے۔

4- سمدر گپت کے اس قدر جاہ و جلال کو دیکھ کر سرحد کے بہت سے ملکوں مثلاً آسام۔ نیپال وغیرہ نے اپنے آپ اس کی اطاعت قبول کر لی اور کئی اور ملکوں نے دوستانہ عہد نامے بھی کئے۔

ان شاندار فتوحات کی یادگار میں سمدر گپت نے اشو میدہ یگیہ کیا اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔ سمدر گپت نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا جرنیل بلکہ وہ علوم و فنون میں بھی غیر معمولی دسترس رکھتا تھا۔ اسے علم موسیقی کا بڑا شوق تھا اور وہ وینا اور ستار بجانے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر بھی تھا۔

## چندر گپت وکرمادتیہ

## (CHANDRAGUPTA VIKRAMADITYA)

(375ء سے 413ء)

چندر گپت وِکرمادتیہ سمدر گپت کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کی طرح جری اور بہادر تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی "وکرمادتیہ" کا لقب اختیار کیا۔

**فتوحات:** اس نے مالوہ، گجرات، اور کاٹھیاواڑ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا اور وہاں کے شک حکمرانوں کو شکست فاش دی۔ گجرات کی فتح سے چندر گپت کی سلطنت بحیرہ عرب تک پھیل گئی، اور کئی بندرگاہوں کے ہاتھ آجانے سے تجارت خوب چمک اٹھی۔ مغربی ممالک کے ساتھ تجارتی رابطہ و اتحاد زیادہ مضبوط ہو گیا، اور ملک میں دولت بڑھنے لگی۔ سلطنت کے بڑھ جانے کی وجہ سے پاٹلی پتر کی بجائے اجودھیا کو دارالسلطنت مقرر کیا گیا۔

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اس نے اجین کو دارالخلافہ بنایا۔

**علم و ادب:** چندر گپت وِکرمادتیہ بڑا علم دوست بھی تھا۔ اس کے زمانہ میں سنسکرت نے بہت ترقی کی۔ اکثر عالموں کی رائے ہے کہ سنسکرت کا مشہور شاعر کالیداس جو اِنڈین شیکسپیئر کے نام سے مشہور ہے اسی زمانہ میں ہوا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ راجہ بکرماجیت جس کے انصاف اور رعایا پروری کی بہت سی روایات مشہور ہیں۔ یہی بادشاہ تھا۔ لیکن اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

**فاہیان:** چندر گپت وِکرمادتیہ کے عہد میں ایک چینی سیاح فاہیان ہندوستان میں آیا۔ اس کا مقصد بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کرنا اور مذہبی کتابیں حاصل کرنا تھا۔ وہ یہاں کوئی چھ سال رہا اس کے سفرنامہ سے اس وقت کے ہندوستان کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔

1- **انتظامِ حکومت:** انتظام حکومت کے متعلق فاہیان لکھتا ہے "گورنمنٹ لوگوں کے معاملات میں بہت کم دخل دیتی ہے۔ سزائیں بہت نرم ہیں۔ اکثر جرمانہ ہی کافی خیال کیا جاتا ہے۔ سزائے موت کسی کو نہیں دی جاتی، لیکن جو لوگ بار بار جرم کرتے ہیں۔ اُن کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ راستے محفوظ ہیں، اور سفر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ٹیکس ہلکے ہیں اور سرکاری آمدنی کا زیادہ حصہ زمینوں کی مالگذاری سے حاصل کیا جاتا ہے جو کل پیداوار کا 1/4 حصہ ہے۔ ملک میں دولت بے شمار ہے۔"

2- **مذہبی حالت:** کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ: "بادشاہ اگرچہ ہندو ہیں۔ تاہم مذہبی معاملات میں بڑی رواداری سے کام لیا جاتا ہے۔ سلطنت بودھوں اور جینیوں کی پوری طرح حفاظت کرتی ہے۔ بودھوں کے کئی وہار ہیں۔ لوگ اہنسا کے قائل ہیں۔"

3- **مجلسی حالت:** کے متعلق فاہیان لکھتا ہے کہ: "ہندوستانی لوگ کسی جیو کو نہیں مارتے۔ نہ شراب پیتے ہیں نہ پیاز یا لہسن کھاتے ہیں۔ یہ لوگ جانور نہیں بیچتے۔ نہ منڈی کے پاس بوچڑوں کی دکانیں ہیں نہ شراب خانے ہیں۔ چنڈال لوگ شہر سے باہر رہتے ہیں اور ان کو شہر میں داخل ہوتے وقت ایک طرح کا نوٹس دینا پڑتا ہے۔ تاکہ لوگ ان سے چھو کر ناپاک نہ ہو جائیں۔"

4- مگدھ دیش: کے متعلق وہ لکھتا ہے: "وہاں بڑے بڑے شہر تھے۔ لوگ نہایت دولت مند اور خوشحال تھے۔ خیراتی انسٹی ٹیوشن بے شمار تھے۔ مسافروں کے لئے تمام سڑکوں پر سرائیں اور دھرم شالائیں بنی ہوئی تھیں، اور پاٹلی پتر میں ایک ایسا ہسپتال تھا۔ جہاں مریضوں کو دوا کے علاوہ کھانا اور کپڑا بھی مفت دیا جاتا تھا۔ پاٹلی پتر میں اشوک کا محل ابھی تک قائم تھا اور وہ اس قدر عالی شان تھا کہ یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ انسانی ہاتھوں نے اسے بنایا ہو۔"

سنہری زمانہ: گپتوں کا زمانہ ہندو تاریخ کا سنہری زمانہ تھا۔ کیونکہ جو ترقی ہندوؤں کی تہذیب و تمدن، علم و فضل اور سائنس اور آرٹ کو اس زمانہ میں ہوئی۔ وہ نہ پہلے کبھی ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد ہوئی۔ لوگ خوشحال تھے اور ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ کی چند ایک خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں:

1- ہندو مذہب کی ترقی: گپت خاندان کے تمام بادشاہ ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔ ان کے زمانہ میں ہندو دیوتاؤں کے بت اور مندر بننے شروع ہوئے اور اس طرح سے ہندو مذہب کو جو بدھ مذہب کے زور کے زمانہ میں پیچھے رہ گیا تھا پھر عروج حاصل ہو گیا۔

2- سنسکرت کی ترقی: ہندو مذہب کی ترقی کے ساتھ کتابیں سنسکرت میں لکھی گئیں، اور یہ عدالتی زبان مقرر کی گئی۔ بدھ وہاروں میں بھی سنسکرت پڑھائی جانے لگی۔ سنسکرت کا مشہور آفاق شاعر اور ڈرامہ نویس کالی داس اسی زمانہ میں ہوا اور اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے شکنتلا ناٹک اس کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ پوران، مہابھارت اور منو سمرتی اپنی موجودہ صورت میں اسی زمانہ میں ترتیب دیئے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ گپتوں کا زمانہ سنسکرت لٹریچر کا سنہری زمانہ تھا۔

3- سائنس کی ترقی: اس زمانہ میں علوم ریاضی و جیوتش نے بھی بہت ترقی پائی۔ اس زمانہ کے تین ریاضی دان اور منجم مشہور ہیں۔ آریہ بھٹ۔ وارہ مہرا اور برہم گپت۔

4- فنونِ لطیفہ میں ترقی: علم موسیقی، فن تعمیر، سنگ تراشی، نقاشی اور مصوری وغیرہ فنون لطیفہ نے بھی اس زمانہ میں بہت ترقی کی۔ اس زمانہ کی بہت سی تعمیرات زمانہ کے انقلاب سے برباد ہو گئیں۔ مگر جو قائم ہیں وہ اس زمانہ کے عہد کی کمالیت کا پتہ دیتی ہیں۔ دہلی میں گپت زمانہ کی لوہے کی لاٹھ جو قطب مینار کے پاس کھڑی ہے دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ اجنٹا (واقع حیدر آباد) کی گپھاؤں کی نقاشی اور مصوری اس کمال کو پہنچی ہے کہ دنیا کے آرٹسٹ دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

5- **تعلیم میں ترقی:** اس زمانہ میں تعلیم نے بھی بہت ترقی کی۔ ٹیکسلا، اجنتا، سارناتھ، نالندا کی مشہور یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ جہاں غیر ممالک سے بھی طلبا تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ (نالندا یونیورسٹی نے آگے چل کر ہرش کے زمانہ میں بہت ترقی کی۔)

6- **نئی بستیاں:** اس زمانہ میں ہندوستانی لوگ دوسرے ملکوں کو گئے۔ انہوں نے جاوا، سماٹرا، کمبوڈیا وغیرہ میں بستیاں قائم کیں اور وہاں ہندوستانی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا۔

7- **تجارت میں ترقی:** تجارت میں بھی معقول ترقی ہوئی۔ سلطنت روما اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے ساتھ تجاوت ہونے لگی۔ جس سے ملک میں دولت بڑھنی شروع ہوئی، اور ہندوستان مالا مال ہو گیا۔

## ہون قوم

## (THE HUNS AND THEIR INVASION OF INDIA)

ہون وسط ایشیا کی ایک وحشی، خونخوار اور خانہ بدوش قوم تھی۔ اس قوم نے پانچویں صدی عیسوی کے نصف میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت گپت خاندان کا بادشاہ سکند گپت حکمران تھا۔ اس نے انھیں شکست فاش دی، اور پسپا کر دیا، لیکن اس شکست کے چند سال بعد وہ زیادہ ثابت قدمی سے ہندوستان پر حملے کرنے لگے اور ان کے سردار تورمان نے گپت سلطنت کو مغلوب کر کے پنجاب، راجپوتانہ، سندھ اور مالوہ پر قبضہ کر لیا اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔

تورمان کے بعد اس کا لڑکا مہر گل بادشاہ بنا۔ اور اس نے سیالکوٹ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ مہر گل بے حد ظالم اور بے رحم تھا۔ آخر اس کے مظالم کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہوئی اور مالوہ اور مگدھ کے بادشاہوں نے مل کر 578ء میں اسے ملتان کے نزدیک شکست فاش دی۔ مہر گل بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ جہاں اس نے بادشاہوں کو قتل کر کے تخت خود سنبھال لیا۔ اور آخر کار 540ء میں وہیں مر گیا۔ اس کی موت کے بعد ہندوستان میں ہونوں کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔

**حملے کا اثر:**

1- ہون قوم کے حملوں نے گپت خاندان کا خاتمہ کر دیا اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

2- بہت سے ہون لوگوں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا۔ کئی راجپوت خاندان ان ہونوں کی اولاد ہیں۔

# ہرش وردھن

(606ء سے 647ء)

ہون قوم کے حملے سے گپت سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ملک میں کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ جو قریباً ایک صدی تک رہیں۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں کوئی ایسا زبردست راجہ نہ تھا۔ جو ان سب کو مطیع کر لیتا۔ آخر ساتویں صدی کے آغاز میں تھا۔ تیسر کے راجہ ہرش وردھن نے تقریباً تمام شمالی ہندوستان کو فتح کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔

ہرش وردھن شمالی ہندوستان کا آخری بڑا ہندو بادشاہ تھا۔ وہ تھانیسر کے راجہ پربھاکر وردھن کا چھوٹا لڑکا تھا۔ 604ء میں پربھاکر وردھن اچانک ہی مر گیا اور اس کی موت پر اس کا بڑا لڑکا راجیہ وردھن بادشاہ بنا۔ راجیہ وردھن کو بادشاہ بنتے ہی مالوہ کے راجہ پر چڑھائی کرنی پڑی۔ کیونکہ مالوہ کے راجہ نے اس کے بہنوئی والئی قنوج کو قتل کر ڈالا تھا۔ اور اس کی بہن کو (جس کا نام راجیشری تھا) قید خانہ میں بند کر دیا تھا۔ راجیہ وردھن نے مالوہ کے راجہ کو شکست دی، لیکن مالوہ کے راجہ کے دوست بنگال کے راجہ نے راجیہ وردھن کو دغا سے قتل کر دیا۔ بڑے بھائی کے اس طرح قتل ہو جانے پر 606ء میں ہرش وردھ بادشاہ بنا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔

**ہرش کی فتوحات:** ہرش بڑا بہادر اور عالم شخص تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا تہیہ کیا۔ اس نے بنگال پر چڑھائی کی اور وہاں کے راجہ کو شکست دے کر اپنے مطیع کر لیا۔ اس کے بعد ہرش نے متواتر چھ سال لڑائیوں میں ہی صرف کئے اور سوائے پنجاب کے باقی تمام شمالی ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

**ہرش کی شکست:** 630ء میں جب ہرش نے دکن پر فوج کشی کی۔ تو چالوکیہ خاندان کے بہادر بادشاہ پلی کیشن نے اُسے شکست دی۔ اس لئے اس کی سلطنت کی جنوبی حد دریائے نربدا سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہرش نے قنوج کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

**ہرش کا مذہب:** ہرش شروع شروع میں ہندو دھرم کو مانتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ بدھ دھرم کی طرف مائل ہو گیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سب مذہبوں کی عزت کرتا تھا۔ اور خود بھی بدھ شو اور سورج کی پوجا کیا کرتا تھا۔ ہرش ہر پانچویں سال پریاگ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا کرتا تھا۔ اور وہاں اپنا تمام دھن دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔

**ہرش کی علم پروری:** ہرش بڑا عالم فاضل بادشاہ تھا۔ اس نے سنسکرت میں تین ڈرامے (رتناولی، ناگانند، اور پریہ درشکا) لکھے اور ویاکرن پر بھی ایک کتاب لکھی۔ اس کے دربار میں کئی علما موجود تھے۔ جن میں سے سب سے مشہور بان بھٹ تھا۔ اس نے ہرش چرتر نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ جو ہرش کے زمانے کے حالات کا بڑا ماخذ ہے۔

**ہیون سانگ:** ہیون سانگ ایک نہایت ہی قابل چینی سیاح تھا۔ وہ بدھ مذہب کا بڑا زبردست عالم تھا۔ ہرش کے زمانہ میں وہ بدھ مذہب کی کتابوں کی کھوج میں ہندوستان آیا اور کوئی 15 سال (630ء سے 645ء) یہاں رہا۔ اس نے ہرش کے عہد حکومت کے حالات قلمبند کیے ہیں:

1۔ **گورنمنٹ:** ہیون سانگ لکھتا ہے۔ کہ ہرش کا انتظام سلطنت بہت اچھا تھا۔ بادشاہ سلطنت کے تمام کاموں کی خود نگرانی کرتا تھا۔ اور اس مدعا کے لئے ملک کا دورہ کیا کرتا تھا۔ قانونِ فوجداری گپت بادشاہوں کے قانون سے بہت زیادہ سخت تھا۔ سنگین جرموں کی سزا میں ہاتھ، پاؤں کان اور ناک کاٹ لئے جاتے تھے اور سڑکیں بھی گپت بادشاہوں کے زمانے کی نسبت کم محفوظ تھیں، لیکن ٹیکس بہت ہلکے تھے۔ کل پیداوار کا 1/2 حصہ بطور لگان وصول کیا جاتا تھا۔

2۔ **تعلیمی حالت:** ہرش کے عہد میں تعلیم کی بڑی اشاعت تھی۔ نالندہ یونیورسٹی اپنے عروج پر تھی۔ یہاں کوئی دس ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے اور پندرہ سو پروفیسر پڑھاتے تھے۔ طلبا کی رہائش اور خوراک کا انتظام بھی مفت تھا۔ ذریعہ تعلیم سنسکرت تھی۔

3۔ **مجلسی حالت:** لوگ عموماً راست باز اور تعلیم یافتہ تھے، اور بڑی پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ذات پات مضبوطی سے قائم تھی۔ عورتیں میں پردے کا رواج نہیں تھا، لیکن رسم ستی عام طور پر جاری تھی۔ بچپن کی شادی کا وجود نہ تھا۔ لوگوں کو گوشت کھانے کی ممانعت تھی، اور اس حکم کی خلاف ورزی میں سخت سزا دی جاتی تھی۔

4۔ **مذہبی حالت:** بدھ دھرم کو آہستہ آہستہ زوال آ رہا تھا۔ اور ہندو مذہب زور پکڑ رہا تھا۔ لوگوں میں مذہبی آزادی تھی اور مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا۔

5۔ **قنوج کا جلسہ:** ہیون سانگ نے قنوج کے جلسہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں وہ خود شامل تھا۔ یہ عظیم الشان جلسہ 643ء میں قنوج کے مقام پر 18 دن تک ہوتا رہا۔ اس میں بیس باجگذار راجے اور ہزارہا آدمی شامل تھے۔ یہ جلسہ بدھ مذہب کے اصولوں کا تصفیہ کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت کے فرائض ہیون سانگ نے ادا کئے۔

# راجپوتوں کا زمانہ

(650ء سے 1200ء)

ہرش کی موت کے بعد ملک میں ابتری پھیل گئی اس ابتری کا فائدہ اٹھا کر بہادر راجپوتوں نے تمام شمالی ہندوستان میں اپنا تسلط جمالیا اور کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ جو کم و بیش پانچ سو سال تک رہیں۔ ہرش کی موت سے لے کر اسلامی حکومت کے قائم ہونے تک کے اِس زمانے کو راجپوتوں کا زمانہ کہتے ہیں۔

## باب 7

# پنجاب اور سندھ میں عربوں کی حکومت

**اسلامی قوت کی ابتدا:** عرب کے ملک میں دنیا کے دو مشہور پاک شہر ہیں، ان میں سے ایک نام مکہ اور دوسرے کا نام مدینہ ہے، شروع میں اسلام کی اطاعت انہیں دونوں شہروں میں پیدا ہوئی، اور بڑھی۔

مکہ میں خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے، آپ کے والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اور چند برس کے بعد آپ کی والدہ بھی وفات پا گئیں، اب آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کے پاس رہنے لگے، اور ان کے بھی رحلت کر جانے پر اپنے بزرگ چچا ابو طالب کے ساتھ ایک عرصہ تک رہے، 25 برس کی عمر میں آپ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، چالیس برس کی عمر سے آپ پر قرآن اترنا شروع ہوا، اور آپ پیغمبر مبعوث ہوئے، اس دن سے آپ بارہ برس تک مکہ میں لوگوں کو خدا کا وعظ سنا سنا کر اسلام کی منادی کرتے رہے، جب مکہ میں مشرکوں اور کافروں نے آپ ﷺ کو بہت ستایا تو خدا کے حکم سے آپ ﷺ مدینہ چلے گئے۔

آپ ﷺ کے مدینہ پہنچنے پر آہستہ آہستہ سارے مسلمان یہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے مل کر بڑی طاقت پیدا کر لی، چنانچہ دس برس میں تمام عرب مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا، یہاں تک کہ آپ نے 10ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔

**مسلمان ہندوستان میں:** آپ ﷺ کی وفات کے بعد عام مسلمانوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے جانشین یعنی خلیفہ ہوئے، اس وقت سے مسلمانوں نے عراق اور شام کے بادشاہوں پر حملہ شروع کیا، دو ڈھائی برس کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی، تو مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا، ان کے زمانہ میں شام و مصر اور ایران کا بہت بڑا حصہ فتح ہوا۔ 15ھ بمطابق 636ء میں حکم ثقفی نے عمان اور بحرین کے گورنر عثمان کے اشارہ سے تھانہ (علاقہ بمبئی) پر حملہ کیا، کچھ دنوں کے بعد بھروچ پر فوج کشی کی، اسی زمانہ میں مغیرہ نے دیبل (دیول سندھ کا بندرگاہ) پر حملہ کیا، تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں حکیم ابن جبلہ سرکاری طور پر ہندوستان کے متعلق تحقیقات کر کے واپس گئے۔

39ھ/659ء میں چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے حکم سے حارث عبدی آئے، اور سرحد کا انتظام کرتے رہے 44ھ/ 664ء میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مہلب کو بھیجا، جنہوں نے

بڑی خوبی سے سرحد کا انتظام کیا' اس وقت سے سرحدی انتظامات کے لئے یہ ایک مستقل عہدہ ہو گیا' سرحد اور سندھ کے مفتوحہ علاقے اسی کی نگرانی میں رہتے' مہلب کے بعد یکے بعد دیگرے لوگ اس عہدہ پر مقرر ہوتے رہے۔

86ھ/ 705ء میں جب ولید بن عبدالملک دمشق میں بادشاہ ہوا تو حجاج ابن یوسف ثقفی عراق کا حاکم تھا جس کے ماتحت بلوچستان' مکران' اور سندھ کے سرحدی علاقے بھی تھے اس وقت اسلام کی حکومت ایشیاء' یورپ اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے بادشاہ اسلام کے دربار میں ہر ملک کے بادشاہ ہدیہ کے ساتھ اپنے سفیر بھیجتے رہتے' لنکا کا راجہ بھی انہی میں سے تھا۔ جو دربار خلافت سے سیاسی یا اخلاقی ربط بڑھانا چاہتا تھا۔

چنانچہ اتفاقی طور پر اس کو اس کا موقع مل گیا' یعنی لنکا میں جو عرب تاجر رہتے تھے ان کے مرجانے پر راجہ نے ان کی عورتوں کو اپنے تحفوں کے ساتھ حجاج بن یوسف کی وساطت سے خلیفہ کے پاس روانہ کیا' ان جہازوں کو سندھیوں نے دیبل (ٹھٹھ) کے پاس لوٹ لیا' جب اس کی خبر حجاج کو ملی تو سندھ کے راجہ داہر کو اس کی طرف توجہ دلائی' اور شریف عرب خواتین کی واپسی کا مطالبہ کیا' راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے' اور وہ میری دست رس سے باہر ہیں۔

حجاج نے سرحد کے افسر عبداللہ کو لکھا کہ دیبل کا بحری راستہ چونکہ مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے' اس لئے کچھ فوج لے جا کر امن قائم کر دو' عبداللہ جنگ میں مارے گئے' ان کی جگہ بدیل بجلی کو مقرر کیا گیا' مگر وہ بھی گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے گر کر مر گئے' تب حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو پوری تیاری کے ساتھ شیراز کے راستہ سے روانہ کیا۔

محمد بن قاسم 93ھ/ 711ء جمعہ کے دن دیبل پہنچا' سمندر کے راستہ سے بھی لڑائی کا سامان آ گیا' اسی میں وہ منجنیق بھی تھی' جس کا نام "العروس" تھا اور جس کو پرانے زمانہ کی توپ سمجھنا چاہئے' وہ پانچ سو آدمی کی طاقت سے چلائی جاتی تھی' سب سے پہلے محمد بن قاسم نے اسی منجنیق کے ذریعہ دیبل کا قلعہ فتح کیا' پھر آگے قدم بڑھا کر نیرون کو فتح کیا اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے سندھ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا' تین برس کے اندر کشمیر کی حد سے لے کر "کچھ" تک اور سمندر (بحر عرب) سے سرحد' مالوہ راجپوتانہ' مارواڑ' اور دریائے راوی کے کنارے تک فتح کر کے کنوج (سندھ کی ایک چھوٹی سی ریاست) کی طرف بڑھا' اس وقت اس کے پاس پچاس ہزار فوج تھی' جس میں زیادہ تعداد ہندوستانیوں کی تھی۔

96ھ/ 714ء میں خلیفہ ولید نے وفات پائی اور سلیمان اس کی جگہ تخت پر بیٹھا' اس وقت حجاج تو مر چکا تھا' جو مشرقی علاقہ کا والی تھا' مگر اس کے ماتحت حاکم محمد بن قاسم والئی سندھ' قتیبہ بن مسلم والی ترکستان' موسیٰ والی افریقہ وغیرہ زندہ تھے اور یہی وہ لوگ تھے جو سلیمان کے خلیفہ

ہونے کے مخالف تھے۔

سلیمان نے خلیفہ ہو کران سب سے بدلہ لیا، چنانچہ اس کے حکم سے محمد بن قاسم 96ھ/ 714ء میں معزول کر کے عراق واپس بلایا گیا اور اپنے تمام خاندان کے ساتھ "واسطہ" (کوفہ) کے زندان میں قید رہ کر، خلیفہ کے خلاف سازش کے جرم میں قتل کیا گیا۔

# محمد بن قاسم کا حملہ

93ھ (711-12ء)

711-12ء: میں محمد بن قاسم مکران کی راہ سے دیبل پہنچا، اور سندھ اور ملتان کے حاکم راجہ داہر کو شکست دی، اس حملہ کی وجوہات اس طرح بیان کی جاتی ہیں:

1- 703ء میں علافی قبیلہ کے لوگوں نے مکران کے مسلمان گورنر کو قتل کر دیا اور بھاگ کر راجہ داہر کی پناہ میں چلے گئے، اور مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکے۔

2- جزائر شرق الہند سے مسلمان تاجروں کے بحری جہاز کو وطن واپس جاتے ہوئے بحری قزاقوں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ کہتے ہیں یہ قزاق راجہ داہر کی سرپرستی میں ایسا کرتے تھے، لیکن جب عراقی گورنر نے داہر سے قزاقوں کے خلاف کاروائی کے لئے کہا تو اس نے بحری قزاقوں سے لاتعلقی ظاہر کر کے جان چھڑالی۔ حجاج بن یوسف ان دنوں عراق کا حاکم تھا۔ وہ بڑا سخت طبیعت اور بہترین منتظم تھا۔ لٹے پٹے مسافروں نے جب حجاج سے فریاد کی تو اس نے داہر کو قیدیوں کی واپسی کے لئے کہا جو اس کے قلعہ میں قید تھے۔ انکار کا سنا تو داہر کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

3- ایران کے مجوسی، مسلمانوں کے خلاف ہندو راجاؤں کو بھڑکاتے رہتے تھے لہٰذا داہر نے مسلمان حاکم کی درخواست پر توجہ نہ دی اور اکڑ گیا۔

4- ایک مسلمان قیدی عورت نے حجاج بن یوسف تک بذریعہ خط کسی طرح اپنی فریاد بھجوادی۔ جس پر حجاج نے داہر کی راجدھانی فتح کرنے کا حکم دے دیا۔

اس کام کے لئے اس نے اپنے بھتیجے اور داماد سترہ سالہ (17) محمد بن قاسم کو بھیجا، اور منجنیقوں کے علاوہ دوسرے مؤثر ہتھیار اور مضبوط فوج اس کے ساتھ کر دی۔ اس کے لشکر میں چھ ہزار گھڑ سوار، چھ ہزار شتر سوار اور تین ہزار باربرداری کے جانور تھے، راستے میں عراق سے مکران تک شتر سوار چوکیاں قائم کی گئیں۔ محمد بن قاسم کا لشکر ۷۱۲ء میں مکران پہنچا جبکہ منجنیقیں وغیرہ بحری

راستے سے لائی گئیں۔

**دیبل کی فتح:** اِدھر محمد بن قاسم کا لشکر دیبل جا پہنچا اور اِدھر بحری جہاز رسد اور اسلحہ لے کر دیبل کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ یہ شہر داہر کا صدر مقام بھی تھا۔ یہاں اس کی فوجی چھاؤنی بھی تھی، اور شہر کے وسطی مندر میں اسلحہ خانہ بھی تھا۔

اس مندر کے کلس پر جو گئے رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ جب تک جھنڈا لہراتا رہے گا شہر فتح نہ ہو گا۔ مسلمانوں نے منجنیق سے سب سے پہلے جھنڈے کو گرایا، پھر عام حملہ کر دیا۔ ہندو اب سمجھے کہ ان کی قسمت میں ہارنا لکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ جاری رکھا اور چند دنوں میں دیبل کا شہر اور قلعہ فتح ہو گیا۔

مسلمان قیدیوں کو چھڑایا۔ جیل کے داروغہ نے مسلمان قیدیوں کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے اسے دیبل کا حاکم بنا دیا اور خود انتظامی امور درست کر کے آگے بڑھ گیا۔

**نیرون کی فتح:** راجہ داہر بھاگ کر "الور" چلا گیا۔ نیرون کے علاقہ میں محمد بن قاسم نے پیش قدمی کا حکم دیا کیونکہ یہ داہر کے بیٹے جے سنگھ کی راجدھانی تھی۔ نیرون کے لوگوں کو مسلمانوں کی قوت کا احساس تھا۔ چنانچہ جے سنگھ نے حجاج بن یوسف کے پاس ایلچی بھیج کر اپنی حفاظت کا وثیقہ حاصل کر لیا، اور جب محمد بن قاسم کی فوج نے نیرون پر حملہ کیا تو وہ وہاں سے بھاگ گیا اور اس کی فوج بھی منتشر ہو گئی۔ اس طرح نیرون پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور نیرون کے قائم مقام حاکم نے محمد بن قاسم کا استقبال کیا اور تحفے پیش کیے اور حجاج بن یوسف کا حفاظت اور امن نامہ بھی پیش کیا۔ چنانچہ محمد بن قاسم مطمئن ہو کر سیستان کی طرف بڑھ گیا۔

**سیستان کی فتح:** مسلمان لشکر سیستان (سہون) کی طرف بڑھا۔ جہاں راجہ داہر کا بھتیجا حکمران تھا۔ یہ بدھ مت کا پیرو تھا اور لڑنا بھڑنا ان کے نزدیک پاپ تھا۔ لیکن بہت سے لوگ لڑنے پر آمادہ تھے۔ تاہم سیستان کے حاکم بچھیرا نے عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں سے وہ فرار ہو جائے۔ چنانچہ وہ فرار ہو گیا اور شہر پر مسلمان فوج نے بغیر کسی جنگ و قتال کے قبضہ کر لیا۔ یہاں کے لوگوں کو امان دی گئی، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ آہستہ آہستہ اسلام کو سچا دین مان کر اسی کی پناہ میں آنے لگے۔ یہاں سے بہت سا مال غنیمت ملا حجاج بن یوسف کو اس کا پانچواں حصہ بھجوایا گیا اور باقی فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔

# جھم پیر کی جنگ

دریائے سندھ کے مغربی علاقہ پر مسلمان قابض ہو گئے تو انہوں نے دریا پار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر راجہ داہر اپنے لاؤ لشکر سمیت مقابلہ کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اتنے میں مسلمان لشکر کو دو ہزار فوجیوں کی کمک حجاج بن یوسف کی طرف سے پہنچ گئی اور کشتیوں کا پل بنا کر دریا عبور کر کے اسلامی لشکر مشرقی کنارے پر اتر گیا' اور برق رفتاری سے داہر کے لشکر پر حملہ آور ہوا اور دھکیلتا ہوا دشمن کو جھم کے میدان میں لے گیا۔

راجہ داہر کی فوج میں ایک ہزار جنگی ہاتھی' بیس ہزار پیادہ فوج جبکہ پانچ ہزار سوار تھے۔ اور مسلمان لشکر کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب تھی' ان پندرہ ہزار میں مقامی طور پر بھرتی کردہ سپاہی بھی شامل تھے جو مسلمان ہو گئے تھے یا انہوں نے اپنی خدمات اسلامی حکومت کے سپرد کر دی تھیں۔

راجہ داہر نے پہلے دستے کے طور پر ہاتھیوں کو آگے بھیجا۔ پیچھے گھڑ سوار فوج اور آخر میں پیادہ فوج تھی' داہر خود ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ مسلمانوں نے پچکاریوں کے ذریعے ہاتھیوں پر آتش گیر مادہ پھینکا جس کی جلن سے ہاتھی آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے اور اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے راجہ دہر کو کمک پہنچنے کے تمام راستے پہلے ہی بند کر رکھے تھے۔ اب اس کے سفید ہاتھی پر آتش گیر مادہ چھڑکا گیا تو وہ بھی دریا میں اتر گیا اور راجہ داہر الور کے قلعہ میں پناہ گزین ہوا۔ مسلمانوں نے الور کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں سے اطلاع ملی کہ اس کے بہترین جرنیل اور عزیز و اقربا قتل کئے جا چکے ہیں۔ اس لئے وہ حوصلہ ہار گیا۔ 17 جون 712ء کو راجہ داہر ایک مسلمان مجاہد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کا بیٹا جے سنگھ قلعہ کا انتظام اپنی والدہ کے سپرد کر کے فرار ہو گیا جس میں پندرہ ہزار فوجی تھے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی جے سنگھ کی ماں نے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر اجتماعی خودکشی کر لی۔

<u>برہمن آباد کی فتح:</u> حیدر آباد سے پچاس میل دور شمال مشرق کی طرف برہمن آباد (موجودہ منصورہ) کا شہر تھا۔ جے سنگھ اب یہاں محصور ہو کر بیٹھ گیا اور سندھی سرداروں اور جاگیرداروں کی مدد سے ایک فوج تیار کر لی جس کی تعداد چالیس ہزار تھی چھ ماہ کے طویل محاصرہ کے بعد آخر برہمن آباد بھی فتح ہو گیا۔ اس جنگ میں آٹھ ہزار یا بقول بعض بیس ہزار سپاہی کام آئے۔ یہاں سے راجہ داہر کی دوسری بیوی "لاڈی" اور اس کی دو بیٹیاں مسلمانوں کی قید میں آئیں۔ فتح کے بعد عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

<u>ملتان کی فتح:</u> ملتان کی طرف پیش قدمی سے پہلے روہڑی کے قریب واقع "الور" نامی ریاست کو

فتح کرنا بھی ضروری تھا۔ جہاں راجہ داہر کا بیٹا گوپی حکمران تھا۔ اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے اور مسلمانوں کے خلاف کمک لینے ہندو راجوں کے پاس گیا ہوا ہے۔ بہرحال یہ شہر بھی مسلمانوں کے عزم صمیم کے آگے دیوار نہ بن سکا اور گوپی نے راہ فرار اختیار کی اور اس طرح شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

شکست خوردہ جاگیردار اور جرنیل بھاگ کر ملتان میں پناہ گزین ہوئے۔ مسلمانوں نے ملتان کو فتح کرنا بھی نہایت ضروری سمجھا' راستے میں بوہاتا اور جاٹ قبائل نے اسلامی لشکر کو زک پہنچانے کی کوشش کی تاہم اسلامی لشکر ملتان تک آپہنچا یہاں کے لوگ سورج دیوتا کے پجاری تھے اور سالانہ تیرتھ کا اہتمام بھی تھا۔ بقول بعض سورج دیوتا کا بت سونے کا بنا ہوا تھا۔ بقول بعض یہ لکڑی کا تھا اور اس کی آنکھوں میں لعل جڑے ہوئے تھے۔

مسلمانوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا اور آخر محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ 713ء میں ملتان بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا۔ یہاں سے مسلمانوں کو بے حساب سونا ہاتھ لگا۔ چنانچہ انہوں نے اس شہر کو "سونے کا شہر" کا نام دیا۔

اب محمد بن قاسم اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کرنے والا تھا مگر ادھر خلیفہ ولید کی جگہ خلیفہ سلیمان نے لے لی۔ خلیفہ سلیمان نے اس عظیم فاتح کو واپس بلا کر پھانسی پر لٹکا دیا کیونکہ اب سابقہ خلیفہ کے مخالف کی حکمرانی تھی جسے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے دشمن کا بیٹا فاتح بن کر جیتا رہے۔

**محمد بن قاسم کا انتظام سلطنت:** وہ جب تک سندھ اور ملتان میں رہا اس نے مفتوحہ علاقوں کا انتظام بڑی مستعدی سے اور نہایت احسن طور پر کیا۔ اس نے غیر مسلموں کے مندروں کو تحفظ دیا حتیٰ کہ ان کی مرمت بھی اپنے ذمہ لی۔ برہمنوں کو بھی حسب سابق مراعات دیں۔ جزیہ کا نفاذ کیا لیکن اس کے تین درجے تھے۔ امراء سے 48 درہم لئے جاتے متوسط لوگوں سے 24 درہم اور غریبوں سے 12 درہم۔ عورتوں بچوں اور معذوروں' بیواؤں' برہمنوں پر کوئی جزیہ نہ تھا۔ جزیہ برہمنوں کے ذریعے وصول کیا جاتا تھا۔

محمد بن قاسم نے ہندوؤں کو بعض اہم مناصب پر بھی فائز کیا تھا۔ بعض امور میں ان سے مشورہ بھی لیتا اور جنگ کے مقامی متاثرین کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ گویا 712-713ء میں مسلمان سندھ' مکران اور ملتان تک حاکم بن گئے۔

# محمد بن قاسم کے بعد عرب مقبوضات کا مختصر حال

محمد بن قاسم کے بعد ایک کے بعد دوسرا' سندھ کے والی مقرر ہوتے رہے' ان والیوں میں جنید خاص کر ذکر کے قابل ہے' یہ 107ھ/ 725ء میں سندھ کا والی ہوا' یہ بڑا بہادر اور مدبر تھا' سندھ کا معقول بندوبست کر کے' سرحدی معاملات کے قطعی فیصلے کے لئے گوجروں کے ملک کی طرف بڑھا' سندھ سے پہلے مرمد (ماڑواڑ) آیا' اور یہاں سے مانڈل (ویرم گام کے پاس) اور پھر دھنج (پٹن کے پاس) پہنچا اور وہاں سے بھروچ بندرگاہ گیا اور اس کے ایک افسر معیب نامی نے اجین (مالوہ) پر دھاوا کیا' وہاں سے بہرہمد (سرحد ماڑواڑ) اور پھر بھیلمان (گوجروں کا پایہ تخت) کو فتح کرتے ہوئے مال غنیمت لے کر سندھ واپس آ گیا' اسی عہد میں شہر چنپائت (بیاس ندی سے مغربی جانب دس میل پر) کی ریاست مطیع ہوئی' اور سندھ کی مملکت میں مقبوضات کا اضافہ ہوا۔

جنید کے بعد تمیم اور پھر حکم بن عوانہ کلبی سندھ کے والی ہو کر آئے' اسی کے ساتھ محمد بن قاسم کا لڑکا عمر بن محمد بن قاسم سندھ آیا' حکم نے یہاں ایک نیا شہر "محفوظ" بسایا' کچھ دنوں کے بعد عمر بن محمد بن قاسم نے دوسرا شہر "منصورہ" آباد کیا جو صدیوں سندھ کا پایہ تخت رہا۔

حکم کے بعد محمد بن قاسم کا لڑکا عمر بن محمد اور پھر یزید عرار سندھ کے حاکم ہوئے اسی زمانہ میں ایک شخص منصور بن جمہور باغی ہو کر سندھ پر قابض ہو گیا۔

132ھ/ 749ء میں امیہ کے خاندان کی جگہ حضرت عباسؓ کا خاندان برسر عروج ہوا اور ملک عراق میں بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا اس عہد میں سب سے پہلے مغلس کو سندھ بھیجا گیا' جو جلد مارا گیا' پھر موسیٰ بن کعب تمیمی آیا' جس نے باغی منصور بن جمہور کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ حاصل کیا' تمیمی کے بعد عیینہ اور پھر عمر بن حفص یہاں کا والی ہوا' چونکہ یہ سادات کا بڑا حامی تھا' اس لئے سندھ میں بھی ان کا اثر قائم ہو گیا' اور شیعیت کی بنیاد اسی وقت سے سندھ میں پڑی۔

140ھ/ 757ء میں منصور عباسی کے حکم سے ہشام والی ہو کر آیا' جس نے عمر بن جمل کو جہازوں کے بیڑے کا افسر بنا کر گجرات کی بندرگاہوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا وہ لوٹ مار کر کے واپس آیا' ہشام کو اس سے اطمینان نہ ہوا' وہ خود ایک بیڑا لے کر گندھار (متصل بھروچ) بندر پر حملہ آور ہوا' اور اپنی فتح کی یادگار میں یہاں ایک مسجد بنوائی یہ گجرات میں مسلمانوں کی پہلی مسجد ہے' واپس آ کر اس نے کشمیر کا سرحدی علاقہ بھی فتح کر لیا' خلیفہ نے اس کی اعلیٰ لیاقت دیکھ کر کرمان کا صوبہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔

159ھ/ 775ء میں خلیفہ مہدی کے حکم سے گجرات پر عبدالملک نے حملہ کیا' اور

160ھ/ 776ء میں بھاڑ بھوت (متصل بھروچ) پر اس نے قبضہ کرلیا، لیکن اتفاق سے یہاں وبا پھیل گئی، جس سے ایک ہزار مسلمان مرگئے، 161ھ/ 777ء میں کئی حاکموں کے بعد معبح بن عمر تغلبی سندھ کا حاکم مقرر ہوا، اسی کے عہد سے یمنی اور حجازی کا جھگڑا شروع ہوا جس نے سندھ کی اسلامی حکومت کو سخت نقصان پہنچایا، 164ھ/ 780ء میں تازہ دم عرب فوج جب بصرہ سے آئی تو یہ فساد ختم ہوا۔

170ھ/ 786ء میں ہارون الرشید کے زمانہ میں طیفور حمیری حاکم ہو کر آیا، اس کے عہد میں حجازیوں اور یمنیوں کا جھگڑا بہت بڑھ گیا، اس لئے اس کو معزول کر کے کئی حاکم متواتر بھیجے گئے مگر کسی سے سندھ کا معقول بندوبست نہ ہو سکا، آخر 184ھ/ 800ء میں داؤد مہلبی کو یہ علاقہ سپرد کیا گیا، پہلے تو اس کا بھائی مغیرہ آیا، مگر سندھی عربوں نے اس کی دال نہ گلنے دی، مجبوراً وہ خود سندھ پہنچا اور تمام سندھ کا معقول بندوبست کیا، جہاں تک ممکن ہو سکا اس نے نزاریوں (حجازی) کی طاقت توڑی اور ملک میں ان کو منتشر کردیا۔

اسی زمانہ میں ہارون الرشید کی طلب پر ہندوستان سے 193ھ/ 808ء ایک طبیب (وید) "گنگا" نامی بغداد گیا تھا، اور ایک اور طبیب منکہ نامی تھا جس کے علاج سے خلیفہ بیماری سے اچھا ہوا تھا۔

205ھ/ 820ء میں بیس برس حکومت کر کے بڑی نیک نامی کے ساتھ داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی دنیا سے رخصت ہو گیا، خلیفہ مامون الرشید نے اس کے لڑکے بشر کو باپ کی جگہ پر بحال رکھا، چنانچہ چند سال کے بعد اس نے باغیانہ رویہ اختیار کیا، اس لئے حاجب بن صالح کو روانہ کیا گیا جو ناکام واپس آیا۔

آخر مامون نے غسان تغلبی کو سندھ روانہ کیا۔ وہ 213ھ/ 828ء میں منصورہ پہنچا، بشر نے اطاعت، قبول کرلی، غسان نے تمام معاملات درست کر کے موسیٰ برمکی کو خلیفہ کے حکم کے مطابق سندھ سپرد کردیا اور عراق چلا گیا، 221ھ/ 835ء میں موسیٰ مرگیا، اور اس کا لڑکا عمران بن موسیٰ سندھ کا حاکم مقرر ہوا۔

عمران باپ کی جگہ مقرر ہو کر بڑی مستعدی سے سندھ کا انتظام کرنے لگا، قیقان کے جاٹ جو باغی ہو گئے تھے، ان کو تابعدار بنایا اور ان کی سرکشی روکنے کے لئے ایک چھاؤنی قائم کی اس کا نام "بیضاء" رکھا، قندابیل کے سرکشوں کو زیر کیا، اس کے بعد جاٹوں کی خبرلی، اور سخت سزا دے کر مید کی طرف چلا، اس سرکش قوم کو زیر کرنے میں مصروف تھا کہ پھر حجازی اور یمنی جھگڑا شروع ہوا حجازیوں کا ایک سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری اچانک اس پر آپڑا، اور عمران مارا گیا، اس کے مرنے پر 236ھ/ 850ء میں عنبہ بن اسحاق ضبی حاکم ہوا، مگر اس کا سارا وقت ان باغیوں سے لڑنے میں

صرف ہوا، جو عمران کے قتل سے صوبے دبا بیٹھے تھے، اس نے اپنے آخری عہد میں ایک بڑا قید خانہ تیار کیا، اور دیبل کی فصیل سڑک، اور مکانات کی درستی میں بڑی دلچسپی سے وقت صرف کیا۔

235ھ/ 859ء میں ہارون سندھ کا حاکم ہوا، مگر اس نے حجازیوں اور یمنیوں کا توازن قائم نہیں رکھا، اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ 240ھ/854ء میں حجازیوں کے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری نے اس کو قتل کر دیا، اور شہر پر قبضہ کر کے خلیفہ متوکل سے یہ درخواست کی کہ سندھ کا صوبہ اگر اس کے سپرد ہو تو اس کا بہترین انتظام کرے گا۔ چنانچہ خلیفہ متوکل نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

**خاندان ہباری:** اس خاندان کا بانی عمر بن عبدالعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمٰن بن ہبار بن اسود ہے، عرصہ سے یہ خاندان سندھ میں آباد تھا، اور سندھی عربوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، منصورہ سے تھوڑے فاصلہ پر "بانیہ" ایک جگہ تھی وہ اس کا وطن تھا، اس نے آہستہ آہستہ طاقت پیدا کی، یہاں تک کہ 240ھ/ 854ء میں سندھ کا حاکم ہو گیا، جو برائے نام خلیفہ کا ماتحت تھا، اس نے اپنا پایہ تخت منصورہ ہی کو قائم رکھا، 270ھ/ 883ء میں اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر تخت پر بیٹھا، لیکن 279ھ/ 892ء میں ایک عام بلوہ ہو گیا، اور ممہ جو بنو کندہ کا غلام تھا، سندھ پر قبضہ کر بیٹھا۔

کچھ دنوں کے بعد عبداللہ نے اپنی حالت سنبھالی، اور اپنا موروثی ملک غاصب سے چھین کر پھر سندھ کا مالک ہو گیا، بنو سامہ کا خاندان عمان میں آباد تھا، اس کی شاخ بنو منبہ ملتان میں بس گئی تھی، غالباً اس قسم کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ملتان کے بنو سامہ نے 290ھ/ 902ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، اس وقت سے سندھ کے دو حصے ہو گئے، شمالی حصہ کا پایہ تخت ملتان ہوا اور جنوبی حصہ کا منصورہ، 330ھ/ 902ء میں ملتان کا حاکم ابواللباب منبہ بن اسد قریشی تھا۔

303ھ/915ء میں عبداللہ کے بعد اس کا لڑکا عمر بن عبداللہ ہباری منصورہ میں تخت پر بیٹھا، اور اسی طرح 375ھ/ 985ء تک ایک کے بعد دوسرے بادشاہ ہوتے رہے، لیکن اسی وقت سے اسماعیلیوں کا اثر بڑھنے لگ گیا تھا، تب بھی 401ھ/ 1010ء تک یہ خاندان حکومت کرتا رہا۔

**سندھ میں اسماعیلی:** اسماعیلی، شیعوں کا ایک فرقہ ہے، جو اس زمانہ میں مصر اور شمالی افریقہ پر قابض تھا، ان کا امام مصر کے پایہ تخت قاہرہ میں رہتا تھا، نسب کے لحاظ سے وہ فاطمی یعنی حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھا، ان کے داعی اور مبلغ عباسیوں کے دور دست صوبوں میں جا کر اپنا مذہب پھیلاتے تھے، 270ھ/ 883ء میں عبداللہ المہدی کے زمانہ میں ہیثم نامی ان کا پہلا داعی سندھ میں آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے داعی آتے رہے اور ملک کو انقلاب کے لئے تیار کرتے رہے، یہ لوگ اپنا کام بہت ہی مخفی طور پر انجام دیتے

تھے، ان کو قاہرہ سے تمام احکام ملتے، یہاں تک کہ اسماعیلی امام عبدالعزیز باللہ فاطمی المتوفی 386ھ/ 996ء کے عہد میں جلم بن شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا گیا، جس نے اچانک سندھ میں بنو سامہ قریشی سے 367ھ/ 977ء میں حکومت چھین لی، اور خود قبضہ کر لیا۔

جلم بن شیبان: اس نے ملتان پر قبضہ کر کے فاطمی خلیفہ کا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا، سندھ میں پہلا اسماعیلی حاکم جلم بن شیبان ہے، ملتان کے اس پرانے مندر کو جس کو محمد بن قاسم کے زمانے سے اس وقت تک کسی مسلمان بادشاہ نے نہیں چھوا تھا۔ اس نے گرا کر جامع مسجد بنا ڈالا، اور محمد بن قاسم کے زمانہ کی جامع مسجد جو موجود تھی، اس کو بند کرا دیا۔

اس نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے ساتھ سلطنت کو بہت مضبوط بنایا، آس پاس کے ہمسایہ ہندو راجاؤں سے ربط و ضبط بڑھا کر ایک دوسرے کی امداد کرنے کا معاہدہ کر لیا۔

375ھ/ 985ء میں شیخ حمید تخت پر بیٹھا، پھر شیخ نصر متوفی 390ھ/ 999ء اس کے بعد اس کا لڑکا ابوالفتوح، داؤد تخت پر بیٹھا، اس نے لاہور کے راجہ جے پال کو محمود غزنوی کے مقابل میں فوجی امداد دی تھی، اس جرم میں سلطان محمود غزنوی 401ھ/ 1010ء میں ملتان فتح کر کے داؤد کو غزنہ لے گیا، جہاں کچھ دنوں کے بعد وہ مر گیا، اسماعیلی یہاں سے بھاگ کر غالباً منصورہ پہنچے اور اچانک منصورہ پر قابض ہو گئے، مگر 419ھ/ 1025ء میں محمود غزنوی نے ریاست منصورہ پر بھی قبضہ کر لیا، اور اس سے سندھ کا کل علاقہ غزنوی بادشاہوں کے ماتحت ہو گیا۔

باب 8

# اسلامی سلاطین کا اجمالی ذکر

## سلطان محمود غزنوی

(997ء سے 1030ء)

**سبکتگین:** افغانستان میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی سلطنت غزنی نام کی تھی۔ 977ء میں ایک شخص سبکتگین جو دراصل ایک ترکی غلام تھا وہاں کا بادشاہ بنا۔ وہ بڑا بہادر اور دلیر تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اِرد گرد کے علاقے فتح کرنے شروع کیے اور پنجاب کے راجہ جے پال کو بھی جس کی راجدھانی بٹھنڈا تھی دو دفعہ شکست دی، لیکن جے پال نے ہر دونوں مرتبہ خراج ادا کرنے کے وعدہ پر رہائی پائی، کوئی بیس سال کی حکومت کے بعد 997ء میں سبکتگین نے وفات پائی اور اس کا بیٹا محمود تخت نشین ہوا۔

**محمود کے مشہور حملے:** محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ اس کے ان حملوں کے اغراض دو تھیں:

ایک تو وہ پکا مسلمان ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں مذہب اسلام کی اشاعت کرنا چاہتا تھا اور دوسرے وہ کافر ملک کی دولت سے بھی ہاتھ رنگنا چاہتا تھا۔ لیکن نرا دولت سے ہاتھ رنگنے والی بات محض الزام ہے۔

تاہم اس کے چند ایک مشہور حملے مندرجہ ذیل ہیں:

1- **جے پال پر چڑھائی:** 1001ء میں محمود نے پنجاب کے راجہ جے پال پر فوج کشی کی اور پشاور کے نزدیک اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ جے پال نے پہلے کی طرح خراج دینے کے وعدہ پر رہائی حاصل کی۔ مگر وہ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکا اور چتا میں جل کر مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آنند پال اُس کا جانشین بنا۔

2- **آنند پال کی شکست 1008ء:** محمود کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پنجاب کے راجہ آنند پال کو بڑا فکر ہوا، اور اس نے محمود کے مقابلہ کے

لئے طاقتور راجپوت راجاؤں کا ایک اتحاد قائم کیا۔ 1008ء میں پشاور کے نزدیک دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ سخت خونریز لڑائی ہوئی۔ قریب تھا کہ محمود کو شکست ہو مگر آنند کا ہاتھی اچانک بھاگ نکلا کھلبلی کیوجہ سے محمود کو فتح نصیب ہوئی اور بہت سے ہندو مارے گئے۔

3- نگر کوٹ پر حملہ 1009ء: 1009ء میں محمود نے نگر کوٹ یعنی کانگڑہ کے مندر پر حملہ کیا۔ مندر کے بتوں کو توڑ ڈالا اور بے شمار مالِ غنیمت لے کر غزنی کو واپس لوٹ گیا کیونکہ یہ مندر محمود کے خلاف تیاریوں اور سازشوں کا گڑھ تھا چنانچہ کانگڑہ فتح ہو گیا۔

4- قنوج پر حملہ 1018ء: 1018ء میں محمود نے قنوج پر حملہ کیا۔ جو ان دنوں شمالی ہند میں ایک نہایت عالی شان شہر تھا۔ لیکن وہاں کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔ قنوج سے واپسی پر محمود نے متھرا کو خوب لوٹا اور وہاں کے بہت سے عالیشان مندروں کو مسمار کر دیا۔

5- لاہور پر حملہ 1021ء: 1021ء میں محمود نے لاہور کو بھی فتح کر لیا اور وہاں ایک مسلمان گورنر مقرر کر دیا۔ اس طرح سے پنجاب اس کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

6- سومناتھ پر حملہ: 1025ء میں محمود نے سومناتھ کے مندر پر جو کاٹھیاواڑ کے انتہائی جنوب میں واقع تھا۔ حملہ کیا یہ اس کا مشہور ترین حملہ تھا۔ بہادر راجپوت سرداروں نے اپنے اس مندر کی حفاظت کے لئے جو اس وقت سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ متبرک اور مالدار تھا۔ جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ تین دن تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مگر فتح محمود کی ہی ہوئی اس نے مندر میں داخل ہو کر بت کو توڑ ڈالا اور بے شمار دولت سمیٹ کر غزنی واپس چلا گیا۔ اسی وجہ سے اسے بت شکن محمود کہا جاتا ہے۔

# شہاب الدین محمد غوری

محمد غوری: شہاب الدین جو تاریخ میں محمد غوری کے نام سے مشہور ہے۔ ریاست غور (واقع افغانستان) کے بادشاہ غیاث الدین کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ بڑا بہادر اور جانباز سپاہی تھا۔ 1173ء میں اس کے بھائی نے غزنی کی سلطنت فتح کر کے اسے دے دی تھی۔ محمد غوری نے سب سے پہلے غزنی میں اپنی حکومت مستحکم کی اور اسکے بعد ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اس کا مدعا ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا تھا اور وہ اپنے اس مدعا میں کامیاب بھی ہوا۔ اس طرح سے محمد غوری ہی ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی ثابت ہوا۔

## اسلامی فتح ہند:

1- **ابتدائی حملے:** محمد غوری نے غزنی میں تسلط جما لینے کے بعد ہندوستان پر حملے شروع کئے۔ 1175ء میں اس نے ملتان فتح کر لیا، اور 1186ء میں لاہور کے حاکم خسرو ملک کو جو غزنی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ معزول کر دیا۔ اس طرح پنجاب اور سندھ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

2- **ترائن کی پہلی لڑائی:** 1191ء میں محمد غوری دہلی کی جانب بڑھا، لیکن راجپوت سرداروں نے پرتھوی راج چوہان والئی دہلی کے ماتحت ایک زبردست فوج کے ساتھ ترائن کے میدان میں (جسے تراوڑی بھی کہتے ہیں) اس کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی، اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ یہ لڑائی ترائن کی پہلی لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔

3- **ترائن کی دوسری لڑائی:** اگلے ہی سال یعنی 1192ء میں محمد غوری اپنی سابقہ شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایک لاکھ بیس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ پھر ترائن کے میدان میں معرکہ آرا ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا، لیکن اس دفعہ راجپوتوں کو شکست ہوئی اور پرتھوی راج گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اس سے دہلی اور اجمیر پر محمد غوری کا قبضہ ہو گیا۔ ترائن کی یہ دوسری لڑائی ایک نہایت ہی فیصلہ کن لڑائی تھی۔ اس سے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی فتح کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔

4- **قنوج کی فتح:** 1194ء میں محمد غوری نے قنوج کے حکمران جے چند راٹھور کو چندادور کے میدان میں شکست دی، اور قنوج اور بنارس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

5- **گجرات اور بندھیل کھنڈ کی فتح:** قنوج کی فتح کے بعد محمد غوری اپنے ایک معتبر غلام قطب الدین ایبک کو اپنا وائسرائے مقرر کر کے واپس غزنی چلا گیا۔ قطب الدین ایبک نے چند ہی سالوں میں گجرات اور بندھیل کھنڈ (جس کی راجدھانی کالنجر تھی) فتح کر لیا۔

6- **بہار اور بنگال کی فتح:** محمد غوری کے ایک جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے 1197ء میں بہار بڑی آسانی سے فتح کر لیا، اور پھر اس نے بنگال کی راجدھانی ندیا پر چڑھائی کی۔ وہاں کا راجہ لکشمن سین ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا، اور 1199ء میں بنگال بھی اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس طرح سے سارے شمالی ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔

**محمد غوری کی وفات:** 1206ء میں وسطی پنجاب سے واپسی پر اسے قتل کر دیا گیا۔

## 1206ء سے 1526ء

1206ء سے لے کر 1526ء تک کا زمانہ تاریخ ہند میں سلطانوں یا پٹھانوں کے عہد کے نام سے مشہور ہے۔ اس زمانے میں پانچ مختلف خاندانوں نے تخت دہلی پر حکومت کی۔

1- خاندانِ غلاماں — 1206ء سے 1290ء تک
2- خاندانِ خلجی — 1290ء سے 1320ء تک
3- خاندانِ تغلق — 1320ء سے 1414ء تک
4- خاندانِ سید — 1414ء سے 1450ء تک
5- خاندانِ لودھی — 1451ء سے 1526ء تک

## 1- خاندانِ غلاماں

**قطب الدین ایبک (1206ء سے 1210ء):** قطب الدین ایبک محمد غوری کا ترکی غلام تھا لیکن اپنی جنگی لیاقت کی وجہ سے اس کا جرنیل بن گیا تھا اور اس نے فتح ہندوستان میں محمد غوری کی بڑی مدد کی۔ چنانچہ محمد غوی جب واپس غزنی چلا گیا تو اسے اپنے مقبوضات کا وائسرائے بنا کر چھوڑ گیا۔

1206ء میں محمد غوری کی وفات پر قطب الدین ہندوستان کا بادشاہ بن گیا اور اس نے خاندان غلاماں کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح سے وہ ہندوستان میں پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔

قطب الدین بڑا بہادر، انصاف پسند اور فیاض آدمی تھا اور اپنی فیاضی کی وجہ سے لکھ بخش یا لکھ داتا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے زبردست سرداروں کے ساتھ رشتے ناطے کئے۔ اس نے دہلی میں خواجہ قطب الدین (ایک مشہور مسلمان ولی) کے نام پر قطب مینار اور قطبی مسجد بھی بنوانی شروع کیں۔ جنہیں التمش نے مکمل کرایا۔ 1210ء میں وہ لاہور میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

**نوٹ:** قطب الدین کی موت پر اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا، لیکن وہ نااہل اور سست آدمی تھا۔ چنانچہ اُسے جلدی ہی التمش نے تخت سے علیحدہ کر دیا۔

**التمش 1211ء سے 1236ء:** التمش شروع میں قطب الدین ایبک کا ایک غلام تھا۔ لیکن ترقی کرتے کرتے اس کا داماد بن گیا۔ 1211ء میں اس نے قطب الدین کے بیٹے آرام شاہ کو تخت سے اتار دیا اور خود قابض ہو گیا۔ اس وقت وہ بہار کا

صوبے دار تھا۔
التمش خاندانِ غلاماں کا ایک نہایت ہی قابل بادشاہ تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اُسے بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ قطب الدین کی موت پر کئی صوبے دار خود مختار بن بیٹھے تھے (1) پنجاب میں تاج الدین یلدوز (2) سندھ میں ناصر الدین قباچہ اور (3) بنگال میں خلجیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی ہندو اور راجپوت سرداروں نے بھی اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بغاوتیں کر دیں، لیکن التمش نے ان سب صوبہ داروں کو مطیع کر لیا اور پھر تھمبور، گوالیار، مالوہ اور اوجین کو بھی فتح کر لیا۔ اس طرح سے اس نے تقریباً سارے شمالی ہندوستان پر اپنا تسلط جما لیا۔

**چنگیز خاں:** التمش کے زمانے کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ مغل پہلی دفعہ ہندوستان کی سرحد تک آگئے۔ 1221ء میں مغل سردار چنگیز خاں جو دنیا میں ایک زبردست فاتح گزرا ہے۔ اپنے ایک دشمن (خوارزم کے بادشاہ جلال الدین) کے تعاقب میں دریائے سندھ تک آ پہنچا، لیکن سندھ سے پار کے علاقے میں ہی لوٹ مار کر کے واپس چلا گیا اور اس طرح ہندوستان ایک خوفناک آفت سے بچ گیا۔

التمش نے قطب مینار اور قطبی مسجد کو مکمل کرایا۔

**نوٹ:** التمش کی موت کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین تخت پر بیٹھا، لیکن وہ ایک نکما اور عیاش شخص تھا۔ اس لئے چند ہی ماہ بعد امراء نے اسے معزول کر کے تخت اس کی بہن سلطانہ رضیہ کے حوالے کر دیا۔

**رضیہ بیگم 1236ء سے 1239ء:** رضیہ التمش کی ہونہار بیٹی تھی۔ مسلمانوں میں وہ پہلی اور اکیلی عورت تھی۔ جو تخت دہلی پر بیٹھی۔ اس نے اپنے باپ کی زندگی میں ہی امورِ سلطنت میں کافی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ جب کبھی التمش دور دراز علاقوں میں جنگ کے لئے جایا کرتا تھا۔ تو انتظام سلطنت رضیہ کے حوالے کر جاتا تھا۔

رضیہ بڑی مدبر اور دلیر عورت تھی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر دربار کیا کرتی تھی، اور فوجوں کی کمان بھی بذاتِ خود کرتی تھی۔ مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ عورت ذات تھی، اور اس کے پٹھان اُمرا عورت کے ماتحت رہنا ہتک سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یاقوت نامی ایک حبشی غلام پر جو اس کا داروغہ اصطبل تھا۔ حد سے زیادہ مہربان ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اس کو سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس پر صوبے داروں نے بغاوتیں کر دیں، اور بٹھنڈا کے باغی سردار التونیہ نے رضیہ کو جب کہ وہ اس کی بغاوت دبانے کے لئے گئی۔ قید کر لیا۔ اس پر سازشیوں نے رضیہ کے بھائی بہرام کو تخت نشین کر دیا، لیکن رضیہ نے التونیہ سے شادی کر لی، اور تخت دہلی حاصل کرنے کی کوشش

کرنے لگی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور بمع اپنے خاوند کے 1240ء میں قتل کر دی گئی۔

نوٹ: رضیہ کے بعد دو بادشاہ یعنی اس کا بھائی بہرام اور بھتیجا علاؤالدین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے، لیکن نااہلیت کی وجہ سے معزول کر دیئے گئے اور پھر ناصرالدین بادشاہ بنا۔

**ناصرالدین 1246ء سے 1266ء:** ناصرالدین التمش کا لڑکا تھا۔ یہ بادشاہ بڑا نیک اور پارسا تھا اور اپنی سادہ زندگی کی وجہ سے تاریخ میں "درویش بادشاہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ شاہی خزانہ سے ذاتی اخراجات کے لئے ایک کوڑی بھی نہ لیتا تھا بلکہ قرآن شریف کی نقلیں لکھ کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ گھر کا سارا کام کاج اس کی نیک بیوی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ ناصرالدین نے تمام انتظام سلطنت اپنے وزیر بلبن کو جو اس کا سسر بھی تھا۔ سونپ رکھا تھا۔ بلبن بڑا لائق اور مدبر شخص تھا۔ اس نے بیس سال تک سلطان کی خوب خدمت کی۔ اس نے مغلوں کو پسپا کیا اور راجپوتوں کی بغاوتوں کو بھی فرو کیا۔ 1266ء میں ناصرالدین کی وفات پر بلبن بادشاہ بن گیا۔

**غیاث الدین بلبن 1266ء سے 1286ء:** غیاث الدین بلبن دراصل التمش کا ایک زر خرید غلام تھا، لیکن وہ ترقی کرتے کرتے بادشاہی کے رتبے تک جا پہنچا۔ بیس سال تک وہ ناصرالدین "درویش بادشاہ" کا وزیر رہا اور اس کی موت پر خود بادشاہ بن بیٹھا۔

بطور ایک بادشاہ کے بلبن بڑا قابل مگر بے رحم تھا۔ دشمنوں اور باغیوں کو وہ عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔ اس کا جاہ و جلال اس قدر تھا۔ کہ وسطی ایشیاء تک اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دہلی کے سلطانوں میں ایک نہایت ہی قابل بادشاہ ہو گزرا ہے۔

**واقعاتِ عہد:**

1۔ **بنگال کی بغاوت:** بلبن کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ بنگال کی بغاوت کو فرو کرنا ہے۔ بنگال کے حاکم طغرل بیگ نے یہ سمجھ کر کہ بادشاہ بوڑھا ہے، اور بنگال کا صوبہ دارالخلافہ سے بہت دور ہے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دو بادشاہی فوجوں کو شکست بھی دی۔ آخر سلطان خود ایک زبردست فوج کے ساتھ بنگال پر حملہ آور ہوا۔ طغرل بیگ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔

2۔ **مغلوں کی روک تھام:** بلبن کے عہد حکومت میں مغلوں نے کئی بار حملے کئے۔ چنانچہ سلطان نے ان کی روک تھام کے لئے شمال مغربی سرحد سے دارالخلافہ تک مضبوط قلعوں کی قطار بنوا کر ان میں مسلح فوج رکھ دی، اور اپنے سب سے بڑے بیٹے

محمد کو ان کی نگرانی پر مامور کیا۔ محمد نے کچھ عرصہ تو مغلوں کو پسپا کیے رکھا، لیکن ایک حملہ میں مغلوں سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ سلطان کو اپنے اس چہیتے بیٹے کی موت سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ اس غم سے 1286ء میں مرگیا۔

**بلبن کا دربار:** بلبن کا دربار بڑی شان و شوکت والا تھا۔ وسط ایشیا کے کئی بادشاہ اس کے ہاں پناہ گزیں تھے۔ بلبن کے درباری قوانین بڑے سخت تھے۔ دربار میں نہ تو کبھی وہ خود ہنستا تھا، اور نہ کوئی درباری ہی ہنسنے کی جرأت کرتا تھا۔ کسی شخص کو باقاعدہ درباری لباس پہنے بنا دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ فارسی کا مشہور شاعر امیر خسرو بھی اس کے دربار کی زینت تھا۔

**نوٹ:** بلبن کی موت کے بعد اس کا پوتا کیقباد جو بغرا خاں حاکم بنگال کا بیٹا تھا بادشاہ بنا۔ وہ بڑا کاہل اور عیاش آدمی تھا۔ 1290ء میں جلال الدین خلجی حاکم پنجاب نے اسے مروا کر تخت خود سنبھال لیا اور خلجی خاندان شروع ہوا۔

# 2- خاندانِ خلجی

(1290ء سے 1320ء)

**جلال الدین خلجی 1290ء سے 1296ء:** سلطان جلال الدین خاندانِ خلجی کا بانی تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا رحم دل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے عہد میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ مغلوں نے بھی حملے کیے لیکن انہیں پسپا کر دیا گیا۔ کچھ مغل دہلی کے نزدیک ہی بس گئے، اور اس جگہ کا نام مغلپورہ پڑ گیا۔ جلال الدین کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ دیوگری پر حملہ ہے۔

**دیوگری پر حملہ:** جلال الدین نے اپنے بھتیجے علاؤالدین کو جو اس کا داماد بھی تھا۔ صوبہ اودھ میں کڑہ کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔ وہ بڑا دلیر اور منچلا نوجوان تھا۔ اس نے آٹھ ہزار سواروں کو ساتھ لے کر 1294ء میں دکن پر فوج کشی کی اور یہ مشہور کیا کہ چونکہ میرا چچا مجھ سے ناراض ہے۔ اِس لئے میں دکن میں کسی ہندو راجہ کے ہاں ملازمت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے اچانک ہی دیوگری کے راجہ رام چندر دیو پر حملہ کر دیا۔ راجہ کو شکست ہوئی، اور علاؤالدین بہت سا مال لے کر واپس لوٹا۔

**جلال الدین کا قتل:** جب جلال الدین نے اپنے بھتیجے کی اس فتح کی خبر سنی تو وہ اس کے استقبال کے لئے کڑہ آیا۔ لیکن علاؤالدین کی نیت میں فرق آیا ہوا تھا۔ وہ تو دہلی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بغلگیر ہوتے وقت اپنے چچا کو قتل کر دیا، اور پھر

اس کے تمام خاندان کا خاتمہ کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا۔

**علاؤالدین خلجی 1296ء سے 1315ء:** علاؤ الدین خلجی 1296ء میں اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد بادشاہ بنا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی امراو وزرا کو رشوتیں دے کر اپنی طرف کر لیا اور عوام میں دل کھول کر روپیہ تقسیم کیا۔ تاکہ وہ بادشاہ کے قتل کو بھول کر اس کی طرف مائل ہو جائیں۔

علاؤالدین نے بیس سال حکومت کی اور وہ ایک نہایت زبردست اور کامیاب بادشاہ ثابت ہوا۔ اس نے شمالی ہند کو فتح کیا۔ دکن میں اسلامی حکومت قائم کی۔ مغلوں کے حملوں کو روکا اور نظامِ حکومت میں کئی اصلاحات کیں۔

**فتوحات:**

1- **گجرات 1297ء:** علاؤالدین نے اپنے جرنیل الغ خاں کو گجرات کی فتح کے لئے روانہ کیا۔ وہاں کا راجہ کرن بھاگ نکلا اور گجرات فتح ہو گیا۔ گجرات کی یہ فتح دو باتوں کے لئے مشہور ہے۔ اول تو یہ کہ راجہ کرن کی بیوی کملا دیوی دہلی میں لائی گئی اور دوسرے کافور نامی ایک ہندو غلام بھی اس حملے میں شہر کھمبایت سے شاہی فوجوں کے ہاتھ لگا۔ جس نے بعد میں علاؤالدین کے لئے دکن فتح کیا۔

2- **رنتھمبور 1301ء:** رنتھمبور راجپوتانے کا مشہور قلعہ تھا۔ علاؤالدین نے خود اس پر چڑھائی کی، اور ایک طویل محاصرہ کے بعد وہاں کے راجہ ھمیر دیو کو شکست دی اور قلعہ فتح کر لیا۔

3- **چتوڑ 1303ء:** چتوڑ کے رانا بھیم سنگھ کی رانی پدمنی بڑی خوبصورت تھی، اور علاؤالدین اسے اپنے حرم میں لانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے چتوڑ پر چڑھائی کی۔ راجپوتوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھائی اور چتوڑ فتح ہو گیا۔ لیکن رانی پدمنی اپنی سہیلیوں سمیت چتا میں جل کر مر گئی۔

نوٹ: چند ہی سال بعد چتوڑ پر پھر راجپوتوں کا قبضہ ہو گیا۔

4- اس کے بعد اور بھی کئی علاقے مثلاً مالوہ، اوجین، منڈو، چندیری وغیرہ بھی فتح ہو گئے، اور اس طرح سے 1305ء تک تقریباً سارے شمالی ہندوستان پر علاؤالدین کا تسلط قائم ہو گیا۔

5- **تسخیر دکن 1306-11ء:** شمالی ہند کو فتح کر لینے کے بعد علاؤالدین نے دکن کی فتح کا ارادہ کیا اور اس کام کے لئے اپنے جرنیل ملک کافور کو مامور کیا۔ کافور نے دیوی گری، وارنگل، دوارسمدر اور مدورا کی ریاستوں کو فتح کر لیا اور بڑھتا ہوا غالباً

جزیرہ رامیشورم تک جا پہنچا۔ آخر 1311ء میں بے انتہا مال و دولت کے ساتھ وہ واپس دہلی لوٹا۔
اس طرح سے علاؤالدین کی سلطنت سارے شمالی ہندوستان اور دکن میں پھیل گئی۔

**مغلوں کے حملے:** علاؤالدین کے شروع عہد میں مغلوں نے ہندوستان پر کئی بار حملے کئے اور ایک دفعہ (1298ء) تو کوئی دو لاکھ مغل اپنے سردار قتلغ خواجہ کی سرکردگی میں دہلی تک آپہنچے، لیکن انہیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد سلطان نے سلطنت کو مغلوں سے محفوظ کرنے کے لئے بلبن کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس نے ایک مضبوط فوج رکھی۔ شمال مغربی سرحد پر نئے قلعے تعمیر کروائے، اور پرانے قلعوں کی بھی مرمت کروائی۔ اس سے مغلوں کے حملے رک گئے اور سلطنت میں امن چین قائم ہو گیا۔

**انتظام سلطنت:** علاؤالدین ایک لائق جرنیل ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا منتظم بھی تھا۔ اس کی سلطنت بڑی وسیع تھی، اور اسے اکثر بغاوتوں کا خدشہ رہتا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد سلطان اس نتیجہ پر پہنچا کہ بغاوتوں کی اصل وجہ (1) شراب نوشی (2) وزیروں امیروں کا باہمی میل جول اور (3) دولت کی زیادتی ہے۔ چنانچہ اس نے بغاوتوں کی بیخ کنی کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے:

1۔ شراب پینا منع کر دیا گیا، اور شراب کی تمام دکانیں بند کر دی گئیں اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔
2۔ اس نے وزیروں امیروں کی بہت سی جاگیریں ضبط کر لیں۔ جائیدادیں چھین لیں اور وظائف بند کر دیئے۔
3۔ امراء وزراء کو ایک دوسرے سے بغیر اجازت ملنے جلنے ضیافتیں دینے اور آپس میں رشتے ناطے کرنے سے روک دیا گیا۔ تاکہ انہیں سازشوں کا موقعہ نہ مل سکے۔
4۔ ملک کے اندر جاسوسوں کا ایک جال بچھا دیا گیا۔ جو ہر بات کی اطلاع بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ امرا و وزرا ان جاسوسوں سے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ وہ اپنے گھروں میں معمولی بات چیت کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔
5۔ گنگا اور جمنا کے درمیانی دو آب پر کل پیداوار کا نصف حصہ لگان مقرر کیا۔ اس کے علاوہ مویشی اور مکانات پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا۔
6۔ مغلوں کی روک تھام اور اندرونی بغاوتوں کو دبانے کے لئے سلطان نے ایک زبردست مستقل فوج قائم کی۔

علاؤالدین ایک بہادر سپہ سالار اور زبردست منتظم تھا۔ لیکن بالکل ان پڑھ تھا۔ اس نے اناج اور دوسری اشیائے خوردنی کے نرخ سستے مقرر کر دیئے۔ جو آدمی مقررہ قیمت سے زیادہ

وصول کرتا تھا اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ سلطان نے بڑے بڑے گودام بنوا کر ان میں غلہ جو لگان کے طور پر وصول ہوتا تھا۔ جمع کیا۔

فتوحات سے خوش ہو کر وہ سکندر کی برابری کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اس کے علاوہ اس نے ایک نیا مذہب چلانے کا خیال کیا، لیکن دہلی کے کوتوال (علاء الملک) کے سمجھانے پر اس نے دونوں ارادے ترک کر دیئے۔

علاؤالدین کسی قانون کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ بلکہ موقع کے مطابق احکام جاری کر لیتا تھا۔ وہ مسلمان بادشاہوں میں فی الواقع ایک زبردست بادشاہ ہو گزرا ہے۔ آخر عمر میں وہ بدحواس ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ملک کافور نے اسے زہر دے کر مار دیا۔

**ملک کافور:** ملک کافور اصل میں ایک ہندو غلام تھا وہ فتح گجرات کے وقت شہر کھمبایت سے علاؤالدین کے ہاتھ آیا۔ پھر وہ مسلمان ہو گیا اور اپنی قابلیت سے سلطان کا سپہ سالار اور وزیر اعظم بن گیا۔ وہ ایک قابل جرنیل ثابت ہوا۔ اسی نے ہی علاؤالدین کے لئے دکن کو فتح کیا تھا۔ جب علاؤالدین بوڑھا ہو گیا۔ تو ملک کافور تخت و تاج کو اپنے ہاتھ میں لینے کی فکر کرنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بادشاہ کو کوئی اس قسم کا زہر دینا شروع کیا۔ جس سے وہ گھل گھل کر مر گیا۔ علاؤالدین کی وفات کے بعد ملک کافور نے اس کے ایک کم سن لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا، اور خود مختار کل بن بیٹھا، لیکن کوئی ایک مہینے کے بعد ہی کسی نے ملک کافور کو قتل کر دیا۔

## خاندانِ تغلق

(1320ء سے 1414ء)

**غیاث الدین تغلق:** غیاث الدین خاندانِ تغلق کا بانی تھا۔ وہ بڑا قابل اور رحم دل بادشاہ تھا۔ تخت نشین ہونے سے پہلے وہ پنجاب کا صوبہ دار تھا۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں مغلوں کی روک تھام کے لئے شمالی مغربی سرحد کو قلعے بنوا کر مستحکم کیا اور بنگال کی بغاوت کو فرو کیا، لیکن جب بنگال کی مہم سے واپس آیا تو دہلی کے نزدیک ایک لکڑی کے محل کے گرنے سے جو اس کے بیٹے جونا خاں نے اپنے باپ کے استقبال کے لئے بنوا رکھا تھا مر گیا۔ اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ محل کا گر جانا اتفاقیہ بات نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک سازش تھی۔ غیاث الدین کی موت کے بعد اس کا بیٹا جونا خاں محمد تغلق کے نام سے بادشاہ بنا۔

**محمد تغلق 1325ء سے 1351ء:** محمد تغلق کا اصلی نام جونا خاں تھا وہ بلاشبہ ایک نہایت ہی عالم شخص تھا۔ اس کی ذہانت غیر معمولی اور یادداشت

غضب کی تھی- ایک باکمال شاعر اور فنون لطیفہ کا قدردان ہونے کے علاوہ اسے فلسفہ، نجوم، حساب، منطق، سائنس طب وغیرہ پر بھی عبور حاصل تھا وہ خوش نویس اور انشاپرداز بھی اعلیٰ درجے کا تھا منطق میں اسے اس قدر کمال حاصل تھا کہ لوگ اسے اپنے زمانہ کا ارسطو کہتے تھے محمد تغلق بڑا سخی بھی تھا وہ غریبوں اور محتاجوں کی بہت مدد کرتا تھا اس نے ہسپتال اور خیرات گھر کھول رکھے تھے اور اس کا سلوک اپنی ہندو رعایا کے ساتھ بھی اچھا تھا- وہ اپنے مذہب کا بھی بڑا پابند تھا اور پانچ وقت نماز پڑھتا تھا- شراب سے اسے نفرت تھی-

محمد تغلق بطور ایک بادشاہ کے ناکامیاب ثابت ہوا اور بڑا بدنام ہو گیا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام اس کی تجاویز کو سمجھ نہ سکتے تھے-

## محمد تغلق کی عجیب تجویز:

**(ا) دارالخلافہ کی تبدیلی:** محمد تغلق کی سلطنت بہت وسیع تھی اس کا خیال تھا کہ دہلی میں رہ کر اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرنا مشکل ہے اس لئے اس نے دہلی کی بجائے دکن کے شہر دیوگری کو جو زیادہ مرکزی مقام تھا اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کا نام دولت آباد رکھا لیکن بجائے صرف سرکاری دفتر وہاں لے جانے کے تمام باشندوں کو مال و اسباب سمیت وہاں پہنچنے کا حکم دیا، اور اپنے اس حکم کی تعمیل سختی سے کرائی ہزارہا لوگ اس سفر کی تکلیف سے مر گئے کچھ عرصہ بعد ان بدقسمت لوگوں کو پھر دہلی جانے کا حکم دیا گیا-

**(۲) مغلوں کو روپیہ دینا:** پایۂ تخت بدلنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ مغلوں نے پنجاب پر خوب حملے کرنے شروع کئے اور بڑھتے بڑھتے دہلی تک آ پہنچے محمد تغلق نے بجائے لڑنے کے انہیں بہت سا روپیہ دے کر لوٹا دیا- اس سے ان کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے آخر مجبوراً بادشاہ کو دہلی دارالخلافہ بنانا پڑا-

**(۳) ایران اور چین پر لشکر کشی:** سلطان نے ایران پر حملہ کے لئے ایک لشکر جرار تیار کیا لیکن پھر اس فوج کو منتشر کر دیا جس نے لوٹ مار مچا دی- دوسرے چین پر حملہ کے لئے ایک لاکھ فوجی بھیجے وہ برفباری میں مارے گئے جبکہ واپس ہونے والوں کو قتل کروا دیا گیا-

۴- تانبے کے سکے جاری کئے تو وہ ناکام رہے-

۵- بھاری ٹیکس لگانے سے زمینیں بنجر ہونے لگیں آخر 1351ء میں سندھ کی بغاوت فرو کرتا ہوا یہ بادشاہ ٹھٹھہ کے مقام پر بخار سے وفات پا گیا اور اس کا چچازاد بھائی فیروز تغلق بادشاہ بنا-

**فیروز شاہ تغلق 1351ء سے 1388ء:** فیروز شاہ تغلق سلطان محمد تغلق کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ بڑا پرہیزگار خدا ترس اور شریعت کا بڑا پابند تھا اور اس کا سلوک فتنہ پرور ہندوؤں کے ساتھ اچھا نہ تھا اس کا عہد حکومت امن و امان اور خوشحالی کا زمانہ تھا چنانچہ تغلق خاندان کا سب سے اچھا بادشاہ شمار کیا جاتا ہے۔

**فوجی مہمات:** فیروز تغلق نے بنگال کو جو محمد تغلق کے زمانہ میں خود مختار ہو گیا تھا فتح کرنے کے لئے دو دفعہ اس پر چڑھائی کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی اور اس نے بنگال کی خود مختاری تسلیم کر لی اس کے بعد اس نے سندھ پر فوج کشی کی سندھ فتح تو ہو گیا لیکن فیروز نے اسے وہاں کے راجہ کے ایک رشتہ دار کے پاس ہی رہنے دیا دکن کو فتح کرنے کی اس نے مطلق کوشش نہ کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز تغلق کوئی قابل جرنیل نہ تھا۔

**انتظام سلطنت:** فیروز کا انتظام سلطنت نہایت اچھا تھا۔ اس نے رعایا کی خوش حالی اور امن و امان کی بحالی کے لئے ہر طرح سے کوشش کی اور ملک میں کئی اصلاحات رائج کیں۔

1- اس نے سب سے پہلے محمد تغلق کے زمانہ کے مصیبت زدہ لوگوں کا پتہ لگایا اور سرکاری طور پر ان کی مدد کی۔
2- سزائیں بہت نرم کر دیں وحشیانہ سزائیں مثلاً ہاتھ پاؤں کاٹ دینا وغیرہ منسوخ کر دی گئیں۔
3- کئی ناجائز محصول ہٹا دئے گئے اور صرف وہی محصول رہنے دئے جو اسلامی شریعت کے مطابق تھے۔
4- اس نے بے روزگاروں کو کام مہیا کرنے کا انتظام کیا اور بوڑھے ملازموں کی پنشنیں مقرر کر دیں۔
5- غلاموں کو مختلف قسم کی دستکاری سکھلانے کا انتظام کیا گیا جس سے وہ سوسائٹی کے مفید رکن بن گئے۔
6- غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے ایک الگ محکمہ "دیوان خیرات" کے نام سے قائم کیا۔ غریب لڑکیوں کی شادی کا انتظام بھی یہی محکمہ کرتا تھا۔
7- زراعت کو بہتر بنانے کے لئے دریائے جمنا اور ستلج سے نہریں نکلوائی گئیں۔ موجودہ نہر جمن غربی فیروز شاہ کی نہر پر بنائی گئی ہے اس طرح سے بنجر زمینیں سیراب اور سرسبز ہو گئیں سلطان نے زمین کا لگان بھی کم کر دیا اور لگان کی وصولی میں کاشتکاروں پر کسی قسم کی سختی بھی نہ کی۔
8- فیروز تغلق نے رفاہ عام کے کاموں میں خاص دلچسپی لی مسجدیں، سرائیں، سڑکیں، حمام پل وغیرہ بنوائے مدرسے قائم کئے شفاخانے جاری کئے محتاجوں اور غریبوں کے لئے خیرات گھر

کھولے اور کئی خوبصورت باغات لگوائے۔

9۔ فیروز شاہ نے کئی شہر بھی آباد کئے۔ دہلی کے نزدیک فیروز آباد شہر بسایا۔ اور وہاں کوئی بارہ سو باغ لگوائے اس کے علاوہ حصار فیروز فتح آباد اور جونپور کے شہر تعمیر کروائے۔

وفات: 1388ء میں اس نے بادشاہ نے وفات پائی اور محمود تغلق جانشین ہوا۔

## تیمور کا حملہ (1398ء)

امیر تیمور: امیر تیمور وسط ایشیا کا ایک زبردست فاتح تھا۔ وہ ترکستان کا بادشاہ تھا۔ اور سمرقند اس کا دارالخلافہ تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور اوائل عمر میں ہی اس کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی:۔ اس لئے اسے تیمور لنگ یا تمرلنگ بھی کہتے ہیں۔ تیمور بڑا عالی ہمت اور جنگجو شخص تھا۔ اس نے تقریباً سارے وسط ایشیاء پر اپنی طاقت بٹھائی ہوئی تھی۔ 1398ء میں اس ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر 62 سال کی تھی۔

تیمور بلا کسی مقابلہ کے بڑھتا ہوا دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں محمود تغلق نے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ اور تیمور دہلی میں داخل ہوا۔ ایک دن تیمور کے سپاہیوں اور دہلی کے۔ لوگوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ جس پر تیمور کے چند ایک سپاہی مارے گئے۔ اس پر غصہ میں آ کر تیمور نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ پانچ دن لوٹ مار اور قتل و غارت ہو تا رہا۔ آخر کوئی پندرہ دن دہلی میں رہنے کے بعد تیمور بہت سامال و دولت ساتھ لے کر اپنے ملک سمرقند کو واپس چلا گیا۔ واپسی پر وہ پنجاب کے حاکم خضر خاں کو اپنا وائسرائے مقرر کر گیا تھا۔

حملے کا اثر: 1- تیمور کے حملے سے سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور ملک میں سخت بدامنی پھیل گئی۔ اور کئی صوبے دار خود مختار بن بیٹھے۔

2- تیمور بہت سامال و دولت اپنے ساتھ لے گیا۔ جس سے ملک غریب ہو گیا۔ اور اس کی واپسی کے بعد ایک زبردست قحط پڑا اور کئی جانیں تلف ہو گئیں۔

نوٹ:۔ تیمور کے حملہ کے کچھ عرصہ بعد محمود تغلق واپس دہلی آ گیا۔ اور اس نے 1412ء میں وفات پائی۔

## 4- خاندان سید- (1414ء سے 1450ء)-

محمود تغلق کے بعد تیمور کا وائسرائے خضر خان 1414ء میں دہلی کا بادشاہ بنا۔ خضر خاں سید نسل سے تھا۔ اس لئے اس کے خاندان کو سید خاندان کہتے ہیں۔ اس خاندان میں کل چار بادشاہ ہوئے۔ اور انہوں نے 37 سال تک حکومت کی۔ اس خاندان کی حکومت فقط دہلی اور اس کے ارد

گرد کے چند اضلاع ہی محدود تھی۔ آخری سید بادشاہ نے اپنی سلطنت پنجاب کے افغان حاکم بہلول لودھی کے سپرد کر دی۔ اور آپ کنارہ کش ہو گیا۔ اس طرح لودھی خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔

## 5۔ خاندانی لودھی۔ (1451ء سے 1526ء)

**بہلول لودھی 1451ء سے 1488ء** بہلول لودھی خاندان لودھی کا بانی تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت دہلی کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنا چاہا۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے دہلی کے ارد گرد کے علاقوں کو مطیع کیا اور پھر 26 سال کی لگاتار کوششوں کے بعد جون پور کی زبردست سلطنت کو فتح کر لیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت نشین ہوا۔

**سکندر لودھی 1488ء سے 1517ء:** سکندر لودھی اپنے باپ کی طرح بڑا لائق اور طاقت ور بادشاہ تھا۔ اس نے بہار اور ترہٹ کو فتح کیا اور دہلی کی بجائے آگرہ کو دارالخلافہ بنایا۔ آگرہ کے پاس ہی سکندرہ نامی گاؤں ہے۔ جہاں اکبر کا مقبرہ ہے یہ گاؤں اسی سکندر کے نام پر آباد ہوا تھا۔

سکندر خاندانِ لودھی کا قابل ترین بادشاہ تھا۔ اس کا انتظام سلطنت بہت اعلیٰ تھا۔ اس کے عہد میں ملک میں خوشحالی کا دور دورہ تھا اور کھانے کی چیزیں سستی تھیں۔ اس کی وفات پر اس کا لڑکا ابراہیم لودھی بادشاہ بنا۔

**ابراہیم لودھی 1517ء سے 1526ء:** ابراہیم خاندانِ لودھی کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ بڑا ظالم اور بدمزاج واقع ہوا تھا۔ اور افغان سرداروں کی توہین کیا کرتا تھا۔ اس پر ملک میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اور آخر پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی نے کابل کے بادشاہ بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ بابر نے بڑی خوشی سے اسے منظور کیا۔ اور 1526ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو شکست دی۔ ابراہیم لڑائی میں مارا گیا اور بابر دہلی کے تخت کا مالک بن گیا۔ ابراہیم کی موت سے سلاطین دہلی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

## سلطنت بہمنی اور وجے نگر

محمد تغلق کے عہد حکومت میں دکن کا علاقہ پٹھان سلطنت یعنی سلاطین دہلی کی حکومت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس علاقہ میں دو سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ ایک تو بہمنی سلطنت جو مسلمانوں کی تھی، اور جس کا بانی ظفر خاں تھا۔ دوسرے وجے نگر سلطنت جو ہندوؤں کی تھی، اور جس کی بنیاد دو

ہندو بھائیوں ہری ہر اور بکا رائے نے ڈالی تھی۔

**سلطنت بہمنی 1347ء سے 1526ء:** بہمنی سلطنت ایک اسلامی سلطنت تھی۔ جو محمد تغلق کے زمانہ مین دکن میں قائم ہوئی۔ اس کی بنیاد ایک شخص ظفر خاں نامی نے 1347ء میں ڈالی' اور گلبرگہ کو اپنی راجدھانی مقرر کیا۔ چونکہ یہ شخص ایران کے بادشاہ بہمن شاہ کے خاندان سے تھا۔ اس لئے اس نے اپنا لقب علاؤالدین حسن شاہ بہمنی رکھا۔

اس خاندان کی حکومت کوئی پونے دو سو برس تک رہی' اور اس میں چودہ بادشاہ ہوئے۔ جو اپنی ہمسایہ ہندو ریاست وجے نگر سے ہمیشہ لڑتے رہے۔ اس ریاست میں سب سے مشہور شخص محمود گاواں ہوا ہے۔ جو بہت عرصہ تک اس سلطنت کا وزیر رہا۔ وہ بڑا عقلمند اور سیاسی معاملات میں ماہر تھا۔ اس نے ملکی انتظام میں کئی اصلاحات کیں۔ آخر (1481ء میں) اس کے دشمنوں نے ایک جھوٹے الزام کی بنا پر اسے قتل کروا دیا۔

**زوال:** محمود گاواں کے بعد اس سلطنت کو زوال آنے لگا۔ اور چند ہی سالوں کے اندر اندر یہ سلطنت پانچ خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئی: (1) بیدر (2) برار (3) احمد نگر (4) بیجا پور اور (5) گولکنڈہ۔

بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہو جانے پر بھی ان کا وجے نگر کی ہندو ریاست کے ساتھ جھگڑا برابر جاری رہا۔ اور آخر کار 1565ء میں مذکورہ بالا سب ریاستوں نے مل کر تلی کوٹ کی لڑائی میں وجے نگر کا خاتمہ کر دیا۔

## ظہیرالدین بابر (1526ء سے 1530)

بابر ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کا پورا نام ظہیرالدین تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا۔ اس طرح اس کی رگوں میں وسط ایشیا کے دو بڑے فاتحوں کا خون بہہ رہا تھا۔ اس کا باپ عمر شیخ مرزا ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست فرغانہ کا حاکم تھا۔

بابر کی عمر مشکل سے بارہ سال کی تھی کہ اس کا باپ مر گیا' اور بابر کو سخت مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے رشتہ داروں نے اس پر بڑی سختیاں کیں' اور اس کا آبائی ملک بھی اس سے چھین لیا۔ آخر دس سال کی ناکام کوشش کے بعد بابر اپنے ملک کو چھوڑ کر کابل چلا آیا۔ جہاں وہ 1504ء میں بادشاہ بن گیا۔ اس کے بعد بابر نے ہندوستان کی فتح کا ارادہ کیا' اور کئی بار دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پر حملے کئے۔

**ہندوستان کی فتح:** بابر آخری مرتبہ 1526ء میں پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور تین ہی لڑائیوں میں سارے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔

1- **پانی پت کی پہلی لڑائی 1526ء:** یہ لڑائی بابر اور دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی۔ بابر کی فوج ابراہیم کے مقابلہ میں بہت کم تھی، لیکن زیادہ قواعد دان تھی، اور اس کے پاس توپ خانہ بھی تھا۔ چنانچہ ابراہیم کو شکست ہوئی اور وہ لڑائی میں کام آیا۔ اس لڑائی سے آگرہ اور دہلی پر بابر کا قبضہ ہو گیا۔

2- **کنواہہ کی لڑائی 1527ء:** پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر کو راجپوتوں سے جنگ آزما ہونا پڑا راجپوتوں کا سردار چتوڑ کا بہادر حکمران مہارانا سانگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابر ابراہیم کو شکست دے کر واپس چلا جائے گا لیکن جب اس نے دیکھا کہ بابر نے ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کا عزم کر لیا ہے تو بابر کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گیا۔ فتح پور سیکری کے نزدیک کنواہہ کے میدان میں زبردست لڑائی ہوئی۔ شروع شروع میں تو مغلوں کے اوسان خطا ہو گئے، لیکن بابر نے ایک مو ثر تقریر سے اپنی فوج کو جوش دلایا۔ شراب کے تمام پیالے توڑ ڈالے، اور قسم کھائی، کہ وہ آئندہ کبھی شراب نہیں پیئے گا۔ اب کے مغلوں نے بڑی دلیری سے حملہ کیا۔ راجپوتوں کو شکست ہوئی اور رانا سانگا میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔

اگلے سال یعنی 1528ء میں بابر نے آگے بڑھ کر راجپوتوں کے مشہور قلعہ چندیری کو بھی جو بہادر راجپوت سردار میدنی راؤ کے قبضہ میں تھا فتح کر لیا۔

3- **گھاگرا کی لڑائی 1529ء:** کنواہہ کی لڑائی کے بعد بابر بنگال اور بہار کی طرف بڑھا۔ کیونکہ وہاں ابھی تک افغانوں کی حکومت تھی۔ 1529ء میں دریائے گھاگرا کے کنارے افغانوں کو شکست ہوئی۔

مندرجہ بالا تین لڑائیوں سے بابر سارے شمالی ہندوستان کا مالک بن گیا۔
بابر نے 1530ء میں وفات پائی۔

# نصیرالدین ہمایوں

(1530ء سے 1540ء) اور (1555ء سے 1556ء)

**ہمایوں کی تخت نشینی:** بابر کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا تخت نشین ہوا۔ بابر نے بستر مرگ پر اسے یہ وصیت کی تھی کہ اپنے بھائیوں سے نیک سلوک کرنا۔ چنانچہ

ہمایوں نے تخت نشین ہوتے ہی انہیں سلطنت کے مختلف حصے حکمرانی کے لئے دے دیئے۔ کامران کو جو کابل اور قندھار کا حاکم تھا۔ اس کے علاقوں میں مستقل کر دیا اور پھر جب اُس نے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ تو ہمایوں خاموش رہا۔ مرزا عسکری کو میوات کا علاقہ اور ہندال کو سنبھل کا علاقہ دیا لیکن سلطنت کی یہ تقسیم نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی۔

**ہمایوں کی مشکلات:** ہمایوں تخت نشین ہوتے ہی چاروں طرف سے مشکلات میں گھر گیا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بابر کو اپنی زندگی میں استحکام سلطنت کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ چنانچہ اس کے مرتے ہی ہر طرف بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ مشرق میں بنگال اور بہار کے افغانوں نے سر اُٹھایا۔ جن میں شیر شاہ سب سے مشہور تھا۔ جنوب میں گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ نے دہلی کو فتح کرنے کی تیاریاں کیں۔ شمال مغرب میں اس کے بھائی کامران نے جو کابل، قندھار کا حاکم تھا پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ جس سے ہمایوں کے لئے ان علاقوں کے جنگ جو سپاہی حاصل کرنا ناممکن ہو گیا لیکن ہمایوں کا سب سے بڑا دشمن شاید وہ خود آپ تھا کیونکہ وہ کوئی کام بھی جم کر نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ ایک کام کو اُدھورا چھوڑ کر دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔

## ہمایوں کی لڑائیاں:

1- **بہار پر چڑھائی:** ہمایوں نے سب سے پہلے مشرق کے افغانوں کی خلاف فوج کشی کی اور انہیں شکست دی، لیکن اس نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ شیر شاہ کو پوری طرح مطیع کئے بنا آگرہ واپس چلا آیا۔

2- **گجرات پر چڑھائی 1535ء:** افغانوں کو شکست دینے کے بعد ہمایوں گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر شاہ کو شکست ہوئی، اور وہ کچھ عرصہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اس وقت ہمایوں کو اطلاع ملی کہ شیر شاہ نے بنگال میں بڑی طاقت پکڑ لی ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی عسکری کو گجرات میں چھوڑ ہمایوں آگرہ واپس آیا اور وہاں سے شیر شاہ کے خلاف بڑھا۔ پیچھے سے بہادر شاہ نے گجرات پھر واپس لے لیا۔

3- **شیر شاہ سے جنگ:** شیر شاہ بڑا چالاک تھا۔ جب ہمایوں اس کے خلاف بڑھا۔ تو اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی بلکہ بلا روک ٹوک ہمایوں کو دور ملک کے اندر گھس جانے دیا۔ ہمایوں نے بنگال کے دارالخلافہ گوڑ پر قبضہ کر لیا لیکن موسم برسات کے شروع ہو جانے کی وجہ سے اسے کافی عرصہ وہیں ٹھہرنا پڑا۔ موسمی بخار پھوٹ نکلا اور اس کی فوج کے بہت سے سپاہی مر گئے۔ اسی دوران میں شیر شاہ نے ہمایوں کے سلسلہ رسل و رسائل کو منقطع کر دیا۔ چنانچہ ہمایوں نے اب واپس لوٹنا چاہا لیکن شیر شاہ نے ہمایوں کی واپس لوٹتی ہوئی فوج پر اچانک حملہ کر

دیا اور اسے دریائے گنگا کے کنارے بکسر کے نزدیک چوسہ کے مقام پر شکست دی۔ یہ واقعہ 1539ء کا ہے۔ ہمایوں جان بچانے کی خاطر گھوڑے پر سوار گنگا میں کود پڑا۔ گھوڑا تو منجدھار میں ڈوب گیا لیکن ہمایوں کو ایک سقے نے جس کا نام نظام تھا ڈوبنے سے بچالیا ہمایوں نے اس احسان کے عوض آگرہ پہنچ کر اس سقے کو کچھ وقت کے لئے حکومت کرنے کی اجازت دی اور سقے نے بھی چام کے دام چلائے۔ اگلے سال یعنی 1540ء میں ہمایوں نے پھر شیر شاہ پر چڑھائی کی، لیکن قنوج کے مقام پر شکست کھائی اور بھاگ نکلا، شیر شاہ ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

**ہمایوں کی جلاوطنی:** قنوج کے مقام پر شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں لاہور آیا۔ تاکہ اپنے بھائی کامران سے مدد حاصل کرے، لیکن کامران شیر شاہ کے ڈر سے لاہور چھوڑ کر کابل چلا گیا تھا۔ یہاں سے مایوس ہو کر ہمایوں نے سندھ کا رُخ کیا اور کئی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد امرکوٹ پہنچا، یہاں ہمایوں کا لڑکا اکبر (1542ء) پیدا ہوا۔ امرکوٹ سے ہمایوں ایران کو چلا گیا۔ وہاں کے بادشاہ شاہ طہماسپ نے اس کی مدد کرنی منظور کی۔ ایران سے فوج لے کر ہمایوں واپس روانہ ہوا، اور کوئی دس سال تک اپنے بھائیوں سے لڑنے کے بعد اس نے قندھار اور کابل فتح کئے۔

**ہمایوں کا دوبارہ سلطنت حاصل کرنا:** اس وقت شیر شاہ سوری مر چکا تھا اور اس کے جانشین بڑے کمزور تھے۔ چنانچہ 1555ء میں ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کے حاکم سکندر سور کو سرہند کے مقام پر شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سے پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد ہمایوں دوبارہ بادشاہ بن گیا۔ لیکن اُسے بہت دیر تک حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی۔ کوئی چھ ہی مہینوں کے بعد وہ دہلی میں اپنی لائبریری کی سیڑھیوں سے اُترتا ہوا گر پڑا اور مر گیا۔

# شیر شاہ سوری

(1540ء سے 1545ء)

**شیر شاہ کی ابتدائی زندگی:** شیر شاہ کا بچپن کا نام فرید خاں تھا۔ اس کا باپ حسن صوبہ بہار میں سہسرام کا جاگیردار تھا۔ فرید اپنی سوتیلی ماں کے سلوک سے پریشان ہو کر جونپور چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے خوب دل لگا کر علم حاصل کیا اور فارسی اور عربی میں اچھی لیاقت پیدا کر لی۔ حسن اسے پھر گھر واپس لے گیا اور اپنی جاگیر کا بندوبست اس کو سونپ دیا۔ فرید نے اس جاگیر کا نہایت اعلیٰ اِنتظام کیا اور یہ تجربہ بعد میں اس کے بڑے کام آیا۔ کچھ عرصہ بعد فرید پھر گھر

سے چلا گیا اور بہار کے صوبہ دار کے ہاں ملازم ہو گیا اسی ملازمت کے دوران میں فرید نے ایک شیر کو مار کر شیر خاں کا خطاب حاصل کیا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے وہ بہار کا خود مختار حکمران بن بیٹھا۔ جب ہمایوں اس کے خلاف بڑھا تو اس نے ہمایوں کو 1539ء میں چوسہ کے مقام پر اور 1540ء میں قنوج کے مقام پر شکست دی۔ اور اس کے بعد وہ شیر شاہ کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

**فتوحات:** شیر شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی پنجاب پر قبضہ کر لیا اور دوسرے سال مالوہ بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جودھ پور پر چڑھائی کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ 1545ء میں اس نے کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن بارود کو آگ لگ جانے کی وجہ سے جل کر مر گیا۔

**انتظام سلطنت:** شیر شاہ ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ جس نے انتظام سلطنت کی طرف خاص طور پر دھیان دیا۔ اس نے اپنے پانچ سال کے قلیل عہد حکومت میں بہت سی مفید اصلاحات کیں۔ جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے مشہور ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔

1۔ **سول گورنمنٹ:** شیر شاہ نے تمام سلطنت کو 47 صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور صوبے سرکاروں میں اور سرکاریں پرگنوں میں تقسیم تھیں۔ ان کے خاطر خواہ انتظام کے لئے باقاعدہ افسر مقرر کر رکھے تھے۔

2۔ **زمین کا بندوبست:** ساری زمین کی پیمائش کرائی گئی اور کل پیداوار کا 1/4 حصہ لگان مقرر کیا گیا۔ جو کہ نقدی یا جنس میں ادا کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کہ کاشتکاروں پر کسی قسم کی سختی نہ ہونے پائے، اور نہ ہی زراعت کو نقصان پہنچے۔

3۔ **رعایا کی حفاظت:** رعایا کی حفاظت کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ اگر کہیں چوری چکاری ہو جاتی تھی۔ تو گاؤں کے مقدم یعنی نمبردار کو اس کا پتہ لگانا پڑتا تھا۔ ورنہ نقصان پورا کرنا پڑتا تھا۔ قتل کی واردات ہو جانے کی صورت میں اگر مقدم قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ تو اس کو پھانسی دی جاتی تھی۔ اس طرح سے جان و مال بالکل محفوظ تھا اور مسافر لوگ بے کھٹکے سفر کر سکتے تھے۔

4۔ **محکمہ خبر رسانی:** شیر شاہ نے سارے ملک میں جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ جو بادشاہ کو ہر بات کی اطلاع دیتے تھے۔ اس سے کسی سرکاری حاکم کو بے جا دست درازی کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے محتسب مقرر کر رکھے تھے۔ جو رعایا

کے چال چلن کی نگرانی کرتے تھے۔

5- **محکمہ انصاف:** شیر شاہ بڑا منصف مزاج بادشاہ تھا کیا ہندو کیا مسلمان سب سے یکساں انصاف کرتا تھا۔ کوئی شخص اپنی اعلیٰ پیدائش یا رتبے کی وجہ سے سزا سے نہیں بچ سکتا تھا۔ سزائیں بڑی سخت اور عبرت ناک تھیں۔ چوری اور رشوت ستانی میں پھانسی تک کی سزا دی جاتی تھی۔ عدالتوں کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔

6- **رفاہ عام کے کام:** شیر شاہ نے مسافروں کے آرام کے لئے کئی سڑکیں بنوائیں۔ ان کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرائیں اور کوئیں تعمیر کروائے۔ ان سراؤں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی رہائش اور خوراک کا الگ الگ انتظام تھا سب سے مشہور سڑک جرنیلی سڑک تھی۔ جو پشاور سے بنگال تک جاتی تھی۔ (دوسری سڑک آگرہ سے برہانپور تک۔ تیسری آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک اور چوتھی لاہور سے ملتان تک تھی) ذرائع آمد و رفت کے بہتر ہو جانے سے تجارت خوب چمک اٹھی۔

7- **تعمیرات:** شیر شاہ کو عمارتوں کا بھی بڑا شوق تھا اسنے دہلی کا نیا شہر بسایا اور پنجاب میں ایک شہر رہتاس قائم کیا۔ سہسرام میں اس کا اپنا مقبرہ جو اس نے خود ہی بنوایا تھا۔ ہندوستان کی عظیم الشان عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

8- **فوجی انتظام:** شیر شاہ کے پاس ایک مسلح اور تربیت یافتہ فوج تھی جس کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ اس نے سرکاری گھوڑوں کو داغنے اور سواروں کا حلیہ درج کرنے کا طریقہ جاری کیا تھا۔ تاکہ گھوڑوں کی جھوٹی گنتی کو روکا جا سکے۔ فوج کو نقد تنخواہ ملتی تھی اور اسے اس بات کی سخت ہدایت تھی کہ لڑائی پر جاتے وقت زراعت کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

9- **ڈاک کا انتظام:** ڈاک کا انتظام بڑا باقاعدہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈاک کی چوکیاں بنی ہوئی تھیں، اور ہرکارے ڈاک لے جاتے تھے۔

10- **خالص سکے:** شیر شاہ سے پہلے سکوں میں بہت کھوٹ ہوتا تھا۔ اس نے سکوں کی بھی اصلاح کی اور خالص چاندی کے بہت سے سکے بنوائے۔

11- **سخاوت اور اوقاف:** شیر شاہ نے تعلیم کے لئے بہت سے مدرسے قائم کئے اور طلبا کے لئے وظیفے مقرر کئے گئے۔ بادشاہ نے کئی خیراتی لنگر بھی جاری کر رکھے تھے۔ جن پر ہر سال ایک لاکھ اسی ہزار اشرفیاں خرچ ہوتی تھیں۔

**شیر شاہ کا درجہ:** شیر شاہ کا شمار ہندوستان کے قابل ترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتا یا اس کے جانشین بھی اس جیسے لائق ہوتے تو مغل دوبارہ ہندوستان کے بادشاہ نہ بن سکتے۔ اس نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں ملک میں مکمل امن و امان

قائم کر دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پکا مسلمان ہوتے ہوئے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں سلوک کیا۔ وہ ہر محکمہ کی بذات خود نگرانی کرتا تھا۔ اسے اس بات کا خیال تھا۔ کہ بادشاہت آرام کے لئے نہیں کام کے لئے ہوتی ہے۔

**سلیم شاہ (1545ء سے 1553ء):** شیر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جلال سلیم شاہ یا اسلام شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک لائق آدمی ضرور تھا۔ لیکن اس میں اپنے باپ جیسی قابلیت نہ تھی اس نے آٹھ سال تک حکومت کی۔

**محمد عادل شاہ (1553ء سے 1555ء):** سلیم شاہ کی موت کے بعد ایک سردار محمد شاہ سوری بادشاہ بن بیٹھا اور اس نے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ عادل شاہ بڑا عیاش اور پست ہمت شخص تھا۔ اس نے سلطنت کا انتظام ایک ہندو وزیر ہیموں کے سپرد کر رکھا تھا۔ ملک میں جابجا بغاوتیں ہوئیں اور ابراہیم سوری نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا پنجاب میں سکندر سور خود مختار بن بیٹھا۔ عادل شاہ ان حالات میں چنار کی طرف چلا گیا اور اس طرح میدان خالی پاکر ہمایوں کو واپس آنے کا موقع مل گیا۔

**اکبر کا پیش رو:** شیر شاہ سوری نے اصلاحات کا جو ڈول ڈالا، اکبر اعظم نے بھی اس میں کچھ زیادہ ردوبدل نہ کیا کیونکہ اصلاحات اور اقدامات کا یہ ڈھانچہ مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اسے اکبر کا پیشرو کہتے ہیں، اگر اس کو حکومت کرنے کی کچھ عرصہ اور مہلت ملتی۔ تو وہ تاریخ ہند میں اکبر سے بڑھ چڑھ کر شہرت دوام پاتا۔

# غزنوی سلاطین پٹھان و مغل بادشاہ اور پنجاب میں اسلامی حکومتیں

## (بعض تفصیلات)

محمد بن قاسم کے بعد عملی طور پر اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا۔ البتہ اب پشاور کے راستے برصغیر پر حملے شروع ہوئے اور یہ سلسلہ غزنوی سلاطین نے شروع کیا۔

**الپتگین (متوفی 974ء):** یہ ایک ترکی غلام تھا۔ جسے عبدالمالک سامانی نے خریدا تھا اور اس کی قابلیت کی بنا پر اسے نازک مہمات پر بھیجا جانے لگا اور وہ کامران واپس لوٹتا۔ اس طرح اس نے خراسان کی گورنری کا عہدہ حاصل کر لیا۔ عبدالمالک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا منصور تخت پر بیٹھا۔ الپتگین اور منصور میں چپقلش چل نکلی۔ آخر وہ غزنی پر حملہ کر کے منصور کی جگہ خود بادشاہ بن بیٹھا۔

**سبکتگین (متوفی 997ء):** یہ الپتگین کا ترک غلام تھا جسے آخر کار اس نے اپنی افواج کا جرنیل مقرر کیا اور اسے لغمان اور ملتان پر چڑھائی کا حکم دیا۔ سبکتگین نے حکم کی تعمیل کی وہ ایک لشکر جرار لے کر ملتان پر حملہ آور ہوا اور فتح پا کر یہاں کے ہزاروں لوگوں کو غلام بنایا اور انہیں غزنی روانہ کر دیا۔ بعد ازاں اس نے لاہور پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا جہاں راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ اسے غزنی فوج کے حملہ کا پتہ چلا تو اس نے مقابلے کے لئے ریاست بھاٹیہ کی فوجی امداد بھی حاصل کر لی۔ آخر غزنی فوج نے حملہ کیا اور فتح پا کر لوٹ مار کے بعد یہ فوجیں واپس غزنی چلی گئیں یہ حملہ پنجاب پر غزنویوں کا پہلا حملہ تھا۔ الپتگین نے 974ء میں وفات پائی۔ سبکتگین اب تک اس کا غلام اور جرنیل ہونے کے علاوہ اس کا داماد بھی بن چکا تھا اور اسے اس کے بیٹے اسحاق (جو خورد سال تھا) کی حمایت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ الپتگین کی وفات کے بعد اسحاق کو بادشاہ بنایا گیا اور سبکتگین نے بھی اس کی حمایت جاری رکھی، لیکن وہ دو سال بعد ہی .تقضائے الٰہی وفات پا گیا۔ آخر امرائے سلطنت نے سبکتگین کو تخت شاہی پر بٹھانا منظور کیا اور 976ء میں وہ امیر ناصرالدین سبکتگین کے لقب سے تخت نشین ہوا وہ ایک سچا مسلمان تھا۔ 977ء میں اس کے جاسوسوں نے راجہ جے پال کی فوجی تیاریوں کی اطلاع دی پھر وہ سبکتگین کی سلطنت پر حملہ آور ہو گیا۔ مقابلہ میں اس نے اپنے بیٹے محمود کو بھیجا۔ جس نے اس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ راجہ جے پال نے صلح کی درخواست داغ دی جسے سبکتگین نے تو قبول کر لیا لیکن محمود اس صلح کے خلاف تھا۔

تاہم جے پال نے دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی بطور تاوان لاہور جا کر بھجوانے کا وعدہ کر کے صلح کر لی اور اس کی ادائیگی کے لئے غزنوی حکومت کے نمائندے کو ساتھ لاہور لے گیا۔

لاہور پہنچتے ہی جے پال کی نیت میں فتور آگیا۔ اس نے ہندوستانی ریاستوں دہلی کالنجر اور اجمیر کے راجاؤں سے فوجی مدد حاصل کر کے غزنویوں کو شکست دینے کا منصوبہ بنایا اس نے غزنی نمائندے کو جیل میں ڈالے رکھا اور خود متحدہ ہندوستانی فوجوں کی بھاری جمعیت لے کر غزنی حکومت پر پھر سے حملہ آور ہو گیا۔ سبکتگین کو اس کی بدعہدی کا چل چکا تھا۔ چنانچہ وہ لغمان کی پہاڑیوں کے عقب میں اپنے بیٹے محمود کے ہمراہ اپنی فوج کے ساتھ فروکش ہو گیا اور زبردست تقریر کرتے ہوئے فوجیوں کو پنجاب سے آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر قبضہ کرنے کا حوصلہ دلایا۔ چنانچہ غزنی فوج کے چند دستوں نے بڑی حکمت اور تیز رفتاری سے ہندو فوج کے کمزور حصوں پر حملہ کر دیا اور اسے پہلے ہی حملہ میں حواس باختہ کر ڈالا، پھر مسلمان فوج نے بھرپور حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ حتیٰ کہ پشاور تک کا علاقہ غزنویوں کے زیر تسلط آگیا۔ جسے انہوں نے اپنی حکومت کا حصہ بنا لیا۔ پشاور میں دس ہزار غزنی فوج کی چھاؤنی قائم کی اور ایک عامل کو مقرر کیا گیا۔ سبکتگین نے 997ء میں بلخ کے قریب ترموز کے مقام پر وفات پائی اور اس کا تابوت وہاں سے لا کر غزنی میں دفن کیا گیا اس وقت اس کی عمر چھپن سال تھی۔

**اسمٰعیل بن سبکتگین:** سبکتگین کی وفات کے وقت محمود کا چھوٹا بھائی اس کے پاس تھا۔ جس کی درخواست پر والد نے اسے تخت کا حقدار قرار دے دیا۔ وفات کے بعد اس کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ محمود کو پتہ چلا تو اس نے بھائی کو حکومت حوالے کرنے کا پیغام بھیجا لیکن اس نے اس کا کچھ اثر نہ لیا پھر محمود نے اسے بلخ اور خراسان کی خود مختار تاجوری کی پیشکش کی لیکن اسمٰعیل نے یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ آخر محمود اپنے چچا بغراز اور بھائی امیر نصیرالدین کو ہمراہ لے کر اپنی فوجوں کے ساتھ اسمٰعیل کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ غزنی کے باہر دونوں فوجیں ٹکرا گئیں۔ اسمٰعیل نے اپنی شکست کے آثار دیکھے تو جان بخشی کی درخواست کی جسے محمود نے منظور کر لیا۔ اور تخت پر متمکن ہو گیا۔ جبکہ اسمٰعیل کو شہزادوں کی طرح زندگی گزارنے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ مارچ 998ء کا ہے۔

**محمود غزنوی بن سبکتگین:** تخت نشینی کے وقت محمود کی عمر تیس سال تھی۔ وہ اب تک ایک سپہ سالار، فن ضرب کا ماہر، فنون لطیفہ کا شیدائی، اور شعر و ادب کا پرستار بن چکا تھا اس کے علاوہ اس کے دل میں ہندوستان کی فتح کے خواب جاگزیں ہو چکے تھے۔ پشاور تک تو اس کی سلطنت پہلے ہی تھی ادھر جے پال نے سبکتگین کی وفات کے بعد پشاور کا علاقہ دوبارہ فتح کرنے کی ٹھانی ادھر محمود نے جے پال سے حکومت چھیننے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ جے پال اور

محمود کی فوجوں میں جنگ کا آغاز ہوا تو پہلے ہی دن فریقین کے پانچ ہزار جوان کام آ گئے۔ اگلے روز جنگ کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا جے پال کو شکست ہوئی اور وہ سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت بھی اس کے گلے میں ڈیڑھ لاکھ روپے کا جواہرات کا ہار تھا۔

محمود کو اس جنگ میں بے حساب مال و زر ہاتھ آیا۔ محمود نے جے پال کو قیدی بنائے رکھا اور اسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

**محمود غزنوی کی فتوحات:** محمود (357ھ بحوالہ تاریخ فرشتہ یا) 9- 10 محرم 361ھ کی درمیانی رات کو پیدا ہوا۔ قاضی ابونصر سے ابتدائی تعلیم پائی اور بڑے ہو کر اپنے والد سے فن حرب سیکھا۔ اسمٰعیل کو پناہ دینے کے بعد وہ خراسان کے حاکم کو بھی شکست دے کر اس پر قابض ہو گیا اور خلیفہ بغداد کو اس کی اطلاع دے دی۔ جس نے اسے غزنی اور خراسان وغیرہ سارے علاقوں کا حکمران تسلیم کر لیا اور **یمین الدولہ و امین الملۃ** کا خطاب عطا کیا۔

**سیستان پر حملہ:** 999ء میں محمود نے سیستان (سندھ) پر حملہ کر دیا اور اس کے حاکم "خلف" نے صلح کی درخواست کی اور محمود صلح کر کے واپس چلا آیا۔ پھر "خلف" کا بیٹا طاہر باغی ہو گیا اور باپ بیٹے میں ٹھن گئی خلف نے طاہر کو قتل کرا دیا۔ 1002ء میں محمود نے خلف کو قید کر دیا اور امرائے سیستان کی درخواست پر سیستان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

**جے پال سے جنگ:** نومبر 1001ء میں جے پال کو شکست دے کر اسے 15 بیٹوں اور پوتوں سمیت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس فتح کے بعد محمود نے اس کے پایہ تخت (ھنڈ) ویہند پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی اس کے گرد و نواح کے علاقے فتح کر لئے۔ آخر جے پال نے کثیر زر فدیہ کے عوض رہائی حاصل کی۔ مگر شکست کی ذلت برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے انند پال کو حکومت دے کر خود آگ میں جل مرا۔

## بھاطنہ پر حملہ

اکتوبر 1004ء میں سلطان محمود نے سبی (بلوچستان) کے راستے بھاطنہ (فرشتہ) (غالباً واقع سندھ یا بہاول پور) پر حملہ کیا اور حکمران بجے رائے کو شکست دی۔ سلطان نے وہاں تبلیغ اسلام کا بندوبست کیا اور پھر واپس غزنی چلا گیا۔ ملتان میں قرامطہ فرقے کا موید ابوالفتح داؤد بن نصر حکمران تھا۔ یہ فرقہ اسلام کے لئے زبردست خطرہ تھا۔ جس کا اثر ملتان اور سندھ تک پھیل چکا تھا۔ اپریل 1006ء میں محمود غزنوی ملتان کو فتح کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوا پشاور کے قریب سے دریائے سندھ کو عبور کرنا تھا کہ انند پال (جے پال کا بیٹا) مزاحم ہوا۔ محمود نے اس کی فوجوں کو شکست دی اور

انندپال نے بھاگ کر جان بچائی۔ چنانچہ محمود نے ملتان کا رخ کیا۔ ابوالفتح محمود کی آمد کا سن کر ملتان سے بھاگ گیا اور اس کی فوج سلطانی فوج سے مقابلہ کے بعد شکست کھا گئی۔ شہریوں نے دو کروڑ درہم تاوان ادا کر کے جان بخشی حاصل کی۔ البتہ محمود غزنوی نے قرامطیوں کو معاف نہ کیا۔ یہاں کی حکومت سکھپال کے سپرد کردی جو اسلام قبول کر چکا تھا اور خود واپس چلا گیا۔ سکھپال جے پال کا نواسہ تھا اور نواسہ شاہ کے نام سے مشہور تھا۔

**سکھپال کا ارتداد:** دسمبر 1007ء میں سکھپال مرتد ہو گیا اور بغاوت کر دی محمود شدید برفباری میں بلخ سے سیدھا ملتان آیا سکھپال بھاگ کر کوہستان نمک کی طرف ایک رشتہ دار کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ مگر گرفتار ہو گیا۔ سکھپال کے بعد ابوالفتح نے ملتان میں اقتدار حاصل کر لیا۔ چنانچہ اکتوبر 1010ء میں سلطان نے ابوالفتح کو بھی شکست دی اور اسے قیدی بنا کر غورک بھیج دیا۔ اِدھر ایلک خاں نے خراسان پر قبضے کی کوشش کی تو محمود نے اسے شکست دی، لیکن ایلک خاں کی وفات (13-1012ء کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی سلطان کو خراساں سے محروم کرنے کی سازش کی۔ آخر محمود نے سمرقند پر حملہ کیا اور فتح پائی۔ کاشغر کا والی قدر خاں خود چل کر محمود کے پاس سمرقند میں بہر ملاقات آیا اور محمود کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر کے واپس چلا گیا۔

## انندپال کی سرکوبی

انندپال پنجاب کے زیادہ تر علاقے پر اب بھی قابض تھا۔ وہ محمود سے خائف تھا۔ اس لئے اس نے ہندو راجاؤں کو مدد کے لئے پکارا اور بھاری بھرکم فوجوں کے ساتھ اپنے بیٹے برہمن پال کو پشاور کی طرف روانہ کر دیا۔

محمود بھی 31 دسمبر 1008ء کو غزنی سے روانہ ہوا اور پشاور پہنچا اور "ویہند" کے قریب دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندو افواج کے مقابلے کے لئے سامنے آن کھڑا ہوا اور ان کو شکست دی۔ ہندی افواج بھاگ کر قلعہ نگرکوٹ (ضلع کانگڑہ) میں پناہ گزیں ہوئیں۔ سلطان نے تعاقب کر کے تین دن میں نگرکوٹ کا قلعہ فتح کر لیا۔ یہاں سے اسے بے حساب، مال غنیمت ہاتھ لگا جو بقول ہندوؤں کے پانڈو خاندان کے راجہ بھیم کے زمانہ سے جمع ہوتا چلا آ رہا تھا۔ سلطان نے قلعہ اپنے نائب کے سپرد کیا اور واپس چلا گیا۔

**اکتوبر 1009ء میں نارائن پر حملہ** سلطان نے گنگا کے دوآبہ تک رسائی کے لئے نارائن پر حملہ کیا۔ یہ مقام غالباً موجودہ ریاست الور میں واقع تھا۔

نارائن کے راجہ کو شکست ہوئی۔ اس نے خراج گزاری کے وعدے پر صلح کر لی اور پچاس ہاتھی نذرانہ میں دیئے، اور دو ہزار سپاہی بوقت ضرورت سلطان کی مدد کے لئے دینے کا وعدہ بھی کیا۔ اس

صلح کے بعد خراسان اور ہندوستان کی درمیان تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

**تراوچن پال:** انندپال 1011ء 1010ء میں مرگیا تو اس کا بیٹا ترلوچن پال تخت پر بیٹھا۔ اس کی حکومت صرف کوہستان نمک تک محدود تھی۔ محمود کو اس کی طرف سے بھی شازشوں کا خطرہ تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے مارچ 1014ء میں اس کی راجدھانی نندنہ (نزد ٹلہ بالناتھ) پر حملہ کیا اور اسے فتح کرلیا ترلوچن پال ازیں پیشترمدد کے لئے کشمیر کے حاکم کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ مدد لے کر آگے بڑھ رہا تھا کہ غزنی فوجوں نے جہلم کے قریب مزاحمت کی اور اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ شکست لی خبر سن کر قرب جوار کے راجاؤں نے سلطان کی اطاعت قبول کرلی، اور بہت سے مقامی لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ سلطان نے ان کے لئے مسجدیں تعمیر کرائیں اور تعلیم کے لئے مدرسے جاری کئے۔ ترلوچن پال بھاگ کر کوہ شوالک میں ایک چھوٹی سی ریاست تھانیسر پر قبضہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اب تک پنجاب کا سارا علاقہ سلطان کے قبضہ میں آگیا تھا۔

اب سلطان نے دریائے جمنا کی طرف رخ کیا اور تھانیسر پر حملہ کیا اس کا راجہ بھاگ گیا اور بلا مقابلہ شہر پر قبضہ ہوگیا۔ اس کے مندر سے مشہور مورتی چکر سوامی محمود کے ہاتھ لگی جسے اس نے غزنین لے جاکر وہاں کے چوراہے میں ڈال دیا۔ کشمیر کو فتح کرنے کی دو مرتبہ کوشش کی مگر لوھکوٹ کے قدرتی استحکامات کی وجہ سے سلطان دونوں مرتبہ ناکام رہا۔

اب سلطان نے انندپال کے حامی میرٹھ، متھرا اور مہاجن کے راجاؤں کو سزا دینے کے لئے پہلے قلعہ سرساوہ پر حملہ کیا اور قلعہ پر قبضہ کرلیا پھر بلند شہر یا برن پر حملہ کیا۔ اس کا راجہ ھردت مسلمان ہوگیا۔ پھر قلعہ مہاجن کو فتح کیا اور متھرا پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کے مضبوط قلعہ پر سلطان کا بغیر کسی مقابلہ کے قبضہ ہوگیا۔ یہاں سے بے حساب مال و زر ہاتھ آیا۔ اب قنوج کی باری تھی سلطان 20 دسمبر 1018ء کو قنوج پہنچا۔ اس کا راجہ راجے پال بھاگ گیا اور حملہ کرتے ہی قلعہ فتح ہوگیا اب سلطان واپس روانہ ہوا۔ راہ میں غزنین اور سندھ کے درمیانی پہاڑی علاقے کے قبائل نے سلطان کی فوج کو کافی نقصان پہنچایا بہرحال غزنی پہنچ کر سلطان نے نئے جوش اور ولولے کے ساتھ ان قبائل پر حملہ کیا اور بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے سوا سب کو تہہ تیغ کردیا۔

ادھر کالنجر کے راجہ نندا یا گنڈا راجہ نے قنوج کے راجہ راجے پال کو سلطان کے مقابلے میں بھگوڑا کا الزام دے کر اس کی ریاست پر قبضہ کرلیا اور راجہ جے پال کو قتل کردیا اور اس کے بیٹے ترلوچن پال کو حکومت سونپ کر واپس چلا گیا۔ اسی فتح کے غرور میں اس نے ترلوچن پال ولد انندپال کو بھی سلطان کے خلاف مدد دینے کا وعدہ کیا تاکہ وہ سلطان سے اپنی ریاست چھڑا سکے۔ محمود کو یہ خبر پہنچی تو وہ اکتوبر 1019ء میں گنگا کی طرف بڑھا اور ترلوچن پال ولد نندپال کو شکست دے کر

"باری" کی طرف آگے بڑھا جہاں قنوج کا نیا راجہ پناہ گزیں تھا۔ چنانچہ باری پر بھی سلطان کا قبضہ ہو گیا اور اس کی تباہی کے بعد سلطان کالنجر کی طرف بڑھا اور گنڈا راجہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ورنہ خراج گزاری کا مطالبہ کیا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ راجہ گنڈا کے زیر کمان لاتعداد فوج تھی۔ سلطان نے اس کی فوج دیکھی تو ہیبت زدہ ہو گیا۔ لڑائی چھڑ چکی تھی۔ سلطان ایک طرف جا کر اللہ کے آگے سربسجود ہو کر دعا کرنے لگا۔ کہتے ہیں کہ سلطان نے ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ کے عطا کردہ جبہ کو سامنے رکھ کر اس کے وسیلے سے فتح پانے کی دعا کی۔ چنانچہ سر اٹھایا تو تھوڑی سی دیر میں جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ رات کے وقت کالنجر کا راجہ خوف زدہ ہو کر فرار ہو گیا۔ سلطان نے ٹڈی دل لشکر کے مقابلے میں فتح پائی' اور بہت سا مال و دولت غنیمت میں ملا اور سلطان غزنی واپس چلا گیا تاہم راجہ گنڈا نے پھر سے سرتابی شروع کر دی۔ چنانچہ 1022ء میں سلطان کالنجر کی فتح کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں گوالیار کا قلعہ تھا۔ اس کے راجہ نے صلح کر کے چند ہاتھی نذرانہ میں دیئے۔ آخر سلطان نے کالنجر کا محاصرہ کر لیا اور رسد کے تمام راستے بند کر دیئے۔ راجہ گنڈا نے بھی صلح کی درخواست کی سلطان کی شان میں ہندی زبان میں قصیدہ بھی لکھ کر پیش کیا اور خراج گزاری کا وعدہ بھی کیا۔ چنانچہ سلطان خوش ہو گیا اس نے راجہ گنڈا کو اس کے علاقے کے علاوہ بعض دیگر علاقے اور قلعے بھی بخش دیئے اور غزنی واپس آ گیا۔

**سومنات پر حملہ:** گجرات کاٹھیاواڑ میں بحری لٹیروں کے اڈے تھے جو عرب جہاز رانوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ راجہ بھی مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ قرامطہ بھی ملتان سے نکل کر گجرات میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ چنانچہ سلطان نے گجرات پر حملہ کے لئے راجپوتانہ کا راستہ اختیار کیا۔ اکتوبر 1025ء میں 30 ہزار کے لشکر جرار سے ملتان ہوتا ہوا جیسلمیر کے پایۂ تخت لدورہ کو فتح کرتا چکلو درماتا پہاڑی کے دامن سے گزرا اور مخالف راجاؤں کو شکست دیتا ہوا "ان ہلواڑا" --- کی راجدھانی تک پہنچ گیا اور راجہ کو بھگا دیا اور پھر دیلواڑا کے راستے بروز جمعرات 6 جنوری 1026ء کو سومنات پہنچ گیا۔ شہر کا محافظ بھاگ گیا۔ مندر کے پجاری اور محافظ سلطانی فوجوں کی ساتھ بڑی بے جگری سے لڑے لیکن پہلے دن لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن بھی لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا آخر تیسرے دن سومنات کا شہر فتح ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی۔ خلیفہ بغداد نے بھی سلطان کو شاباش دی۔ القابات اور خطابات سے بھی نوازا۔ آخر وہ 23 ربیع الاول 431ھ (30 اپریل 1030ء) بروز جمعرات شام کے 5 بجے اس دنیا سے آخرت کی طرف سدھار گیا۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**

**اوصاف:** سلطان نے لاہور اور ملتان میں اپنے صوبیدار مقرر کئے تھے۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ اسلامی شریعت پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔ متقی اور پرہیزگار تھا۔ علما اور صوفیاء کا

قدردان اور معتقد تھا۔ ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ سے بہت متاثر تھا۔ البیرونی فردوسی، ابن سینا جیسے لوگ اس کے دربار میں باوقار مقام رکھتے تھے۔ متعصب مورخین نے محمود غزنوی کو لٹیرا ظالم اور سفاک وغیرہ کہنے کی قسم اس لئے لکھا رکھی تھی کہ وہ ایک کامیاب مسلمان حکمران تھا۔ ایاز اس کا پہلا گورنر تھا جو لاہور میں متعین ہوا۔ سلطان نے ملتان کی بجائے لاہور کو پنجاب کا دارالحکومت قرار دیا۔ جس کے بعد لاہور ایک قصبہ کی بجائے شہر بن کر شہرت کے آسمان پر جگمگانے لگا۔ لاہور میں اسلامی تعلیم کے مراکز قائم ہوئے۔ زبان و ادب کی ترقی کا گہوارہ ثابت ہوا اور اسلامی فتوحات کا راستہ محمود غزنوی کی مساعی سے ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔

## محمود غزنوی کے بعد کے غزنوی سلاطین

1030ء سے 1186ء تک کے عرصہ میں گیارہ غزنوی سلطان پنجاب پر بھی حکمران رہے۔

1- سلطان مسعود اول: یہ 1030ء سے 1040ء تک حکمران رہا۔ محمود نے اپنے بیٹے محمد کو خراسان غزنی اور پنجاب کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ لیکن مسعود کو اس فیصلہ سے اختلاف تھا۔ چنانچہ اس نے ستمبر 1030ء میں محمد بن محمود کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال کر اندھا کروا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا 1033ء میں اس نے کشمیر کی طرف بڑھ کر قلعہ سرسوتی کو فتح کر لیا اور 1036ء میں ہانسی کے قلعہ پر حملہ آور ہوا اسے فتح کرنے کے بعد وہ سونی پت کی طرف بڑھا اور اس کے حکمران کو بھگا کر اس پر قبضہ کیا اور کثیر مال غنیمت غزنی بھجوا دیا۔ پھر وہ لاہور آیا جہاں اپنے بیٹے مودود کو اپنا جانشین مقرر کر کے ملک ایاز کو اس کا اتالیق و نگران مقرر کیا۔ اور غزنی چلا گیا۔ پھر اس نے مودود کو بلخ کا حاکم بنا دیا اور خود لاہور کا رخ کیا۔ جسے اس کے ساتھی فوجیوں نے گرفتار کر کے اس کے بھائی محمد کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مسعود کو قتل کر دیا گیا۔

مودود بن مسعود وغیرہ: باپ کے قتل کی خبر سن کر مودود بلخ سے پنجاب آیا اور اپنے باپ کے غداروں کا صفایا کیا اور باغیوں کو تہ تیغ کر کے بادشاہت کا اعلان کیا اور حکومت کو مستحکم کر لیا۔ 1043ء میں ہانسی اور تھانیسر کے راجاؤں نے بغاوت کر دی اور نگر کوٹ کا مندر دوبارہ تعمیر کر دیا اور لاہور کا محاصرہ کر کے اسے نقصان بھی پہنچایا۔ آخر لاہور کے مسلمانوں نے قلعہ سے نکل کر جنگ کی اور ہندو فوجوں کو مار بھگایا اور پنجاب میں غزنوی سلطنت قائم رہی۔ 1049ء میں مودود نے مرض قولنج سے وفات پائی۔ پھر اس کا بیٹا مسعود دوم چار سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا لیکن 1050ء میں ابوالحسین سلطان مسعود اول نے تخت پر قبضہ کر لیا اور پنجاب پر قبضہ قائم رکھنے میں کوشاں رہا۔ لیکن 1052ء میں سلطان محمود کے بیٹے عبدالرشید نے

مملکت کی باگ ڈور سنبھال لی اور ابوالحسین کو معزول کر کے تخت پر متمکن ہو گیا۔ اس نے نگر کوٹ پر دوبارہ تسلط جمالیا۔ لیکن اس کو اس کے حاجب طغرل نامی نے جسے فوجی امیر بنایا گیا تھا قتل کر کے اپنی حکومت قائم کر لی اور چالیسویں دن خطاب عام کے دوران اسے ایک امیر نشتگین نے قتل کر ڈالا۔ جس کے بعد امرائے سلطنت نے سلطان مسعود اول کے بیٹے فرخ زار کو تخت نشین قرار دے دیا۔

سلطان فرخ زار (1054ء تا 1059ء) کے دور میں پنجاب میں عموماً امن قائم رہا البتہ سلجوقیوں نے اس کے خلاف چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ آخر 1059ء میں فرخ زار کا انتقال ہو گیا اور حکومت اس کے بھائی ابراہیم کو ملی۔ سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود 1059ء سے 1098ء سریر آرائے سلطنت رہا۔ سلجوقیوں کے ساتھ اس نے معاہدہ امن کر لیا اور بے فکر ہو کر پنجاب اور ہندوستان کی طرف توجہ کی چنانچہ 1079ء میں اس نے اجودھن (پاک پتن) کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ پھر راجستھان میں ڈیرہ نامی دریائی جزیرہ نما قلعہ کو بڑی مشکل سے فتح کیا اور ایک لاکھ افراد کو غلام بنا کر غزنی روانہ کیا۔ ابراہیم بڑا نیک خو اور پکا مسلمان تھا۔ قرآن حکیم کی کتابت کر کے نسخہ جات مکہ معظمہ بطور نذرانہ بھیجتا تھا۔ اس کے چھتیس لڑکے اور چالیس لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں علماء کرام سے بیاہی گئیں۔ 1098ء میں اس نے انتقال کیا اور اس کا لڑکا سلطان مسعود سوم تخت پر بیٹھا۔

سلطان مسعود سوم (1098ء تا 1118ء) نے تخت نشین ہوتے ہی ملکی قوانین کی تدوین کی۔ اپنے جرنیل تونشتگین کو لاہور کا حاکم بنا کر اسے گنگاپار کے علاقوں پر فوج کشی کا حکم دیا۔ جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ اس کے دور میں غزنی کی جگہ لاہور کو غزنوی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا گیا اور شاہی خاندان کے افراد غزنی سے لاہور میں آن بسے۔ چنانچہ بطور دارالحکومت کے، لاہور کو بہت زیادہ ترقی ملی اس نے 1118ء میں وفات پائی اور سلطان ارسلان بن مسعود (1118ء تا 1121ء) بادشاہ بن بیٹھا اور اپنے باپ کے متوقع جانشین اور اپنے بھائی شیر زار کو قتل کر دیا اور اپنے دوسرے بھائی بہرام کو قتل کرانے کے درپے ہوا۔ بہرام نے سلطان سنجر کی مدد سے ارسلان کو مار بھگایا اور تخت پر قابض ہو گیا اور سلطان کو بعد میں قتل کروا دیا گیا۔

بہرام بن مسعود: 1121ء میں وہ تخت پر بیٹھا۔ لاہور میں ارسلان کا مقرر کردہ حاکم محمد بھیلم تھا۔ اس نے بہرام کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ بہرام نے فوج کشی کر کے اسے زیر کیا اور معافی دے کر غزنی واپس چلا گیا، لیکن بھیلم نے پھر بغاوت کر دی جسے بہرام نے شکست دی اور اپنے سالار حسن بن ابراہیم علوی کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ سلطان بہرام 1156ء میں وفات پا گیا اور اس کا بیٹا سلطان خسرو تخت پر بیٹھا۔ جسے علاؤالدین نے سلطان بہرام کے ہاتھوں

قتل ہونے والے اپنے دو بھائیوں قطب الدین محمد غوری اور سیف الدین کا انتقام لینے کے لئے چین نہ لینے دیا' اور غزنی کو تاراج کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور خسرو لاہور میں پڑا رہا۔ آخر وہ 1160ء میں فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا۔

**سلطان خسرو ملک:** یہ (1160ء تا 1186ء) غزنوی خاندان کا آخری چراغ ثابت ہوا۔ 1180ء میں شہاب الدین محمد غوری نے علاؤالدین کی حمایت سے خسرو کے ملک لاہور پر حملہ کیا' لیکن ناکام رہا آخر صلح نامہ طے پایا اور محمد غوری خسرو ملک کا چار سالہ بیٹا بطور ضمانت امن اپنے ساتھ لے گیا 1184ء میں محمد غوری نے پھر لاہور پر چڑھائی کی لیکن ناکام رہا۔ پھر وہ سیال کوٹ پر حملہ آور ہوا لیکن ناکامی حاصل ہوئی 1186ء میں اس نے تیسرا حملہ لاہور پر کیا اور خسرو ملک کو اس کے بیٹے سے ملوانے کے بہانے بطور مہمان شہر سے باہر اپنے خیموں میں سلا لیا اور رات کے وقت اپنی فوج کو لاہور پر قابض ہونے کا حکم دیا یہ سکیم کامیاب رہی۔ صبح کو خسرو ملک محمد غوری کے خیموں سے بیدار ہوا تو خود کو گرفتار پایا اور محمد غوری نے لاہور پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا

اس طرح غزنوی سلطنت ختم ہو گئی اور اقتدار پر غوری قابض ہو گئے۔

**غزنوی عہد پر تبصرہ:** غزنوی بادشاہ دولت کے پیچھے اس لئے پڑتے تھے تا کہ وہ اپنی فوج میں اضافہ کر کے سلطنت کو وسیع تر اور مستحکم کر سکیں اور یہ ہر حکومت کی خواہش ہوتی ہے نیز یہ خاندان عالموں اور حکماء و داناؤں کا قدر دان تھا۔ اس دور میں اسلام کی تبلیغ کی راہیں کھلیں اسلام ہندوستان میں دور تک پھیل گیا۔ غزنوی سلاطین نے ہندو شاہیہ کو زیر کرنے کے لئے ہندوستان پر پے در پے حملے کئے اور باغی ذہنوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ محمود غزنوی اس کار خیر کا بانی تھا جسے اس کی وفات کے بعد اس کے گیارہ جانشینوں نے بھی قائم رکھا۔ تاہم ہر کمالے را زوال کے مصداق یہ خاندان 200 سو سال کے قریب حکومت نبھا کر رخصت ہوا اور اپنا نام تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں لکھوا گیا اور آئندہ کے مسلم حکمرانوں کو حوصلہ دے گیا کہ وہ برصغیر کو تاراج کر کے یہاں وسیع تر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھیں۔

## شہاب الدین غوری

غزنی پر غوریوں کا قبضہ ہو گیا تو لاہور وغیرہ مقبوضات کو بھی وہ اپنی سلطنت کا حصہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ 1176ء میں شہاب الدین غوری نے ملتان اور اُوچ شریف پر دھاوا بول دیا اور قابض ہو گیا۔ 1179ء میں اس نے پشاور پر قبضہ کیا۔ 1182ء میں اس نے جنوبی سندھ کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا 85-1184ء میں سیال کوٹ کو زیر کیا اور وہاں مضبوط قلعہ تعمیر کیا 1186ء

میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور 1191ء میں تراوڑی یا ترائن کے مقام پر دہلی اور اجمیر کے ہندو راجہ پرتھوی راج سے مقابلہ ہوا لیکن غوری نے کافی نقصان اٹھا کر پسپائی اختیار کی تاہم اگلے سال پھر اسی مقام پر راجپوتوں کی متحدہ افواج کو شکست دے کر چوہان خاندان کا خاتمہ کر دیا اور شمالی ہندوستان پر اسلامی اقتدار کی راہ ہموار کر دی۔ غوری نے دہلی پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تاہم وہ نذرانے وصول کر کے واپس عازم غزنہ ہوا۔

## خاندانِ غلاماں کا آغاز

**قطب الدین ایبک کا تقرر:** 1194ء میں غوری نے قنوج اور بنارس کو بھی فتح کر لیا اور اپنے ہندوستانی مقبوضات کا انتظام اپنے لائق اور معتمد غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کر دیا اور خود واپس چلا گیا۔ ایبک نے "کہرام" نامی مقام کو دارالحکومت قرار دے کر مزید فتوحات کا سلسلہ شروع کیا چنانچہ مشرق میں بنگال اور بہار اور جنوب میں کالنجر اور گوالیار کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

1205ء میں غوری آخری بار لاہور آیا اور باغی گکھڑوں کو شکست دی جو جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور لاہور پر بھی قبضہ کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ اس لڑائی میں گکھڑوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ غوری نے لاہور میں عظیم جشن فتح منایا۔ جس میں قطب الدین ایبک کو شاہی اعزازات اور ملک کا خطاب عطا کر کے ہندوستان میں اپنا ولی عہد مقرر کیا اور بعض انتظامی امور درست کیے۔ واپس غزنی جاتے ہوئے مارچ 1209ء میں اسے ایک جنونی ملحد اور بقول بعض گکھڑوں نے جہلم کے قریب موقع پا کر قتل کر دیا۔ قطب الدین ایبک اس وقت دلی میں تھا وہ لاہور آیا اور امرائے سلطنت نے اسے شاہی تخت پر بٹھا دیا۔ چنانچہ جون 1209ء میں لاہور میں ہی اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی اور قطب الدین ایبک تادم وفات (نومبر 1210ء) لاہور ہی میں مقیم رہا۔ اس کا مقبرہ نئی انار کلی میں ایبک روڈ پر واقع ہے جسے محمد ایوب خان نے نئی شان و شوکت دلائی۔ اور تجاوزات سے پاک کیا اسکی وفات پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر واقع ہوئی تھی۔

قطب الدین ایبک ایک رحم دل اور خدا ترس حکمران تھا۔ ہندو مسلم اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے جیسا کہ اس کی لاہور میں آمد پر ہر طبقہ کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ایبک کے دور میں لاہور اسلامی مرکز بن گیا جہاں اسلام کی تعلیم و تبلیغ کا کام بڑے زوروں پر تھا۔ تاج المآثر کے مطابق لاہور کی 90 فیصدی آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ شہر میں جابجا مدرسے مسجدیں اور خانقاہیں یہ فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ ایبک نے اپنے دور میں ہونے والی متعدد بغاوتوں کو فرو کیا۔ 1206ء میں

تاج الدین یلدز کو شکست دی پھر ناصرالدین قباچہ کو شکست دے کر اس سے سندھ کا علاقہ چھین لیا۔ اسی طرح ملتان کو بھی دوبارہ فتح کیا۔ قطب الدین ایبک نے مزید فتوحات کا سلسلہ ترک کر کے اپنے مفتوحہ علاقوں میں اقتدار مستحکم کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی۔ وہ علما اور صلحا کا بڑا قدر دان تھا۔ اس کا مزار طویل مدت تک مرجع خلائق رہا۔ ماہ رجب میں ہر سال اس کا عرس بھی ہوتا ہے۔

**شمس الدین التمش (التمش):** قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اس کے متبنی آرام شاہ کو تخت راس نہ آیا کیونکہ وہ نااہل اور عیش پرستی کا دلدادہ تھا۔

نیز دہلی کے امراء نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ التمش ان دنوں بدایوں کا گورنر تھا۔ امرا نے اسے تخت نشینی کی دعوت دی جس نے آرام شاہ کو شکست دے کر قتل کر دیا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور دہلی کی راجدھانی میں رہنے لگا۔ اس کے خلاف ایبک کے ایک گورنر ناصرالدین قباچہ نے باغیانہ سر اٹھایا اور ملتان اور سندھ پر قابض ہو گیا۔ نیز بٹھنڈہ، گوہام اور سرسوتی پر بھی قبضہ کر لیا۔ ادھر غزنی کا حاکم تاج الدین یلدوز بھی پنجاب پر نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ کیونکہ وہ اسے غزنی کا حصہ سمجھتا تھا۔ جنوری 1216ء میں ترائن (تراوڑی) کے مقام پر یلدوز اور التمش کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوتی۔ جس میں التمش کامیاب ہوا۔ یلدوز گرفتار ہو کر بدایوں میں لے جا کر قتل ہوا۔ اسی طرح قباچہ کو بھی التمش نے بھرپور شکست دی اور 1217ء میں التمش نے اپنے بیٹے ناصرالدین کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ (اصل نام التمش ہے) 1221ء میں علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کا بیٹا جلال الدین چنگیز خاں سے شکست کھا کر پنجاب میں پناہ گزین ہوا اور کھکھڑوں سے سازباز کر کے بعض علاقوں پر قابض بھی ہو گیا۔ وہ تین سال تک یہاں رہا۔ التمش نے مزید سیاسی پناہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ چنگیز خانیوں کا خطرہ پنجاب کی طرف بھی بڑھ سکتا تھا۔ جلال الدین یہاں سے ناصرالدین قباچہ کے مقبوضات کی طرف نکل گیا اور اس کے ساتھ جھڑپیں کرتا رہا۔ قباچہ فوت ہوا تو التمش نے مکران اور اُچ کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور تین صوبے قائم کئے۔ یعنی لاہور، ملتان اور سندھ اور ہر صوبے میں اپنے گورنر مقرر کئے۔ کھکھڑوں کی شورش مٹانے کے لئے اس نے ان کے مرکز نندنہ پر بھی قبضہ کر لیا اور اپنے مفتوحہ علاقوں میں مکمل امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا التمش نے ہمیشہ اسلامی حکومت کے مفادات کا خیال رکھا اور اہل اسلام کی ترقی اور وقار میں اضافہ کرنے کی سعی کرتا رہا اور کفر و الحاد کی حوصلہ شکنی کی اور بت شکنی کے کارنامے بھی انجام دیئے۔ مالوہ اور اوجین کے مندروں کے بت تڑوا کر وہاں کی مساجد کے بیرونی دروازوں کے باہر بچھوا دیئے تا کہ شرک کی تحقیر ہو۔ التمش نے 26 سال حکومت کر کے 30 اپریل 1236ء کو دہلی میں وفات پائی۔

**رکن الدین فیروز:** یہ التمش کا بیٹا تھا۔ یکم مئی 1336ء کو تخت پر بیٹھا۔ لیکن تخت کی ذمہ داریاں نبھانہ سکا التمش اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ ادھر رکن الدین کی ماں نے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالی اور رکن الدین عضو معطل بنا رہا۔ اس کی ماں ترکان شاہ ایک ترک لونڈی تھی جو حسن اتفاق سے ایک غلام سے بیاہ کرکے اس کے بادشاہ بننے پر ملکہ بن گئی تھی۔ امراء اس کی اصلیت سے واقف تھے۔ دہلی کے امرا نے رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھا دیا اور رکن الدین کو شکست دے کر قید کر دیا گیا اور ترکان شاہ نے بھی اس کے ساتھ قید میں ہی وفات پائی۔ رکن الدین نے ساڑھے چھ ماہ تک اقتدار کے مزے لوٹے۔

**رضیہ سلطانہ:** نومبر 1236ء میں رضیہ سلطانہ حکمران بنی۔ خطاب "ملکۂ دوران" دیا گیا اس نے والد کے ساتھ رہ کر تربیت پائی تھی بعض فوجی مہمات میں بھی کمان کر چکی تھی۔ اس نے خواجہ مہدی غزنوی کو وزیراعظم مقرر کیا، خاں کبیر خاں کو لاہور کا عامل بنایا۔

پھر بٹھنڈہ کے گورنر ملک التونیہ نے بغاوت کر دی۔ رضیہ نے چڑھائی کی لیکن اسے شکست ہوئی اور یاقوت کو قتل کر دیا گیا۔ رضیہ گرفتار ہوئی اور اس نے زندگی کی خاطر ملک التونیہ سے شادی کرلی اور دونوں نے دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اکتوبر 1339ء میں کیتھل کے مقام پر بہرام بن التمش (والئ دہلی) کی فوج سے جنگ میں ملک التونیہ قتل ہوا اور رضیہ کو 14 نومبر کو کسی قاصد نے قتل کر دیا اور بہرام شاہ بن التمش حکومت کرنے لگا۔

**بہرام شاہ:** 1240ء میں یہ تخت پر بیٹھا۔ 1241ء میں چنگیز خاں کی فوجوں نے ملتان پر یلغار کر دی اور اسے روندتی ہوئی لاہور میں داخل ہو گئیں۔ 22 نومبر 1241ء کو لاہور چنگیز خانی فوجوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ منگولوں نے لاہور کے خزانے لوٹے اور مردوں کو غلام بنا کر ایران لے گئے۔ بہرام شاہ نے اختیار الدین کو لاہور کا دفاع کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے منگول واپس جا چکے تھے۔ لاہور سے واپسی پر اختیار الدین نے بہرام شاہ کی خلاف بغاوت کر دی اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔

**علاؤالدین مسعود شاہ:** 1242ء میں رکن الدین فیروز کا یہ بیٹا تخت پر بیٹھا۔ 1244ء میں منگول اُچ شریف کو لوٹ کر لے گئے، ادھر علاؤالدین نے ملکی استحکام کی طرف توجہ کی، لیکن امرا نے حکم عدولی کی اور سازش کے تحت جون 1246ء کو اسے تخت سے اتار کر جیل میں ڈال دیا اور ناصرالدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔

**ناصرالدین محمود:** یہ التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو 10 جون 1246ء کو تخت نشین ہوا۔ اس نے غیاث الدین بلبن کو الغ خاں کا خطاب دے کر وزیراعظم بنا دیا جو التمش کا داماد بھی تھا۔ اس کا بھتیجا شیر خاں تھا جسے اس نے پنجاب سرہند اور ملتان کا گورنر مقرر کرلیا۔

1240ء میں ناصرالدین نے گکھڑوں کی طاقت کو نیست و نابود کر دیا۔ 1248ء میں اس نے بلبن کی بیٹی سے شادی کی۔ 1250ء میں شیر خاں نے غزنی پر حملہ کر کے اسے دہلی کی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ جو منگولوں کے قبضہ میں تھا 1257ء میں منگولوں نے پنجاب کے کئی شہر تباہ کر دیئے اور بعجلت واپس چلے گئے۔ 1258ء میں ہلاکو خاں کا سفیر پنجاب اور دہلی کے دورہ پر آیا اور خوشگوار تاثرات لے کر واپس گیا۔ 1264ء میں ناصرالدین محمود بیمار ہوا اور 18 فروری 1266ء کو وفات پا گیا۔

یہ بادشاہ خاندان غلاماں میں بڑا کامیاب ثابت ہوا اور بیس سال تک حکمران رہا۔ وہ ایک نیک دل اور مخلص مسلمان تھا۔ علم دوست اور علم پرور تھا۔ قرآن حکیم کو بامعنی پڑھتا تھا۔ بے باک جنگجو بھی تھا۔ اس کی بیوی گھریلو کام کاج اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھی۔ بادشاہ قرآن حکیم کی کتابت بھی کیا کرتا تھا۔ وہ بیت المال کو عوامی ملکیت سمجھتا تھا۔

**غیاث الدین بلبن:** 1266ء میں تخت پر بیٹھا اور لاہور آکر اس کی فصیل تعمیر کرائی، پھر وہ بنگال کی بغاوت فرو کرنے چلا گیا۔ 1267ء میں اسکا بھتیجا شیر خاں فوت ہو گیا اور اس کی جگہ بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ بڑا علم دوست اور بہادر تھا۔ امیر خسرو بھی اس کے دربار سے وابستہ تھا بلبن کے دور میں منگولوں نے ملتان پر حملہ کیا جس کا مقابلہ شہزادہ محمد نے بڑی بے جگری کیا۔ حملہ پسپا کر دیا گیا۔ پھر تاتاریوں نے سردار تیمور لنگ کی سرکردگی میں 20 ہزار سواروں کے ساتھ پنجاب پر حملہ کیا اور دیپال پور کو تباہ کر دیا۔ پھر لاہور اور اس کی نواحی آبادیوں کو تاراج کیا۔ شہزادہ محمد کی فوجوں نے مقابلہ کیا اور دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ایک جنگل میں نماز کے دوران قریب چھپے ہوئے دو ہزار منگولوں نے شہزادہ محمد کو قتل کر ڈالا۔ جس سے بلبن کی کمر ٹوٹ گئی اور اسی غم میں وہ 1286ء میں وفات پا گیا۔

**صوفیائے کرام:** بلبن کے عہد میں فریدالدین گنج شکر (پاک پٹن میں) بہاؤالدین زکریا (ملتان میں) قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ بدرالدین ایسے بزرگ زندہ تھے جن کے فیوض سے لوگ فیضیاب ہو رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ بلبن کو فریدالدین گنج شکر کی دعا سے بادشاہی ملی تھی۔ وہ صوفیاء کا عقیدت مند تھا۔ اس کی ایک بیٹی بابا فرید کے عقد میں تھی۔ بلبن اسلام کا شیدائی اور اس کی تقویت کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ عوام پر وہ بڑا مہربان تھا اس نے تاتاری اور منگول حملہ آوروں کا مقابلہ بھی خوب کیا اور انہیں قدم جمانے کا موقع نہ دیا۔

**کیقباد:** یہ ناصرالدین قراخاں بن بلبن کا بیٹا تھا۔ دادا کی وفات کے وقت بنگال کا گورنر تھا۔ عمر اٹھارہ سال تھی دادا کے بعد اسے تخت ملا اور وہ لاابالی پن کی عمر میں عیش و عشرت کا شکار ہو گیا۔ وہ 1287ء میں تخت پر بیٹھا اس کے عہد میں لاہور پر منگولوں نے حملہ کر دیا۔ جسے اس

کے جرنیلوں ملک یار بیگ برلاس اور خاں جہان نے ناکام بنا دیا اور بہت سے منگول گرفتار ہوئے۔

کیقباد نے منگولوں سے سازباز کے شبہ میں اپنے دربار کے تمام مغل افسران کو قتل کرادیا اور خود عیش پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ آخر اسے اس کے امیر جلال الدین خلجی نے 1288ء قتل کروا کے بادشاہت پر قبضہ کرلیا۔

اس طرح خاندان غلاماں کا خاتمہ ہو گیا اور خلجی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔

# خلجی خاندان

**جلال الدین خلجی (1290ء تا 1296ء):** جلال الدین فیروز کیلوکھری (برکنار جمنا پُر فضا محل) میں 13 جون 1290ء کو تخت پر بیٹھا اور اس کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین محمد نے 19 جولائی 1296 کو اسے قتل کرا دیا۔ جلال الدین کے عہد میں ملک چھجو نے بغاوت کی جسے فرو کر دیا گیا۔ پھر علاؤالدین جو بادشا کا بھتیجا اور داماد تھا، کو "کڑہ" کا عامل بنایا گیا جس کی فوج میں چھجو کے باغی ساتھی بھی شامل ہو گئے اور انہوں نے علاؤالدین کو بادشاہی حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ جلال الدین خلجی کافی سلجھا ہوا بادشاہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنی اوقات میں رہتا اور رحمدلی اور نرمی کا مظاہر کرتا۔ وہ قتل کے مستحق سازشی امراء تک کو معاف کر دیتا۔ اسے پتہ تھا کہ لوگ اس سے ڈرتے نہیں لیکن اس نے کبھی دبدبہ جمانے کی کوشش نہ کی۔ وہ رباعی اور غزل بھی کہتا تھا۔ خوش اعتقاد اور خوش اعتماد تھا۔ دوسروں کی باتوں میں آجاتا۔ گویا سادہ لوح بھی تھا لیکن جس طرح اس نے کیقباد کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح اسے اس کے داماد نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ گویا یہ مکافاتِ عمل کا نتیجہ تھا۔

**علاؤالدین خلجی:** یہ 1296ء سے 1316 تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے چچا کے ساتھ غداری کی خفت مٹانے کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور امراء کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ جلال الدین خلجی کے بیٹے ملتان میں تھے۔ انہیں وہاں قتل کرادیا اور جن امراء کو منوں سونا دے کر ہمنوا بنایا تھا استحکام پکڑتے ہی ان سے سونا واپس لے لیا اور بعض امراء کو قید کر دیا اور بعض کو قتل تک کرادیا تا کہ اس کی دہشت قائم ہو جائے۔ 1297ء میں منگولوں نے پنجاب پر حملہ کیا جسے الغ خاں کی سرکردگی میں شاہی فوج نے شکست دی۔ 1298ء میں 2 لاکھ منگول فوج نے پھر حملہ کیا۔ جسے علاؤالدین خلجی نے خود اپنی کمان میں ناکام بنا دیا۔ 1303ء میں منگول ایک بار پھر پنجاب سے گزر کر دہلی پر حملہ آور ہوئے جبکہ علاؤالدین وارنگل، تلنگانہ اور چتوڑ کی تسخیر میں مصروف تھا۔ لیکن اس مرتبہ بھی منگولوں کا کافی جانی نقصان ہوا اور بہت سے منگول گرفتار کر کے قتل کیے گئے۔

1304ء میں چنگیزیوں نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ لاہور پر حملہ کیا گورنر پنجاب

تغلق خاں نے مقابلہ کیا اور چنگیزی فوج کو گھیر کر تباہ کر دیا۔ ان کا سردار علی بیگ بھی مارا گیا۔ 1305ء میں ایک بار پھر ایلک خاں کی سرکردگی میں منگول ملتان پر حملہ کر کے قابض ہو گئے، لیکن تغلق خاں نے ان کو مار بھگایا اور ان کا کابل اور قندھار تک تعاقب بھی کیا۔ جو منگول مسلمان ہو گئے تھے۔ علاؤالدین ان سے بھی بدظن ہو گیا اور پندرہ ہزار نو مسلم منگول قتل کرا دیئے۔ آخر 19 دسمبر 1316ء کو یہ بادشاہ بھی راہی ملک عدم ہوا۔

علاؤالدین اگرچہ ایک ظالم اور جابر بادشاہ تھا وہ ان پڑھ بھی تھا لیکن اس نے رعب اسقدر قائم کیا کہ کسی کو سرتابی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ غلہ اور زرعی اجناس نہایت سستی تھیں۔ کوئی دکاندار کم تولنے کا مرتکب نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ کم تولنے کی سزا یہ تھی کہ جو کوئی جتنا کم دیتا سرکاری کارندے اس دکاندار کی ران کا گوشت اسی مقدار میں کاٹ کر پھینک دیتے تھے۔ چنانچہ کم تولنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی۔ اس نے ہر شے کے بھاؤ مقرر کئے۔ غلہ ذخیرہ کرنے کے لئے سرکاری گودام بنوائے۔ غرباء کے لئے سرکاری خزانے سے مدد دی جاتی تھی۔ بہت سی یادگار عمارات تعمیر کروائیں۔ کسانوں کو جاگیرداروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ ٹیکسوں کی ادائیگی کا امرا کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا مالیاتی نظام میں تبدیلیاں کیں۔ زمین کی پیائش کرائی اور اراضی کی دستاویزات کے اجرا کا طریقہ منضبط کیا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھائیں۔ پیداوار میں اضافہ کیا۔ بیرونی حملہ آوروں پر دھاک بٹھادی وہ صوفیا کی عزت کرتا تھا۔ علمائے حق اس کے سامنے حق گوئی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ ان سے مشورہ لیتا تھا لیکن مصلحت کے تحت اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس نے شراب پر پابندی لگادی تھی اور اس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ سینکڑوں من شراب بہادی گئی۔

**قطب الدین مبارک شاہ 1316ء تا 1320ء):** علاؤالدین کے بعد اس کا غلام ملک کافور تخت کا خواہشمند ہوا۔ جبکہ امراء نے اس کے چھ سات سالہ بیٹے شہزادہ عمر کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور ملک کافور اس کا نگران تھا۔ اس نے عمر کے بڑے بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں کو گرفتار کر کے ان کی آنکھیں نکلوادیں، پھر وہ اس کے چوتھے بھائی مبارک خاں کو قتل کرانا چاہتا تھا کہ سازش کا پتہ چل گیا اور مبارک خاں نے سازشیوں کو حکمت عملی سے ٹھکانے لگا دیا، پھر کسی نہ کسی طرح ملک کافور کو بھی قتل کر دیا گیا اور 1306ء میں مبارک خاں قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا اور اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا، لیکن پھر وہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو کر اغلام بازی تک میں مبتلا ہو گیا۔ اور ہندو غلام ملک خسرو جو بظاہر مسلمان ہو چکا تھا۔ اس کا چہیتا محبوب تھا اس نے مبارک خاں کو 1320ء میں قتل کر دیا اور خود نصیرالدین کے لقب سے تخت نشین ہو گیا۔ لاہور کے گورنر غازی بیگ نے سرسوتی کے مقام پر ملک خسرو کی فوجوں کو شکست دی اور 22 اگست 1321ء کو اسے موت کے گھاٹ اتار

دیا۔ خسرو دراصل ہندو تھا۔ اس نے مسلمانوں کی عزت و آبرو اور شعائر کو دل کھول کر نقصان پہنچایا اور اسلام کی تضحیک کی غازی بیگ تغلق نے اس بے دین سے نجات دلائی تو امراء نے اسے بادشاہ تسلیم کرلیا وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

# تغلق خاندان

**غیاث الدین تغلق (1321ء تا 1325ء):** اس کے عہد میں عموماً امن رہا۔ البتہ اسے بنگال اور نگر کوٹ کی شورشیں فرو کرنا پڑی۔ وہ واپس آرہا تھا کہ اس کے بیٹے جونا خاں نے اس کو خوش آمدید کہا، لیکن جس چبوترے پر اسے بٹھایا اس کے گرنے سے بادشاہ ملبے تلے دب کر فوت ہوگیا۔

**الف خاں محمد تغلق:** بادشاہ کے فوت ہونے کے بعد اس کا بڑا بیٹا الف خاں محمد تغلق 1325ء میں تخت پر بیٹھا۔ 1327ء میں ترمشرین مغل سردار پنجاب پر حملہ آور ہوا اور دہلی تک جا پہنچا۔ محمد تغلق نے تاوان دے کر جان بچائی۔ وہ واپسی پر بہت سامال اور ہزاروں لوگوں کو غلام بنا کر لے گیا۔ 1327ء میں محمد تغلق نے چین کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور نیپال کے راستے چین کی طرف پیش قدمی بھی کی لیکن موسم تبدیل ہوگیا اور ساری فوج برف اور سردی اور دشمن سے نبرد آزمائی میں کام آگئی۔ 1340ء میں دہلی کی بجائے دولت نگر کو دارالخلافہ قرار دیا گیا۔ 1341ء میں ملتان پر افغان سردار شاہو نے حملہ کیا اور مقامی گورنر کو شکست دی جس کا تدارک کرنے کے لئے محمد تغلق خود ملتان تک آیا۔ 1341ء میں ہی پنجاب کے گکھڑوں نے ملک حیدر خاں کی سرکردگی میں لاہور پر حملہ کرکے اس کے گورنر کو قتل کردیا۔

ان کی سرکوبی کے لئے محمد تغلق نے فوج روانہ کی چنانچہ گکھڑ منتشر ہوگئے۔ وہ 1351ء میں سندھ میں ایک مہم کے دوران بخار سے فوت ہوگیا۔

**محمد تغلق کی اصلاحات اور کارنامے:**

1- اس نے ہر محکمے میں اصلاحی قوانین نافذ کئے اور پرانی خرابیاں دور کردیں۔
2- چین پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن موسم کی تبدیلی آڑے آئی اور ساری فوج تباہ ہوگئی۔
3- دہلی کی بجائے دولت نگر کو دارالخلافہ قرار دیا۔ جس نے اس کے لئے بھی بڑی مشکلات پیدا کیں اور ملازمین کے لئے بھی۔
4- اہل لوگوں کو مختلف مناصب پر مقرر کیا۔
5- خراج کی وصولی کا بہتر نظام اپنایا۔

6- پونے چار لاکھ افراد پر مشتمل جدید فوج تیار کی تا کہ بیرونی حملہ آوروں کا قلع قمع کیا جا سکے۔
7- خشک سالی کی وجہ سے پیداوار نہ ہو سکی تو کسانوں کو واجبات معاف کر دیئے بلکہ امداد بھی دی اور چھ چھ ماہ کا راشن سرکاری گوداموں سے لوگوں کو دیا۔ نیز زراعت کو ترقی دی۔
8- زیادہ سے زیادہ اراضی کو زیر کاشت لانے کے لئے ترغیبی سکیمیں شروع کیں۔
9- جدید سکے تانبے کے جاری کئے۔ وہ کرنسی نوٹ بھی جاری کرنے کا سوچتا تھا لیکن اس کی سوچ کو لوگوں نے قبول نہ کیا کہتے ہیں کہ وہ اپنے دماغ اور سوچ کے لحاظ سے کئی سو سال پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ اور جو منصوبے وہ بناتا تھا وہ اس دور میں قدامت پرستی کی وجہ سے پورے نہ ہو سکتے تھے۔ اگر وہ تین چار صدیوں کے بعد پیدا ہوتا تو ترقی کے دروازے کھولنے والوں میں وہ سرفہرست ہوتا۔

**فیروز شاہ تغلق:** (1351ء تا 1388ء) 14 ستمبر 1351ء کو فیروز شاہ تغلق دہلی میں تخت پہ بیٹھا۔ 1353ء میں کلانور میں بیرونی حملہ آوروں کے خلاف منصوبہ بندی کی 1354ء میں دہلی کے قریب فیروز آباد نیا شہر آباد کیا۔ اسی سال دیپال پور کے قریب دریائے ستلج سے 48 میل لمبی نہر نکالی تا کہ زرخیز علاقوں کو سیراب کیا جائے۔ 1336ء میں ہانسی اور حصار کے قریب جمنا سے بھی ایک نہر نکالی اور تیسری نہر دریائے سرسوتی سے نکالی گئی۔ 1358ء میں منگولوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور دیپال پور کے محافظ سالار نے انہیں مال دولت دے کر واپس بھیج دیا۔ اس کے دور میں عموماً امن و امان رہا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ 1388ء میں بادشاہ نے وفات پائی۔

فیروز شاہ تغلق نے چالیس مساجد بنوائیں۔ تیس درسگاہیں کھولیں۔ تقریباً ایک سو کے قریب سرائیں تعمیر کرائیں۔ آبپاشی کے لئے پچاس بند تعمیر کرائے۔ ایک سو کے قریب شفا خانے بنوائے۔ پچاس کنوئیں کھدوائے۔ ڈیڑھ سو پل تعمیر کرائے۔ تیس مصنوعی جھیلیں بنوائیں۔ ڈیڑھ سو باغات لگوائے اور بیس محل تعمیر کروائے۔

غیاث الدین تغلق ثانی اس کا پوتا صرف پانچ ماہ حکومت کر کے قتل کی راہ سے عالم جاودانی کو سدھار گیا۔ پھر اس کا دوسرا پوتا ابوبکر صرف 9 ماہ تک اقتدار میں رہا پھر امرا نے فیروز شاہ تغلق کے بیٹے محمد کو بادشاہ بنا لیا جسے اس کے باپ نے جلاوطن کر دیا تھا۔

**نصیر الدین محمد تغلق دوم:** (1389ء تا 1394ء) اسے اسلام خاں نامی کی سازش کا پتہ چلا کہ وہ ملتان اور لاہور پر قبضہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ اسے قتل کرا دیا گیا 1394ء میں گکھڑوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ آخر وہ 19 فروری 1394ء کو فوت ہو گیا۔ اس کے بعد محمد تغلق دوم کا بیٹا ہمایوں سکندر صرف چالیس دن تخت نشین رہ کر وفات پا گیا۔

**محمود تغلق(1394ء تا 1412ء):** 1396ء میں ایران کے حکمران مرزا پیر محمد جو تیمور کا پوتا تھا دریائے سندھ پر پل بنا کر دریا پار کیا اور اُچ کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خاں گورنر ملتان نے اُچ کے گورنر ملک علی کی مدد کے لئے اپنی فوج بھیجی۔ پیر محمد نے ملتان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔ سارنگ خاں ملتان سے بھاگ گیا۔ دہلی میں مقرب خاں اور اقبال خان دو امیروں نے بادشاہ کو نچانا شروع کر دیا تھا۔ سول وار کا امکان تھا۔ پیر محمد نے ہندوستان کی سیاسی ابتری کا حال تیمور لنگ کو جا بتلایا۔

**تیمور کے حملے:** 1398ء میں اس نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کے گورنر کو بھگا دیا پھر پیر محمد کی قیادت میں ملتان پر قبضہ کر لیا گیا، پھر دیپال پور پر قبضہ کر کے لوگوں کو تہہ تیغ کیا یہاں کے گورنر نے اطاعت قبول کر کے تیمور کو تین سو عربی گھوڑے پیش کئے۔ پاک پتن کو تیموری فوجوں نے احتراماً کوئی گزند نہ پہنچایا، پھر تیمور نے سرسوتی کی طرف پیش قدمی کی اور قتل عام کیا۔ آگے وہ فتح آباد اور سامانہ پر اسی طرح شامت بن کر وارد ہوا، پھر جمنا کو عبور کر کے دہلی کی طرف بڑھا اور شاہی فوجوں کو شکست دے کر پندرہ سال سے زائد عمر کے افراد کے قتل عام کا حکم دے دیا 1399ء میں وہ دہلی پر قابض ہو گیا۔ محمد تغلق گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے ایک لاکھ ہندو قیدیوں کو خطرہ سمجھ کر قتل کروا دیا۔

جنوری 1399ء اس نے کانگڑا فتح کیا، پھر جموں کے راجہ کو گرفتار کر لیا، جس نے اسلام قبول کر لیا۔ کشمیر کے حکمران سکندر شاہ نے اطاعت قبول کر لی۔ بعد ازاں لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔

تیمور کی واپسی کے بعد محمود تغلق 1405ء میں دہلی میں آ گیا اور 1412ء میں وفات پائی۔

# سید خاندان کی حکومت

**دولت خاں لودھی(1412ء تا 1414ء):** اپریل 1412ء میں دولت خاں کو امرا نے بادشاہ تسلیم کر لیا۔ سید خضر خاں اس کا حریف آڑے آیا اس نے دولت خاں پر ساٹھ ہزار سواروں سے حملہ کر دیا۔ دولت خاں لاہور میں محصور ہو کر چار ماہ تک خاموش ہو رہا، لیکن قحط کی وجہ سے سپلائی لائن ٹوٹ گئی اور دولت خاں لودھی نے خضر خاں کی شرائط پر صلح کر لی۔ یہ جون 1414ء کا ذکر ہے، پھر وہ حصار فیروز کی طرف بھاگ گیا۔ جہاں وہ فوت ہو گیا اور لاہور خضر خاں کے ہاتھ آیا۔

**سید خضر خاں:** (1414ء تا 1421ء) بڑا بہادر جرنیل تھا۔ اس نے تیمور لنگ کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے اس کی واپسی پر اسے لاہور، اُچ، ملتان اور دیپال پور کی گورنری مل گئی

تھی۔ خضر خاں 1414ء میں تخت پر بیٹھا اور ملتان کا گورنر اپنے سوتیلے بھائی عبدالرحیم کو مقرر کیا۔ اس کے دور میں پنجاب میں مکمل امن و امان رہا۔ 20 مئی 1421ء کو اس نے وفات پائی۔ دہلی میں تین دن تک اس کا سوگ منایا گیا اور اس کا بیٹا سید مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔

**سید مبارک شاہ:** (1421ء تا 1435ء) نے ملک رجب کو لاہور اور دیپال پور کا گورنر مقرر کیا۔ ادھر گکھڑوں نے سرتابی کی اور جموں پر قبض ہو گئے۔ اگلے سال کشمیر کو لے لیا۔ ترک سردار ملک توغان کو پہاڑی علاقے سے بلا کر اپنے ساتھ ملایا اور 1422ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا، پھر وہ جالندھر کی طرف بڑھے اور مغل گورنر زرق خاں کو گرفتار کر لیا۔ پھر سرہند پر چڑھائی کی اور اسلام خاں گورنر کو شکست دی۔ مبارک شاہ نے عظیم لشکر جمع کر کے سرہند کو دوبارہ حاصل کیا اور دور تک گکھڑوں کا تعاقب کیا۔ لاہور پر دوبارہ قبضہ کیا اور محمود حسن کو لاہور کا گورنر بنا کر واپس دہلی چلا گیا۔ گکھڑوں نے موقع ملتے ہی لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ناکامی کا منہ دیکھا اور کلانور کی طرف بھاگ گئے۔ بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ گکھڑوں نے پھر جموں کے راجہ بھیم رائے کو قتل کر دیا۔ لاہور پر حملہ کیا مگر ناکام رہے اس کے جاتے ہی پھر محاصرہ کر لیا۔ 1429ء میں کابل کے گورنر نے شاہ مرزا کے حکم سے پنجاب پر حملہ کیا اور یہاں سے گورنر ملک سکندر نے تاوان دے کر جان چھڑائی، پھر وہ دیپال پور پر چڑھ دوڑا۔ 1432ء میں گرگ انداز کو لاہور کا گورنر بنایا گیا اور اس نے لاہور کا دفاع جاری رکھا۔ 28 جنوری 1435ء کو مبارک شاہ کو مسجد میں قتل کر دیا گیا۔

**سید محمد:** (1435ء تا 1445ء) مبارک شاہ کے بعد اس کا بیٹا سید محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں انتشار پھیلنے لگا۔ اسلام خاں کے بھتیجے بہلول لودھی نے سرہند پر قبضہ کر لیا اور پانی پت تک جا پہنچا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ سید محمد کی نرمی سے فائدہ اٹھایا۔ 1445ء میں سید محمد وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سید علاؤالدین عالمشاہ تخت پر بیٹھا اور اس نے دہلی کی بجائے راجدھانی بدایوں کو قرار دیا، اور عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اب بہلول کے قبضے میں سرہند، دیپال پور پانی پت اور لاہور تک کے علاقے تھے۔ 1450ء میں سید علاؤالدین عالم شاہ کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور وہ بدایوں میں ہی 1478ء میں وفات پا گیا اور بہلول لودھی نے حکومت سنبھال لی۔

**لودھی خاندان (1351ء تا 1526ء):** بہلول لودھی (1451ء تا 1488ء) 19 اپریل 1451ء کو تخت نشین ہوا۔ اس نے ملتان کی بغاوت فرو کی اور پنجاب میں امن بحال کیا۔ اس نے جونپور کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ پنجاب سے بہار تک اس کی سلطنت تھی۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سادہ غذا اور سادہ لباس

استعمال کرتا۔ فرشی نشست کا عادی تھا۔ اس نے سلطنت کو زیادہ وسیع کرنے کی بجائے پہلے سے حاصل کردہ علاقوں پر اپنا اقتدار مستحکم کیا۔ 1488ء میں اس نے انتقال کیا اور سکندر لودھی کو حکومت مل گئی۔

سکندر لودھی (1488ء تا 1517ء): بہلول کا بیٹا تھا۔ اس کے دور میں کوئی خاص واقعہ نہیں گزرا۔ اس نے بھی حکمت عملی سے حالات پر قابو رکھا اور مختلف مہمات میں کامیابی حاصل کی۔ 24 دسمبر 1517ء کو اس نے وفات پائی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کا شہر بسایا اور اسے دارالحکومت بنائے رکھا۔ وہ عالم فاضل تھا اور علما کا قدردان تھا۔ اس کے عہد میں فرہنگ سکندری کی تدوین ہوئی جو ایک علمی کارنامہ ہے۔

ابراہیم لودھی (1517ء تا 1526ء): سکندر لودھی کا بیٹا تھا یہ ظالم اور خودغرض آدمی تھا۔ اس نے تخت پاتے ہی اپنے بھائی جلال خاں کو قتل کروا دیا۔ لاہور کے گورنر دولت خاں لودھی نے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور دہلی تک جا پہنچا۔ اس کی امداد کے لئے ابراہیم لودھی کا چچا شہزادہ علاؤالدین کابل سے چالیس ہزار سوار فوج کے ساتھ دولت خاں سے آملا۔ چنانچہ وہ دہلی پر حملہ آور ہوئے اور شاہی فوجوں کو زچ کر دیا، لیکن اگلے دن شاہی فوج کو کمک پہنچ گئی اور ابراہیم لودھی کو فتح حاصل ہوئی۔ آخر دولت خاں اور علاؤالدین بھاگ کر پنجاب میں آگئے پھر بابر کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دولت خاں لودھی نے دی۔ اس کا خیال تھا کہ بابر لوٹ مار کر کے واپس چلا جائے گا اور سلطنت دہلی کا مالک اسے بنایا جائے گا، لیکن بابر کی حکمت عملی اب مختلف صورت اختیار کر چکی تھی۔

## مغلیہ خاندان

بابر: 21 اپریل 1526ء کو بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان پانی پت کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور بابر فتح پا کر 26 اپریل 1526ء کو دہلی میں داخل ہوا اور خاندان مغلیہ کی بنیاد رکھی، اور بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ازیں پیشتر وہ 1519ء میں پنجاب پر حملہ آور ہو کر بھیرہ تک کا علاقہ تاراج کر چکا تھا اور چار لاکھ روپے سکہ رائج الوقت (شاہ رخ) لے کر واپس ہوا تھا۔ 1520ء میں بابری افغان سیالکوٹ پر حملہ آور ہوئے تھے، لیکن بدخشاں کی بغاوت کی وجہ سے انہیں واپس جانا پڑا۔ اب کے وہ دولت خاں لودھی کی دعوت پر آیا تھا اور گکھڑوں سے نمٹتا ہوا مبارک خاں اور بہار خاں لودھی اور بھیکن خاں لودھی کو شکست دے کر لاہور پر قابض ہوا تھا۔ چار دن کے بعد یہاں سے دیپال پور کے حاکم دولت خاں لودھی کے پاس پہنچا اس نے خیر مقدم کیا لیکن دونوں میں کھٹ پٹ ہو گئی چنانچہ بابر نے بابا خشکا خاں کو دیپال پور کا گورنر مقرر کر دیا اور دولت خاں پہاڑی

علاقوں کی طرف چلا گیا۔

9 مئی 1526ء کو خزانہ خوب لٹایا اور 1527ء میں کنواہہ کی جنگ جیتی اور اس سے مغل سلطنت کا دائرہ وسطی ہندوستان تک وسیع ہو گیا اور لودھی خاندان کے بچے کھچے افراد کنواہہ سے بھاگ کر بنگال چلے گئے تھے۔ دریائے گھاگرا کے پار محمود لودھی اور بابر کی فوجوں میں ایک اور بڑی جنگ ہوئی جس میں بابر کا پلہ بھاری رہا۔ اسی طرح بابر کی سلطنت بنگال تک وسیع ہو گئی۔ جبکہ غزنی کابل، قندھار اور بدخشاں تک کے علاقے بھی اس کی حکومت میں شامل تھے۔ آخر 26 دسمبر 1530ء کو بابر نے وفات پائی اور ہمایوں باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔

**نصیر الدین ہمایوں:** اس وقت ہمایوں کی عمر صرف 23 سال تھی۔ اس کے بھائی کامران نے پنجاب پر قبضہ کی کوشش کی وہ کابل اور قندھار کا گورنر تھا، لیکن ہمایوں نے پنجاب کا علاقہ بھی اسے دے دیا، اور خود ہندو راجاؤں پر فوج کشی کر کے بغاوتیں فرو کیں۔ بہار اور بنگال میں شیر خان پٹھان نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور مغل علاقوں پر قبضہ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری طرف کامران بھی دہلی پر قبضہ کی نیت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمایوں شیر خاں کا مقابلہ نہ کر سکا اور کامران بھی ناکام رہا۔ ہمایوں کو لاہور میں بھی پناہ نہ ملی۔ شیر خاں اس کے تعاقب میں تھا۔ جولائی 1540ء میں ہمایوں نے شیر خاں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی، لیکن بھائیوں کے نفاق نے شکست کے سامان پیدا کر دیئے۔ اور ہمایوں سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ چند جانثار اور اس کے اہل خانہ بھی تھے 15 اکتوبر 1542ء کو امرکوٹ کے مقام پر اس کی ملکہ حمیدہ بانو کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اکبر رکھا گیا۔ ہمایوں یہاں سے قندھار پہنچا۔ جہاں اس کے بھائی مرزا عسکری نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ایران کی سرحد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ اکبر ولد ہمایوں مرزا عسکری کے ہاتھ لگا اور وہ عسکری کی بیوی کی تحویل میں پرورش پانے لگا اور ہمایوں شاہ ایران کی میزبانی میں رہا۔

## سوری خاندان

**شیر شاہ سوری (1540ء تا 1545ء):** شیر خاں پٹھان پنجاب میں 1472ء میں پیدا ہوا۔ اس کا نام فرید خاں تھا۔ اس کی سوتیلی ماں نے اسے باپ کی جاگیر سے بھگا دیا اور وہ بہار کے حاکم کے پاس 1518ء میں ملازم ہو گیا۔ جس نے محمد شاہ کے لقب سے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ فرید خاں نے ایک شیر کو مار کر اپنے آقا کی جان بچائی تھی۔ لہٰذا اسے شیر خاں کا خطاب ملا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد بہار کی حکومت کی نگرانی شیر خاں کرنے لگا۔ جبکہ جلال الدین ولد محمد شاہ اپنی والدہ سلطانہ لاڈو کی سرکردگی میں وارث تخت تھا کیونکہ

وہ کم سن تھالاڈو فوت ہوئی تو شیر خان نے شیر شاہ کالقب اختیار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جلال الدین بھاگ کر بنگال کے حکمران نصرت شاہ کے پاس چلا گیا۔ پھر شیر شاہ نے چنار کے گورنر تاج خاں کی بیوہ سے شادی کرلی اور مزید علاقہ اس کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ 1540ء میں اس کی کثیر فوج نے ہمایوں کی ایک لاکھ فوج کو شکست دی اور ماہ مئی 1540ء میں شیر شاہ دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور سارے نواحی علاقے فتح کر کے پشاور تک پر قابض ہو گیا۔

**اصلاحات:** شیر شاہ نے عوام کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کی ٹھانی۔ رفاہ عامہ کے بے شمار کام کئے، پل بنوائے، سرائیں تعمیر کروائیں اور سب سے بڑا کارنامہ اس کا یہ ہے کہ اس نے سناء گاؤں (مشرقی بنگال) سے لے کر پشاور تک جرنیلی سڑک بنوائی جس کی لمبائی پندرہ سو میل ہے۔ دوسری بڑی سڑک آگرہ سے برہان پور تک اور تیسری سڑک آگرہ سے جودھپور تک اور چوتھی سڑک لاہور سے ملتان تک بنوائی۔ سڑکوں کے دونوں جانب پھلدار سایہ دار درخت لگوائے اور راہ میں کنوئیں کھدوائے باؤلیاں تعمیر کروائیں اور سرائیں بنوائیں۔ جہاں ہندو اور مسلمان ملازمین بطور خدمت گذار مقرر کئے، اور تیز رفتار ڈاک کا نظام قائم کیا۔ دوسری طرف شیر شاہ سوری نے انتظامی اصلاحات نافذ کیں۔ افسر مقرر کئے اور ان کو ہر طرح کی ذمہ داری سونپی۔ وہ کوتاہی پر سخت بازپرس کرتا تھا۔ پرگنے کی سطح پر انتظامی امور قائم کئے۔ مالیہ کی وصولی کا منظم نظام اختیار کیا۔ چوری کی وارداتوں کا قلع قمع کیا اور سختی کے ساتھ اس کے ثمرات عوام تک پہنچائے۔ فوج کی وردیوں کا خاص اہتمام کیا۔ توپ خانہ اور نئے قلعوں کی تعمیر کے اضافی منصوبے زیر عمل آئے۔ چھاؤنیاں بنوائیں اور وہاں فوجدار مقرر کئے۔ فوجی گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ شروع کیا اور تمام فوج کو جاگیرداروں کی بجائے مرکزی حکومت کی فوج قرار دے کران کو مرکزی سرکاری ملازمین کا درجہ دیا۔ مالیاتی اور اقتصادی میدان میں شیر شاہ نے اراضی کی از سرنو پیمائش کروائی۔ زمین کے درجات مقرر کر کے پیداوار کے اعتبار سے لگان مقرر کیا مال افسروں کو امین کہا جاتا تھا مالیہ کی وصولی کا نظام بہتر بنایا عدل وانصاف کی مد میں اس نے قاضی القضنا کا عہدہ مقرر کیا اور نظام عدل نافذ کیا۔ آخر اپیل بادشاہ خود سنتا تھا۔ ظالم سزا سے بچ نہیں سکتا تھا۔ قاتل کو فوری طور پر سزا ملتی تھی۔ اندھے قتل کی تفتیش کا انتظام ایسا تھا کہ باثر قاتل بھی نہ بچ سکتے تھے۔ شیر شاہ کے عہد میں راستے محفوظ ہو گئے۔ سفر کرنا آسان ہو گیا۔ آخر کالنجر کے محاصرہ کے دوران شیر شاہ اپنے اسلحہ خانہ میں آگ لگنے سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔

یہ واقعہ 22 مئی 1545ء کو پیش آیا۔

**شیر شاہ کے جانشین:** اسلام شاہ سلیم شاہ سوری (1545ء تا 1553ء) 25 مئی 1545ء کو سلیم شاہ سوری ولد شیر شاہ کو امرا نے بادشاہ تسلیم کیا۔ اس کا اصل نام

جلال خاں تھا- وہ سلیم شاہ یا اسلام شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا- لاہور کے گورنر ہیبت خاں (لقب عظیم خاں) نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اسلام شاہ نے چڑھائی کی- دونوں فوجیں انبالہ کے مقام پر ٹکرا گئیں- اسلام شاہ نے فتح پائی اور ہیبت خاں نے بھاگ کر جان بچائی 1548ء میں ہیبت خاں نے گکھڑوں کو ساتھ ملا کر شورش برپا کی اسلام شاہ فساد خون کے عارضے میں مبتلا تھا تاہم اس نے چیتے کی سی تیزی سے پنجاب کا رخ کی اور اقتدار کی حفاظت میں کامیاب رہا 1553ء میں اسلام شاہ نے وفات پائی- اسی سال گجرات کے حکمران محمود شاہ اور احمد نگر کے بادشاہ بہرام نظام شاہ کا انتقال ہوا- اسلام شاہ کے بعد اس کا بارہ سالہ بیٹا شہزادہ فیروز تخت پر بیٹھا جسے تین دن کے بعد شیر شاہ سوری کے بھتیجے مبارز خاں ولد نظام خاں نے قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور محمد شاہ سور لقب اختیار کیا یہ ایک ان پڑھ اور کمینہ صحبت شخص تھا- یہ بری حرکات میں پڑ گیا- ہیموں بقال نامی سبزی مارکیٹ کے ناظم و ناظر نے خوشامد کے ذریعے محمد شاہ سور کے دربار تک رسائی حاصل کی اور اس کا وزیر بن گیا- ہیموں بقال بھی نالائق تھا- مملکت کی حالت خستگی کا شکار ہو رہی تھی- آخر ابراہیم خاں سور نے 1554ء میں محمد شاہ کو ایک معاہدہ کے تحت مشرقی علاقوں تک محدود کر دیا اور باقی علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا-

**سکندر شاہ سور (1554ء تا 1555ء):** اس بندر بانٹ میں حصہ بٹورنے کے لئے شیر شاہ سوری کا ایک بھتیجا احمد خاں سور آگے بڑھا- اس نے ہیبت خاں سے رابطہ کر کے پنجاب پر حکومت کا منصوبہ بنایا- چنانچہ احمد خاں سور نے سکندر شاہ سور کے لقب سے پنجاب میں اپنی حاکمیت کا اعلان کر دیا بعد ازاں بارہ ہزار کے لشکر سے ابراہیم خاں سور کی ستر ہزار سپاہ کو شکست دے کر اس کا علاقہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور ابراہیم خاں سور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا-

**ہمایوں کی واپسی:** ہمایوں ایرانی بادشاہ کی افواج کے سہارے ہندوستان پر حملہ ہوا' اور نفاق زدہ سور خاندان کے حکمرانوں کو جولائی 1555ء میں شکست دے کر اس نے پنجاب' سندھ اور راجپوتانہ پر قبضہ جما لیا اس طرح مغل سلطنت بحال اور سوری خاندان کی بادشاہت ختم ہو گئی ہمایوں 21 جنوری 1556ء کو اکاون 51 برس کی عمر میں انتقال کر گیا-

**اکبر کی تخت نشینی:** اکبر کامران مرزا کی بیوی کے پاس پرورش پا رہا تھا- ہمایوں نے جب افغانستان پر قبضہ کیا تو 1554ء میں اسے اس کا بیٹا بھی زندہ اور سلامت مل گیا جسے کامران نے یرغمال بنا رکھا تھا- پنجاب پر قبضہ کے بعد ہمایوں نے اسے اپنے معتمد جرنیل بیرم خاں کے ہمراہ سکندر شاہ سور کا مقابلہ کرنے کے لئے سرہند کی طرف روانہ کر دیا تھا- اس طرح اکبر کی جنگی تربیت ہونے لگی تھی- ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر بیرم خاں کے ہمراہ پنجاب میں

کلانور (ضلع گورداسپور) کے مقام پر تھا۔ بیرم خاں نے مستعدی دکھائی اور 15 فروری 1556ء کو کلانور میں ہی اکبر کی تاجپوشی کی رسم ادا کرکے اسے جلال الدین محمد اکبر کے نام سے شاہی تخت پر بٹھادیا۔

**پانی پت کی دوسری لڑائی:** ہیموں بقال نے ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر کو نیچا دکھانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے پنجاب کے علاقوں پر قبضہ کا مدعی ہو کر بکر ماجیت کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور پورے ہندوستان پر ہندو غلبہ کے لئے کوشاں ہوا اور نومبر 1556ء میں اکبری فوجوں پر یلغار کرتا ہوا پانی پت کے میدان تک آگیا جنگ کا میدان اکبر کے ہاتھ رہا۔ کیونکہ بیرم خاں (اتالیق اکبر) نے جوانمردی دکھائی اور ثابت قدمی سے حالات کو اپنے حق میں کرلیا۔ ہیموں بقال کو شکست ہوئی اور اسے قتل کیا گیا۔ بیرم خاں نے 1554ء سے 1560ء تک اکبر کے نگران (اتالیق) کے طور پر شاہی خدمات انجام دیں اور پھر غلط فہمی کی بنا پر وہ اکبر کے غصہ کی زد میں آگیا۔ تاہم اسے حج پر بھیج دیا گیا آخر 1561ء میں بیرم خاں کو ایک افغان نے اثنائے راہ میں گجرات میں قتل کردیا۔

**جلال الدین محمد اکبر (1556ء تا 1605ء):** اکبر ایک کامیاب حکمران ثابت ہوا۔ قسمت بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ بیرم خاں جیسا نمک خوار اس کا ہمدرد اتالیق اسے مل گیا جس نے برے وقت میں اسے سہارا دیا تھا اور چار مشکل سال (1556ء تا 1560ء) اس کے نکال دیئے تھے۔ بہرحال بیرم خاں کے بعد اکبر نے خود کو سنبھال لیا۔ ہمایوں کے جرنیل اور لاہور کے گورنر نے اکبر کی کم سنی کے پیش نظر اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ جسے لاہور کے کوتوال گلزار پہلوان نے گرفتار کرلیا وہ جیل سے بھاگ کر سازشوں میں مصروف ہوا کبھی گکھڑوں کو آلۂ کار بنایا کبھی دیپال کے حاکم بہادر خاں سیستانی سے سازباز کی۔ تاہم آخر وہ گرفتار ہو کر مارا گیا 1566ء میں اکبر کا چچازاد بھائی محمد حکیم مرزا لاہور میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے حملہ آور ہوا۔ لیکن اکبری فوجوں کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گیا۔ 1575ء میں خان جہاں کو لاہور کا گورنر بنایا گیا اور 1579ء میں غیر مسلم سالار راجہ مان سنگھ کو یہ منصب عطا ہوا۔ حکیم مرزا ایک بار پھر بھاری فوج لے کر رہتاس کے قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ مان سنگھ نے مقابلہ کیا لیکن لاہور کو بچانے کی خاطر لاہور کے قلعہ میں محصور ہو کر اکبری کمک کا انتظار کرنے لگا۔ اکبر کو پتہ چلا وہ آیا تو حکیم مرزا نے فرار ہونا چاہا۔ آخر اکبر نے اس کو معاف کرکے حکومت میں باعزت عہدہ دے دیا یعنی کابل کا گورنر بنا دیا 1580ء میں حکیم مرزا وفات پا گیا جس پر کنور مان سنگھ کو کابل کا گورنر بنا دیا گیا۔

**کشمیر کی تسخیر:** 1585ء میں اکبر نے کشمیر کو تسخیر کرنا چاہا۔ اس کا حاکم یوسف خاں تھا۔ سردی کی وجہ سے اکبری سالاروں کو صلح کرنا پڑی۔ تاہم یوسف خاں نے اطاعت کا اظہار کیا لیکن اکبر نے ناراضگی ظاہر کی۔ یوسف خاں کابل کی طرف بھاگ گیا۔ تاہم آخر صلح ہو گئی اور اسے کشمیر کا گورنر بنا دیا گیا۔

**لاہور دارالخلافہ:** 1591ء میں اکبری فوجوں نے سندھ کو فتح کر کے ایسے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا 1582ء میں لاہور کو (دہلی کے بعد) ثانوی دارالخلافہ کی حیثیت دی اور 1598ء تک اسے یہ حیثیت حاصل رہی۔

**نظم و نسق:** اکبر بڑا ذہین اور موقع شناس تھا۔ وقت کی نبض پر ہر وقت ہاتھ رکھے رہتا۔ اس سلسلے میں وہ دین و ایمان کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس کا مقصد سلطنت کو قائم رکھنا اور اسے مستحکم کرنا تھا۔ شیر شاہ سوری کا مختصر سا عہد اکبر کے لئے روشن چراغ ثابت ہوا۔ اس نے انہی خطوط پر آگے بڑھنے کا عزم کیا۔ مالیاتی نظام میں قدرے ترامیم کر کے اسے نافذ کیا انتظامی عہدوں پر رشتہ داروں کی بجائے اہل لوگوں کو مقرر کیا۔ ہندوؤں سے تعلقات مضبوط بنانے کے لئے راجپوتوں سے رشتہ داریاں قائم کیں۔ ہندو بیویوں کے زیر اثر اس نے ہندوانہ عبادات و رسومات کو بھی اپنایا اور آخر "دین الٰہی" کے نام سے نیا مذہب جاری کیا۔ جس کی بیخ کنی کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ سے کام لیا۔ اکبر کا دور دینی لحاظ سے اسلام کے انحطاط کا دور تھا۔ آخر اکبر 13 اکتوبر 1605ء کو اکاون سال حکومت کر کے فوت ہوا اسے آگرہ کے قریب سکندرہ کے مقام پر دفن کیا گیا اور اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔

**جہانگیر (1605ء تا 1627ء):** شہزادہ سلیم (پ 1569ء) شیخ سلیم چشتی کی دعا سے پیدا ہوا۔ انہی کے نام سلیم پر نام رکھا۔ "شیخو بابا" کا نام بھی پایا کہ اکبر اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔ "شیخوپورہ کا نام بھی اس نام کی یاد تازہ کرتا ہے۔ 1606ء میں شہزادہ خسرو نے بغاوت کی اور لاہور پر یلغار کر دی۔ جسے جہانگیر نے خود فرو کیا۔ شہزادہ بھاگ کر کابل چلا گیا لیکن اس کے ساتھیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ گورو ارجن سکھوں کے چوتھے گورو نے خسرو کا ساتھ دیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے لاہور جیل میں رکھا اور بعد ازاں قتل کر دیا گیا۔ سکھوں کا عقیدہ یہ ہے کہ گورو صاحب گرفتاری کے بعد قید سے فرار ہو کر غائب ہو گئے تھے اور ان کو اللہ نے اٹھا لیا تھا۔ سکھ چوتھے گورو کو شہید گورو کہتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد سکھوں نے مغلوں سے دشمنی کا رویہ اختیار کر لیا۔ جہانگیر 1607ء میں جنوری میں واپس آگرہ چلا گیا۔ 1616ء میں پنجاب میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی جو آٹھ سال تک جاری رہی۔ اس نے گھر کے گھر خالی کر دیئے۔

اقبال نامہ جہانگیری کے مطابق لاشوں کو اٹھانے والا کوئی نہ ہوتا تھا 1616ء میں جہانگیر نے

خرم کو شاہجہاں کا خطاب دیا اور بیس ہزاری منصب دیکر دربار میں تخت کے دائیں جانب کرسی عطا کی 1622ء میں شہزادہ خسرو بغاوت کے جرم میں زندان میں تھا کہ اسے اجل نے آلیا۔

**نور جہاں:** نور جہاں کا نام مہرالنساء تھا۔ مرزا غیاث الدین کی یہ بیٹی قندھار کے قریب ایران سے نقل مکانی کے دوران میں بے سرو سامانی کے عالم میں پیدا ہوئی تھی جو 1594ء میں علی قلی خاں نامی ایرانی سے بیاہی گئی۔ وہ شہزادہ سلیم کا باڈی گارڈ بن گیا اور شیر کو شکار کر کے شیر افگن کا خطاب پایا۔ 1605ء میں شیر افگن کو بنگال کا گورنر بنایا گیا۔ جہاں مہرالنساء نے "لاڈلی بیگم" بیٹی کو جنم دیا۔ مہرالنساء کو شہزادہ سلیم نے پہلی ہی نظر میں دل دے دیا تھا مگر اظہار نہ کر سکتا تھا کہ وہ کسی کی منکوحہ تھی۔ شیر افگن شہزادہ خسرو کی حمایت کے الزام میں باغی قرار دے کر مارا گیا اور مہرالنساء اور لاڈلی بیگم جہانگیر کی سوتیلی والدہ سلیمہ بیگم کی کفالت میں دہلی میں چار سال تک رہیں۔ 1611ء میں مہرالنساء کو نور محل کا خطاب دیا گیا۔ اسی سال جہانگیر نے اس سے شادی کرلی۔ اور نور جہاں کا خطاب بھی دیا اس طرح وہ مہرالنساء سے ملکہ نور جہاں بن گئی اور جلد ہی اس نے جہانگیر کے اعصاب پر قبضہ کر کے حکومت میں عمل دخل پیدا کر لیا اور جہانگیر کی معاونت کے بہانے شاہی اختیارات استعمال کرنے لگی۔ آصف خاں اس کا بھائی تھا جسے اس نے پنجاب کا گورنر مقرر کروایا۔ پھر مرکز میں وزارت بھی اسے دلوائی۔ اس کی بیٹی ارجمند بانو کی شادی خرم سے ہوئی (وہ بعد میں شاہجہاں کے نام سے تخت کا وارث ہوا۔) اور جس کی یاد میں روضہ تاج محل کا عجوبہ منصہ شہود پر آیا۔ لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ شہریار سے کر دی گئی اور نور جہاں اسے کوشش کے باجود بادشاہ نہ بنوا سکی۔ اس طرح آصف خاں اور نور جہاں میں کشمکش بھی رہی۔ تاہم وہ جہانگیر کی زندگی میں ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک بنی رہی۔

**حضرت مجدد الف ثانیؒ:** جہانگیر نے اکبر کے دین الٰہی کی سرپرستی حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں کے نتیجہ میں بند کر دی اور اسلامی تعلیمات کا احیاء کیا اس کے بہت سے جرنیل حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو چکے تھے۔ نور جہاں شیعہ عقائد کی حامل اور پاسدار تھی چنانچہ جب جہانگیر نے حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کیا تو آپ کے مرید جرنیلوں نے جہانگیر سے سرتابی کی۔ لیکن جب غلط فہمی دور ہو گئی تو حضرت مجدد کے حکم سے سب جرنیل جہانگیر کے اطاعت گزار بن گئے اور رہائی کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نے خود بھی لشکر سلطانی میں رہ کر تبلیغ اسلام کا فریضہ نبھایا اور روحانی تربیت کا سلسلہ جاری کیا۔ جہانگیر بیمار ہوا تو وہ کشمیر کے صحت افزا مقام پر چلا گیا۔ واپسی میں راجوری کے قریب 29 اکتوبر 1627ء کو خالق حقیقی سے جاملا۔ لاہور میں اس کا شاندار مقبرہ بنایا گیا۔ جس کے ساتھ ہی آصف خاں (آصف جاہ) کا مقبرہ ہے اور نزدیک ہی نور جہاں کا مقبرہ ہے۔ جو 1641ء میں فوت ہوئی

تھی۔

جہانگیر کا عدل و انصاف شہرت کے بام عروج تک پہنچا ہوا تھا۔

**شاہجہان (1628ء تا 1658ء):** جہانگیر نے وصیت کی کہ شہزادہ شہریار کو تخت نشین کیا جائے، لیکن شہزادہ خرم نے مخالفت کی۔ شہریار نے لاہور پہنچ کر فوراً قبضہ کر لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شہزادہ خرم دکن میں تھا اس نے آصف خاں کے کہنے پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور لاہور کی طرف بڑھا۔ 1627ء میں لاہور سے تین کوس دور دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی اور لاہور پر شہزادہ خرم کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ شہریار گرفتار ہوا جسے تین دن بعد اندھا کر دیا گیا۔ آخر 4 فروری 1628ء کو شہزادہ خرم شہاب الدین شاہجہان کے نام سے تخت نشین ہوا جس کی عمر ابھی چھتیس سال تھی۔ اس نے آصف خاں کو اپنا وزیر خاص مقرر کیا اور مہابت خاں کو کمانڈر انچیف بنایا جس نے مختلف مرحلوں میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ 1631ء میں شاہجہاں نے نئی دہلی آباد کی اور اسے شاہجہاں آباد کا نام دیا۔ 1658ء میں دہلی کی جامع مسجد تعمیر کروائی۔ جو دنیا کی بہترین مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔ ارجمند بانو کی یاد میں ساڑھے سات لاکھ پونڈ کی لاگت سے اس نے 22 سال میں روضہ تاج محل تعمیر کروایا۔ 1639ء میں علی مرزان خاں کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے لاہور کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے کے اہتمام کئے۔

1641ء میں آصف خاں نے لاہور میں وفات پائی۔ 1650ء میں شاہجہاں نے کئی ماہ تک لاہور میں قیام کیا اور اپنا دربار یہیں منعقد کرتا رہا۔ شاہجہاں کو اسلامی فن تعمیر کے حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسے مورخین معمار بادشاہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

ستمبر 1657ء میں شاہجہاں بیمار ہو گیا اور آٹھ دن تک بیہوش رہا۔ چاروں شہزادے تخت کے وارث بننے کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔ یہ چاروں ارجمند بانو عرف ممتاز محل کے بطن سے تھے۔ دارالشکوہ پنجاب کا گورنر تھا جو نائب السلطنت بن کر والد کی علالت کے دوران شاہی خدمات انجام دینے لگا۔ اورنگزیب دکن میں تھا۔ جس نے مراد کے خلاف جنگ کے لئے فوج بھیجی اور شاہی توپخانے کا سربراہ میر جملہ خفیہ طور پر اورنگزیب سے جاملا اور ادھر شجاع بھی اس جنگ میں کود پڑا۔ قصہ کوتاہ۔ اس جنگ میں اورنگزیب کامران ہو کر 1658ء میں تخت پر بیٹھا۔

اور شاہجہان کو آگرہ کے قلعہ میں نظربند کر دیا جہاں وہ 1666ء میں فوت ہو گیا اور اسے روضہ تاج میں ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ یہ بات من گھڑت ہے کہ اسے اورنگزیب نے انگریز معالج کے ذریعے زہر دلا کر ہلاک کرا دیا کیونکہ اگر اس نے یہی کام کرنا تھا تو وہ پہلے بھی کر سکتا تھا۔ اس کے لئے آٹھ سال تک انتظار کھینچنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ اورنگ زیب پر بعض دوسرے الزامات کی طرح کا ایک الزام ہے جو اس کے اسلامی

اور سنی تشخص کی وجہ سے اس پر لگا دیا جاتا ہے۔

**اورنگزیب عالمگیر (1658ء تا 1707ء):** اورنگزیب عالمگیر ایک سنی اور حنفی العقیدہ مسلمان بادشاہ تھا۔ جو سرہند شریف کے نقشبندی خانوادہ کا معتقد تھا۔ شاہجہان بھی اسی خانواہ میں بیعت تھا۔ ہندو سکھ انگریز اور شیعہ مصنفین نے تعصب کی بناء پر اورنگزیب عالمگیر کو بری طرح مطعون کیا ہے۔

نیز فن کار طائفوں مثلاً موسیقاروں، بھانڈوں، نجومیوں، شاعروں وغیرہ کو بھی عالمگیر نے اپنے دربار میں کوئی جگہ نہ دی تھی اس لئے وہ بھی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اور ہر ایک نے اپنی بھڑاس نکالی، ورنہ عالمگیر تو ایک مخلص مسلمان تھا جس نے اسلامی احکامات کی ترویج و اشاعت کے لئے بہت کام کیا۔ فتاویٰ عالمگیری اسی کے عہد کی یادگار تالیف ہے۔ مقامی زبانوں میں اسلامی کتب کی اشاعت بھی اسی کے دور میں اپنے عروج پر تھی۔ پنجاب میں اس کے عہد میں امن وامان رہا۔ دینداری کا چرچا خوب رہا۔

**سکھ اور عالمگیر:** جہانگیر کے عہد میں گورو ارجن سنگھ کا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو فوجی تربیت دے کر مغلوں کے خلاف ابھارا 1664ء میں گورو تیغ بہادر (نواں گورو) گدی پر بیٹھا جو اورنگزیب کا سخت مخالف تھا۔ ان کے دسویں گورو گوبند سنگھ (1675ء تا 1708ء) نے انند پور (ضلع ہوشیار پور) کو اپنا ہیڈ کواٹر قرار دے کر سکھوں کی فوجی تربیت شروع کر دی، اور ان کو ایک جنگ جو قوم بنا دیا اور مغل حکومت کے خلاف شورشیں برپا کر دیں 1701ء میں ہندو سرداروں نے مل کر انندپور پر یلغار کر دی، لیکن شکست کھائی اور شاہی فوجوں کی مدد طلب کی، آخر سرہند کے گورنر نے انندپور کو تاراج کیا۔ گورو گوبند سنگھ بھاگ کر تلونڈی میں آیا اور پھر روپوش ہو گیا۔ دو سال بعد اسنے "ظفرنامہ" بزبان فارسی (شعروں میں) لکھ کر بادشاہ کو بھیجا۔ جس کو دیکھ کر بادشاہ نے گورو صاحب کو دربار میں طلب کیا۔ بادشاہ ان دنوں دکن میں تھا۔ گورو 1707ء میں حاضری کے لئے روانہ ہوا لیکن راستے میں خبر ملی کہ بادشاہ احمد نگر کے مقام پر وفات پا گیا ہے۔ لہٰذا وہ راستے میں رک گیا اور 1708ء میں ایک افغان کے ہاتھوں نانڈیر کے مقام پر مارا گیا۔

اورنگزیب نے زیادہ عرصہ بغاوتیں فرو کرنے میں گزارا۔ اس کی زندگی شاہی محل کی بجائے خیموں میں زیادہ گزری، اور آخر 1707ء میں اس نے ایک خیمے کے اندر ہی اپنی جان، جانِ آفریں سپرد کر دی۔ اس کا بیٹا معظم (گورنر کابل) بہادر شاہ کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔

ان دنوں پنجاب کا گورنر منعم خاں تھا۔ اس نے بھی بہادر شاہ کا ساتھ دیا اور دوسرے دو بھائیوں اعظم اور کام بخش کو محرومی کا منہ دیکھنا پڑا۔

**محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ (1707ء تا 1712ء):** بہادر شاہ کے ساتھ جنگ میں اعظم اور اس کے بیٹے اپریل 1707ء میں آگرہ کے مقام پر لڑائی میں قتل ہو گئے تو کام بخش کو غصہ آیا اور 1708ء میں اس نے بہادر شاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ جنگ میں وہ زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور دو دن میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ ادھر سکھوں نے دسویں گورو کی وفات کے بعد لچھمن داس عرف بندہ بیراگی کی سرکردگی میں مغلوں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیاں شروع کر دیں اور 72 ہزار سکھوں کی فوج تیار کر لی۔ جالندھر کے مغل حاکم شمس الدین خاں نے "راہوں" کے مقام پر سکھ فوجوں کو شکست دی، لیکن سکھوں نے چین نہ لیا۔ آخر بہادر شاہ نے اپنا دفتر لاہور منتقل کر کے سکھوں کو لاہور سے نکلوا دیا۔ لاہور میں ہی فروری 1712ء میں وفات پا گیا اور دہلی لے جا کر اسے دفن کیا گیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ ایک فیاض، نرم دل اور خلیق بادشاہ تھا؛ وہ شیعہ ازم سے متاثر تھا۔ لاہور میں اس نے شیعہ ازم کا نفاذ سنی مساجد میں بھی کرنا چاہا تو اس کے لڑکے خجستہ اختر اور عظیم الشان جو سنی تھے آڑے آئے۔ سنی علماء کے کے احتجاج پر وہ حکم نامہ واپس لے لیا۔ لاہور کا شاہ عالمی دروازہ اسی بادشاہ کے نام پر ہے اور شاہ عالم مارکیٹ بھی اس کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شاہ عالم نے بڑے بیٹے عظیم الشان کو وارثِ تخت بنایا تھا؛ لیکن چار بھائیوں میں معزالدین جہاندار شاہ اپنے دو بھائیوں خجستہ اختر اور رفیع الشان کی مدد سے عظیم الشان کی فوجوں پر غالب آ کر تخت نشین ہوا؛ اور عظیم الشان بھگوڑے ہاتھی کے ساتھ راوی میں ڈوب کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

**جہاندار شاہ (1712ء تا 1713ء):** یہ عیاش بادشاہ شاہد بازی کا شکار ہو کر امورِ سلطنت سے غافل ہو گیا؛ ہیجڑوں، گویوں، نٹوں، بھانڈوں، بازیگروں اور بازاری موسیقاروں کو دربار میں رسائی حاصل ہو گئی اور شرفا ذلیل کیے جانے لگے، اور ذوالفقار خاں کو مختار کل بنا دیا۔ آخر یہ حکمران بھی فرخ سیر ولد عظیم الشان اور اس کے حامیوں کی فوج سے شکست کھا کر دہلی بھاگ گیا اور صرف گیارہ مہینے بعد اس کی بادشاہی ختم ہو گئی۔

**محمد فرخ سیر:** 1713ء میں تخت پر بیٹھا۔ یہ بھی ایک عیاش اور نااہل حکمران ثابت ہوا۔ سکھوں نے اس کمزور حکمران کے علاقے میں لوٹ مچا دی تاہم فرخ سیر کے جرنیلوں نے انہیں زیر کیا۔ عبدالصمد خاں سالار نے سکھوں کو چن چن کر مارنا شروع کیا۔ فرخ سیر، سید عبداللہ خاں گورنر بہار اور سید حسن علی خاں گورنر الہ آباد کی مدد سے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ لہٰذا اس انہیں شاہی دربار میں اقتدار و رسوخ حاصل تھا؛ اور فرخ سیر اُن کا زیر دست بن کر حکومت چلا رہا تھا۔ آخر ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں سید برادران سے اس کی ٹھن گئی اور انہوں نے مرہٹوں کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور فرخ سیر کو اندھا کر کے زندان میں ڈال دیا۔ 1719ء میں

بہادر شاہ کا پوتا رفیع الدرجات جو رفیع القدر کا بیٹا تھا فرخ سیر کی قید کی خبر سن کر بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے فرخ سیر کو مروا دیا۔

1719ء میں رفیع الدرجات سید برادران کی حمایت سے (جنہیں بادشاہ گر بھی کہتے تھے) بر سر اقتدار آیا تو مرہٹوں نے اپنی امداد کی قیمت وصول کرنا چاہی' اور پول ٹیکس کا خاتمہ کروایا یہ بادشاہ بھی کٹھ پتلی بنا رہا۔ آخر تپدق سے اگست 1719ء بطور کو راہی ملک عدم ہوا۔ جس کے بعد سید برادران نے اس کے بھائی رفیع الدولہ شاہجہان کو بادشاہ بنا دیا۔ وہ اگست تا نومبر 1719ء مجبور حکمران رہ کر مالیخولیا کے عارضہ سے نومبر 1719ء میں وفات پاگیا اور خجستہ اختر کے بیٹے روشن اختر کو ایک مجبور بادشاہ بنا دیا گیا۔ جسے غزنی سے بلایا گیا تھا۔

**ناصر الدین محمد شاہ روشن اختر ابوالفتح (نومبر 1719ء تا 1739ء):** روشن اختر ناصر الدین محمد شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ سید برادران نے اسے کٹھ پتلی بنانا چاہا لیکن اکتوبر میں سید حسین علی کو اس کے خیمے میں کسی نے قتل کر دیا۔ چنانچہ عبداللہ نے انتقاماً محمد شاہ پر چڑھائی کر دی لیکن گرفتار ہو کر 19 ستمبر 1723ء کو قید تنہائی میں وفات پاگیا اور محمد شاہ کھل کر حکومت کرنے لگا اور ساتھ ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ سکھوں نے اس رنگینی طبع سے فائدہ اٹھایا اور شورش برپا کر دی جسے عبدالصمد خاں' دلیر جنگ۔۔۔۔ گورنر لاہور نے دبا دیا۔ حسین کاں پٹھان علاقہ قصور کے سردار نے بھی بغاوت کر دی' اور لاہور کے حاکم قطب الدین کو قتل کر دیا۔ آخر عبدالصمد خاں نے اسے شکست دے کر یہ فتنہ رفع کیا' اور بادشاہ کی طرف سے سیف الدولہ کا خطاب پایا۔ عبدالصمد 1737ء میں لاہور میں وفات پاگیا۔ جس کے بعد اس کے بیٹے خاں بہادر زکریا خاں کو گورنر لاہور مقرر کیا گیا۔ نیز اسے ملتان کی گورنری بھی سونپی گئی' محمد شاہ نے حکومت کا انتظام امراء کے سپرد کیا تھا۔ پھر سعادت خان (شیعہ) اور چن قلیچ خاں (سنی) ایسے امراء میں بھی ٹھن گئی اور بادشاہ اس چپقلش کو اپنے اقتدار کے لئے نیک فال سمجھنے لگا اور اسی اثناء میں نادر شاہ نے پنجاب پر حملہ کر کے مغل سلطنت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں کیونکہ محمد شاہ اب رنگیلا بھی تھا۔

**نادر شاہ:** وہ دسمبر 1688ء میں پیدا ہوا۔ اس نے 1729ء میں کرمان اور قندھار میں تسلط قائم کر لیا' اور طہماسپ خاں کے وفادار کے طور پر کام کرتا رہا جس نے اسے طہماسپ قلی کا خطاب دے کر خراساں' سیستان کرمان وغیرہ صوبوں کا حاکم بنا دیا۔ وہ سنی مسلمان تھا۔ 1731ء میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور چند سال بعد ہندوستان پر حملہ کیا تاکہ اپنے مخالف بھگوڑے افغانوں کو سزا دے سکے جو نقل مکانی کر کے ادھر آ گئے تھے۔ پشاور میں گورنر شیر دل خاں نے مزاحمت کی لیکن ڈیڑھ ماہ بعد شکست کے بعد اپنے بیٹے سمیت قتل ہوا۔ ادھر نادر شاہ کو بے

حساب مال غنیمت ہاتھ لگا۔ 1738ء میں وہ پنجاب میں گجرات تک چڑھ اور زکریا خاں گورنر پنجاب کے جرنیل قلندر خاں کو شکست دے کر لاہور تک پہنچ گیا اور زکریا خاں سے کہا کہ اگر اسے لاہور تک کے اخراجات ادا کر دیئے جائیں تو وہ لاہور کو نقصان پہنچائے بغیر آگے بڑھ جائے گا چنانچہ بیس لاکھ روپیہ نقد، دو سو ہاتھی دے کر لاہور کو بچالیا گیا۔ جنوری 1739ء میں نادر شاہ دہلی کی طرف بڑھا اور محمد شاہ کی فوج اس کے مقابلے کی تاب نہ لاسکی اور نادر شاہ نے دہلی کا محاصرہ کر لیا اور 25 کروڑ روپے تاوان جنگ وصول کرنے کے عوض دہلی کو امان دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن نادر شاہی فوج نے شہر میں آتے ہی قتل عام شروع کر دیا کیونکہ مقامی لوگوں نے تین ہزار نادر شاہی فوجی بلوہ کر کے مار ڈالے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ لاکھ افراد قتل کر دیئے گئے۔ محمد شاہ نے رحم کی اپیل کر کے یہ قتل عام بند کروایا۔ نادر شاہ کو بھی اپنے ظالمانہ رویہ پر دکھ ہوا۔ پھر وہ محمد شاہ کو تخت پر بیٹھا کر 30 کروڑ روپے کا مال غنیمت ایک ہزار ہاتھی، سات ہزار عمدہ گھوڑے۔ دس ہزار اونٹ، ایک سو خواجہ سرا، ایک سو تیس معمار اور دیگر کاریگروں اور فنکار ساتھ لئے، 6 مئی 1739ء کو دہلی سے چلا۔ لاہور میں زکریا خاں نے خوش آمدید اور الوداع کہا اور وہ چند روز میں کابل پہنچ گیا۔ 1947ء میں نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا۔

**حملے کے اثرات:** نادر شاہ کا حملہ مغلوں کے لئے ضرب کاری ثابت ہوا۔ مغل خزانہ خالی ہو گیا۔ مرہٹے اور جاٹ اور سکھ دلیر ہو گئے۔ طاؤس و رباب نے اپنا کام کر دکھایا۔ فنکار، اداکار، ہیجڑے، خواجہ سرا اور گویے مغلیہ سلطنت کی جڑوں میں بیٹھ گئے۔ اہلکار بددیانت ہو گئے۔ امراء کے جو ہاتھ لگتا ہڑپ کر جاتے۔ ملازمین کی تنخواہیں باقاعدہ ادا کرنا بھی ناممکن ہو گیا۔ رعایا کی خوشحالی زبوں حالی میں بدل گئی۔ انگریز مغلوں کو کمزور پا کر اپنی توسیع قابضانہ سرگرمیوں میں مزید انہماک سے مصروف ہو گئے۔ محمد شاہ "رنگیلا" وقت کی قدر نہ کر سکا اور بادشاہ ہو کر بیہودگی کا شکار رہا۔ حالانکہ اسے چاہئے تھا کہ جب اس نے اپنے عزیز و اقارب اور بھائیوں تک کو قتل کر دیا تھا تو اپنے مقصد کو نہ بھلاتا۔ لیکن اس نے ذلت کا راستہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے مغل حکومت بھی ذلیل ہوئی اور اس کے زیر سایہ رعایا بھی ذلیل اور رسوا ہوئی۔

**ابوالناصر احمد شاہ:** محمد شاہ کے آخری ایام مایوسی سے گزرے اس کا دل جس قدر مہوشوں کی رنگینوں سے خوش ہوا کرتا تھا اسی قدر اب بے چین اور اضطراب کا شکار رہنے لگا۔ دولت اور عزت اور عظمت کے لٹنے کا غم اسے لے بیٹھا۔ آخر وہ 1748ء میں وفات پا گیا اور اس کا بیٹا ابوالناصر احمد شاہ مجاہد الدین کے لقب سے 18 اپریل 1748ء کو تخت نشین ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح عیاش اور زن پرست تھا۔ اس کا زنان خانہ ایک میل لمبا تھا۔ اس کے عہد میں سکھوں نے اقتدار حاصل کرنے کی کوششیں خفیہ طور پر جاری رکھیں۔ زکریا خاں کے بعد لاہور کا

گورنر معین الدین عرف منو تھا جس نے سکھوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ دربار میں امراء باہمی چپقلشوں کا شکار ہونے لگے۔ جس میں مرہٹوں اور ہندوؤں کی مدد حاصل کرنا وہ عار نہ سمجھتے۔ حتیٰ کہ ایک امیر غازی الدین نے مرہٹوں کی مدد سے بادشاہ پر چڑھائی کر دی۔ سکندرہ کے مقام پر بادشاہ اور اس کی والدہ گرفتار ہوئے اور دونوں کی آنکھیں نکال دی گئیں، اور سلیم گڑھ کے قلعہ میں قیدی رہے۔ احمد شاہ 5 جون 1754ء کو معزول ہوا اور 21 سال بعد 1770ء میں قید کی حالت میں وفات پا گیا۔

**عزالدین عالمگیر ثانی 1754ء تا 1759ء:** احمد ساہ کے بعد جہاندار شاہ کے بیٹے کو امراء نے عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔ یہ ایک متقی اور نیک شخص تھا۔ تاہم سابق حکمرانوں کی کرتوتوں کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ پنجاب میں گڑبڑ بڑھ گئی۔ 1756ء میں میر معین الدین گورنر لاہور فوت ہو گیا، اور اس کی بیوی مراد بیگم عرف مغلانی بیگم نے اپنے تین سالہ بیٹے امین الدین کی نگران بن کر بطور گورنر لاہور فراء بطریق احسن انجام دیئے، لیکن لاہور کی سنہری مسجد تعمیر کرانے والے میر بھکاری کاں کو محض زنان خانے میں آنے کی پاداش میں مروا دیا۔ جس سے دیگر امراء کو مراد بیگم سے نفرت ہو گئی اور سکھوں کو سر اٹھانے کا موقع اس لئے بھی ہاتھ آگیا کہ گورنر ایک عورت تھی۔ سکھوں کے خلاف بادشاہ نے سید جمیل کو بھیجا جس کی کارکردگی عمدہ رہی۔ مراد بیگم جلاپے کا شکار ہو کر سید جمیل کے خلاف شکایت کناں ہوئی۔ سید جمیل نے اسے شادی کا پیغام بھی دیا۔ لیکن اختلاف بڑھتے گئے۔ آخر مراد بیگم کو معزول کر کے آدینہ بیگ خاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ مراد بیگم گرفتار کر کے دہلی پہنچا دی گئی ادھر آدینہ بیگ نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

## پنجاب میں مرہٹے

1756ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا۔ آدینہ بیگ خاں بھاگ گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں دہلی تک پہنچ گئیں مراد بیگم کسی طرح رہا ہو کر مغلوں کے خلاف اس کی مدد کرتی رہی اور امراء کے خزائن کی نشاندہی بھی کی اور وہ لٹ گئے۔ عالمگیر ثانی تاوان جنگ ادا کر کے دوبارہ بحال ہوا۔ واپسی پر پنجاب میں ابدالی کو سکھوں نے لوٹنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے شہزادہ تیمور کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔

**آدینہ بیگ خاں:** شرقپور (ضلع شیخوپورہ) کے نواح کا باسی تھا اور ارائیں فیملی سے تھا اور پٹواری تھا جو ترقی کرتے کرتے گورنر لاہور بن گیا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کے ڈر سے جالندھر کی طرف بھاگ گیا تھا اور سکھوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ تیمور نے اس کا تعاقب کیا۔ تیمور

نے سکھوں کو امرتسر خالی کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ڈٹ گئے اور دوآبہ بست جالندھر میں آدینہ بیگ کی مدد سے شورشیں برپا کرنے لگے اور تیمور کی فوج واپس لاہور آ گئی۔ 1758ء میں سکھوں نے لاہور پر قبضے کا اعلان کر دیا۔ آدینہ بیگ نے ملہار راؤ اور راگھوبا (مرہٹہ سرداروں) کو پنجاب پر حملہ کے لئے کہلوایا۔ چنانچہ وہ سرہند پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب کی طرف بڑھے، اور 1758ء میں افغان سپاہ کو شکست دے کر آگے بڑھے اور مئی 1758ء کو مرہٹہ لشکر لاہور پر قابض ہو گیا اور آدینہ بیگ کو گورنر بنا دیا جس نے بٹالہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ہندو راجوں نے اسے خودمختار حکمران تسلیم کر لیا اور پھر مغل بادشاہ نے بھی اس کی خودمختاری تسلیم کر لی۔ دسمبر 1758ء میں آدینہ بیگ فوت ہوا اسے جالندھر کے قریب خان پور میں دفن کیا گیا۔ اس نے بٹالہ (ضلع گورداس پور) کے قریب نیا قصبہ آدینہ نگر بسایا۔

**جان کو رائے:** آدینہ بیگ کے بعد مرہٹہ سردار جان کو رائے کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن 1759ء میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا اور کریم داد خاں افغان کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا۔ اُدھر عالمگیر ثانی کو 30 نومبر 1759ء کو ایک سازش کے تحت ہلاک کر دیا گیا۔

**علی گوہر شاہ عالم ثانی (1759ء تا 1806ء):** عالمگیر ثانی کے بعد دہلی کے تخت پر علی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے بٹھا دیا گیا۔ اب یہ سلطنت محدود ہو چکی تھی۔ مرہٹے، روہیلے اور سکھ ترقی کر گئے۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کا زور توڑنے کے لئے جنوری 1761ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں شکست دی اور دہلی میں چند دن قیام کے بعد لاہور واپس آیا اور کریم داد کی جگہ امیر محمد خاں کو لاہور کو گورنر مقرر کیا اور جالندھر میں فوجدار کی جگہ بلند خان کو صوبیدار مقرر کیا۔ اُدھر سکھوں نے بیساکھی کے موقع پر لاہور کو لوٹنا شروع کر دیا اور پھر سکھوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور تیس ہزار روپے لے کر محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے۔ چنانچہ احمد شاہ نے عبید خاں کو لاہور کا نیا صوبیدار مقرر کیا۔

شاہ عالم ثانی نے 12 اگست 1765ء کو بنگال بہار اور اڑیسہ کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے لارڈ کلائیو کو دے دیا تھا۔ اگست 1788ء میں شاہ عالم ثانی رہیلوں کے سردار غلام قادر روہیلہ کے ہاتھ آ گیا جس نے بادشاہ کی آنکھیں نکلوا دیں، لیکن سندھیا نے اچانک پہنچ کر اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور نابینا بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا اور وہ 1806ء میں وفات پا گیا۔

جس کے بعد اس کا بیٹا ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا جو 1821ء کو فوت ہو گیا۔

# احمد شاہ ابدالی کے حملے

**پہلا حملہ 1748ء:** میر منو زکریا خاں کے بعد لاہور کا حکمران بنا۔ پھر یہ ہوا کہ کچھ عرصہ زکریا خاں کا بڑا بیٹا یحییٰ خاں اپنے ماموں میر قمرالدین کی مدد سے لاہور کا حاکم بن گیا۔ قمرالدین دہلی دربار میں وزیراعظم تھا۔ ان دنوں بھی لاہور کا دیوان لکھپت رائے تھا۔ دوسری طرف ایمن آباد کا فوجدار جسپت رائے تھا۔ جس نے سکھوں کے خلاف معرکہ لڑا لیکن مارا گیا۔ لکھپت رائے نے سکھوں کا تعاقب کیا مگر وہ جموں کی طرف فرار ہوگئے۔ البتہ وہ ایک ہزار سکھوں کو پکڑ کر لاہور لایا اور قتل کرکے ایک بڑے گڑھے میں اجتماعی تدفین کی۔ یہ جگہ بعد میں شہید گنج سکھ شہیدوں کا مدفن کہلوائی اور تقسیم سے پہلے کی تحریکوں میں مسجد شہید گنج کا تنازعہ بھی اسی جگہ سے متعلق تھا۔ یحییٰ خاں نے بعد میں بھی سکھوں کو پنپنے نہ دیا۔

نواب زکریا کے چھوٹے بیٹے شاہنواز خاں جو ملتان کا حاکم تھا' نے لاہور پر حملہ کرکے اپنے بڑے بھائی یحییٰ خاں کو شکست کے بعد گرفتار کرکے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ یحییٰ خاں قید سے کسی طرح رہائی پاکر دہلی جا پہنچا۔ آدینہ بیگ ناظم جالندھر نے اندازہ لگایا کہ اب یحییٰ خاں لاہور پر شاہی لشکر سے چڑھائی کرے گا۔ چنانچہ شاہنواز کو کہہ کر احمد شاہ ابدالی کو حملہ کی دعوت دی اور یلغار کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ادھر شاہنواز کے ماموں میر قمرالدین نے اسے سمجھایا اور لاہور، کشمیر، ملتان، کابل اور سندھ کی صوبے داری بھی اسے عطا کردی۔ چنانچہ اس نے احمد شاہ کو ٹالنے اور مار بھگانے کا منصوبہ بنایا۔ احمد شاہ بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس نے مفاہمت کے لئے اپنے خاندانی پیر صابر شاہ کو بھیجا مگر شاہنواز نے اسے ایلچی کو قتل کردیا جس کا مزار شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں واقع ہے۔ اس قتل کے بعد احمد شاہ نے حملہ کرکے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ مغل پورہ ان دنوں امرا کی بستی تھی۔ احمد شاہ کے سپاہیوں نے اس بستی کو لوٹ کر ویران کردیا اور قتل عام بھی کیا۔ قلعہ لاہور سے اسے اشرفیاں وغیرہ بھی ہاتھ لگیں اور ہیرے جواہرات بھی بہت ملے آس پاس کے مفتوحہ امرا نے نذرانے بھی پیش کئے اور اسلحہ بھی کافی ہاتھ لگا۔ یہاں وہ ایک ماہ تک قیام پذیر رہا کیونکہ اسے اپنے ملک سے کمک بھی پہنچ رہی تھی۔ اسی اثناء میں لاہور میں اس نے دیوان لکھپت رائے کو قید سے رہا کرکے لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ اپنے نام کے سکے بھی جاری کئے اور شاہی مہر بھی احکامات جاری کرنے کی غرض سے تیار کروائی۔

**سرہند پر حملہ:** 13 مارچ 1748ء کو ابدالی فوج نے سرہند پر جا قبضہ کیا۔ یہاں سے اسے بارود اور چند بھارتی توپیں بھی ہاتھ آئیں، اور مرکزی ہیڈ کوارٹر بنا کر وہ سرہند میں مقیم ہوگیا۔ کیونکہ یہاں سے نو میل دور منارہ کے مقام پر مغلیہ لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ منارہ کے

مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ جو ایک ماہ جاری رہی۔ مغلوں کے ساتھ راجے اور نواب بھی تھے، لیکن وہ بھگوڑے ثابت ہوئے۔ میر قمرالدین گولا لگنے سے بحالت نماز جاں بحق ہوا۔ پھر اس کے بیٹے میر منو اور صفدر جنگ نے ابدالی کے لشکر کو بھگا دیا اور احمد شاہ ابدالی 1748ء میں کابل واپس پہنچ گیا۔ اس جنگ میں فتح نے مغلوں کی ساکھ کو سہارا دیا۔ یہ واقعات محمد شاہ رنگیلا کے دور میں وقوع پذیر ہوئے آخر 16 اپریل 1748ء کو محمد شاہ نے فتح سے واپسی کے بعد دہلی میں وفات پائی۔

اور اس کا بیٹا احمد شاہ جانشین ہوا لیکن وہ بھی کامیاب حکمران ثابت نہ ہوا۔

## میر منو اور سکھ

اب میر قمرالدین کا بہادر بیٹا میر منو (معین الملک) لاہور کا گورنر بنا۔ تو سکھوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور امرتسر سمیت کئی مقامات پر قلعے بنا لئے۔ میر منو نے پہلے امرتسر کے سکھ قلعہ کو تباہ کیا اور باغیوں کو قتل کرایا حتیٰ کہ سکھ پہاڑوں میں جا چھپے، لیکن انہوں نے درپردہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ سکھ میر منو کو جلاد کے نام سے یاد کرتے تھے آخر وہ مغل سرکار سے دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ عام مسلمانوں کے دشمن بن کر ابھرے۔ اس میں ملتان کے ہندو گورنر راجا کوڑا مل کی سازشوں کا عمل دخل بھی تھا اور جالندھر کے صوبیدار آدینہ بیگ کی خود غرضانہ پالیسی کا بھی۔

**احمد شاہ ابدالی کا دوسرا حملہ:** ابدالی نے بسرعت پنجاب پر حملہ کی ٹھانی اور لشکر جرار لے کر پنجاب تک آگیا۔ میر منو کو مرکز سے مدد نہ مل سکتی تھی جبکہ ابدالی کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا۔ چنانچہ وہ ابدالی سے پہلے چناب پر پہنچ گیا۔ اب دونوں لشکروں نے بات چیت کر کے صلح کو ترجیح دی۔ یہ دسمبر 1749ء کی باتیں ہیں۔

(1) پنجاب کا گورنر پچاس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ دینے پر آمادہ ہو گیا۔

(2) نیز پسرور سیالکوٹ اور گجرات کے علاقوں کا آبیانہ بطور خراج ہر سال دینے کی حامی بھری، اور اس طرح احمد شاہ واپس قندھار کو لوٹ گیا۔ (ایسا ہی معاہدہ 1739ء میں نادر شاہ سے ہوا تھا۔)

اس معاہدہ کی آڑ میں دہلی کے دربار میں میر منو کے مخالفین نے سازشیں گھڑنا شروع کر دیں اور بادشاہ سے کہہ کر لاہور کے سابق گورنر شاہنواز خاں کو ملتان کا گورنر بنوا دیا۔ میر منو کے گورنر ملتان کوڑا مل نے شاہنواز کی فوجوں کو شکست دی جس میں شاہنواز بھی قتل ہو گیا۔ اب میر منو نے اپنی فوجی قوت میں خاصا اضافہ کر لیا۔

**احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ:** میر منو اب کافی طاقتور ہو گیا تھا۔ اس نے فصل کی خرابی کے بہانے طے شدہ خراج دینے سے معذرت کر لی۔ چنانچہ احمد شاہ نے 1751ء میں تیسرا حملہ کرنے کے لئے سوہدرہ کے مقام پر اپنے لشکر جمع کر دیئے، اور ایک وزیر

سکھ جیون مل کے ذریعے میر منو سے گفت و شنید کا ڈول ڈالا۔ میر منو نے کہا کہ ابدالی کی فوجوں کے ڈر سے لوگ گھر چھوڑ گئے ہیں۔ مالیہ وغیرہ کی فراہمی مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ ابدالی فوج لوٹ جائے تاکہ لوگ اپنے گھروں میں آباد ہو کر ٹیکسوں کی ادائیگی کر سکیں، لیکن ابدالی نے حملہ کا فیصلہ کر لیا اور کالا شاہ کاکو تک پہنچ گیا۔ ادھر سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی، اور چار ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر 12 اپریل 1752ء کو پنجاب نے غنیم پر حملہ کر دیا۔ فتح قریب تھی کہ کوڑا مل کا ہاتھی گڑھے میں گرا اور کوڑا مل کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت سے شاید کچھ انتشار نہ پھیلتا لیکن ایک اور پنجابی جرنیل عزیز محمود بوٹی کے قریب ساتھیوں سمیت قتل ہو گیا اور اس خبر نے پنجابی لشکر کو بددل کر دیا۔

آخر لاہور کی فوج شہر میں محصور ہو کر دو ماہ تک لڑتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر میر منو نے صلح کی درخواست کی۔ شالامار باغ میں شرائط صلح طے ہوئیں کہ تاوان پچاس لاکھ دینا پڑا۔ سرہند کا علاقہ افغانستان میں شامل کر کے میر منو کو اس کی گورنری بھی دی گئی۔ اس جنگ نے پنجاب حکومت کا بھرکس نکال دیا۔ جس کے نتیجہ میں سکھوں کو بدامنی کا موقع مل گیا۔ میر منو قصور کی مہم میں کامیابی کے بعد گھوڑا پر سوار پا در رکاب ایسا گرا کہ دور تک گھسٹتا چلا گیا اور اس طرح وہ فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سکھوں کو مزید کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اب پنجاب پر اس بیوی مغلانی بیگم اپنے تین سالہ بیٹے کی اتالیق اور سرپرست بن کر حکومت کرنے لگی۔

**احمد شاہ ابدالی کا چوتھا حملہ:** مغلانی بیگم کو مغل دربار کی جانب سے نیچا دکھانے کی کوششیں کی جاری تھیں اس نے احمد شاہ ابدالی کو خبر کی وہ اس کی مدد کے لئے آیا۔ ادھر مغل بادشاہ نے آدینہ بیگ کو پنجاب کی گورنری کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا اور مغلانی بیگم اور اس کی لڑکی کو گرفتار کر کے سرہند لے جایا گیا جہاں وزیراعظم دہلی غازی الدین نے اس کی لڑکی سے زبردستی شادی کر لی اور مغلانی بیگم کو نظربند کر دیا۔ ادھر احمد شاہ تیزی سے لاہور پہنچا تو آدینہ بیگ نے بادل ناخواستہ مقابلہ کی ٹھانی لیکن چند دنوں کے بعد کانگڑہ کی طرف بھاگ گیا۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کا لاہور کا گورنر بنا کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ کرنال کے قریب عزالدین عالمگیر ثانی نے امراء کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ غازی الدین نے مغلانی بیگم سے معافی مانگ کر صلح کر لی، اور مغلانی بیگم کی رہائی کے ساتھ ابدالی نے 90 لاکھ روپے تاوان کا سختی سے مطالبہ کیا اور دہلی میں خانہ تلاشی سے وصولی کی کوشش کی اور لوٹ مار اور قتل عام میں نادر شاہی دور کی یاد تازہ کر دی اور دو ماہ تک دہلی میں مقیم رہا۔ لاہور میں اپنے بیٹے گورنر تیمور کو بلا کر اس کی شادی عالمگیر ثانی بادشاہ کی بیٹی سے کی اور خود اپنی شادی محمد شاہ رنگیلے کی پوتی سے کر لی اور سرہند اور پنجاب کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے بالم گڑھ (موجودہ پالم پور جہاں ہوائی اڈہ ہے) کو لوٹا 1756ء میں متھرا پر حملہ کر کے بڑی دولت پر قبضہ کر لیا لیکن وہاں تہوار کے موقع کی وجہ سے

نذرانے بہت جمع ہو چکے تھے۔

پھر آگرہ کا قلعہ فتح کر کے واپس پر جاٹوں سے معرکہ آرا ہوا اور ان کو شکست دی' اور دہلی کا تخت عزالدین کے سپرد کر کے عازم لاہور ہوا۔

اس نے سرہند کا گورنر اپنے جرنیل عبدالصمد کو مقرر کر کے سکھوں کی سرکوبی کا حکم دیا' پھر تیمور شاہ کو لاہور اور ملتان کی گورنری دی۔ دو آبہ جالندھر میں سرفراز خاں افغان کو اپنا نائب مقرر کیا اور سکھوں کا گڑھ ہونے کی وجہ سے ان کی سرکوبی کی بھی تاکید کی۔ احمد شاہ ابدالی نے 1752ء میں کشمیر فتح کر لیا تھا۔ اب 1757ء میں قیام لاہور کے دوران کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کیا پھر یہ بادشاہ واپس افغانستان چلا گیا جہاں ترکوں کے حملے کا خطرہ بڑھ چکا تھا۔

## سکھوں کا لاہور پر قبضہ

تیمور شاہ کے دور میں چھ ماہ امن سے گزرے' پھر سکھوں نے ہر طرف لوٹ مچا دی۔ جالندھر کا دو آبہ ان کا بڑا مضبوط مرکز تھا۔ تاہم اس نے سکھوں کو سختی سے دبا دیا۔ ادھر آدینہ بیگ کانگڑہ کی پہاڑیوں سے نکلا اور سکھوں کے ساتھ سازش کر کے ان کی طاقت کے بل پر جالندھر دو آبہ کو تاراج کرنے میں لگا اور امرتسر تک دست درازیاں کرنے لگا۔ اب پنجاب میں جسا خاں کلال اور آدینہ بیگ نے معاہدہ کر کے افغانوں کو پنجاب سے نکالنے کا عزم کیا۔ کیونکہ کامیابی کی صورت میں گورنری کا عہدہ آدینہ بیگ کو دینے کا عہد کیا گیا۔

تیمور شاہ نے آدینہ بیگ کو جان و مال کی حفاظت اور صوبیداری بحال رکھنے کے وعدہ پر سکھ شورشوں سے لاتعلق رہنے کے لئے خط لکھا لیکن آدینہ بیگ نے یہ پیشکش حقارت سے مسترد کر دی' چنانچہ مراد خاں کی سرکردگی میں افغان لشکر جالندھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی مدد کے لئے کشمیر سے بلند خاں' سرہند سے عبدالصمد محمد زئی اور جالندھر سے سرفراز بھی چلے' لیکن آدینہ بیگ نے سکھوں کی فوج کی مدد سے ان چاروں پلٹنوں کے چھکے چھڑا دیئے اور افغان مار کھا گئے۔ پھر لاہور سے تیمور شاہ کا وزیر اعظم خان خاں ایک لشکر جرار لے کر آگے بڑھا اور بٹالہ (گورداسپور) تک جا پہنچا۔ آدینہ بیگ اور سکھ پہاڑوں کی طرف فرار ہوئے چنانچہ اس نے سکھوں کے گڑھ امرتسر کے قلعہ رام راونی کو مسمار کر دیا اور سکھوں کو قتل کیا۔ بٹالہ اور کلانور میں بھی سکھوں کے قلعے مسمار کر دیئے اس مہم کے نتیجے میں سکھ دو سال تک سر نہ اٹھا سکے۔ البتہ اس کے بعد مذہب کے نام پر سکھ متحد ہونے لگے اور آہستہ آہستہ انہوں نے لوٹ مار اور قتل کا بازار گرم کر دیا' اور روپوش سکھوں نے مل کر اچھی خاصی فوج کی شکل دھار لی اور آدینہ بیگ کی قیادت میں اپریل 1758ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا' اور شاہی خاندان کو قیدی بنا لیا۔ تاہم مسلمان ہونے کے ناطے آدینہ بیگ نے شاہی

بیگمات کو سکھوں کی دست برد سے محفوظ کرکے افغانستان بھجوا دیا۔ آدینہ بیگ کا خیال تھا کہ سکھ میرے لئے لڑے ہیں حالانکہ سکھ حضرات تو صرف اپنی خالصہ حکومت قائم کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد کر رہے تھے۔ چنانچہ جب آدینہ بیگ کو جسا سنگھ کلال (سکھ جرنیل) نے لاہور کا گورنر بنانے سے انکار کیا تو سکھوں نے آدینہ بیگ کو ذلیل و خوار کرکے لاہور سے بھگا دیا اور جسا سنگھ کلال کی سرکردگی میں سکھ حکومت قائم کرلی اور اس کے نام کے سکے بھی جاری کردیئے۔

**پنجاب پر مرہٹوں کا قبضہ:** آدینہ بیگ سکھوں کی وعدہ خلافی کا انتقام لینے کی غرض سے مرہٹوں سے ملا اور مرہٹہ سردار رگھوناتھ راہو کو ایک لاکھ روپیہ روزانہ بھتہ الاؤنس اور قیام کے دوران پچاس ہزار روپے دے کر پنجاب پر چڑھا لایا۔ چنانچہ پہلے مرہٹوں نے سرہند کو تاراج کیا یہاں آدینہ بیگ بھی ان سے مل گیا۔ آدینہ بیگ نے سرہند کو لوٹنے کے بعد شہر کو مسمار کرایا اور قتل عام کرکے افغان گورنر عبدالصمد محمد زئی کی حاکمیت ختم کرڈالی اس کے بعد مرہٹہ فوج لاہور کی جانب بڑھی اور سکھ محصور ہو کر لڑتے اور کام آتے رہے آخر لاہور پر گولہ باری کرکے انہیں مغلوب کرلیا اور مرہٹے لاہور پر قابض ہوگئے۔

تیمور شاہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ابھی پنجاب کے شمالی مغربی اضلاع میں تھا کہ مرہٹوں نے تعاقب کرکے افغان فوج کو بھی اٹک تک پسپا کردیا۔ وہ صرف دو سو گھوڑ سواروں کے ساتھ دریائے سندھ عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جبکہ اس کی باقی فوج ماری گئی اور مرہٹہ جرنیل سردار پٹیل دس ہزار گھوڑ سواروں سے قلعہ اٹک پر قابض ہوگیا بعد ازاں مرہٹے ملتان اور ڈیرہ جات پر بھی قابض ہوگئے۔

**آدینہ کی گورنری:** آخر سردار رگھوناتھ نے پچھتر لاکھ روپے سالانہ خراج کے بدلے آدینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر مقرر کردیا۔ جبکہ ملتان کا گورنر مرہٹہ سردار شمہ جی راؤ کو بنایا گیا اس طرح پنجاب سکھوں اور مرہٹوں کی بار بار کی لوٹ مار کی زد میں آکر ہر لحاظ سے پچک کر رہ گیا۔

سکھوں نے اب پھر سر اٹھایا۔ مالیر کوٹلہ کی افغان فوج رہیلوں پر مشتمل تھی، اس کے نواب نے آدینہ بیگ کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اور پھلورہ کے مقام پر جنگ ہوئی اور آدینہ بیگ جیت گیا۔ جس کے بعد اس نے اپنا دارالخلافہ لاہور کی بجائے بٹالہ ضلع گورداسپور کو قرار دیا۔ پھر اس نے مرہٹہ گورنر ملتان شمہ جی راؤ کو بھی بزورِ قوت نکال دیا اور سندھ سے بھی مرہٹہ گورنر کو چلتا کیا۔ اس طرح آدینہ بیگ کو عزالدین عالمگیر ثانی نے جنگ بہادر کا خطاب ملا کرکے پنجاب ملتان اور سندھ کا حکمران تسلیم کرلیا۔

اب سکھوں نے ماجھہ کے علاقہ میں کام دکھایا تو بارہ ہزار سکھ بٹالہ میں موت کے گھاٹ

اتار دیئے گئے۔ تاہم نومبر 1758ء کے اس واقعہ کی رات کو گورنر آدینہ بیگ کو بھی کسی سکھ نے بھیس بدل کر گورنر ہاؤس میں داخل ہو کر سوتے میں قتل کر دیا۔

**شمہ جی راؤ بطور گورنر پنجاب:** آدینہ بیگ کی موت نے مرہٹوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو دور دور تک پھیلا دیا۔ تا کہ افغان فوج حملہ کی جرأت نہ کرے۔ آدینہ بیگ کے مرتے ہی سکھ بھی تیز تر ہو گئے اور مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے اور پنجاب میں سکھ قلعوں کی تعمیر نو شروع کر دی۔ ایک طرف سکھ، مسلمان رعایا کو لوٹنے میں مصروف تھے دوسری جانب مرہٹہ گورنر کے اہلکاران سے ٹیکس کی وصولی کی آڑ میں نبرد آزما تھے۔ ادھر دہلی کے دربار میں امرا کی باہمی چپقلش نے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رکھے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کو یہ صورت حال بے چین کیے رکھتی۔ آخر ایک وزیر غازی الدین نے عالمگیر ثانی کو بہانے سے کھنڈرات میں بلا کر بالا پوش خاں نامی سپاہی سے قتل کروا دیا۔ اس طرح یہ درویش صفت نیک دل لیکن نام نہاد بادشاہ 30 نومبر 1749ء کو خالق حقیقی سے جا ملا اور ہمایوں کے مقبرے میں دفن کی جگہ پائی۔

**احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ 61-1760ء:** مرہٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیوں اور ستم ظریفیوں نے مسلمان رعایا کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اِدھر ابدالی ترکوں کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ لہٰذا جلدی اس طرف توجہ نہ دے سکا اور مرہٹے مسلمان کو ختم کر کے اپنی مستقل حکومت کے قیام کے خواب دیکھنے لگے۔ ادھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی احمد شاہ کو مرہٹوں کی کمر توڑنے کی دعوت دی۔ چنانچہ چالیس ہزار کا لشکر لے کر احمد شاہ ابدالی بڑی برق رفتاری سے لاہور تک پہنچ گیا۔ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی سکھ تو چوہوں کی طرح اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے۔ مرہٹہ سردار بھی کھسک گئے اور مرہٹوں نے دہلی میں اکٹھا ہونے کا پروگرام بنایا ابدالی نے لاہور پر قبضہ کیا اور دیگر انتظامات مکمل کر کے سرہند پر بھی قابض ہو گیا پھر ابدالی فوجوں نے سہارن پور کے مقام پر دریائے جمنا کو عبور کیا۔ یہاں روہیلہ سردار حافظ رحمت اللہ خاں اپنی دس ہزار فوج کے ساتھ ابدالی کے ہمرکاب ہو لیا۔ مرہٹہ فوج (80) اسی ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی۔ توپخانے کے اندھا دھند استعمال نے مرہٹوں کو ہر محاذ پر شکست دی۔ مرہٹوں نے بھی جہاں ممکن ہوا مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ تاہم مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں اور توپوں کی گولہ باری نے مرہٹوں کی گھوڑ سوار اسی ہزار کی نفری کو تہ و بالا کر کے ملیامیٹ کر دیا۔ سب مرہٹہ سردار بھی مارے گئے۔ مرہٹوں کا بھاری توپخانہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ سکندر آباد کے مقام پر (دہلی کے قریب) مرہٹوں کے ایک لشکر نے ملہار راؤ ہلکر کی سرکردگی میں حملہ کیا لیکن یہ سارے لوگ بھی قتل کر دیئے گئے اور احمد شاہ دہلی میں قیام پذیر ہوا۔ جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں سمیت

بہت سے راجاؤں اور نوابوں نے اس کی خدمت میں نذرانے پیش کئے اور اطاعت گزاری یا غیر جانبداری کا اقرار کیا۔

**پانی پت کی تیسری لڑائی:** ہر طرف سے شکست کھانے کے باوجود مرہٹوں نے اپنی طاقت جمع کی اور تین لاکھ پیادوں اور ایک لاکھ بارہ ہزار گھوڑ سواروں نے تین سو بھاری توپوں کے ساتھ احمد شاہ کی غیر موجودگی میں جولائی 1760ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا اور اسلامی عمارات کو تباہ کرکے مسلمانوں کا قتل عام بھی کیا اور اس طرح قتل و غارت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔

23 اکتوبر 1760ء کو احمد شاہ ابدالی کو یہ خبریں ملیں۔ مرہٹے پانی پت کے میدان میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ احمد شاہ بھی طغیانی کے باوجود دریائے جمنا کو عبور کرکے یکم نومبر 1760ء کو پانی پت کے میدان میں ج اترا اور آخر 14 جنوری 1761ء کو اد میدان میں یہ تاریخی جنگ لڑی گئی جس میں مرہٹوں کے دو لاکھ سپاہی قتل ہوئے اور بائیس ہزار گرفتار ہوگئے۔ مرہٹوں کے ساٹھ ہزار گھوڑے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور تین سو توپوں پر مشتمل مرہٹہ توپخانہ بھی ہاتھ لگا۔ مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور اہل اسلام کو جذبہ جہاد کی وجہ سے فتح نصیب ہوئی اور احمد شاہ ابدالی نے شہزادہ علی بن گوہر ثانی کو (جو ان دنوں بنگال میں تھا) دہلی کا بادشاہ مقرر کیا اور مارچ 1761ء میں وہ دہلی سے لاہور پہنچا اور یہاں صوبائی انتظامی امور کو حتمی شکل دی اور واپس کابل چلا گیا۔

**احمد شاہ ابدالی کا چھٹا حملہ:** اب سکھوں نے پر پرزے نکالے اور لاہور اور گردونواح کے علاقے ان کی دہشت گردی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اب زمینداروں سے مالیہ اور آبیانہ بھی وہی وصول کرکے لے جاتے اور افغانستان انتظامیہ کو بے بس کر دیا۔ چنانچہ نومبر 1762ء میں احمد شاہ ابدالی بہ سرعت تمام لاہور پہنچا۔ کہتے ہیں اس موقع پر جنڈیالہ شیر خاں (ضلع شیخوپورہ) میں سکھوں نے یہاں جمع ہونے والے مسلمانوں کا محاصرہ کر رکھا تھا اور انہیں قتل کرنے کے درپے تھے کہ اچانک احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر پھیل گئی اور سکھ حضرات حسب دستور میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر روپوش ہونے لگے۔ ہیر وارث شاہ کے خالق سید وارث شاہ نے اس طرف اشارہ اپنی ہیر میں اس طرح کیا ہے:

احمد شاہ از غیب تھیں آن پوسی
رب رکھ جنڈیالے نوں جا سیائی!

دوسری طرف سکھوں نے سرہند کو گھیر رکھا تھا۔ مالیر کوٹلہ کے مسلمان نواب اور اس کے خانوادہ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد بروچ کے نواب امیر مرتضیٰ کو خاں کو تاراج کرکے غارت گری کی انتہا کر دی اور شہر کو جلا دیا۔ احمد شاہ ابدالی آگے بڑھتا گیا اور سکھوں کی سرکوبی کرتا اور ان کو شکست

دیتا ہوا سرہند اور لدھیانہ اور کوٹ رہیرا کے مقام پر بھی سکھوں سے نبرد آزما ہوا اور ہر جگہ مسلمان کامیاب رہے، اور دس ہزار تا پچاس ہزار سکھ مارے گئے۔ کنہیا لال ہندی کے مطابق چوبیس ہزار سکھ مارے گئے تھے، پھر احمد شاہ نے امرتسر پر حملہ کیا اور سکھوں کو بھگا دیا حتیٰ کہ ہر دیو نامی گردوارہ مسمار کروا کر اس کے ملبے سے تالاب رام راونی کو پر کروا دیا اور پھر قندھار کو لوٹ گیا۔

**سکھوں کی سرگرمیاں:** احمد شاہ کے جاتے ہی سکھ پھر سے امرتسر میں اکٹھے ہوئے اور پچاس ہزار سکھوں نے قصور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مال غنیمت لوٹ کر لوگوں کو قتل اور شہر کو نذر آتش کر دیا پھر وہ ریاست مالیر کوٹلہ پر بھی حملہ آور ہوئے پھر سرہند کو بھی تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ مسجدیں مدرسے اور مقبرے مسمار کر دیئے۔ حتیٰ کہ ان کا ملبہ پچیس ہزار روپے میں پٹیالہ کے راجہ آلا سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا اور لاہور کے سوا ہر طرف سکھوں کی عملی داری قائم ہو گئی جس کو ختم کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی نے ساتواں حملہ کیا۔

**احمد شاہ کا ساتواں حملہ:** اس حملہ کے لئے احمد شاہ ابدالی جنوری 1764ء کے آخر میں لاہور پہنچا۔ سکھوں نے ڈر کے مارے اپنی وضع قطع اور لباس تک ترک کر دیا اور وہ پنجاب سے بھاگ کر ادھر اُدھر روپوش ہو گئے۔ احمد شاہ یہاں سے سرہند پہنچا اور مقبروں، مسجدوں اور مدرسوں کی بربادی اسے خون کے آنسو رلانے لگی اور اس نے سکھوں کے خلاف کارروائی کی بہت کوشش کی مگر یہ لوگ گوریلا جنگ کرنے لگے کیونکہ ان کے لئے سامنے آ کر لڑنا ممکن نہ تھا۔

**لاہور پر سکھوں کا قبضہ:** اس کے جاتے ہی سکھ حضرات اپنی کمین گاہوں سے نکل کر اپنی کارروائی دکھانے لگے اور آخر انہوں نے لاہور کے گورنر کابلی مل کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ آخر 1767ء میں احمد شاہ ابدالی نے ایک اور حملہ کیا۔

**احمد شاہ کا آٹھواں حملہ:** 1767ء میں ایک بار پھر احمد شاہ ابدالی برق رفتاری سے لاہور پہنچ گیا۔ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی سکھ سارا پنجاب خالی کرتے چلے جا رہے تھے خصوصاً احمد شاہ کی آمد سے قبل نو تعمیر کردہ سرہند شہر سکھوں کے ہاتھوں مسمار ہو چکا تھا۔ احمد شاہ سرہند میں گیا تو دل گرفتہ ہوا پھر سکھوں نے احمد شاہ پر حملہ کر دیا اور اس جنگ میں بھی احمد شاہ غالب آیا تو سکھ پہلے کی طرح بکھر کر روپوش ہو گئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کو احمد شاہ نے ساتویں حملہ کے وقت 1765ء میں راجہ مقرر کیا تھا وہ اس کا باجگزار رہا۔ پٹیالہ کا راجہ آلہ سنگھ فوت ہوا تو اس کا بیٹا امر سنگھ 1767ء میں باجگزاری کی رقم مبلغ ایک لاکھ روپے پیش کرنے حاضر ہوا جس سے خوش ہو کر احمد ساہ نے اسے اپنا سکہ جاری کرنے اور مستقل فوج رکھنے کی اجازت بھی دی، پھر احمد شاہ

لاہور آیا جہاں اس نے عبید اللہ خاں کو گورنر مقرر کیا۔ اسی حملہ کے دوران بھنگی نسل کے ایک سردار لہنا سنگھ کو خیرسگالی کے طور پر پھل بھجوائے۔ جس کو اس نے قبول نہ کیا۔ بلکہ حاضر ہو کر نذرانہ پیش کر کے وفاداری کا یقین دلایا۔ چنانچہ لہنا سنگھ کو نواح لاہور کا کچھ علاقہ بخش دیا۔

اسی اثناء میں خراسان میں بغاوت فرو کرنے کے لئے فوراً واپس جانا پڑ گیا۔ وہاں وہ بیمار رہ کر جون 1773ء میں وفات پا گیا جس کے بعد تیمور شاہ تخت کا وارث ہوا۔

احمد شاہ ابدالی نے صرف مسلمانوں کی حمایت اور ان کے تحفظ کے لئے ہی زیادہ تر حملے کئے۔ اگر وہ سکھوں اور مرہٹوں کی طاقت کا غرور نہ توڑتا تو مسلمان شاید یہاں سے نابود ہو جاتے۔

بہرحال احمد شاہ ابدالی اپنی خراب صحت اور مقامی سرتابی کی شورشوں کی وجہ سے سکھوں کے خلاف مہم کو مکمل نہ کر سکا۔

بعض متعصب مورخین احمد شاہ ابدالی کو بھی ظالم حملہ آوروں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ احمد شاہ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی عظیم اسلامی شخصیت نے بار بار خط لکھ کر مرہٹوں اور سکھوں کا زور توڑنے کی دعوت دی تھی۔ اگر احمد شاہ بار بار یہ حملے نہ کرتا تو برصغیر سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا جاتا۔ خصوصاً مرہٹے جو ظلم ڈھاتے اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں سکھوں نے بھی احمد شاہ کی فراخ دلی کی بنیاد پر ہی آگے بڑھ کر مسلمانوں کا تیا پانچا کیا لیکن وہ ان کا نام و نشان مٹانے سے قاصر رہے۔ پھر رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت میں مصلحتاً مسلمان زعماء سے اہم کام لئے کیونکہ سکھ حضرات میں انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔

## باب 9

# سکھوں کا عروج اور زوال (1469ء تا 1849ء)

## سکھ مت کی ابتداء اور عروج

**گوربابانانک:** اس کے بانی بابا گورونانک 1469ء میں تلونڈی رائے بھولا میں پیدا ہوئے جسے اب ننکانہ صاحب کہتے ہیں۔ تعلیم زیادہ نہ پائی تاہم طرت سلیم سے بہرہ مند تھے اور ہروقت معرفت کی وادی میں سیر کرتے تھے اور دنیاداری سے لگاؤ بالکل نہ تھا۔ والد صاحب نے کچھ رقم سودا خریدنے کے لئے دی جو انہوں نے فقراء میں تقسیم کردی۔ والد نے حساب مانگا تو کہا میں نے "سچا سودا" کیا ہے۔ جس مقام پر یہ واقعہ گذرا اسے سچا سودا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو ضلع شیخوپورہ میں ایک قصبہ ہے پھر والد نے سلطان پور (لودھی) کپور تھلہ (بھارت) کے نواب دولت خاں کے ہاں ملازمت دلا دی۔ جہاں سال ہا سال تک یہ فرائض انجام دیتے رہے، لیکن فرصت کے لمحات میں جنگلوں میں نکل جاتے اور مراقبہ کرتے۔ ایک دن انہیں اللہ کا دیدار نصیب ہوا اور تبلیغ کا حکم ملا کہ اللہ واحد کے نام کا پرچار کرو۔ جو صرف ایک ہے اس کا نام حق ہے۔ وہ خالق ہے۔ دشمنی اور خوف سے مبرا ہے۔ لافانی ہے۔ غیر مخلوق ہے۔ قائم بالذات ہے اکبر (اعلیٰ) اور فیاض ہے۔" چنانچہ وہ ملازمت چھوڑ کر سیاحت کے لئے نکلے اور تیس سال کی عمر میں اپنے دین کی تبلیغ کرنے لگے۔ اس اثنا میں وہ ہندوؤں کے مقدس مقامات اور مسلمان اولیائے کرام کے مزارات پر حاضر ہوتے اور فیض پاتے اور پنڈتوں سے مباحثے کرکے انہیں شرک سے منع کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ بابا نانک نے ایران، افغانستان اور مکہ معظمہ اور بغداد شریف کا سفر بھی کیا۔ انہوں نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک مقامی سید بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی (سیر المتاخرین) بابا نانک نے آخری عمر میں ایک قصبہ کرتار پور بسا کر اس میں رہائش اختیار کرلی، اور 1539ء میں فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔

**دو بیٹے:** ایک کا نام لکھمی چند تھا وہ دنیاداری کی طرف راغب تھا۔ دوسرا سری چند فقیری طریق پر گامزن ہوا اور اپنے طریقہ کا نام اوداسی رکھا۔ جس کے پیروکار لمبے بال رکھتے ہیں اور انہیں پگڑی کی جگہ سر پر باندھتے ہیں۔ پاجامہ یا تہمد نہیں پہنتے۔ صرف لنگوٹا پہنتے ہیں۔ بدن پر راکھ

ملتے ہیں۔ حجامت نہیں کرواتے۔ بدن کو استرا نہیں لگواتے۔

کہتے ہیں کہ بابا نانک کے والدین شاہ کوٹ (ضلع شیخوپورہ) کے مسلمان بزرگ شاہ ابوالخیر عرف بابا نو لکھ ہزاری یا ان کے جانشین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اولاد نرینہ کے لئے دعا کی درخواست کی۔ صاحب کرامت ولی اللہ نے دعا کی اور ساتھ ہی کہا اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا دے گا وہ تمہارا کم اور ہمارا زیادہ ہوگا۔ چنانچہ جب بابا نانک پیدا ہوئے اور بڑھے پلے تو اہل نظر نے معلوم کیا کہ وہ مادر زاد ولی اللہ ہیں۔ کنھیا لال ہندی اپنی تاریخ پنجاب (صفحہ 18 - 19) میں لکھتے ہیں چھ سات سال کی عمر میں نانک گھر سے باہر نہ نکلتا۔ نہ لڑکوں سے کھیلتا۔ اکثر خاموش رہتا۔ کوئی بلاتا تو بولتا ورنہ چپکا رہتا۔ اقرباء نے مریض جان کر طبیب کو بلایا۔ اس کے ساتھ عارفانہ باتیں ہوئیں وہ مریض عشق قرار دے کر چلا گیا۔ سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی بٹالہ کے مولا کھتری کی بیٹی سلکھنی سے ہوئی نانک جی کی بہن نانکی سلطان پور کے جے رام کھتری سے بیاہی گئی تھی۔

میں نے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ بابا نانک چونکہ بابا نو لکھ ہزاری کی دعا یا فیض سے پیدا ہوئے تھے اس لئے وہ اسلام کی طرف مائل اور بت پرستی کے خلاف تھے وہ توحید پرست، صلح کل خدا دوست، صاحب کشف و کرامت بے طمع اور صاحب عبادت و ریاضت بزرگ تھے۔ ایک مسلمان عقید تمند بھائی مردانہ (مطرب = میراثی) ان کے ساتھ رہتا۔ وہ خدا تک پہنچنے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو وسیلہ قرار دیتے تھے۔ وفات کے بعد ان کی میت کے غائب ہو جانے پر مورخین متفق ہیں۔ جو ایک سربستہ راز تھا۔ ہندو حضرات بابا نانک جیسے مجذوب اور عاشق صادق ولی اللہ کی مجذوبیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہندو قرار دیتے تھے جبکہ اہل اسلام کے نزدیک وہ ایک مجذوب اور اللہ کی محبت میں وارفتہ اور ایک پہنچے ہوئے مسلمان بزرگ تھے۔

(اک راز سے پردہ اٹھتا ہے)

# کیا بابا نانک مسلمان درویش تھے اور دفن کئے گئے تھے؟

بہت سے مسلمان بزرگ بابا نانک کو مسلمان بزرگ ہی سمجھتے ہیں۔ بہرحال بابا نانک ایک صلح کل شخصیت کے مالک تھے۔ مسلمان ان کو مسلمان اور ہندو ان کو ہندو سمجھتے تھے بھائی مردانہ جو اُن کا ہروقت کا ساتھی تھا مسلمان تھا۔ بابا جی توحید کی شراب میں مست رہتے تھے اور ان کے ارشادات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ مصطفیٰ کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ بھی مانتے تھے۔ وہ عشق الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ جیسے ایک مجذوب ہوتا ہے۔

ستمبر 1974ء کے بعد کی بات ہے کہ موڑ سمن آباد (لاہور) پر مدینہ کراکری مارٹ کے نام

سے راقم (قدو آفاقی) کی پارٹ ٹائم دکان تھی۔ 1980ء کے بعد 85-1984ء تک کے عرصہ میں مکان شریف المعروف بہ رتڑ چھتڑ ضلع گورداسپور (بھارت) کے نقش بندی بزرگوں سید امام علی شاہ اور سید صادق علی شاہ مرحوم کے خاندان کے چشم و چراغ ایک سید صاحب تھے وہ موڑ سمن آباد کے قریب اُردو نگر میں عبدالحمید بٹ کی کوٹھی کے ایک حصہ میں کرایہ پر رہتے تھے اور غالباً وہ لیبر ڈیپارٹمنٹ میں افسر تھے۔ وہ اکثر شام کے وقت راقم کے پاس تشریف لے آتے اور میری دکانداری چونکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لئے گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے۔ ان کے ساتھ مجھے بھی محبت تھی کیونکہ سلسلہ نقشبندیہ کے مہر عالمتاب میاں شیر محمد صاحب شرقپوری" کا بڑا پیرخانہ مکان شریف ہی تھا اور میرا پیرخانہ شرقپور شریف ہے ان شاہ صاحب کا نام غالباً شوکت صاحب یا کچھ اور تھا۔

مجھے اِن شاہ نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ "بابا گورونانک کی وفات کے بعد مسلمانوں نے نہایت رازداری سے باباجی کو رات کی تاریکی میں کہیں لے جاکر دفن کر دیا تھا اور ان کی چارپائی پر چادر کے نیچے پھول رکھ دیئے تھے۔ جن کو بانٹ کر مسلمانوں نے دفن اور ہندوؤں نے نذر آتش کر دیا تھا"

یہ بات میرے لئے بڑی تعجب خیز تھی، لیکن میں چپ رہا کیونکہ ایسی بات کو آگے بڑھانا کسی طرح بھی قرین انصاف نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے ان شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے بابانانک جی کے بارے میں جو واقعہ مجھے بتلایا تھا۔ وہ ذرا دوبارہ بیان کریں تاکہ میں اسے قلمبند کر لوں تو ان شاہ صاحب نے نہ صرف اس واقعہ سے کلی لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ انہوں نے ایسا کوئی واقعہ کبھی سنایا ہی نہ تھا۔ میں نے بہت یاددہانی کروانے کی کوشش کی مگر بے سود---- آخر میں نے جان لیا کہ سید صاحب مجھے اس واقعہ کو قلمبند کروانے سے گریزاں ہیں۔

بہرحال یہ واقعہ ان شاہ صاحب نے مجھے سنایا ضرور تھا۔

تاہم میں خاموش ہو رہا (چند سال بعد ان سید صاحب کا انتقال ہو گیا۔)

1994ء کی بات ہے کہ میں ماہنامہ ایوارڈ سیالکوٹ بابت نومبر 1994ء (شمارہ 8 جلد 6 چیف ایڈیٹر جاوید احمد ضیائی) کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس کے صفحہ نمبر 17 پر ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ کا آرٹیکل "بابا نانک سیالکوٹ میں دفن ہیں" دیکھا۔ اسے غور سے پڑھا تو وہی شاہ صاحب والی بات قلمبند کی ہوئی مل گئی۔ وہ آرٹیکل من و عن ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ تاکہ ایک راز ایک رسالے کی ایک اشاعت میں دفن ہو کر ہی نہ رہ جائے یاد رہے کہ رتڑ چھتڑ یعنی مکان شریف دریائے راوی کے بائیں کنارے جسڑ کے قریب بھارتی علاقہ میں واقع ہے، اور نقش بندی بزرگوں کے مزارات کے کلس پاکستانی سرحد سے صاف نظر

آتے ہیں۔

(قدر آفاقی)

نوٹ: بعض تاریخ نگار بابا نانک کا سن پیدائش 1468ء لکھتے ہیں۔ جبکہ کنھیا لال ہندی نے تاریخ پنجاب میں سن پیدائش 1520 بکرمی مطابق 880ھ و 1448ء دیا ہے اور سال وفات 1596 بکرمی مطابق 993ھ و 1538ء لکھا ہے۔ تقویم کی رو سے سال 880ھ 7 مئی 1475ء کو شروع ہو کر 27 مارچ 1476ء تک چلتا ہے۔ اسی طرح تاریخ وفات 993ھ و 1585ء کے مقابل آتا ہے۔ لہٰذا کنھیا لال ہندی کی دونوں تاریخیں غلط چھپی ہیں۔

(بحوالہ تاریخ پنجاب
مطبوعہ مجلس ترقی

ادب کلب روڈ لاہور صفحہ 18 و 22)

# (سینہ بہ سینہ چلا آنے والا پوشیدہ راز)

# بابا نانک ضلع سیالکوٹ میں دفن ہیں!

از قلم ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ۔

کئی قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ بابا نانک اوپر سے تو ہندو تھے مگر اندر سے مسلمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں سخت نزاع برپا ہوا کہ ان کو مسلمان سمجھ کر دفن کیا جائے یا ہندو سمجھ کر جلا دیا جائے۔

پیشتر اس کے میں تفصیلاً لکھوں کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔ کیونکر ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔ میں اس موضوع پر رائے بہادر کنہیا لال کی مشہور کتاب تاریخ پنجاب کے صفحہ 11 کی فوٹو کاپی پیش کر رہا ہوں جس میں میری تحقیقات کو 1/2 یعنی آدھا تو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1875ء میں شائع ہوئی تھی (انگریزوں نے پنجاب پر 1849ء میں قبضہ کیا تھا۔ یہ کتاب پورے 26 سال بعد 1875ء میں شائع ہوئی۔ ان ایام میں رائے بہادر کنہیا لال۔ لاہور میں انجینئر تھے۔ وہ شعر و شاعری بھی فرمایا کرتے تھے۔ ان کا تخلص "ہندی" تھا۔)

رائے بہادر نے لکھا ہے کہ بعد از وفات مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس بات پر سخت تنازع یا نزاع برپا ہوا تھا کہ میت کو دفن کرنا ہے یا ہندو رسومات کے مطابق جلانا ہے۔ تلواریں بھی دونوں جانب کھنچیں۔

یہاں تک رائے بہادر نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ مگر آگے جا کر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ

صحیح نہیں- قارئین کرام سب سے پہلے مذکورہ کتاب کے صفحہ 11 کی فوٹو کاپی (صحیح عکس) ملاحظہ فرمائیے اور مندرجات کو غور سے پڑھیے: (یہاں صرف اقتباس دے رہا ہوں) (قدر آفاقی)

تاریخ پنجاب مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال (تخلص ہندی) مطبوعہ 1875ء صفحہ 11 کا اقتباس:

"طرح طرح کی نعت کا خوان بن گیا جب یہ جواب پایا تو لڑکے خاموش ہو گئے- آخر گورونانک بروز رکی اسوج س م 1599 بکرمی 993ھ اور 1538ء کو اس جہانِ فانی سے سفر کر گیا چونکہ گورونانک ایک آدمی صلح کل ہندو مسلمان کے ساتھ برابر رکھتا تھا- بعد وفات اِس کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں درباب جلانے یا دفن کرنے نعش اس کے سخت تنازع برپا ہوا کیونکہ مسلمان اس کو جانتے تھے کہ یہ فقیر خدا پرست ہے اقوال اس کے مطابق آیات قرآن و حدیث پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے مطابق اس کو دفن کرنا چاہئے- جلا دینا ایسے مقبول شخص کی سراپا بے ادبی ہے اور ہندو بسبب اس کے کہ وہ ہندوؤں کے گھر پیدا ہوا اور ہندو تھا اپنے عقائد کے بموجب اس کی نعش کو جلا دینا ثواب تصور کرتے تھے- اس بات پر فریقین کے درمیان سخت نزاع برپا ہوئی اور تلواریں کھینچیں ایسی حالت کے بعد بعض مردمان انصاف پرست درمیان میں آگئے اور فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ گورونانک کی نعش نہ تو دفنائی جائے اور نہ داغ دیا جائے بلکہ دریائے راوی میں بعد کفن اور خوشبو لگانے کے بہا دی جائے مسلمان اس بات پر راضی ہوئے اور غلبہ کرکے اس مقام پر جا گھسے جہاں بابا نانک کی نعش رکھی تھی وہاں پہنچ کر چاہتے تھے کہ نعش کو اٹھائیں مگر جب چادر نعش سے اٹھائی تو نعش کو وہاں موجود نہ پایا صرف چند پھول خوشبودار چادر کے نیچے پڑے ہوئے نظر آئے ایسے حال کے وقوع میں آنے سے مسلمان نہایت شرمندہ ہوئے اور چاہا کہ اسی چادر اور پھولوں کو لے جا کر دفن کریں اتنے میں ہندو اجتماع کرکے آپہنچے اور آدھی چادر انہوں نے مسلمانوں سے چھین لی غرض وہی آدھی آدھی چادر مسلمان نے تو دفن کی اور ہندوؤں نے جلا دی اور گورنانک مع جسم جان دیدہ ظاہربین سے پوشیدہ ہو کر بہشت میں منزل گزیں ہوا-"

بھارت کا قصبہ ڈیرہ بابا نانک ضلع گورداسپور ہمارے قصبہ جسٹر ضلع سیالکوٹ سے صرف پانچ میل دور ہے اور پاکستان بھارت کی سرحد پر واقع ہے-اس قصبہ کے گوردوارہ میں بابا نانک کی ایک قمیض تاحال محفوظ ہے جسے سکھ حضرات چولا صاحب کہتے ہیں- اس قمیض پر پورا کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سنہری گوٹے میں لکھا ہوا آج بھی موجود ہے- قیام پاکستان سے پہلے میں نے چولا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا- اس زمانے میں میرے والد تحصیل بٹالہ

گورداس پور کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر(ADI سکولز) تھے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ایک انگریز تھا۔ (مسٹر تھامس لیزرس Lazrus-t)ڈیرہ بابا نانک کے تمام مڈل وہائی سکول میرے والد مرحوم کے ماتحت تھے۔ کیونکہ ڈیرہ کا قصبہ بٹالہ تحصیل کا ہی ایک حصہ تھا۔ میرے والد بٹالہ سے ڈیرہ بابا نانک مدارس کا معائنہ کرنے اپنے موٹر سائیکل پر جایا کرتے تھے، اور کئی بار مجھے بھی اپنی پیچھے بٹھالیا کرتے تھے۔ راستے میں علی وال کاستی وال اور دھرم کوٹ بگہ کے قصبے آیا کرتے تھے۔ دھرم کوٹ بگہ سے کے قصبہ کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر منشی فقیر اللہ قریشی ہوا کرتے تھے۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب نہ صرف میرے والد کے ماتحت آفیسر تھے بلکہ ایک ہی برادری ہونے کی وجہ سے دوست بھی بن گئے تھے۔ ان کا صاحبزادہ انوار الحق قریشی (XEN محکمہ PWD) حال ہی میں فوت ہوا۔ لاہور شاہدرہ کا نیا پل (دریائے راوی والا) انوار الحق قریشی XEN ہی نے بنایا تھا۔ میرے والد منشی فقیر اللہ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے لڑکے کا نام احسان الحق قریشی ہے اور تمہارے لڑکے کا نام انوار الحق قریشی ہے۔ میرا لڑکا پرنسپل گورنمنٹ کالج بنے گا اور تمہارا لڑکا انجینئر یعنی XEN بنے گا۔ (بعد میں ایسا ہی وقوع پذیر ہوا تھا) میرے والد کا نام پیر محمد غنی قریشی تھا اور وہ سلسلہ قادریہ میں قصور کے ایک ولی اللہ سے بیعت تھے۔ (در سلسلہ عالیہ حضرت سید بلھے شاہ قادری شطاری) انوار الحق قریشی چند سال سیالکوٹ میں بھی XEN رہے اور مجھے تقریباً روزانہ ملا کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کا جلد انتقال ہوگیا۔

برصغیر ہندوپاک کی تین برگزیدہ ہستیوں نے اسلام کا(Openly) ظاہر طور پر اظہار نہیں کیا۔ رات کو یہ تینوں حضرات اپنی نمازیں اکٹھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ (1) بابا گرونانک، (2) بھگت کبیر (3) بھگت چھجو--- ان تینوں حضرات نے چوری چوری حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ان دنوں مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ جانا کارے دارد تھا۔ سفر کی بہت سی مشکلات تھیں۔ بادبانی جہاز تھے۔ سٹیمر نہیں ہوا کرتے تھے۔ پھر ان مشکلات کو پار کرکے یہ تینوں حضرات اپنے اپنے وقتوں میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ آج تک کوئی غیر مسلم مکہ معظمہ نہیں جا سکا اور نہ ہی جائے گا۔ پھر یہ تین حضرات کیسے (اگر یہ غیر مسلم ہندو تھے) مکہ شریف پہنچ گئے؟ بابا نانک کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا ثبوت (ثبوت نمبر2) یہی ہے کہ ہندو اور سکھ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نانک جی مکہ گئے تھے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور سکھوں کے دسویں گورو (گورو گوبند سنگھ) ہم عصر تھے۔ ایک سال تک ان دونوں کی آپس میں صلح رہی۔ بعد میں سخت مخالفت ہوگئی۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی حکومت کے دوران صوبہ سرہند کے گورنر نے (بغیر پوچھے عالمگیر سے) گورو گوبند سنگھ کے صاحبزادے زندہ دیوار میں چنوا دیئے تھے۔ بادشاہ سرہند کے گورنر پر بہت ناراض ہوا۔ گورنر کی اس حرکت پر اسے برا بھلا کہا (نیز) اسے کہا کہ یہ کام تو تُو نے بغیر میری اجازت کے کیا مگر تاریخ کے اوراق

میں یہ کام میرا لکھا جائے گا۔ گورنر سرہند نے بادشاہ سے معافی مانگی اور کہا گوبند سندھ دن بدن سرکش اور باغی ہوتا جارہا ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کی خاطر میں نے یہ کام کرڈالا معذرت خواہ ہوں۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہندوستان کا مزار اورنگ آباد ضلع حیدر آباد دکن میں ہے اور گورو گوبند سنگھ کی آخری مڑھی بھی صرف 20 میل دور قصبہ نانذیر ضلع حیدر آباد دکن میں ہے۔ جب گورو گوبند سنگھ نے اورنگزیب کی وفات کی خبر ہوشیار پور پنجاب میں سنی کہ وہ حیدر آباد کن میں انتقال کرگیا ہے تو گورو کو یقین نہ آتا تھا۔ وہ خوشی اور مسرت کے جذبات میں بہہ کر بمعہ پانچ سو سکھ سواروں کے سیدھا حیدر آباد دکن پہنچا اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی قبر دیکھی تب اسے یقین آیا کہ بادشاہ فوت ہوچکا ہے۔

اس کے بعد وہ 20 میل دور قصبہ نانذیر میں سکھوں کے ایک گوردوارہ میں پہنچا۔ خوشی مسرت اور جذبات بے خودی میں اسے شادی مرگ ہوگئی۔ دل کی حرکت بند ہوگئی اور وہ بھی مرگیا۔ دونوں دشمنوں کی آخری آرمگاہ پاس پاس ہی ہے۔ میں نے دونوں قبریں اپنی آنکھ سے 1938ء میں دیکھی تھیں۔

صلح کے ایام میں گورو گوبند سنگھ نے اورنگ زیب عالمگیر کی تعریف میں ایک فارسی کتابچہ "ظفرنامہ" لکھا تھا۔

گورو گوبند سنگھ اور اورنگ زیب میں لڑائی کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورو جی نے ایک مضمون میں کہا تھا کہ جب بابا نانک مکہ شریف گئے تو بجائے اس کے کہ نانک جی کعبہ کا طواف کرتے کعبہ نے خود گھوم کر گورو نانک جی کا طواف شروع کردیا تھا۔ یہ من گھڑت بات تھی جس کو پڑھ کر اورنگزیب عالمگیر سخت ناراض ہوا تھا۔

گورو گوبند سنگھ سے ایک بار نواب سعد اللہ خاں نے پوچھا کہ آپ کے اولین گورو بابا نانک تو مسلمان تھے کیونکہ انہوں نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ان کے مکہ معظمہ کے سفر کی تاریخ ثبوت موجود ہے۔ کوئی غیر مسلم مکہ شریف میں داخل نہیں ہوسکتا، پھر یہ کیسے مکہ میں داخل ہوگئے تھے؟ گورو گوبند سنگھ نے فوراً ایک رباعی گھڑی اور فرمایا:

"عرب کے بادشاہ نے ان کو غیر مسلم ہونے کے سبب گرفتار کرلیا تھا اور یوں پوچھا تھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ بابا نانک نے شعر میں جواب دیا تھا۔"

ہندو آکھاں تے ماریئے، میں مسلمان دی ناں
پنج تت دا پتلا تے نانک میرا ناں

اس پر گورنر مکہ مطمئن ہوگیا تھا۔ جب اس نے یہ جواب سنا کہ میں نہ ہی ہندو ہوں اور نہ ہی مسلمان تو گورنر مکہ نے بابا نانک کو شک کا فائدہ دے کر بری کردیا تھا۔

یہ بات گورو گوبند سنگھ نے من گھڑت ہی بنا ڈالی تھی۔ گورنر مکہ تو پنجابی زبان یا پنجابی اشعار سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

سچی اور سیدھی سادی بات یہ ہے کہ بابا نانک نے عام مسلمانوں کے طرح احرام پہن کر باقاعدہ طواف کعبہ کیا تھا اور تمام رسومات حج بھی ادا کی تھیں۔ بابا نانک کا مسلمان ملازم بھائی مردانہ قوال بھی تمام سفر میں باباجی کے ساتھ رہا اور اس نے بھی باباجی کے پیچھے پیچھے طواف کعبہ (دورانِ حج) کیا تھا۔

میں نے خود کئی سکھوں سے پوچھا کہ بابا نانک کی قمیض پر کلمہ شریف کیوں کندہ ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے بابے نے ایسا کیا تھا۔ جب پوچھو کہ حج بیت اللہ و طواف کعبہ کیوں باباجی نے کیا تھا تو جواب ملتا ہے کہ یہ بھی بابے نے اپنے قوال بھائی محمد مردانہ کو خوش کرنے کے لئے کیا تھا۔

دراصل حضرت بابا نانک قصبہ دربار صاحب کرتار پور ضلع سیالکوٹ میں دفن ہیں۔ میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے کبھی کبھی دربار صاحب کرتار پور تحصیل شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ چلا جاتا ہوں۔ بابا نانک 1539ء میں قصبہ دربار صاحب کرتار پور میں فوت ہوئے۔ ان ایام میں شیر شاہ سوری کی حکومت تھی۔ جس دن باباجی کی وفات ہوئی اسی دن سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ ہندو کہنے لگے کہ ہم نے ہندوانہ رسوم کے مطابق ارتھی کو جلانا ہے۔ مسلمان کہنے لگے کہ ہم نے بابے کا جنازہ پڑھنا ہے۔ پھر بابے کو دفن کرنا ہے۔ باباجی کو ہم نے کئی نمازیں پڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بابے نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ہم کسی صورت میں بابے کی میت کو جلانے نہیں دیں گے۔ یہ شیر شاہ سوری کا زمانہ تھا جس نے نصیرالدین ہمایوں بادشاہ سے سلطنت ہندوستان (عارضی طور پر) چھینی تھی۔ بعد میں شاہ ایران (طہماسپ) کی امداد ہمایوں بادشاہ نے دوبارہ سلطنت ہندوستان حاصل کرلی تھی۔ بہرحال قصبہ کرتار پور نور کوٹ، چک قاضیاں اور جسڑ کے مسلمان اور ہندو آپس میں لڑنے لگے۔ بابا نانک کی میت نے سخت جھگڑا اختیار کیا۔ دو روز سے میت اس طرح پڑی ہوئی تھی۔ آخر کار شکر گڑھ کے تعلقہ دار شاہ رحمان دیوان ثانی قصبہ کرتار پہنچے اور مسلمان نمبردار کو یوں کہا:

"ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ شیر شاہ سوری شہنشاہ ہندوستان ہے تم لوگ خواہ مخواہ ہندوؤں سے خائف ہو کر دب رہے ہو۔"

"ننگی تلواریں دونوں اطراف سے جلوہ گر ہیں تم اس طرح کرو کہ آٹھ دس مسلمان بعد از نماز عشاء باب نانک دین کی میت کو چوری کرلیں اور باہر میدان میں لے جائیں۔ ہم دس بارہ لوگ ان کی نمازہ جنازہ خفیہ خفیہ اندھیرے میں ہی پڑھ لیں اور بابا نانک کو کفن

دے کر سپرد خاک کر دیں۔ کسی اور کو کانوں کان علم نہ ہو۔ صبح سویرے تم شور مچا دینا کہ لوگو سنو! صبح صبح آسمان سے ایک عجیب مخلوق فرشتہ نما دیوتے اترے اور بابا نانک کی میت کو اٹھا کر آسمانوں پر لے گئے۔ چارپائی پر ایک ریشمی معطر چادر اور چند پھول چھوڑ گئے۔ اس چادر میں سے مشک وغیرہ کی خوشبوئیں اور اعلیٰ لپیٹیں آ رہی ہیں۔ آؤ ہندو بھائیو! ہم آپس کی لڑائی اب بالکل ختم کر دیں۔ اب تو میت ہی مفقود ہے۔ بابا نانک غائب ہیں۔ دیوتاؤں کی لائی ہوئی چادر ہم دو ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ آدھا ٹکڑا تم ہندو لوگ جلا دو اور وہاں پر بابا کی مڑھی یا کی سمادھی بنا دو۔ باقی آدھی چادر ہم مسلمان لوگ دفن کر کے اس پر قبر بنا لیتے ہیں۔ چلو جھگڑا ختم شد۔ ہم بھی خوش تم بھی خوش۔"

چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ مسلمانوں نے میت چوری کر کے اندھیرے میں چوری چوری باہر میدان میں چپکے چپکے دبے الفاظ میں نماز جنازہ پڑھ لی اور بابا کو وہیں قصبہ کرتار پور میں راوی کے کنارے دفن کر دیا گیا۔ صبح صبح نمبردار قصبہ نے شور مچا دیا کہ بابا کی میت کو آسمانی فرشتے اور دیوتے اوپر آسمان پر لے گئے ہیں اور ان کی میت یا ارتھی کی بجائے یہ معطر چادر چارپائی پر چھوڑ گئے۔ یہ چادر آسمانی تحفہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

نتیجتاً افہام و تفہیم سے ہندو باشندے راضی ہو گئے کہ آدھی چادر ہندوؤں کی رسومات منعقد کر کے سپرد کر دی جائے اور بقیہ آدھی معطر چادر مسلمان قبر کھود کر دفن کر دیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ ہندوؤں نے نصف چادر چتا بنا کر جلا ڈالی اور مسلمانوں نے بقیہ آدھی چادر عین اسی گڑھے میں دفن کر دی جہاں بابا نانک کا جسد خاکی گذشتہ شب چوری چوری جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا گیا تھا۔

اس واقعہ کے وقت ہندوستان میں سکھ مذہب نہیں چلا تھا۔ اس وقت ایک بھی سکھ موجود نہ تھا تمام ہندو ہی تھے۔ سکھ مذہب بابا کی وفات کے 150 سال بعد چلا۔

چار سو سال بعد مہاراجہ پٹیالہ نے بابا نانک کی چادر والی سمادہ پر (انگریزوں کے دور میں 1920ء میں) سنگ مرمر کا گوردوارہ بنا دیا۔ مگر مسلمانوں والی قبر ویسے کی ویسے ہی رہنے دی گئی۔ انجینئر رام سیال تھے۔

سکھوں کی متبرک کتاب (جو کہ گورو گوبند سنگھ کے وقت میں معرض تحریر میں آئی تھی) بھی یہی واقعہ بتلاتی ہے کہ آسمانی دیوتے آئے تھے اور میت کو اوپر اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کتاب کا نام گورو گرنتھ صاحب رکھا گیا اور بابا نانک کے وصال کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں بابا فرید الدین مسعود المعروف گنج شکر پاک پتنی کے بھی دو سو سے زائد شلوک (اشعار) موجود ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ میت دفن کی گئی تھی۔

یہ تمام واقعہ کسی تاریخی کتاب میں درج نہیں۔ میں نے یہ واقعہ اپنے دادا ابو پیر نبی بخش قادری صابری سے سنا تھا۔ میرے دادا ابو 120 سال کی عمر میں امرتسر میں فوت ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش 1809ء ہے اور تاریخ وفات 1929ء-9-9 ہے۔ انہوں نے بتلایا تھا کہ یہ واقعہ انہوں نے اپنے باپ پیر بھولے شاہ سے سنا تھا اور انہوں نے اپنے باپ سے سنا تھا۔ ہمارے جد امجد شاہ رحمان دیوان ثانی تھے جو ان ایام میں شکر گڑھ کے تعلقہ دار تھے۔ انہوں نے ہی بابا نانک کا جنازہ پڑھا تھا۔ سارا انتظام جنازہ انہوں نے ہی کیا تھا۔ شاہ رحمٰن دیوان ثانی کی مکمل سوانح عمری میں پھر کسی فرصت کے وقت قلمبند کروں گا۔ میرے دادا ابو پیر نبی بخش قادری نے مجھے یوں کہا تھا۔

"بیٹا احسان! تم میرے پوتے ہو۔ یہ واقعہ سینہ بہ سینہ ہمارے جد امجد شاہ رحمان دیوان ثانی کے وقت سے زبانی روایت پر ہی چلا آ رہا ہے۔ تم اسی طرح آگے زبانی ہی لا دینا۔ صفحہ قرطاس پر مت لانا۔ کیونکہ پھر غیر مسلم ہمیں طعنے دیں گے کہ مسلمان کفن چور ہیں۔ انہوں نے بابا نانک کی میت چوری کر لی تھی اور بعد میں جنازہ بھی خفیہ ہی پڑھ لیا تھا۔ اب تم بتلاؤ کہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور حضور سرور کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی شخص جسدی حالت میں آسمان پر نہیں گیا۔ بابا نانک کا آسمان پر چلے جانے کا قصہ مسلمانوں نے مجبوراً گھڑ لیا تھا تاکہ قصبہ کرتار پور میں ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے۔"

یہ روایت ہمارے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے۔ مگر صفحہ قرطاس پر میں یہ پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ میرے بزرگوں کی روحیں مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گی کیونکہ ان کی نصیحت عرصہ سے چلی آ رہی ہے کہ اس واقعہ کو کاغذ پر مت لکھنا۔ زبانی ہی ہر باپ اپنے بیٹے کو بتلا دیا کرے، اور یہ سچی بات صرف سینہ بہ سینہ ہی چلے۔ مندرجہ ذیل بزرگوں سے یہ بات مجھ تک پہنچی تھی:

(1) شاہ رحمان دیوان ثانی قریشی صدیقی تعلقہ دار شکر گڑھ۔ جنہوں نے بابا نانک کی نماز جنازہ کرتار پور میں پڑھائی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد و امجاد میں سے تھے۔ (2) پیر شیر محمد (3) پیر محمد یونس (4) پیر غلام غوث (5) پیر غلام مصطفیٰ (6) پیر غلام رسول (7) پیر بھولے شاہ (8) پیر نبی بخش قادری صابری (9) پیر محمد غنی سابق ADI سکولز امرتسر (10) راقم الحروف ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ۔

جب اوپر کے تفصیلی واقعات مجھے میرے دادا ابو نے سنائے تھے اس وقت میں آٹھویں یا نویں کا طالب علم تھا مگر ان کی باتیں مجھ پر نقش بر قلب ہو چکی تھی۔ افسوس کہ وہ میرے میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے اور قصبہ جنڈیالہ گورو ضلع امرتسر میں دفن ہوئے جہاں پر ان

دنوں میرے والد صاحب ADI سکولز جنڈیالہ سب ڈویژن تھے۔ دادا ابو نے 120 سال کی طویل عمر پائی ان کی صحت آخر تک بہت اچھی رہی۔ انہوں نے اپنی جوانی میں رنجیت سنگھ کا دربار لاہور بھی دیکھا تھا۔ قیام پاکستان (1947ء) کے بعد ہمارا خاندان امرتسر سے ہجرت کرکے سیالکوٹ میں دوبارہ آباد ہوا۔ دراصل دادا ابو اپنی جوانی میں ہی 1857ء کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر موضع ڈھوڈہ تحصیل پسرور سے ہجرت کرکے امرتسر چلے گئے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ انہوں نے امرتسر میں ہی محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ جس وقت پنجاب میں ریلوے سسٹم کا نظام نافذ ہوا تب ان کی موجودگی در امرتسر کا ڈھوڈہ والوں کو پتہ چلا۔

جب میں گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ کالج سیالکوٹ کا پرنسپل مقرر ہوا تو مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں شکر گڑھ جانا پڑا۔ جب گاڑی دربار صاحب کرتار پور اسٹیشن پہنچی تو معاً مجھے اپنے دادا ابو صوفی نبی بخش قادری صابری کی وہ تمام باتیں یاد آگئیں جو انہوں نے بابا نانک کے متعلق میرے بچپن میں مجھے بتلائی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ انہوں نے کہا تھا کہ بابا نانک کی قبر دربار صاحب کرتار پور نامی قصبہ میں ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ دربار صاحب کرتار پور پہنچوں۔ وہاں بابا نانک کی قبر تلاش کروں اور فاتحہ پڑھوں۔

پاس ہی قصبہ چک قاضیاں تھا (ریلوے اسٹیشن نور کوٹ) وہاں ایک مشہور بزرگ رہائش پذیر تھے۔ جن کا تعلق سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ سے تھا۔ ان کا نام تو سید محمد اشرف تھا مگر ان کے مرشد خواجہ حسن نظامی نے ان کا نام بدل کر سید کشفی شاہ نظامی رکھ دیا تھا۔ کیونکہ ان کو علم کشف القبور اور کاشن (کذا) دسترس حاصل تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے کشفی شاہ جی کو خلافت عالیہ چشتیہ نظامیہ سے بھی سرفراز کر دیا تھا۔ سید کشفی جی وہی بزرگ ہیں جو مشہور عالم قانون دان سید محمد ظفر سابق وزیر قانون ایوب خان کیبنٹ) کے والد ماجد ہیں۔ افسوس ان کا بھی چند سال قبل انتقال ہو گیا۔ مزار پر انوار چک قاضیاں میں ہی ہے۔ ہر سال 13 ربیع الاول کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ کلیئر شریف (انڈیا) میں عرس صابریہ بھی 13 ربیع الاول کو ہی ہوتا ہے۔ نیز دہلی میں عرس حضرت خواجہ قطب الدین بختار کاکی خلیفہ خواجہ اجمیری بھی 13 ربیع الاول کو ہی ہوتا ہے۔ حضرت قطب الدین دوران سماع ہی فوت ہوئے تھے۔ یہ واقعہ دہلی کا ہے۔ سید کشفی نظامی نے ان تین حضرات کو خلافت عالیہ چشتیہ نظامیہ سے نوازا تھا۔

1۔ حضرت صوفی محمد صدیق اخوانی، رنگ پورہ۔ سیالکوٹ (مشہور رائٹر ابو طالب نظامی کے والد ماجد) فوت شد۔
2۔ سید بشیر حسین شاہ چشتی نظامی صابری محلہ خواجگان، رنگ پورہ، سیالکوٹ (زندہ ہیں)
3۔ صاحبزادہ سید قدیر احمد شاہ، سجادہ نشین درگاہ کشفی شاہ نظامی، چک قاضیاں براستہ نور کوٹ ضلع

سیالکوٹ۔ کشفی شاہ کے داماد (زندہ ہیں)

بہرصورت میں اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں میں سیدھا چک قاضیاں چلا گیا وہاں سید کشفی شاہ نظامی (خلیفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی) سے ملا اور ان سے عندیہ ظاہر کیا کہ مجھے قصبہ دربار صاحب کرتارپور لے چلو جو کہ چک قاضیاں سے چند میل کے ہی فاصلہ پر واقعہ ہے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے۔

جس جگہ ہندوؤں نے بابا نانک کی معطر چادر نذر آتش کی تھی وہاں پر مہاراجہ پٹیالہ اور ان کے انجینئر لالہ شیام داس نے 1912ء میں سنگ مرمر سے ایک عالی شان گوردوارہ اور سمادھ بنائی تھی۔ اس کے باہر آدھے میل کے فاصلے پر دریائے راوی بہہ رہا تھا۔ جو کہ ضلع سیالکوٹ اور ضلع گورداسپور کے درمیان بین الاقوامی سرحد ہے۔ صرف ان دو اضلاع کے درمیان دریائے راوی کو سرحد مانا گیا ہے۔

گوردوارہ سے 50 گز دور سید کشفی شاہ نظامی مجھے ایک قبر کے پاس لے گئے اور مجھے کہا کہ یہ قبر بابا نانک کی ہے۔ انہوں نے اس قبر پر آدھ گھنٹہ تک مراقبہ کیا اور علم کشف القبور کے ذریعے مجھے بتلایا کہ انہوں نے باباجی سے بات کی ہے۔ ان کا جسد خاکی اسی طرح محفوظ ہے جیسے تدفین کے وقت تھا۔ چونکہ بابا نانک مسلمان تھے اور حاجی تھے وہ ولی اللہ بھی تھے۔ درویش کامل بھی تھے سید کشفی شاہ نے مجھے بتلایا کہ بابا نانک نے تم کو سلام اور پیار دیا ہے' اور کہا ہے کہ "یہ لڑکا شاہ رحمان دیوان ثانی تعلقہ تعلقہ دار شکر گڑھ کی دسویں پشت میں سے ہے۔ شاہ رحمان دیوان ثانی نے ہی بابا نانک کی میت کو لے جا کر اس رات چیدہ چیدہ مسلمان اہلکاروں کو مدعو کر کے رات کے اندھیرے میں ہی خود بابا نانک کا جنازہ پڑھایا تھا۔ راتوں رات ہی مجھے دفن کر دیا گیا تھا۔ اس عزت افزائی پر میں احسان قریشی صابری اور شاہ رحمان دیوان ثانی کے خاندان کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ بعد میں شیر شاہ سوری شہنشاہ ہندوستان کو بھی اس اقدام کی اطلاع دے دی گئی تھی مگر ہندوؤں کی ناراضگی کے خطرہ کے پیش نظر اس اقدام کو خفیہ رکھا گیا تھا۔

آج بھی تاریخ کا یہ ورق مخفی ہے اور چونکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور پتہ نہیں کب بلاوا آ جائے اس لئے میں نے اس سچے تاریخی واقعہ کو سپرد قلم کر دیا ہے۔ کئی حضرات میری اس تحریر پر جزبز تو ہوں گے کہ نعوذ باللہ ایک کافر کو ولی اللہ لکھ مارا لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بابا نانک مسلمان تھے۔ آخر کچھ تو بات تھی کہ ایک ہزار مسلمان 1539ء میں ننگی تلواریں لے کر نکل آئے تھے۔ کہ بابے کو جلانے نہیں دیں گے۔ باقاعدہ تدفین کریں گے۔ قصبہ دربار صاحب کرتارپور میں ہی بابا نانک دفن ہیں۔ ان کی قبر موجود ہے میں اس قبر کی اب بھی نشان دہی کر سکتا ہوں۔

میں اہل ثروت حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بابا نانک دین کے مزار پر ایک قبہ یا گنبد

نما عمارت بنا دیں۔ اس عمارت کے باہر بابا جی کا اسم گرامی اور تاریخ وفات 1539ء کندہ کر دی جائے۔ 1530ء میں وہ اپنے قوال بھائی محمد مردانہ کے ساتھ حج کرنے گئے تھے۔ لہٰذا سال 1530ء بھی کندہ کر دیا جائے (بطور سال حج)

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بہ ماند نام نیکت برقرار

(ترجمہ) نیک بزرگان دین کے نام نامی کو ضائع مت کرنا۔ ان کا تذکرہ صفحہ قرطاس پر محفوظ رکھنا، پھر تیرا نام بھی حق تعالیٰ تا قیامت زندہ رکھے گا۔ تیرا یہ نیک کارنامہ اور تیرا نیک نام بھی تاریخ اسلام میں برقرار رہے گا۔

بابا نانک کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔ اس رباعی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک محمد کے اعداد 92 نکل آتے ہیں۔

عدو گنو جس انچر کے کیجو چوگنے تا
دو ملاؤ پنج گن کیجو کا نوبیں بنا
باقی بچیں جو نو گن کیجو دو اسمیں اور ملا
نانک ہر کے بچن سے محمد ﷺ نام بنا

رباعی نمبر 2

جو ست گورو کی بات سنا دے
کہو نانک اسے کیا دیجئے
سیس کاٹ بیٹھس کو دیجئے
بن سر سیوا کریجے

(ترجمہ) جو شخص گوروؤں اور اولیاء اللہ پر ماتماہ واہگورو ایشور اور اللہ کے پیاروں کی باتیں بتادے اور سوانح عمری لکھے اے نانک اس لیکھک (رائیٹر) کو کیا انعام دیا جائے؟

اس لیکھک کا کم از کم انعام یہ ہے کہ اپنا گلا کاٹ کر اس کے لئے کرسی بنائی جائے۔ اس کرسی پر اس لیکھک کو بٹھلا دیا جائے۔ پھر ہمارا انسانی دھڑ (بغیر گلے والا دھڑ) اس لیکھک کی سیوا کرے۔ اس لیکھک کی خدمت کرے۔

میں اپنا مضمون ختم کرنے سے پہلے بابا نانک کے چار مزید شلوک دربارہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتا ہوں جن سے ان کی واحدانیت عشق رسول، ایک خدا پر ایمان اور تقویٰ ظاہر ہو گا۔

## بابانانک کے دیگر اشعار توحید:

اور نعت ہائے رسول مقبول۔

(1) صاحب میرا ایکو ہے۔ ایکو ہے بھائی ایکو ہے

(آسا محلہ صفحہ نمبر1)

(ترجمہ) میرا پروردگار ایک ہے۔اے میرے بھائی وہ ایک ہی ہے۔ (قل ھو اللہ احد)

2 نمبر

ایکو سمرو نانکا جو جل تھل رہیا سمائے
دوجا کاہے سمریئے جو جمے تے مر جائے
پاک پڑھو کلمہ رب دا۔ محمد نال ملائے
ہویا معشوق خدائے دا۔ ہویا تل الائے

(جنم ساکھی بھائی بلا (بالا)۔ صفحہ 121)

ترجمہ نانک ایک خدا کو مانو اور اس کی پوجا کرو جو سمندر میں بھی سمایا ہے اور تھل (زمین) میں بھی سمایا ہے۔ کسی دوسرے کو خدا مت مانو وہ جو عورت سے پیدا ہوا اور پھر مرجائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ کلمہ پاک پڑھا کرو۔ جو کہ محمد سے تمہیں ملا دے گا۔ محمد نہ صرف اللہ کا پیارا نبی ہے بلکہ اللہ کا معشوق بھی ہے۔ وہ نبی ساری دنیا کا تارا ہے اور نور سے اوتار ہے۔

نمبر3

اول نام خدائے دا' در دربار رسول ﷺ
شیخا نیت راس کر۔ تاں درگاہ پویں قبول

(جنم ساکھی ولایتاں صفحہ 48)

(ترجمہ) سب سے پہلے یعنی اول نام خدا کا لو اور رسول ﷺ کی ذات تو درمیان میں سلسلہ ملانے والی ہے جس طرح شاہی محل کا دربان بادشاہ سے ملا دیا کرتا ہے اے شیخ حرم اپنی نیت صاف کرلے اگر تو نے حق تعالیٰ کی درگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرنا ہے۔

نمبر4

اول اللہ نور او پایا قدرت کے سب بندے
اک نور تھیں جگ اپجیا' کون بھلے کون مندے؟

(محلہ مغویہ)

(ترجمہ) یہ سب دنیا اللہ کے نور سے پیدا ہوئی۔ ایک ہی نور سے سارا جگ روشن ہوا۔ کچھ بندے نیک ہوئے کچھ "مندے" ہوئے مگر سب اپنی اپنی بولیاں بول کر پرندوں کی طرح اڑ

گئے۔"

(احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ۔)

مندرجہ بالا شہادت سے پتہ چلا کہ بابا نانک کی میت بظاہر گم ہو گئی تھی، اور چادر اور پھولوں کا آدھا حصہ مسلمانوں نے دفن کر دیا اور بقیہ آدھا حصہ ہندوؤں نے جلا دیا تھا اب یہ راز طشت از بام ہو گیا ہے کہ بابا نانک جی روحانی طور پر اتنے متصرف بزرگ تھے کہ انہوں نے اپنی میت کو جلوانا درست نہ جانا بلکہ حالات کے تحت بالآخر بطور مسلمان دفن ہونا قبول کیا اور ہندوؤں کی زبردستی کا علاج جو کیا وہ گویا ہندوؤں کی بے بسی کا مظہر تھا۔ پس بابا نانک مرحوم کو مسلمان صوفیاء نے ہمیشہ توحید پرست مسلمان اور مست الست موحد خیال کیا۔ اور جب امرتسر کے تالاب وغیرہ کی بنیاد رکھی جانے لگی تو یہ فریضہ مشہور مسلمان صوفی بزرگ حضرت میاں میر قادری لاہوری نے انجام دیا، لیکن ہندوؤں نے ہمیشہ بابا نانک جی کے پیروکاروں کو مسلمانوں کی بجائے ہندوازم میں مدغم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ حتیٰ کہ بھارتی مرکزی حکومت نے 1954ء میں "ہندو کوڈ بل" پاس کیا اس کوڈ بل "code bill" میں سکھوں کو ہندوؤں کا ہی ایک فرقہ بیان کیا گیا۔ جس کے خلاف سکھ حضرات نے غم و غصے کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ گورو گوبند سنگھ کے دور کی مرتب کردہ قانونی کتاب پریم آشرم کے مطابق سکھوں کو ایک الگ قوم تسلیم کر کے ان کا پرسنل لا اور الگ قانونِ وراثت تشکیل دیا جائے۔ ویسے بابا نانک جی کا ایک مشہور ارشاد اس طرح بھی ہے:

مہر میت، صدق مصلے، حق حلال قرآن صوم سنت، سیل روزہ ہوئے مسلمان

(پنجابی ادب دی کہانی صفحہ 209 از عبدالغفور قریشی)

**دوسرے گورو، انگد جی:** بابا نانک جی نے 22 ستمبر 1539ء کو وفات پائی۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ مسلمان اور ہندوؤں کی رائے کے مطابق وہ ہندو تھے۔

ہندوؤں میں ان کا جانشین گورو انگد جی کو مقرر کیا گیا۔۔۔ گورو انگد 13 سال جانشین رہ کر 1552ء میں وفات پا گئے اور اپنا جانشین امرداس کو نامزد کیا وہ بائیس سال تک خدمت نبھا کر 1574ء میں فوت ہوئے۔ رام داس نے سکھوں کی مذہبی اور سیاسی تنظیم کی طرف توجہ دی، اور سکھ ازم کی تبلیغ باقاعدہ اور منظم طریقے سے شروع کی۔ یہ مذہب مساوات اور بھائی چارے کا پرچار کرتا تھا۔ چھوت چھات کا منکر تھا۔ امرداس کی اکبر بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی اور اپنی عارفانہ گفتگو سے مطمئن کیا۔ چنانچہ اکبر نے امرداس کو ایک جاگیر عطا کی۔

اس جاگیر پانے سے سکھ ازم ترقی کرنے لگا۔ امرداس نے رسم ستی کی مخالفت کی اور

بیوگان کی شادی پر زور دیا۔ اور بابا نانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا۔

رام داس سکھوں کا چوتھا گورو تھا۔ جو امرداس کا چیلا اور داماد تھا۔ اس نے نے بھی سکھ ازم کا خوب پرچار کیا۔ رامداس بادشاہ اکبر کا مداح اور ہر طرح سے اس کا مددگار تھا۔ چنانچہ اکبر نے 1577ء میں اسے پانچ سو بیگھے کی جاگیر عطا کی جہاں اس نے مقدس تالاب کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ جو بعد میں امرتسر کے نام سے مشہور ہوا۔ حالانکہ شروع میں اس کے قریب تعمیر کئے جانے قصبے کا نام رامداس پور رکھا گیا تھا۔ تالاب کی تکمیل اس کے بیٹے اور پانچویں گورو ارجن کے ہاتھوں انجام پائی جس نے اس کے وسط میں "ھرمندر" کی بنیاد رکھی اور سکھوں کے عام عبادت خانہ کے طور پر اسے وقف کر دیا۔

جسے دربار صاحب کا نام دیا گیا۔ یورپی مصنفین اسے "گولڈن ٹمپل آف امرتسر" کہتے ہیں۔ گورو صاحب نے اعلان کر دیا کہ اس تالاب میں اشنان کرنے والا گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سکھوں کا روحانی مرکز بن گیا۔

گورو ارجن 1581ء میں اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا اور سکھوں کو ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کے کوشش میں مصروف ہوا۔ نیز اس نے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کی تدوین کی جس میں پچھلے تین گورو صاحبان کے علاوہ اپنی تحریریں بھی شامل کیں اور بابا نانک سے پہلے کے ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیاء کا کلام بھی اقتباساً درج کیا۔ تاکہ اپنے دین کی وسیع المشربی ظاہر کی جاسکے۔

گرنتھ صاحب کو چھ سال میں 1604ء میں مکمل کیا اور اس کا نام آدی گرنتھ (قدیم صحیفہ) رکھا۔ گورو ارجن نے دنیا داری اور مذہب کو اکٹھا کر دیا اور گورو کے نام پر چندہ جمع کرنے کے لئے نمائندے اطراف و جوانب میں روانہ کئے۔ گورو ارجن نے اپنا لقب "سچا بادشاہ" اختیار کیا اور سیاسی ہوس کا اظہار بھی کیا۔ اس نے تجارت کے معاملے میں اپنے چیلوں کی حوصلہ افزائی کی۔ نیز اپنے مذہب کے مبلغوں کو افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی بھیجا۔ 1606ء میں گورو ارجن نے مغل شہزادہ خسرو کی مالی مدد کی جس نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ جسے شکست ہوئی اور سیاسی سازباز کی پاداش میں گورو ارجن کو لاہور میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ جلد ہی وفات پا گیا۔

چھٹے گورو ارجن کے بیٹے ھرگووند مقرر ہوئے اور انہوں نے 1606ء سے 1645ء تک یہ فرض نبھایا۔ اس کے عہد میں سکھ مذہب اور قوم کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے پیداوار کا دسواں حصہ (عشر) ٹیکس (نذرانہ) نافذ کیا اس طرح وہ بڑا مالدار ہو گیا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور کھیلوں اور شکار کا رسیا تھا۔ وہ جہانگیر کے خلاف معاندانہ رویہ رکھنے لگا اور کیونکہ وہ اسے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ وہ جہانگیر سے انتقام لینا بھی چاہتا تھا اس لئے اس نے دریائے بیاس کے کنارے

"ھرگوند پور" میں ایک قلعہ بھی بنایا اور ہر طرح کے عادی مجرموں کو اکٹھا کر کے جمعیت بھی فراہم کرلی- وہ قلعے کے نواح میں لوٹ مار کرتا- اب اس کے اصطبل میں آٹھ سو گھوڑے بھی تھے اور تین سو گھڑ سوار ہر وقت اس کی خدمت میں موجود رہتے اور ساٹھ توڑے دار بندوقچی اس کی حفاظت پر مامور تھے- اس فوجی تیاری کی خبر جہانگیر تک پہنچی تو اسے گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور کچھ عرصہ بعد اسے رہا کر دیا گیا- اس قید نے گورو کے دل میں مزید دشمنی پیدا کر دی- جہانگیر فوت ہوا تو شاہجہان کے عہد میں ھرگوبند نے کھلم کھلا بغاوت کر دی، اور چھ سال میں لاہور کے گورنر کی فوجوں کو تین بار شکست دی اور پھر پہاڑی علاقوں میں روپوش رہا- جہاں اس نے 1645ء میں انتقال کیا-

گورو ھرگوند نے سکھوں کو ایک فوجی قوت بنانے کے لئے بڑا کام کیا- اس کے بعد اس کا پوتا "ہررائے" گدی نشین ہوا جو بہت خاموش طبیعت گورو تھا- اس کے داراشکوہ کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی تھے- چنانچہ جب داراشکوہ 1658ء میں اورنگزیب کی فوجوں سے بچنے کے لئے مارا مارا پھر رہا تھا تو گورو ہررائے نے دریائے بیاس عبور کرنے اور کسی پناہ گاہ تک پہنچنے میں اس کی مدد کی- جس کی وجہ سے گورو ہررائے اورنگزیب کے زیر عتاب آگیا اور نگزیب نے بازپرس کے لئے ہررائے کو دہلی طلب کیا- لیکن اس نے اپنے بیٹے رام رائے کو بھیج دیا- جسے اورنگزیب نے سکھوں کے پرامن رویہ کی ضمانت کے طور پر دہلی میں رکھ لیا- 1661ء میں ہررائے وفات پا گیا تو اس کے چھ سالہ بیٹے ہرکشن کو گدی پر بٹھایا گیا- رام رائے نے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے عالمگیر کے دربار میں ہرکشن کی گدی نشینی کو چیلنج کیا اور ہرکشن کو مقدمہ میں جواب دہی کے لئے دہلی بلایا گیا- جہاں وہ چیچک سے 1664ء میں فوت ہو گیا، اور بڑا جھگڑا پیدا ہوا کہ گدی نشین کون ہو- آخر کئی امیدواروں میں سے ھرگوند کے بیٹے تیغ بہادر کو گدی نشین گورو تسلیم کر لیا گیا-

جبکہ بعض ناکام امیدوار بھی اپنی اپنی جگہ گورو بن بیٹھے چنانچہ تیغ بہادر ناراض ہو کر کوہ شوالک کی طرف کوچ کر گیا اور وہاں انندپور کی بنیاد رکھی- نیز اس نے مشرقی بنگال، دکن وغیرہ کا طویل سفر اختیار کیا- راستے میں پٹنہ میں قیام بھی کیا جہاں سکھوں کا بہت بڑا تخت (مذہبی مقام) تھا- اس کا بیٹا گووند رائے 1666ء میں اسی جگہ پیدا ہوا- کچھ عرصہ بعد وہ پنجاب میں واپس آگیا اور اپنے چیلوں کی پشت پناہی شروع کر دی- شاہی دستوں نے اسے گرفتار کر لیا اور دہلی لے گئے اور 1675ء میں اورنگزیب کے حکم سے سزائے موت دے دی گئی- 1675ء میں اس کا نو سالہ بیٹا گووند رائے گدی نشین ہوا جس نے سکھ قوم کو جنگجو اور فوجی قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہ اورنگزیب کا سخت دشمن بن گیا لیکن اسے سرکشی کی جرأت نہ ہو سکی- تاہم وہ سکون کی خاطر پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور مسلمانو اور ہندوؤں کے مذہبی علوم حاصل کرتا رہا-

نیز مغلوں کی حکومت مٹانے کے منصوبے بناتا رہا- افرادی قوت کے لئے اس نے "پاہل" کی رسم جاری کی- جس کے ذریعے ہر کوئی سکھ مذہب میں شامل ہو کر باوقار زندگی گذار سکتا تھا- اس نے یکسانیت قائم کرنے کے لئے پانچ ککوں (کاف سے شروع ہونے والے پانچ لوازم) کنگھا، کیس، کچھا، کڑا اور کرپان کو لازمی قرار دیا تاکہ ذات پات کا تصور مٹایا جائے- نیز اس نے ہر سکھ کے نام کے آخر میں سنگھ کا لفظ شامل کرنے کا حکم دیا، اور اپنا نام گووند سنگھ رکھا- اور سکھوں کو "خالصہ" (خالص، برگزیدہ، آزاد کردہ) کا نام دیا-

گووند سنگھ نے اپنی قوت میں اضافہ کرکے بار بار مغلوں سے انتقام لینے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوتی رہی- البتہ لوٹ مار کی وارداتیں جاری رہیں- پہاڑی راجاؤں نے شاہی مدد طلب کی- اورنگزیب نے سرہند کے گورنر کو ان کی مدد کے لئے لکھا- چنانچہ لڑائی میں گورو جی کو شکست ہوئی- انندپور کے قلعہ میں 1701ء میں شاہی فوجوں نے اسے گھیر لیا- اس کے بہت سے پیروکار ساتھ چھوڑ گئے- اس کا خاندان اس کی والدہ، بیٹے، بیویاں وغیرہ بچ کر سرہند کی طرف نکل گئے، لیکن وہاں ہندو اہلکاروں کی سازش سے اس کے دو بچے قتل کر دیئے گئے-

گورو گووند سنگھ بھیس بدل کر چمکور (ضلع انبالہ) کے قلعہ کی طرف بھاگ نکلا- اور پھر ادھر ادھر چھپتا چھپاتا بھٹنڈہ کے ویرانوں میں پہنچ گیا اور فیروز پور میں مکتسر کے مقام پر پہنچا تو اسے تعاقب کرنے والوں سے نجات ملی، لہٰذا اس جگہ کا نام مکتسر (نجات دہندہ) رکھا گیا-

اسی جگہ گرنتھ صاحب (آدی گرنتھ) کی تکمیل اور دسم گرنتھ تصنیف کیا- اسی اثنا میں 1707ء میں اورنگزیب نے وفات پائی اور اس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا جس نے گورو صاحب کو دکن کی فوجی کمان عطا کر دی وہ چارج لینے وہاں پہنچا لیکن کسی افغان ملازم کی ذاتی رنجش کا نشانہ بن کر دریائے گوداوری کے کنارے، "ناندیر" کے مقام پر اکتوبر 1707ء میں مقتول ہو گیا-

یہ سکھوں کا دسواں گرو تھا- اپنے بعد اس نے کسی کو جانشین نامزد نہ کیا بلکہ آئندہ کے لئے جانشینی کا سلسلہ ختم کر دیا-

**بندہ بیراگی:** یہ شخص گووند سنگھ کا چیلا تھا- اس نے سکھوں کے فوجی قائد کی جگہ حاصل کی وہ کشمیری راجپوت تھا اور بیراگی سلسلے سے متعلق تھا- سکھ بننے کے بعد دکن میں ہی بندہ کا لقب اختیار کیا- گووند سنگھ نے اسے پنجاب میں جانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے سکھوں کو منظم کرے- پنجاب کے سکھ اس کے گرد جمع ہو گئے اس نے رہزنی شروع کر دی- مغلیہ سلطنت زوال کا شکار تھی- باہمی جنگوں نے اس کا وقار ختم کر دیا تھا- بندہ نے اپنا کام بلا روک ٹوک جاری رکھا- وہ لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے قریب تک جا پہنچا- مال غنیمت کی ہوس اور گورو کے بچوں کے انتقام نے سکھوں کو سرہند پر حملہ کرنے پر اکسایا- مئی 1710ء میں وہ

کامیاب ہو گئے۔ سکھوں نے سرہند کے مسلمانوں پر ہیبت ناک مظالم توڑے۔ بہادر شاہ دکن میں تھا۔ اُسے خبر ملی تو پنجاب کا رخ کیا اور بندہ کی فوجوں کو شاہی افواج نے شکست دی، لیکن بندہ بیراگی بچ نکلنے میں کامیاب ہو کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔ 1712ء میں بہادر شاہ نے وفات پائی تو اس کے بیٹے جانشینی کی جنگ میں الجھ گئے جس میں جہاں دار شاہ کو کامیابی ہوئی، لیکن گیارہ ماہ کے اندر وہ فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور دہلی کا اقتدار ڈھلنے کے بعد غروب ہونے کے قریب آگیا۔ ادھر سکھوں کی سرکشی تیز ہو گئی بندہ بیراگی کے مظالم سے سارا پنجاب زچ تھا۔ آخر فرخ سیر نے پنجاب کے گورنر عبدالصمد خاں کو اس کی سرکوبی کا حکم دیا۔ یہ گورداس پور کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ آخر پکڑا گیا اور اپنے سات آٹھ سو ساتھیوں سمیت 1716ء میں دہلی لے جا کر اسے لرزہ خیز مظالم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ بندہ بیراگی سکھوں کے نزدیک بھی قابل تعظیم و تحسین نہیں تھا۔ کیونکہ وہ مفسدانہ سرگرمیوں کا حامل انتہائی خود غرض قسم کا شخص تھا۔ وہ دسویں گورو کے حکم کے خلاف گیارھواں گورو بن بیٹھا تھا۔ چنانچہ گووند سنگھ کے مخلص چیلوں نے اس کے خلاف بغاوت بھی کر دی تھی۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کو قرار واقعی سزائیں دی گئیں، اور لگتا تھا کہ سکھ مٹ جائیں گے لیکن وہ پہاڑیوں میں تتر بتر ہو گئے اور مغل راج کے کمزور ہوتے ہی پھر نمودار ہونے لگے۔

فرخ سیر کے عہد میں سکھوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا کیونکہ ان کے مظالم حد سے گزر گئے تھے۔ اس کے لاہور کے گورنر میر منو نے سختی کی پالیسی جاری رکھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے بھی سکھوں کی کمر توڑنے میں خاصا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن مغلوں کی کمزوری نے انتشار کو جنم دیا۔ سکھوں کو لوٹ مار کا موقع ملا۔ جس سے انہوں نے مالیاتی طاقت بھی حاصل کر لی۔ ان کا مرکز امرتسر تھا۔ شہزادہ تیمور احمد شاہ ابدالی کی طرح سکھوں کے خلاف تھا۔ اس نے 1756ء میں امرتسر پر حملہ کر کے "ہرمندر" کو منہدم کر دیا اور مذہبی تالاب (آب حیات کا تالاب) کو ملبے سے پُر کر دیا۔ جس پر سکھوں نے شہزادے کو لاہور سے نکال دیا اور عارضی طور پر اس پر قابض بھی ہو گئے۔ سکھ سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا۔ لیکن راگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد پر وہ 1768ء میں لاہور سے نکل گئے اور احمد شاہ نے پنجاب کا رخ کیا اور پانی پت کے مقام پر 1761ء میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس عرصہ میں سکھ ادھر ادھر روپوش رہے۔ جونہی احمد شاہ واپس ہوا وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اگلے سال احمد شاہ ان کا زور توڑنے کے لئے پھر پنجاب میں وارد ہوا اور لدھیانے میں 1762ء میں سکھوں کو شکست فاش دی پھر اسے قندھار میں بغاوت فرو کرنے کے لئے واپس جانا پڑا چنانچہ سکھ پھر واپس آگئے اور 1763ء میں سرہند شریف کے افغان گورنر زین خاں کو شکست دے کر سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

بعد ازاں وہ لاہور پر بھی قابض ہو گئے اور اپنی گرفت ان علاقوں میں کافی مضبوط کر لی، اور امرتسر میں اکٹھے ہو کر 1764ء میں پنجاب میں "خالصہ" حکومت کا اعلان کر دیا اور اقتدار اعلیٰ کے لئے قومی مجلس تشکیل دی جس کا نام "گرومتہ" رکھا اور اپنا سکہ جاری کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ
یافت از نانک گرو گووند سنگھ

سکھ حکومت قائم ہوتے ہی وہ متعدد ریاستوں میں بٹ گئے جن کو مسلیں کہتے تھے۔ ان مسلون کی تعداد بارہ تھی۔ جن کا ہر سکھ سردار خود مختار ہو کر اپنے علاقے میں حکومت کرتا تھا۔ ان پر کوئی حاکم اعلیٰ مقرر نہ تھا۔ جو ان سے باز پُرس کر سکے، اور سکھ ازم کے سوا ان میں کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ چنانچہ ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لئے وہ آپس میں دست و گریباں رہتے۔ ان کی خانہ جنگیوں نے پنجاب کو مزید تباہی اور بربادی کے تحفے دیئے۔ تیس سال کا یہ سکھ عہد غیر مستقل حکومت کا علمبردار تھا۔

**سکھوں کے فرقے:** دو سکھ فرقے زیادہ مشہور ہیں۔ (1) سنگھ یا کیس دھاری (2) سہج دھاری۔

کیس دھاری سکھ وہ ہیں جو پاہل کی رسم ادا کر کے سکھ بنائے گئے تھے۔ یہ گرو گووند سنگھ (گوبند سنگھ) کے کٹر پیروکار ہیں۔ سہج دھاری فرقہ کے لوگوں نے "پاہل" کی رسم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ وہ بابا نانک کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر روحانی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے جنگجو خالصاؤں کے جتھوں میں شامل ہونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ بعض دیگر فرقوں کے نام اس طرح ہیں۔

1۔ **نانک پنتھی:** وہ گوبند سنگھ کی بنائی ہوئی رسموں کو نہیں مانتے یا انہیں ضروری خیال نہیں کرتے۔ وہ قدیم گورو صاحبان کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ تمباکو نوشی کے بھی خلاف نہیں۔ لمبے بال رکھنے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ "پاہل شدہ" نہیں ہوتے۔ گویا وہ سہج دھاری فرقے کے زیادہ قریب ہیں۔

2۔ **اداسی** (تارک الدنیا) یہ بھی سہج دھاری فرقے میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ گورو نانک جی کے بیٹے سری چند کو رہبر مانتے ہیں۔ مجرد رہتے ہیں ان میں ہندوؤں کے راھبانہ مسلک کی جھلک بدرجہ۔ اتم پائی جاتی ہے۔

3۔ **اکالی:** (اکال۔ کبھی نہ مرنے والا غیر فانی۔ یعنی اللہ۔ خدائے لایزال کے پرستار) یہ لوگ گوبند سنگھ کے کٹر پیروکار اور جنگجو سکھ ہیں جن میں جنگی روح اب تک باقی ہے۔ اسی پنتھ کے سکھوں نے 1947ء کے بٹوارے میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

4- بندائی یا بندہ پنتھی: یہ سکھ بندہ بیراگی کو گیارھواں گرو تسلیم کر کے اس کی پیروی کی مدعی ہیں- مگر خالصے جٹ بندہ بیراگی کی بدعات کی بجائے گورو گوبند سنگھ کی پیروی کے سختی سے پابند ہیں-

5- مذہبی سکھ: (عام تلفظ مزبی ہے) یہ خاکروب طبقہ کے وہ سکھ ہیں جو پاہل کی رسم کے ذریعے سکھ ازم قبول کر کے سکھ بنائے گئے تھے-

6- رام داسی سکھ: وہ ان کی اولاد ہیں جو گورو رام داس کے ہاتھ پر سکھ ہوئے تھے اور ان کے نام کا اطلاق ان چماروں اور موچیوں پر بھی ہوتا ہے- جنہوں نے پاہل کی رسم ادا کر کے سکھ ازم قبول کیا تھا- (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر11 نمبر107 تا 117- تلخیص)

## لاہور (قلب پنجاب) پر چند بڑے حملے

کنہیال لال ہندی تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ لاہور پر پہلا حملہ سلطان محمود غزنوی نے 413ھ میں کیا- کیونکہ اس کے خراج گزار راجہ جے پال نے کالنجر کے راجہ کی فوج مقابلہ کے لئے بلائی تھی- چنانچہ اسے شکست دے کر محمود واپس غزنی چلا گیا اور ملک ایاز کو بطور گورنر یہاں چھوڑ گیا- جس کے بہتر انتظامات کی وجہ سے لاہور علم و ادب کا گہوارہ بن گیا-

2- دوسری بار لاہور پر شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کو شکست دے کر قبضہ کیا اور غوری سلطنت قائم کی اور غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا-

3- سلطان غوری نے دہلی اور لاہور کو فتح کر کے قطب الدین ایبک نامی اپنے غلام کو کار مختار بنایا جبکہ کیچ اور مکران اور سندھ اور ملتان کی نیابت اپنے دوسرے غلام تاج الدین یلدوز کو عطا کی- سلطان غوری کی وفات کے بعد تاج الدین نے لاہور پر حملہ کر دیا- مگر حاکم لاہور شکست کھا کر دہلی کی طرف بھاگ گیا- لاہور سے اسے کچھ نہ مل سکا- پھر اس کا مقابلہ دہلی سے آنے والے قطب الدین ایبک کے لشکر سے ہوا، اور تاج الدین یلدوز مار کھا کر غزنی کی طرف بھاگ گیا- ایبک کی اچانک موت کے بعد تاج الدین یلدوز نے لاہور کو فتح کر لیا اور التمش کی طرف بڑھا جو دکن میں مصروف پیکار تھا- التمش نے اسے سرہند کے مقام پر آلیا اور اسے شکست دے کر ملتان اور سندھ کی طرف بھگا دیا اور تعاقب کر کے سکھر کے قلعہ میں محصور کر دیا- جہاں سے بھاگتے وقت ملاحوں کی سازش سے ساتھیوں سمیت اسے غرق کر دیا گیا-

4- لاہور پر چوتھی آفت جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے دور میں آئی- جب امیر تیمور نے لاہور اور پنجاب کو تاراج کیا- التمش ان دنوں گجرات کی مہم میں مصروف تھا- آخر وہ تیموری لشکر

پر چڑھ دوڑا اور دریائے ستلج پر اسے شکست دی۔ تاتاریوں نے اس دفعہ لاہور کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ التمش نے لاہور اور دیگر لٹی پٹی بستیوں کو دوبارہ آباد کیا اور دفاعی انتظام بھی خوب کئے کہ دوبارہ اس کے عہد میں کوئی پنجاب پر حملہ آور نہ ہو سکا۔

5- سلطان محمد تغلق کے عہد میں بے شمار تاتاری فوج مغرب کی جانب سے پنجاب پر چڑھ آئی۔ دیپال پور اور لاہور کو ہدف بنا کر خوب لوٹا۔ پھر تاتاری دہلی کی طرف بڑھے اور تاوان لے کر واپس گئے۔ تاتاری لشکر بہرام نامی حاکم ملتان کی شہہ پر حملہ آور ہوا تھا چنانچہ بعد میں سلطان نے اس کو سزا کے طور پر قتل کروا دیا۔

6- تاتاری مغل لشکر نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک بار پھر پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کی رعیت کو بہت نقصان پہنچایا تاہم فیروز شاہ نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کرتے ہی تاتاریوں کو آلیا اور وہ پنجاب سے بھاگ گئے۔

7- پھر محمد شاہ تغلق کے عہد میں گکھڑوں نے "سیکھا" نامی سربراہ کی قیادت میں پنجاب پر حملہ کیا اور شاہی اہلکاروں کو نکال دیا۔ لاہور کو بھی خوب لوٹا۔ گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے شہزادے کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا گیا۔ لیکن اتنے میں محمد شاہ تغلق وفات پا گیا اور 796ھ میں محمود شاہ سلطان بنا۔ اس نے بھی مہم جاری رکھی اور سیکھا شکست کھا کر جموں کو بھاگ گیا۔ ادھر امیر تیمور کا بیٹا شہزادہ پیر محمد ملتان پر قابض ہو گیا جبکہ خود امیر تیمور دہلی میں براجمان ہوا۔ اسی کشمکش میں سیکھا نے لاہور پر قبضہ کر کے ظلم کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ امیر تیمور نے دہلی سے واپسی پر کوہ جموں میں مقیم ہو کر سلطان سکندر بت شکن بادشاہ کشمیر کو خلعت سے نوازا۔ اس موقعہ پر پنجاب کی رعایا نے سیکھا گکھڑ کے ظلم کی دہائی دی۔ چنانچہ دس ہزار کے لشکر سے سیکھا کو شکست دی جس میں وہ مارا گیا اور اس طرح لاہور میں امن بحال ہوا۔

8- خضر خاں کے بیٹے سلطان مبارک شاہ کے عہد میں لاہور پر افتاد پڑی جب امیر تیمور نے سیکھا گکھڑ کے قتل کے بعد پنجاب میں امن قائم کیا تو خضر خاں کو ہند کی نیابت سے نوازا۔ چنانچہ اس کی زندگی میں امن قائم رہا۔ 828ھ میں خضر خاں فوت ہوا تو مبارک شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور پنجاب میں گکھڑوں نے سیکھا کے بھائی جسرت کی قیادت میں اودھم مچا دیا اور لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ ناظم شہر شکست کھا گیا لیکن شہریانِ لاہور نے مقابلہ جاری رکھا۔ دو ماہ بعد لاہور کو فتح کر لینے کے بعد گکھڑوں نے اسے خوب لوٹا اور پھر جلا کر خاکستر کر دیا۔ چنانچہ سرہند کے حاکم کو بادشاہ نے صورت حال سے نمٹنے کے لئے کہا۔ لیکن وہ تعمیل ارشاد کی بجائے گکھڑوں سے مل گیا۔ اور دہلی پر حملہ کرنے کے منصوبہ بنایا اور جسرت کی فوج کو

سرہند تک لے گیا۔ لیکن جسرت نے دھوکہ سے اسے مغلوب کرلیا اور چاہا کہ اکیلا ہی دہلی کے تخت پر قابض ہو جائے۔ اتنے میں بادشاہ خود جسرت کے مقابلے کو آگیا۔ اور اسے پہاڑوں کی طرف بھگا دیا اور خود لاہور آگیا اور ویران شہر کو آباد کرنے کے لئے منادی کروادی کہ جو کوئی شہر لاہور میں آباد ہو گا چھ ماہ کا خرچہ حکومت کی طرف سے پائے گا۔ اس طرح تین ماہ میں شہر آباد ہو گیا۔ پھر بادشاہ نے گکھڑوں کا علاقہ برباد کر دیا۔ لیکن جسرت ہاتھ نہ آیا۔ واپسی پر سرہند کے قریب جسرت نے پھر بادشاہ پر حملہ کیا۔ ازیں پیشتر وہ جموں کے حاکم کو مخبری کی پاداش میں قتل کر چکا تھا۔ پھر جسرت نے کابل کے حاکم امیر شیخ علی کو ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ کی کوشش کی۔ اور پنجاب میں تباہی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ادھر شاہی فوج نے راستہ روکا۔ دوآبہ باری میں شیخ علی کو شکست دی اور پھر جسرت کے لشکر کا تیا پانچا کیا اور جسرت کی لاش تک نہ مل سکی۔ شیخ علی کا تعاقب پشاور تک کیا اور اس کی لڑکی سے بادشاہ نے نکاح کے عوض اسے معافی دے دی۔

9- پھر بابر کے دور میں پنجاب پر حملے ہوئے۔ لاہور کو فتح کیا اور پھر اپریل 1526ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا۔

10- نادر شاہ ایرانی کے حملہ کے وقت بھی پنجاب اور لاہور پر افتاد پڑی اور حاکم لاہور زکریا خاں نے بیس لاکھ نقد اور دس ہاتھی بطور تاوان دے کر لاہور کو غارت گری سے بچالیا۔

11- پھر احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت بھی پنجاب اور لاہور پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے جب شاہ نواز خاں حاکم پنجاب کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ مغل پورہ کے محلہ میں شاہی ارکان کی رہائش گاہوں سے لاکھوں کروڑوں کا مال غنیمت ہاتھ لگا۔

12- پھر معین الملک عرف میر منو کی شکست کے بعد احمد شاہ ابدالی نے لاہور میں اپنے بیٹے تیمور کو پنجاب کا ناظم بنایا۔ آدینہ بیگ نے مرہٹوں سے سازباز کر کے انہیں ساتھ ملا لیا۔ آخر احمد شاہ اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ البتہ اس کے بعد سکھ عروج پکڑنے لگے۔

13- سکھوں کے عہد میں بھی لاہور کو برے دن دیکھنا پڑے جب اس پر تین سکھ سردار حاکم بن بیٹھے، اور پھر لاہور اور پنجاب نے سکھا شاہی کے مظالم ملاحظہ اس طرح جبراً برداشت کئے کہ حیا سرنگوں ہو گئی۔

# سکھ مسلوں کا اجمالی تذکرہ

1- بھنگی مسل: یہ بھنگی نسل کے سکھوں کی مسل تھی جس کا امرتسر، گجرات، چنیوٹ اور لاہور پر قبضہ تھا۔ اس کے پاس بارہ ہزار سوار تھے۔ ان کا بڑا چھجا سنگھ تھا جس نے گورو گوبند سنگھ کے ہاتھ پر سکھ ازم قبول کیا تھا۔ یہ بھنگ کا رسیا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھیوں کی مسل بھنگی کے نام سے مشہور ہوئی۔

لوٹ مار اور غارتگری کے لئے یہ مسل بہت بدنام تھی۔ رعایا کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چھجا سنگھ کی موت کے بعد بھما سنگھ اس مسل کا سربراہ بنا جس کے بعد اس کا متبنی ہری سنگھ سربراہ بنا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ یہ مرا تو اس کا لڑکا مہاں سنگھ سربراہ مقرر ہوا۔ اس کی موت کے بعد چندا سنگھ کو سربراہ بنایا گیا۔ اس نے بارہ ہزار سواروں سے جموں پر حملہ کیا راجہ رنجیت دیو راجہ جموں نے مقابلہ کیا اور لڑائی میں چندا سنگھ کام آ گیا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ چنانچہ گلاب سنگھ کے بیٹے گنڈا سنگھ کو مسل کا سردار بنایا گیا۔ اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہو چکا تھا۔ چنانچہ گنڈا سنگھ دوسری مسلوں کے سکھ سرداروں کے تعاون سے لاہور کی طرف بڑھا۔ بھسین کے مقام پر دونوں طرف کی فوجیں جمع ہو گئیں، لیکن جنگ سے پہلے ہی گلاب سنگھ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے مر گیا۔ اس طرح سکھوں کا اتحاد ختم ہو گیا۔ پھر رنجیت سنگھ نے موقع پا کر امرتسر پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر بھنگی مسل کے سارے علاقے ایک ایک کر کے رنجیت سنگھ کی تحویل میں آ گئے۔

2- رام گڑھیا مسل: اس کا سربراہ جسا سنگھ آدینہ بیگ کا تحصیلدار تھا۔ اس کی وفات کے بعد اپنے تفویض کردہ علاقے میں خود مختار بن بیٹھا۔ سردار جے سنگھ کنہیا نے اسے شکست دے کر ستلج سے پار بھگا دیا۔ جے سنگھ اور رنجیت سنگھ کے والد مہاں سنگھ میں ٹھن گئی تو جسا سنگھ مہاں سنگھ کا حامی تھا۔ جے سنگھ کو شکست ہوئی اور جسا سنگھ اپنے علاقے پر دوبارہ قابض ہو گیا اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جودھ سنگھ مسل کا حاکم بنا۔ جس نے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر کے باجگزاری اختیار کر لی۔ جودھ سنگھ مرا تو رنجیت سنگھ نے اس کے بیٹوں کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھا کر اس کے علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور مال و دولت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح نااتفاقی کی سزا تینوں بھائیوں کو مل گئی۔

3- کنہیا مسل: اس کا سردار جے سنگھ کنہیا تھا۔ جو کاہنہ (لاہور) کا رہنے والا تھا۔ اس نے فاقوں سے تنگ آ کر سکھ ازم قبول کر لیا اور سردار کپور سنگھ کی سرپرستی میں ڈاکے مارنے لگا۔ پھر اپنی بستی کے سکھ جوانوں کو ساتھ ملا کر الگ مسل کا بانی ہوا۔ جس کو مہاں سنگھ نے

سنگھ اور سنسار چند نے مقابلہ کر کے اس کے مقبوضہ قلعہ کانگڑا پر سنسار چند کا قبضہ کروادیا۔ اس جنگ میں جے سنگھ کا بیٹا مارا گیا۔ اور جسا سنگھ بدستور اپنے علاقوں پر قابض رہا۔ 1819ء میں جے سنگھ فوت ہو گیا تو اس کی بہو رانی سدا کنور زوجہ گور بخش سنگھ اس کے علاقے پر قابض ہو گئی۔ جس کو اس کے داماد رنجیت سنگھ نے قید کر کے اس علاقے کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔

4- نیکائی یا نکئی مسل: اس کا سردار ہیرا سنگھ تھا۔ اس نے بھی فاقوں سے تنگ آکر اور سکھ بن کر راہزنی کو اپنایا اور بہت سا مال و زر جمع کر لیا اور لشکر بھرتی کر کے اپنے علاقہ کا سردار بن گیا اور ملک نکہ (یہ نکہ گاؤں کا باسی تھا) کہلانے لگا۔ اور علاقے میں استحکام پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکپتن کی ریاست تھی جس کا سربراہ بابا فرید شکر گنج کے خانوادہ میں سے میاں شیخ سبحان قریشی تھا۔ ہیرا سنگھ نے پاکپتن پر حملہ کر دیا۔ جس میں ہیرا سنگھ مارا گیا۔ اس کا لشکر بھاگ کر بھیروال چلا گیا، پھر ہیرا سنگھ مسل میں باہمی نزاع نے سر اٹھایا۔ آخر رنجیت سنگھ نے اس مسل پر بھی قبضہ جما لیا۔

5- آلووالیہ مسل: اس کا سربراہ بھاگ سنگھ شراب فروشی میں مندے کا شکار ہو کر سکھ بن گیا اور ڈاکہ زنی اختیار کی۔ اور چھوٹا سا لشکر تیار کر کے ایک علاقے پر حکمران بن بیٹھا۔ اس کا بھانجا جسا سنگھ کپور سنگھ کے علاقے میں بااختیار افسر تھا۔ بھاگ سنگھ بے اولاد تھا اس لئے وفات کے بعد اس کی مسل پر جسا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ جسا سنگھ آدینہ بیگ کا معتقد اور اطاعت گزار تھا۔ اس کی زندگی میں اس کا اقتدار قائم رہا۔ مگر آدینہ بیگ کے مرتے ہی سکھوں نے اس کی علاقے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ جسا سنگھ نے سرہند کے قریب فتح آباد پر قبضہ جما لیا۔ پھر کپور تھلہ کی ریاست ابراہم بھٹی سے چھین لی۔ جسا سنگھ نے احمد شاہ درانی سے دو سو ہندوستانی عورتوں کو آزادی بھی دلائی تھی جن کو وہ اپنے ساتھ زبردستی کابل لے جا رہا تھا۔ اس طرح اس کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جسا سنگھ کی موت کے بعد بھاگ سنگھ اس مسل کا مہری بنا۔ یہ مرا تو اس کی جگہ سردار فتح سنگھ جانشین ہوا۔ فتح سنگھ راجہ رنجیت سنگھ کا حامی اور مددگار بن کر اس کی فتوحات میں اضافہ کا باعث بنا۔ جب سکھوں اور انگریزوں کے درمیان دریائے ستلج کو سرحد بنایا گیا تو رنجیت سنگھ کی نیت میں فتور آگیا لیکن بروقت اطلاع ہو جانے سے فتح سنگھ کپور تھلہ سے بھاگ کر انگریزی علاقے میں چلا گیا اور انگریزوں کو دوست بنا لیا۔ اس کی وفات کے بعد نہال سنگھ جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی وہ غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر اس کی سکھ فوج انگریزوں کے خلاف ڈٹ گئی۔ تاہم انگریز فتح مند ہوئے اور کپور تھلہ وغیرہ پہ انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ نہال سنگھ نے عذر پیش کئے مگر بات نہ بن سکی۔ چنانچہ ایک لاکھ بتیس ہزار روپے نقد سالانہ خراج دینا منظور کیا اور راجہ کا خطاب پایا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا رندھیر

سنگھ جانشین بنا۔ اس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو فوجی امداد دی۔ چنانچہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی زمینداری اسے لکھنؤ کے علاقے میں انگریزوں نے عطا کی۔ جو اس کی وفات کے بعد 1884ء میں بحق سرکار ضبط قرار پائی جسے بعد ازاں اس کے بیٹے کھڑک سنگھ کے نام منتقل کر دیا گیا۔

6- **ڈلے والیہ مسل:** اس کا بانی ڈلے وال کا باسی گلابا کھتری تھا۔ جس نے سکھ ازم اختیار کر کے ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے اور گلاب سنگھ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ مختصر مدت میں جمعیت تیار کر کے ایک علاقے پر حکمرانی کرنے لگا۔ وفات کے بعد تارا سنگھ چرواہے کو اس کا جانشین بنایا گیا کیونکہ گلاب سنگھ لاولد تھا۔ تارا سنگھ نے سکھ بن کر بھنگی مسل کے سرداروں کے ساتھ قصور کے حسین خاں کو شکست دی وہاں سے چار لاکھ کا زیور ہاتھ آیا۔ اور دس ہزار سپاہ بھرتی کر لی۔ جب سکھوں نے مل کر سرہند کو تاراج کیا انہیں وہاں سے بہت سا خزانہ ملا۔ رنجیت سنگھ نے فتح سنگھ آلووالیہ کو کہا کہ تارا سنگھ سے اس کے علاقے چھین لے۔ یہ علاقے چھنتے ہی وہ اسی غم میں موت کی آغوش میں چلا گیا۔

7- **نشان والیہ مسل:** سنگت سنگھ اور مہر سنگھ نے دریائے ستلج کے علاقے میں ڈاکے مار کر دولت اکٹھی کی۔ اس میں دس ہزار سوار فراہم کر لئے۔ ایک دفعہ میرٹھ پر بھی یلغار کی اور دولت لوٹ کر لائے انبالہ اس مسل کا مرکز تھا۔ سنگت سنگھ مرا تو مہر سنگھ نے ساری مسل پر قبضہ جما لیا۔ وہ لاولد تھا۔ اس کی وفات کے بعد رنجیت سنگھ نے دیوان محکم چند سنگھ کے ذریعے اس مسل کو بھی ہڑپ کر لیا اور بہت بڑا خزانہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا۔

8- **فیض اللہ پوریہ مسل:** دوآبہ جالندھر میں فیض اللہ پور واقع ہے۔ یہاں کا کپور چند سکھ بنا تو نواب کپور سنگھ کے نام سے سکھوں کا پیشوا بھی بن گیا۔ پھر ہزاروں غیر مسلموں کو سکھ ازم کی آڑ میں اپنا حامی بنایا اور لوٹ مار شروع کی۔ اس نے بقول خود پانچ سو مسلمانوں کو قتل کیا تھا تاکہ اس کی نجات کا باعث بنے گا۔ اس کی مسل میں 2500 سوار تھے۔ ستلج سے دہلی تک لوٹ مار کرنا اس کا کام تھا۔ اسے اپنے گاؤں کا نام فیض اللہ پور پسند نہ تھا کیونکہ اس میں اللہ کا نام تھا چنانچہ اس نے اپنے گاؤں کا نام سنگھ پور رکھا اور فیض اللہ پور کہنے والوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا۔ کپور سنگھ مرا تو خوشحال سنگھ اس مسل پر قابض ہو گیا۔ آخر رنجیت سنگھ نے اس مسل کو بھی اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔

9- **کروڑا سنگھیہ مسل:** اس کا بانی کروڑی مل تھا جو سکھ ہو کر کروڑا سنگھ ہوا اور ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ اپنا کر یہ مسل قائم کر لی۔ مرنے کے بعد بگھیل سنگھ جانشین ہوا۔ اس میں بارہ ہزار سپاہی تھے۔ دوآبہ بست جالندھر اور ستلج پار کا علاقہ بھی اس مسل میں شامل تھا بالآخر رنجیت سنگھ نے اس مسل پر بھی قبضہ کر لیا۔

10- شہیدیہ مسل: گور بخش سنگھ اور کرم سنگھ اس کے بانی تھے جو دریائے ستلج کے مشرقی اضلاع پر مشتمل تھی۔ اس میں دو ہزار سپاہی تھے۔ ان کے بزرگ پٹیالہ کے نزدیک مسلمانوں نے دمدمہ کے مقام پر قتل کئے تھے۔ اس لئے اس مسل کو شہیدوں کی مسل کہا جانے لگا۔

11- پھلکیاں مسل: اس کا بانی پھول قوم کا جاٹ تھا۔ پھول کی اولاد کی ملکیت، یہ مسل پھلکیاں (پھول والوں کی یا پھول سے نسبت والوں کی اور پنجابی میں پھول، پھل ہے لہٰذا اسے پھلکیاں کہا گیا) کی ٹھہری۔ پھول کی اولاد میں آلا سنگھ نے سکھ ہونے کے بعد سرہند پر چڑھائی کی اور اسے تباہ و برباد کیا۔ مالیر کوٹلہ کی مسلم ریاست کو بھی اس نے تاراج کیا۔ 1818ء میں احمد شاہ ابدالی نے پٹیالہ پر حملہ کیا تو آلا سنگھ نے چار لاکھ روپیہ نذرانہ دے کر جان بچائی۔ پھر اس کے جانشینوں نے بھی اپنا کام جاری رکھا۔ رنجیت سنگھ نے ریاست پٹیالہ، نابھہ، "جیند اور مالیر کوٹلہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں کی حمایت آڑے آئی اور وہ کامیاب نہ ہوا سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں اس کا راجہ انگریزوں کا وفادار رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ انگریزوں کا طرفدار تھا اور اس کی فوج دہلی گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے بعد میں اس مسل کو اقتدار میں رہنے دیا۔ ریاست نابھہ بھی قائم رہ گئی اور ریاست نابھہ اور جیند کا حکمران ہیرا سنگھ کو مقرر کیا۔

12- سکر چکیا کی مسل: اس کا بانی چڑھت سنگھ تھا جس کا مسکن سکر چک تھا۔ لیکن یہ مسل کچھ عرصہ قصبہ مجیٹھہ میں قائم رہی چڑھت سنگھ نے اپنی طاقت بڑھانے کے بعد وزیر آباد کو خوب لوٹا۔ اور چکوال، جلال پور، رسول نگر وغیرہ کو اپنی مسل میں شامل کیا جب وہ اپنے ہاتھوں گولی چل جانے سے مر گیا تو اس کا بیٹا مہاں سنگھ جانشین ہوا۔ اس نے رسول نگر اور علی پور پر قبضہ کیا۔ اور نام بدل کر رام نگر اور اکال گڑھ رکھ دیئے۔ 1792ء میں یہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا رنجیت سنگھ جانشین ہوا۔ 1799ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا اور آہستہ آہستہ تمام پنجاب پر قابض ہو گیا۔ اور 1839ء تک حکومت کر کے وفات پا گیا۔

# سکھوں کی بارہ مثلیں (مسلیں)

## (تفصیلات)

1- پہلی مثل بھنگی سکھوں کی: اس خاندان کے سکھ شہر امرت سر و گجرات و چنیوٹ اور تیسرے حصے شہر لاہور پر قابض و حاکم تھے۔ سب سے پہلے

انہی نے غارت گری میں ناموری پیدا کی اور بارہ ہزار سوار اس میں تھے۔ اس کا مورثِ اعلیٰ چھجا سنگھ تھا جس کی سکونت موضع پنج وڑ میں امرتسر سے بہت قریب تھی۔ اس نے گورو گوبند سنگھ کے ہاتھ سے پاہل لی اور سکھ بنا۔ چونکہ یہ شخص بھنگ بہت پیتا تھا اس لئے بھنگی کے خطاب سے مخاطب ہوا۔ اس سے مسمیان بھما سنگھ و نتھا سنگھ نے پاہل لی اور سکھ ہوئے۔ تینوں کا ایک جگا یعنی مجمع بنا۔ بعد ازاں مسمیان مہیان سنگھ جگت سنگھ و گلاب سنگھ ساکنان موضع دھوسہ نزد امرتسر اور کروڑ سنگھ ساکن موضع چوبھال (امرتسر) اور گور بخش سنگھ ساکن اورانوالہ ذات جاٹ سندھو اور رائے سنگھ کنگوڑہ ساکن جیئے سنگھ والہ و ساون سنگھ رندھاوا ان کے ساتھ شامل ہوئے اور سب نے چھجا سنگھ سے پاہلیں لیں، پھر تو یہ خاص گروہ بن گیا اور چاہا کہ بہ موجب بشارت گورو گوبند سنگھ کے کہ "ہمارا خالصہ راج کرے گا۔" ہاتھ پاؤں ماریں اور قوت حاصل کر کے سلطنت چغتائی کو اپنے قبضے میں کرلیں اور گورو کی منادی تمام ہندوستان میں کرائیں۔

اس خیال پر انہوں نے غارتگری و رہزنی شروع کی۔ اور بہت سے گاؤں لوٹ کر برباد دیئے۔ رعایا کا کوئی فریاد رس نہ تھا۔ چند سال کے بعد چھجا سنگھ بھنگی، جو بڑا افسر اور سپہ سالار تھا مر گیا۔ اس کے بعد بھما سنگھ مالک و سرپرست اس مثل کا بنا۔ یہ شخص اولاد نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے ہری سنگھ ساکن تنجور کو متبنیٰ کیا اور اسے فرزند بنا کر اپنی جائیداد کا مالک کر دیا

جب بھما سنگھ مر گیا تو ہری سنگھ اس کی جگہ افسر تمام مثل کا قرار پایا۔ اس سے پہلے تو اس مثل کے رہزن رات کو ہی رہزنی کرتے تھے مگر اس نے روز روشن میں غارتگری شروع کر دی اور یہ سو سو کوس تک دھاوا کرتا۔ اچھے اچھے جوان سکھ اس نے نوکر رکھے اور گھوڑے سواری کے لئے مہیا کیئے۔ چودھری ملا ساکن تنجور کی دختر کے پیٹ سے گنڈا سنگھ و چندا سنگھ دو بیٹے اس کے گھر ہوئے، اور دوسری عورت کے بطن سے چڑت سنگھ و دیوان سنگھ و دیسو سنگھ تین فرزند پیدا ہوئے۔ یہ پانچ فرزند بھی بڑے ہوشیار تھے۔ جب ہری سنگھ مر گیا تو ان پانچوں میں سے کسی کو سرداری نہ ملی اور مہیان سنگھ افسر بنا۔ ہری سنگھ کے پانچوں بیٹے اس کے ماتحت گھوڑا سوار بنے۔

جب مہیان سنگھ مر گیا تو گلاب سنگھ نے چاہا کہ میں سردار بنوں مگر چندا سنگھ و گنڈا سنگھ اپنی عقل و مردانگی سے سردار ہوئے اور مثل کے تمام سکھ ان دونوں کے تابع دار بن گئے۔ چندا سنگھ نے بارہ ہزار سواروں کے ساتھ جموں پر حملہ کیا۔ راجہ رنجیت دیو (راجہ جموں) میدان میں آیا اور چندا سنگھ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے کوئی اولاد نہ رہی اور گنڈا سنگھ پٹھان کوٹ کی لڑائی میں حقیقت سنگھ کھنیہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اگرچہ گنڈا سنگھ کے مارے جانے کے بعد اس کا بیٹا گلاب سنگھ وارث موجود تھا لیکن بہ سبب خورد سالی کے وہ سردار نہ بنا اور دیسو سنگھ، (چھوٹا بھائی گنڈا سنگھ کا) مثل میں سردار ہوا۔ جب دیسو سنگھ مر گیا تو گلاب سنگھ (گنڈا سنگھ کا بیٹا) سردار بنا۔ اس کے وقت

میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور لے لیا تو اس کو کمال حسد ہوا اور چاہا کہ دوسری مثلوں کے ساتھ مل کر رنجیت سنگھ پر حملہ کر کے اس کو لاہور سے نکال دے۔ موضع بھسین کے میدان میں اس کا لشکر آ کر اترا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی ان کے مقابلے کے لئے لاہور سے نکلا اور ابھی بڑا مقابلہ ہونے والا تھا کہ ایک رات گلاب سنگھ نے بہت سی شراب پی لی اور ایسا مست ہوا کہ پھر آنکھ نہ کھولی۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی جمیعت متفرق ہو گئی۔ پھر اس کا بیٹا گوردت سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس نے چاہا کہ پھر سکھوں کو جمع کر کے رنجیت سنگھ پر چڑھائی کرے مگر رنجیت سنگھ کو خبر ہو گئی اور اس نے اس کو امرتسر سے نکال دیا اور شہر پر قابض ہو گیا۔ چند گاؤں گذارے کے لئے اس کو دیئے، وہ بھی چند ماہ کے بعد ضبط کر لئے۔ جب گوردت سنگھ مر گیا تو دو بیٹے اس کے گنڈات سنگھ و مول سنگھ باقی رہے مگر وہ محض گمنام اور ابتر حال رہے۔ پھر خاندان نیست و نابود ہو گیا اور کرم سنگھ کا بیٹا جسا سنگھ بھنگی، جو اسی خاندان کا سردار چنیوٹ پر قابض تھا، اس کو بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وہاں سے بیدخل کر دیا اور صاحب سنگھ بھنگی، جو بڑا سردار گجرات کا مالک تھا اور بہت بڑا علاقہ اس کی حکومت میں تھا، اس کو بھی رنجیت سنگھ نے غالب ہو کر نیست و نابود کر دیا۔

2- **دوسری مثل رام گڑھی سکھوں کی:** اس مثل کے ماتحت تین ہزار سوار تھے جو جواں مردی و غارتگری و تاراج و قتل و کشت و خون میں مشہور تھے۔ بانی مبانی اس مثل کا سردار جسا سنگھ بھگوانا گیانی کا بیٹا تھا جو موضع ایچوگل علاقہ ضلع لاہور میں رہتا تھا۔ ابتدائے عمر میں سنگھ بھی گیانیوں کے زمرے میں رہ کر اپنے باپ دادا کا کسب کرتا تھا۔ جب اس کام میں گذارہ نہ ہوا تو اس نے بھی گوردیال سنگھ پنج گھریہ سے پاہل لی۔ (بعض لوگ کہتے ہیں کہ انند سنگھ روڑانوالی سے پاہل لے کر سکھ بنا) اور پیشہ قزاقی و رہزنی سے عزت و اثاثہ پیدا کر کے معتبر بن گیا اور داڑھی کے بال بہت بڑھا لئے۔ جب سکھان دوآبہ اور آدینہ بیگ خاں صوبۂ دوآبۂ جالندھر کے درمیان تنازع برپا ہوا تو سکھوں نے ایسے شخص کو معتبر تصور کر کے اپنا وکیل بنایا اور جواب و سوال کے لئے آدینہ بیگ خاں کے پاس بھیجا اس کی ہوشیاری اور خوش تقریری اور معتبر شکل دیکھ کر آدینہ بیگ خاں بہت خوش ہوا اور مشاہرہ معقول اس کو اپنے پاس نوکر رکھ لیا اور کام تحصیل داری ایک بڑے علاقے کا اس کے سپرد کر دیا۔ جب ادینہ بیگ خاں بہ قضائے الٰہی مر گیا تو اپنی تحصیل کا مالک و حاکم خود مختار بن بیٹھا۔ چند سال کے بعد اس کی عداوت سردار جے سنگھ کھنیا سے پیدا ہوئی اور جے سنگھ نے بہت سی لڑائیوں کے بعد اس کو بے دخل کر کے ستلج کے پار بھگا دیا۔

جہاں اس نے لوٹ مار کر کے گذارہ کیا۔ آخر جب سردار جے سنگھ کھنیا اور سردار مہان سنگھ (پدر مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے درمیان عداوت پیدا ہوئی تو مہان سنگھ نے جسا سنگھ کو اپنی امداد

کے لئے طلب کیا۔ جب یہ آیا تو دونوں سرداروں میں سخت لڑائی ہوئی۔ آخر جے سنگھ نے شکست کھائی اور گور بخش سنگھ (جے سنگھ کا بیٹا) عین لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح نمایاں کے بعد جسا سنگھ دوبارہ اپنے قدیمی علاقے پر قابض ہو گیا اور چند سال کے بعد مر گیا۔ اس کے بعد جودہ سنگھ کا بیٹا مالک و قابض علاقہ پدری کا ہوا۔

پھر جودھ سنگھ نے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرلی۔ اگرچہ کوئی تعداد باج سالانہ کی نہ تھی مگر رنجیت سنگھ جب تنگ کرتا، کچھ دے چھوڑتا۔ آخر جب جودہ سنگھ مرا تو اس کے بیٹے دیوان سنگھ، بیرا سنگھ، بیر سنگھ باقی رہے۔ ان میں سے ہر ایک ریاست کی گدی اپنے لئے چاہتا تھا۔ آخر یہ بات ٹھہری کہ ملک و مال اور حصص کی تقسیم کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ منصف و ثالث مقرر ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ فی الفور اپنا لشکر لے کر اُن کے علاقے میں داخل ہوا اور ایسی منصفی کی کہ ان کے تمام علاقے میں اپنے کار گذار بھیج دیئے اور خزانہ و دولت سب کچھ ضبط کر لیا۔ وہ تینوں اس ایک کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ باہمی لڑائی اور اسے اپنی عزت کا فیصلہ دوسروں کے سپرد کرنے سے ایسے ہی نتائج سامنے آتے ہیں۔

## 3- تیسری مثل سردارانِ کہنیا کی:

اس مثل کا بانی سردار جے سنگھ کہنیا تھا۔ وہ موضع کاہنا کا تھا۔ جو لاہور سے جنوب کی طرف دس کوس پر آباد ہے، اس لئے اس کو سردار جے سنگھ کہنیا کہتے تھے، یعنی موضع کاہنا کا رہنے والا۔ اصل حال اس مثل کا یہ ہے کہ مسمی خوشحال سندھو جاٹ کاہنا کا رہنے والا ایک غریب و مفلس آدمی تھا کہ اکثر اوقات گزارہ اس کا گدائی و دریوزہ گری کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ اس کے دو بیٹے جے سنگھ اور جندہ سنگھ تھے ان میں جے سنگھ، بڑا اولوالعزم و صاحب داعیہ نکلا۔ اس نے چاہا کہ کسی طرح مفلسی و فاقہ کشی کے عذاب سے نکل کر ہاتھ پاؤں ہلائے، شاید کہ خدا مہربان ہو، اسی فکر میں تھا کہ یکایک سکھوں کی فتح کا آوازہ عالمگیر ہوا۔ اس سے بھی سردار کپور سنگھ فیض اللہ پوریہ کی خدمت میں جاکر اس نے پاہل لی اور سکھ بن گیا۔ اس کی مثل کے ہمراہ ہو کر رہزنی و غارتگری میں سرگرم ہوا اور اپنے ہمسروں اور ہم چشموں سے بڑھ گیا۔ جب بہت سے آدمی اپنے بستی کے بھی اس نے سکھ بنا کر اپنی ساتھ شامل کر لیئے تو اپنی مثل اس نے الگ بنالی اور دور دور جاکر پے در پے ڈاکے مارے۔ بڑے بڑے قصبے اور گاؤں لوٹے اور خوب جمعیت بہم پہنچائی۔

جب سلطنت شاہان دہلی اور کابل کی پنجاب سے بالکل نیست و نابود ہو گئی تو اس نے بھی بہت سا ملک اور سکھوں کی طرح دامن کوہ شمالی کا دبالیا اور خیالات اس کے بہت بلند ہو گئے۔ چونکہ اس وقت مہاراجہ سنسار چند والی کوہستان بھی اپنے علاقے کی حدود بڑھانے میں مصروف تھا اور وہ قلعۂ کانگڑہ پر وہ تسلط چاہتا تھا مگر نواب سیف علی خاں قلعدار کانگڑہ جو سلاطین چغتائی کے وقت سے

قلعے پر قابض تھا۔ اس کو قلعے پر قابض ہونے نہیں دیتا تھا اس واسطے مہاراجہ سنسار چند نے سردار جے سنگھ کہنیا کو اپنی امداد پر بلایا۔ یہ فی الفور کانگڑے پہنچا اس کے وہاں پہنچتے ہی خبر آئی کہ نواب سیف علی خاں قلعدار بہ قضائے الٰہی مرگیا ہے یہ خبر سن کر جے سنگھ نے قلعے والوں کو بہت ڈرایا اور دھمکایا اور سیف علی خاں کے بیٹے جیون خاں سے قلعہ خالی کرا لیا اور سردار جے سنگھ خود قلعے پر قابض ہو بیٹھا اور مہاراجہ سنسار چند چونکہ جمعیت سردار جے سنگھ کی مہاراجہ سنسار چند کی سپاہ سے اس وقت زیادہ تھی، علاوہ اس کے قلعے میں اس نے اپنا قرار واقعی قبضہ کر لیا تھا، سنسار چند ناچار خاموش رہا۔ یہ ترقی اور جاہ و جلال سردار جے سنگھ کا دیکھ کر سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو کمال حسد ہوا اور اس کے علاقے سے مزاحمت کرنی شروع کی۔ جے سنگھ نے اس پر بھی فوج کشی کی اور لڑائی میں اس کو شکست دے کر ستلج کے پار اتار دیا۔ جب رام گڑھیوں کا علاقہ بھی جے سنگھ کے قبضے میں آگیا تو جے سنگھ بہت مغرور ہو گیا اور بابت حصہ مال اور اسباب غارت شہر جموں، سردار مہان سنگھ، (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ) کے ساتھ خصومت شروع کی۔ اگرچہ یہ دعویٰ اس کا سچا تھا کہ اس نے مہان سنگھ کی ہمراہی میں شہر جموں کو لوٹا تھا اور غارت کرکے پورا حصہ نہ پایا تھا مگر سردار مہان سنگھ کو اب وہ حصہ دینا مشکل ہو گیا۔ پہلے تو مہان سنگھ نے جے سنگھ کی بہت خوشامد کی اور چاہا کہ کسی طرح یہ اپنے دعوے سے باز آجائے۔ جب چاپلوسی سے کام نہ نکلا تو جنگ کی تیاری کی اور سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو ستلج پار سے اپنی امداد پر طلب کیا اور مہاراجہ سنسار چند سے بھی دوستی کر لی۔ اب دو دشمن قوی زور اور تیسرا مہان سنگھ، جے سنگھ کی سرکوبی پر مستعد ہو گئے۔

یہ خبر جب جے سنگھ نے سنی تو مسمی گوربخش سنگھ دودیہ کو، فوج دے کر بھیجا تاکہ جسا سنگھ رام گڑھیہ کا راستہ روکے وہ ستلج پار اتر گیا اور قریب پٹیالہ کے لڑائی میں گوربخش دودیہ مارا گیا۔ دوسری لڑائی اس کے جے سنگھ کے بیٹے گوربخش سنگھ سے اس کے ملک کی سرحد پر ہوئی۔ اس لڑائی میں دوسرا گوربخش سنگھ (یعنی جے سنگھ کا بیٹا) بھی قتل ہوا۔ مہاراجہ سنسار چند نے پہاڑ سے اتر کر جے سنگھ کے علاقے کی ضبطی شروع کی۔ جب جے سنگھ پر چاروں طرف سے دشمنوں کا ہجوم ہو گیا تو سخت گھبرایا۔ چنانچہ فی الفور اس نے قلعہ کانگڑا مہاراجہ سنسار چند کو دے دیا اور اس کی مزاحمت سے رہائی پائی اور مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ، جو آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب ہوا، اپنے پوتے گوربخش سنگھ کی بیٹی مسمات مہتاب کنور کا ناطہ کرکے اس سے بھی صلح کر لی۔ سردار مہان سنگھ نے انہی ایام میں اپنے فرزند رنجیت سنگھ کی شادی مہتاب کنور سے کر لی اور دو سرداروں میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ اس وقت مہان سنگھ نے صلح اس شرط پر کی تھی اور ناطہ لیا تھا کہ سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ بھی بدستور اپنے علاقے پر قابض و متصرف ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہو گیا۔ سردار جے سنگھ اپنے بیٹے گوربخش سنگھ مقتول جو بڑا بہادر اور لائق تھا کے غم والم میں سمت 1819 مطابق 1227ء

ہجری میں مرگیا اس کے مرنے کے بعد رانی سدا کنور زوجہ گوربخش سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ساس اس کے مقبوضہ علاقے پر قابض و متصرف رہی۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر یورش کی تو رانی سدا کنور مع اپنی فوج کے اس کے ہمراہ تھی اور مدتِ دراز تک اس کی مدد و معاون رہی۔ آخر باہم نااتفاقی ہو گئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا علاقہ کیریاں وغیرہ ضبط کر کے اس کو قید میں رکھا اور وہ قید ہی میں مرگئی اور خاندان سرداران کھنیا کا نیست و نابود ہو گیا۔

4- چوتھی مثل نکئی سکھوں کی: اس مثل کا بانی ہیرا سنگھ قوم جاٹ گوت سندھو ایک غریب مفلس آدمی کا بیٹا تھا اور محنت و مزدوری پر گزارہ تھا۔ جب مزدوری نہ ملتی تو گدائی سے کام چلا لیتا۔ موضع بھڑوال سابق پرگنہ فرید آباد حال پرگنہ چونیاں واقع ملک نکہ میں اس کی سکونت تھی۔ جب وہ عیال دار ہوا اور گھر کے آدمی بڑھ گئے تو ان کا پیٹ اس کی محنت و مزدوری اور گدائی سے بھرتا نہ تھا۔ ایک ہفتے میں چار دفعہ فاقہ ہوتا تھا۔ جب اس سے کوئی صورت بن نہ پڑی تو اس نے پاہل لی اور سکھ بن گیا۔ اپنے گاؤں کے ہم عمر بھی بہت سے آدمی اپنے ہمراہ کر لیے اور ڈاکہ مارنا شروع کیا۔ پہلے پہلے تو نزدیک کے گاؤں رات رات لوٹے، پھر آگے قدم بڑھایا اور دور دور کے ملکوں کو لوٹنے لگے۔ جب مال و دولت بہت سا چند سال میں جمع کر لیا تو گھر کے ملازم گھوڑ سوار نوکر رکھے اور سوار و پیادہ لشکر بہم پہنچایا اور اپنی حکومت کل علاقہ پر قائم کر لی۔ پھر آگے قدم بڑھایا اور دریائے ستلج کے کنارے کنارے دور دور تک ملک فتح کیا اور فرماں فرمائے ملک نکہ ہو گیا اور بڑے استحکام کے ساتھ ریاست قائم کی۔ چونکہ اسی علاقے میں ریاست و جاگیر شیخ سبحان قریشی سجادہ نشین خانقاہ فرید گنج شکر چشتی کی واقع تھی اور ان کے علاقے میں گاؤ کشی کا رواج تھا، یہ بات ہیرا سنگھ پر ناگوار گزری اور بڑی جمعیت کے ساتھ پاک پتن پر یورش کی۔ عین معرکے میں ایک ایسی گولی ہیرا سنگھ کے مغز میں لگی کہ سرپاش پاش ہو گیا۔ ہیرا سنگھ کے مارے جانے کے بعد لشکر اس کا بھڑوال کو واپس چلا گیا۔

شیخ سبحان نے چار ہزار سوار کے ساتھ ان کا تعاقب کیا مگر وہ دستیاب نہ ہوئے۔ ہیرا سنگھ مقتول کا بیٹا دل سنگھ اس وقت خرد سال تھا، اس لئے ناہر سنگھ برادر زادہ اس کا قائم مقام اس کا ہوا۔ اس کی مسند نشینی کو نو ماہ ہی گزرنے پائے تھے کہ تپدق سے وہ مرگیا۔ اس کے بعد وزیر سنگھ (ناہر سنگھ کا چھوٹا بھائی) مالک ہوا۔ اس مثل کے ایک شخص سردار چتر سنگھ کی دختر دل سنگھ سے منسوب تھی۔ اتفاقاً وہ چتر سنگھ مرگیا۔ دل سنگھ خرد سال داماد اس کا ان کی نصف ریاست کا حق دار تھا، لیکن وزیر سنگھ نے اس کی ریاست پر بھی قبضہ کر لیا اور دل سنگھ کو، جو ہیرا سنگھ اور اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں گیان سنگھ اور خزان سنگھ کو بطور مدد معاش دے دیا۔

بھگوان سنگھ نے اپنی بیٹی راجکوراں کو (جس کے پیٹ سے مہاراجہ کھڑک سنگھ پیدا ہوا)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ منسوب کر دیا اور سردار مہان سنگھ کو اپنا مددگار بنایا۔ چونکہ عداوت سخت درمیان وزیر سنگھ اور بھگوان سنگھ کے برپا تھی آخر وزیر سنگھ کے ہاتھ سے بھگوان سنگھ مارا گیا اور اس کا چھوٹا بھائی گیان سنگھ اس کی جگہ بیٹھا۔ اور انہی دنوں وزیر سنگھ کو دل سنگھ نے قتل کر دیا مگر دل سنگھ بھی قتل گاہ سے جانے نہ پایا، اسی دم اور اسی مقام پر اس کو وزیر سنگھ کے ساتھیوں نے قتل کر دیا۔ غرض وزیر سنگھ اور دل سنگھ دونوں ایک ہی دن کھیت رہے۔ مہر سنگھ و مہر سنگھ دو بیٹے وزیر سنگھ کے باقی رہے اور گیان سنگھ کے بعد خزان سنگھ اس کا چھوٹا بیٹا جانشین ہوا اور کانھا سنگھ، گیان سنگھ بہادر نے نکہ پر فتح یاب ہو کر سب سرداران کا ملک ضبط کر لیا اور بارہ ہزار روپے کی جاگیر خزان سنگھ و کانھا سنگھ کو عطا کی اور کچھ تھوڑا علاقہ مہر سنگھ، وزیر سنگھ کے بیٹے کے لئے مقرر کیا۔ کانھا سنگھ سردار بھی مر گیا تو اس کے بیٹوں کے لئے کچھ گزارہ سرکار انگریزی سے مقرر ہوا۔

5- **پانچویں مثل آلو والیوں کی:** موضع آلو، ضلع لاہور میں ایک شخص بھاگو نہایت مفلس و پریشان حال رہتا تھا۔ پہلے وہ اپنے ہی گاؤں میں شراب فروشی کی دکان کرتا رہا۔ جب کام نہ چلا اور تنگ دستی نے بہت ستایا تو اس نے لاہور کے حصار کے باہر کی آبادی میں شراب فروشی کی دکان جاری کی۔ مگر اس میں بھی گزارہ نہ چلا۔

آخر اس نے اپنا تمام دکان کا اسباب فروخت کر کے ایک گھوڑا خریدا اور بمقام فیض اللہ پور سردار کپور سنگھ کے پاس جا کر پاہل لی اور سکھ بنا اور اس کی مثل کے ہمراہ ہو کر رہزنی و غارت و تاراج میں مصروف ہوا، اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک چھوٹی سی جماعت کا سردار ہو گیا۔ دو سال کے عرصے میں اس نے بہت سے آدمی اپنے گاؤں اور گرد و نواح کے دیہات کے اپنے ساتھ شامل کر کے جمعیت معقول بہم پہنچائی۔ سردار کپور سنگھ فیض اللہ پوری بھی اس پر کمال مہربان تھا۔ ایک روز کپور سنگھ، بھاگ سنگھ کے گھر گیا۔ وہاں اس نے بھاگ سنگھ کی بہن کو جو بیوہ تھی دیکھا کہ پاہل لے کر سکھنی ہوئی اور رباب لے کر گورو کی بانیاں گا رہی ہے۔ کپور سنگھ کو اس کی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس پر مہربان ہو کر پہلے تو اس کو کچھ نقد روپیہ انعام دیا اور پھر اس کے بیٹے جسا سنگھ کو اپنی پرورش میں لے لیا اور تھوڑے عرصے میں اپنی ریاست میں اس کو صاحب اختیار کر دیا۔ یہاں تک کہ بھاگ سنگھ اس کے ماموں سے بھی اس کا رتبہ بڑھ گیا۔

آخر جب بھاگ سنگھ مر گیا اور اس کا کوئی صلبی بیٹا وارث نہ رہا تو جسا سنگھ ہی اس کا وارث قرار پایا اور کل جائیداد اندوختہ بھاگ سنگھ کی جسا سنگھ کو ہی مل گئی۔ چونکہ جسا سنگھ نہایت دانا آدمی تھا، کمال ہوشیاری و لیاقت کے سبب سے نواب آدینہ بیگ خاں ناظم و حاکم دوآبہ بست جالندھر کا مقرب و مصاحب بن گیا اور جب تک آدینہ بیگ خاں زندہ رہا۔ اس کی مصاحبت میں رہ کر بڑی عزت پائی جب آدینہ بیگ خاں مر گیا اور سکھوں نے ملک گیری شروع کی تو جسا سنگھ نے

اول سرہند کی طرف کچھ فتوحات حاصل کیں اور شہر فتح آباد وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ پھر ایک چھوٹی سی لڑائی میں کپور تھلہ کا کچھ علاقہ اپنے ماتحت کرلیا۔ حتیٰ کہ دولت، لشکر، فوج، خزانہ، ملک ہر ایک چیز اس کے پاس موجود ہوگئی۔

ایک مرتبہ احمد شاہ درانی جب ولایت کابل کو واپس جاتا تھا اور دو ہزار دو سو عورت ہندو ہندوستان کے ملک سے پکڑ کر اپنے ہمراہ قید کئے ہوئے لیے جا رہا تھا یہ بات سکھوں پر ناگوار گزری مگر کسی کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ بادشاہ کے پنجے سے ان قیدیوں کو چھڑا لائے۔ اس وقت جسا سنگھ نے جواں مردی کی اور احمد شاہ کی فوج پر اپنی جمعیت کے ساتھ رات کو جا پڑا اور تمام عورتوں کو چھڑا کر لے آیا اور ہر ایک کو خرچ دے کر ان کے گھروں میں پہنچا دیا جس سے اس کی تمام پنجاب میں ناموری ہوگئی جب سردار جسا سنگھ مرگیا تو اس کا صلبی بیٹا وارث ریاست کا کوئی نہ رہا۔ صرف مہر سنگھ و بھاگ سنگھ رشتہ دار رہ گئے۔ ان میں سے سردار جے سنگھ کھنیا کی تجویز سے بھاگ سنگھ گدی نشین ہوا۔ یہ شخص بھی نہایت دانا اور جواں مرد تھا۔ جب اس نے بھی عالم فانی سے سفر کیا تو اس کی جگہ سردار فتح سنگھ جانشین ہوا۔ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ دوستی پیدا کی اور ایک مہم میں اس کا حامی و مددگار رہا کبھی نافرمانی نہ کی۔ فتوحات ملک پنجاب، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نصیب ہوئیں، سردار فتح سنگھ نے اس میں کمال جاں فشانیاں کیں۔

جب دریائے ستلج حد فاصل درمیان علاقہ پنجاب اور علاقہ سرکار انگریزی کے قائم ہوگیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نیت اس کی طرف سے بھی بدل گئی اور چاہا کہ اس کو بھی اس علاقے سے بے دخل کر دیا جائے مگر اس کو وقت پر خبر ہوگئی اور کپور تھلہ سے صاحبانِ انگریزی کے علاقے میں چلا گیا۔ چونکہ وہ انگریزی عمل داری میں بھی جمعی پانچ لاکھ کا موجود تھا للہٰذا گورنر جنرل کے یہاں سے ایک خط مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام جاری ہوا کہ چونکہ علاقہ سردار فتح سنگھ آلو والیہ کا سرکار انگریزی کے علاقے میں بھی جمعی پانچ لاکھ روپیہ کا موجود ہے، آج کی تاریخ سے وہ زیر حمایت سرکارِ انگریزی تصور کیا گیا ہے۔ مہاراجہ صاحب بہادر والی پنجاب کو اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس کے علاقے واقع دوآبہ جالندھر پر بھی دست اندازی کرے۔ اور کوئی امر ایسا وقوع میں نہ لائیں جس سے دوستانِ محبت کیش کی دل شکنی ہو۔

یہ واقعہ 1826ء عیسوی میں گذرا۔ اس کے بعد سردار فتح سنگھ اپنی ریاست کپور تھلہ میں آگیا۔

سردار فتح سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نہال سنگھ جانشین ہوا۔ اس سردار نے بڑی بڑی عمارتیں کپور تھلہ میں بنوائیں۔ اس کے وقت میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس کا ارادہ مصمم تھا کہ کپور تھلہ کو چھوڑ کر ستلج پار کے ملک میں چلا جائے لیکن سکھ فوج نے

جلو خانہ سردار نا کھیر لیا اور کہا کہ سردار کو سکھوں کی ہمراہی سے غلام محمد وزیر باز رکھتا ہے، وزیر کو ہم ضرور قتل کر ڈالیں گے۔ اگر سردار ان کی حمایت کرے گا تو اس کے بھی ہم دشمن ہیں لہٰذا اس نے وزیر کو رخصت کیا۔ وزیر غلام محمد المتخلص بہ غلامی نہایت شاعر و عالم و فاضل و صاحب تدبیر مشیر تھا۔ اگرچہ داہنا ہاتھ اس کا بیکار تھا مگر وہ بائیں ہاتھ سے ایسا خوش خط لکھتا تھا کہ اپنا ثانی خوش خطی میں نہیں رکھتا تھا۔

جب وزیر کو سردار نے حسرت کے ساتھ رخصت کیا تو وہ برہنہ تلوار بائیں ہاتھ میں لے کر میدان میں تنہا آیا اور سکھوں کو آواز دی کہ میں ایک ہاتھ کا مالک ہوں، ایک ایک شخص میرے ساتھ لڑنے کے لئے آجائے۔ یہ سن کر ایک جوان سکھ اکال اکال کرتا ہوا اس پر آپڑا مگر وزیر نے ایک ہی تلوار کے وار سے اس کا کام تمام کیا۔ اسی طرح چند سکھوں کا کام وزیر نے جب تمام کیا تو سکھوں نے مل کر بندوقیں اس پر جھونک دیں اور شہید کر دیا۔

اس کو قتل کر کے فوج کا بلوہ موقوف ہوا۔ جب انگریز فتح یاب ہوئے اور سکھ میدان سے بھاگ کر اپنے گھروں میں آگئے اور دریائے ستلج پار کا کل علاقہ، جو اس ریاست کے متصل تھا، ضبط کر لیا گیا۔ صرف وہ علاقہ جو دو آبہ بست جالندھر میں واقع تھا، باقی رہ گیا اور پانچ لاکھ کا علاقہ، جو دو آبہ بست جالندھر میں باقی رہا، اس میں سے ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ نقد سالانہ رئیس کی طرف سے سرکار انگریزی کو نقد دینا قرار پایا۔

جب راجہ نہال سنگھ فوت ہوا تو اس کا بڑا بیٹا مہاراجہ رندھیر سنگھ جانشین ہوا۔ یہ شخص انگریزوں کا کمال خیر خواہ تھا۔ 1857ء میں جب فوج انگریزی بگڑ گئی اور ہندوستان میں سخت فساد برپا ہوا اور ہزاروں انگریزوں کو قتل کر ڈالا تو اس وقت رندھیر سنگھ اپنی فوج کے سمیت خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے بڑے کام کیے جس کے عوض سرکار انگریزی نے اس کو لکھنؤ میں ایک لاکھ روپے سالانہ کی زمینداری نصف جمع پر بہ صیغہ استمراری عطا فرمائی اور پچیس ہزار روپیہ سالانہ زر باج مقررہ سے کم کیا گیا اور ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ ایک سال کا، جو بہ ذمۂ ریاست واجب الادا تھا، بالکل معاف ہوا اور دس ہزار روپے کا خلعت بر سر دربار بہ کمالِ عزت و احترام گورنر جنرل بہادر نے رئیس کو مرحمت کیا۔ علاوہ اس کے جاگیر جمعی پچیس ہزار روپیہ سالانہ اسی راجہ نہال سنگھ، جو علاقۂ دو آبہ باری میں اس کے حین حیات تک واگزار تھی اور بعد وفات 1852ء سے ضبط ہو چکی تھی، وہ بھی دوبارہ بنام راجہ رندھیر سنگھ واگذار و معاف ہوئی اور مہاراجہ کا خطاب ملا۔ 1869ء میں مہاراجہ رندھیر سنگھ بہ عزم سیر ولایت انگلینڈ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ جب جہاز شہر عدنان تک پہنچا، مہاراجہ بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد راجہ کھڑک سنگھ اس کا بڑا بیٹا جانشین ہوا۔

6- چھٹی مثل ڈلی والے سکھوں کی: بانی اس مثل کا گلابا کھتری تھا جو موضع ڈلی والی میں دکان کرتا تھا۔ ایک رات اس کی دکان چوروں نے لوٹ لی اور یہ مفلس محض رہ گیا تو اس نے چاہا کہ دوبارہ کچھ روپیہ بہم پہنچا کر دکان جاری کرے مگر روپیہ اس کو کہیں سے نہ ملا آخر پاہل لے کر سکھ بن گیا اور غارت و رہزنی پر کمر باندھ لی۔ دس بیس آدمی خانہ بدوش بھی شامل ہو گئے اور نزدیک نزدیک کے گاؤں پر اس نے دست اندازی شروع کی۔ چونکہ موضع مسکن اس کا ڈیرہ بابا نانک کے قریب اور دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے اور موضع بوڑا ڈلا بھی اس کو کہتے ہیں، دیہات قرب و جوار کے زمیندار اس کی دست اندازی سے تنگ آ گئے اور سب نے مل کر بابا نانک کے ڈیرے جا کر وہاں کے مسند نشین کے پاس اس کی فریاد کی۔ اس نے اس کو روبرو بلایا اور ممانعت کی کہ اگر تم سکھ ہوتے ہو اور غارت پر کمر باندھی ہے تو اپنے ہمسایوں کو مت لوٹو، دور دور کے علاقوں میں تمہارا اختیار ہے۔ چنانچہ گلاب سنگھ عرف گلابا نے دور دور کے ملکوں میں گردش و غارت شروع کی اور پانچ چار برس میں اچھی خاصی جمعیت بہم پہنچائی۔ جب مر گیا تو کوئی صلبی بیٹا اس کا موجود نہ تھا، اس لئے ایک شخص تارا سنگھ جس کا خطاب غیبہ تھا جانشین ہوا۔ چونکہ غیبہ پنجابی میں ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بے سمجھے سوچے باتیں منہ سے نکالے اور ہر وقت بک بک کرتا رہے، اس سردار کو بھی اس صفت سے موصوف دیکھ کر اس کا خطاب غیبہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ خطاب اس کا ایام مفلسی سے تھا۔

جب سردارانِ بھنگی نے قصور پر یورش کی اور حسین خاں قصور کا حاکم مارا گیا اور قصور غارت ہوا تو یہ بھی گلاب سنگھ کے ہمراہ تھا۔ اس کو قصور سے بڑا مال حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ علاوہ مال نقد کے چار لاکھ روپے کا تو زیور اس کو ملا۔ اس لئے اس نے اپنی مثل علیحدہ قائم کر لی اور اپنے خویش و اقربا اس نے سب سکھ بنا کر اپنے ساتھ شامل کر لئے بلکہ گوہر داس چودھری موضع گنگ کو، جو ایک موضع غربی کنارے دریائے ستلج کے واقع ہے، اپنے ساتھ ملا کر سکھ بنا لیا۔

جب گوہر داس سکھ بن کر گوہر سنگھ ہوا تو اس کے ساتھ اس کا تمام گاؤں بھی سکھ ہو گیا اور سب نے تارا سنگھ کی رفاقت پر کمر باندھ لی اور تارا سنگھ کی مثل میں دس ہزار سوار تھے۔ جب سکھوں نے سرہند کو لوٹا اور ایسے بڑے شہر کو جو بعد بربادی بندا بیراگی کے دوبارہ آباد ہو گیا تھا، بیخ سے اکھاڑ دیا تو وہاں سے بھی اس نے بڑا خزانہ پایا۔ جب وہاں سے لوٹ کر آیا تو بہت علاقے فتح آباد وغیرہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔ پھر تو حاکم با استقلال و فرمان فرمائے خود مختار بن گیا۔ مدت تک حکومت کرتا رہا۔ سات ہزار سوار اس نے اور ملازم رکھے۔ آخر جب نیر اقبال مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چمکا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ آلووالیہ کے نام حکم جاری کیا کہ تارا سنگھ غیبہ کو مغلوب کر کے اس کا ملک شامل ممالک محروسہ کے کرے۔

چنانچہ سردار فتح سنگھ نے اپنی فوج اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے ساتھ اس پر یورش کی مگر غیبہ ڈر گیا اور مقابلے سے بھاگ نکلا اور کل علاقہ اس کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قلم رو میں داخل ہوا۔ چند ماہ کے بعد وہ اسی غم و غصہ میں مرگیا اور اس کے بیٹے، سندھا سنگھ و چندا سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں آئے۔ مہاراجہ نے چند گاؤں ان کے گزارے کے لئے مقرر کر دیئے، مگر چند ماہ کے بعد بابا بکرم سنگھ بیدی نے دو گاؤں ان کی جاگیری کے بھی ضبط کر لئے اور مہاراجہ نے خاموشی اختیار کی اور اس مثل کی دولت مندی بہ اختتام پہنچی۔

7- **ساتویں مثل نشان والے سکھوں کی:** اس مثل کے بانی سنگت سنگھ اور مہر سنگھ قوم جاٹ تھے جنہوں نے دریائے ستلج کے علاقے میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے وسعت و دولت بہم پہنچائی۔ دس ہزار سوار کا مجمع اس مثل میں تھا اور بہت دور دور تک وہ ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ شہر میرٹھ پر جا پڑے اور بڑی دولت لوٹ کر لائے۔ شہر انبالہ ان کا دارالحکومت تھا۔ چونکہ وہ اپنی مثل میں ایک اونچا نشان موجود رکھتے تھے اس لئے تمام سکھ ان کو نشان والا کہتے تھے۔ ان دونوں میں سے پہلے سنگت سنگھ مرگیا اور کل ریاست مہر سنگھ کے قبضے میں رہی، پھر وہ بھی لاولد مرگیا۔ رئیس انبالہ کی وفات کی خبر سن کر مہاراجہ نے دیوان محکم چند کو مامور کیا کہ فی الفور انبالہ جا کر اپنا قبضہ کر لے۔ جب دیوان محکم چند کا لشکر انبالہ میں پہنچا، خفیف مقابلے کے بعد اس مثل کے سوار متفرق ہو گئے اور بڑا بھاری خزانہ و اسباب برسوں کا جمع کیا ہوا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے میں آیا۔ بعد ازاں جب سرکار انگریزی و مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حدود کا فیصلہ ہو کر دریائے ستلج حد قائم ہو گئی اور مہاراجہ کا اختیار ستلج پار کے کل علاقوں سے جاتا رہا اور اس مثل کا قبضہ انگریزوں نے لے لیا۔

8- **آٹھویں مثل فیض اللہ پوریوں سکھوں کی:** فیض اللہ پور ایک قصبہ سرزمین دوآبہ جالندھر میں واقع ہے۔ آجکل اس کو سنگھ پوری کہتے ہیں۔ اس گاؤں کے ایک شخص کپور چند نے پاہل لی اور سکھ بنا۔ غارت و رہزنی سے بہت سی دولت و حشمت بہم پہنچائی اور اپنے آپ کو نواب کے خطاب سے مخاطب کیا اور تمام زمانے میں نواب کپور سنگھ مشہور ہو گیا۔ تمام سکھ اس کو اپنا پیشوا تصور کرتے اور جو شخص اس کے ہاتھ سے پاہل لے کر سکھ بنتا وہ فخر کرتا کہ میں وہ سکھ ہوں جس نے نواب کپور سنگھ سے پاہل لی ہے۔ ہزاروں جاٹ، ترکھان، بھنگی، کھتری، اروڑے اس نے سکھ کر ڈالے۔ اس کے سکھ بڑے بڑے دولت مند ہو کر والیان ملک و صاحب دولت و حشمت ہو گئے۔ اس کا قول تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے پانچسو مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ یہ عمل میری نجات کا موجب ہو گا کہ میں نے گورو گوبند سنگھ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی ہے۔ اس کی مثل میں دو ہزار پانسو سوار حاضر رہا کرتے تھے۔ دریائے

ستلج سے اتر کر شہر دہلی تک یہ ملک کو لوٹنے جاتا تھا۔ کسی کو اس کے ساتھ مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے گاؤں کا نام فیض اللہ پور تھا۔ آخر اس نے گاؤں سنگھ پوری رکھا اور حکم دیا کہ آئندہ اس گاؤں کو کوئی فیض اللہ پور نہ کہے ورنہ قتل ہو گا۔ اس کی ریاست کا بہت سا علاقہ ستلج کے دونوں طرف تھا جس میں یہ بہت برس تک حکومت کرتا رہا۔

جب کپور سنگھ مر گیا تو خوشحال سنگھ قابض ہوا، پھر رنجیت سنگھ نے اس مثل کا علاقہ بھی ضبط کر لیا۔ مگر بعد تقرر حد فاصل کے، جس قدر مشرقی کنارے دریائے ستلج کے اس مثل کی ریاست تھی وہ صاحبان انگریز نے واگذار کر دی۔

9- **نویں مثل کروڑی سکھوں کی:** اس مثل کا بانی کروڑا سنگھ تھا۔ جس کا نام پہلے کروڑی مل تھا۔ جب اس نے پاہل لی اور سکھ بنا تو کروڑا سنگھ مشہور ہوا۔ سکھ ہو کر غارت گری و رہزنی بہت کی، ثروت و دولت بہم پہنچائی، ہزاروں گورو کے سکھ اس کے ساتھ شامل ہو کر رہزنی کرنے لگے۔ جب وہ مر گیا تو بگھیل سنگھ اس کی جگہ اس مثل کا سردار بنا۔ یہاں تک کے بارہ ہزار سوار اس میں جمع ہو گئے اور بہت سا ملک ستلج دریائے پار ان کے تصرف میں آ گیا۔ تھوڑا علاقہ دوآبہ بست جالندھر کا بھی اس مثل کے ماتحت تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے ان کا تمام علاقہ اپنے تصرف میں کر لیا تھا، پھر بعد حدود بندی کے دریائے ستلج کے پار کے علاقہ واگذار ہو گیا۔ جس پر بگھیل سنگھ کی اولاد کسی قدر قابض و متصرف رہی۔

10- **دسویں مثل شہید بنگیوں کی:** اس کے بانی مبانی گوربخش سنگھ و کرم سنگھ تھے۔ اضلاع مشرقی دریائے ستلج پر ان کا قبضہ تھا۔ دو ہزار سوار ان کے ماتحت تھے۔ چونکہ ان کے بزرگ بمقام دمدمہ (جو جنوب کی طرف پٹیالہ کے واقع ہے) مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے، لہٰذا ان کا نام شہید بنگیوں کی مثل رکھا گیا۔

11- **گیارہویں مثل پھلکیوں کی:** اس مثل کا بانی پھول قوم جاٹ گوت برار سندھو تھا۔ اس نے سلطنت چغتائی کے ضعف کے وقت اپنی دولت و حشمت کی ترقی میں کوشش بہت کی اور زمینداری حاصل کر کے بڑا عزت دار بن گیا، اور موضع پھول، (علاقہ نابھہ) اس نے آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام پھل رکھا۔ پھول کے چھ بیٹے تھے۔ تلوکا، راما، کتھو، چندو، جستو، تخت مل۔ پھر راما کی اولاد میں سے پانچ بیٹے ہوئے۔ آلا سنگھ، دونا سنگھ، بخت مل، سوبھا سنگھ، لدھا سنگھ۔ ان میں سے آلا سنگھ نے سکھ ہو کر بہت ترقی کی اور دولت بے شمار بہم پہنچائی۔ ریاست کی بنیاد بھی اسی نے رکھی اور بہت سا ملک بزور شمشیر اپنے تحت و تصرف میں لے آیا۔ رئیس مالیر کوٹلہ پر بھی اس نے چڑھائی کی اور بڑے بڑے معرکوں کے بعد اس کو زیر کیا۔ شہر پٹیالہ کو بھی اسی نے آباد کیا۔ 1818ء بکرمی میں جب احمد شاہ درانی نے ہند پر حملہ کیا تو اس

علاقے میں آکر اول اس نے قلعہ پرتالہ کو لوٹا، پھر پٹیالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ آلا سنگھ نے جانا کہ اب بادشاہ سے مقابلہ کرنا مشکل ہے، اطاعت کے ذریعے وقت گذار لینا چاہئے۔ چنانچہ فی الفور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لشکر سلطانی کو اپنے علاقے سے رسد پہنچائی۔ چار لاکھ روپیہ نقد بادشاہ کو دے کر اپنے علاقے کو افغانوں کی غارت و قتل سے بچایا۔ احمد شاہ اس پر کمال مہربان ہوا اور خلعت فاخرہ دے کر راجگی کا خطاب بخشا اور شاہی سند لکھ دی۔ جب احمد شاہ چلا گیا تو آلا سنگھ نے سرہند پر حملہ کیا۔ اس شہر کی غارت سے اس کو بے انتہا دولت ملی اور سرہند کا علاقہ اس کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔

آلا سنگھ مرا تو سردول سنگھ اور سردول سنگھ کے بعد امر سنگھ جانشین ہوا۔ امر سنگھ نے قلعہ بٹھنڈہ فتح کرکے اپنے علاقے میں شامل کیا۔ جب وہ مرگیا تو اس کے بیٹے صاحب سنگھ نے ریاست پائی۔ اس کے دور میں ریاست پٹیالہ و نابھہ و جیند و مالیر کوٹلہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زبردستی سے تنگ آگئیں، اس لئے اس کے راجوں نے انگریزی حمایت حاصل کی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اس سے دست بردار ہو گیا۔ صاحب سنگھ کی وفات کے بعد مہاراجہ کرم سنگھ گدی نشین ہوا۔ اس کی وفات کے بعد مہاراجہ مہندر سنگھ مالک ریاست ہوا۔ یہ مہاراجہ باپ کے مرنے کے بعد نابالغ رہ گیا تھا مگر بہ ذمہ داری اہلکارانِ نمک حلال کے انتظام ریاست کا بہ خوبی رہا۔ جب وہ بالغ ہوا تو اس نے بھی بہ وزارتِ خلیفہ سید محمد حسین کے خوب انتظام ریاست کا رکھا۔ 1876ء مہاراجہ عین جوانی کی عمر میں انتقال کرگیا اور بڑا بیٹا خرد سال مہاراجہ چندر سنگھ گدی نشین ہوا۔

جن دنوں سرکار نے گورکھیوں پر یورش کی اور چاہا کہ ان کے لشکر کو کوہستان مابین پر دو دریائے ستلج و جمنا سے نکال دیں اور وہاں کے قدیمی راجوں و مسند نشینوں کو دوبارہ ریاستوں کا مالک و فرمانروا بنائیں تو اس وقت بھی پٹیالے کے رئیس نے لشکر و فوج سے کامل امداد سرکار انگریزی کی کی اور تا اختتام مہم گورکھیہ سرگرم امداد رہا اور جزو علاقہ کیوتھل و بگھاٹ جمعی پینتیس ہزار روپیہ سالانہ بہ عوض مبلغ دو لاکھ اسی ہزار روپے کے اس نے انگریزوں سے خرید لیا۔ پھر 1830ء میں انگریزوں نے پہاڑی علاقہ شملہ کا اس رئیس سے لے کر پرگنہ تردلی کا علاقہ اس کو دیا۔ جب انگریزوں کی سکھوں کے ساتھ جنگ ہوئی تو باوجود ہم مذہبی و ہم قومی کے یہ رئیس وفادار دوست سرکار انگریزی کا بنا رہا اور سرکار انگریزی نے تمام دعاوی خراج و مال گزاری و خرچہ فوج وغیرہ، جو اس رئیس کو سالانہ روپیہ دینا پڑتا تھا، تمام و کمال معاف واگزار کیا۔ ملک منضبط دس ہزار روپیہ سالانہ دوام کے لئے اس رئیس کو دیا، جس کے عوض میں رفتہ رفتہ 1857ء میں تو یہ رئیس دلی دوست سرکار کا رہا۔ اس کی فوج دہلی گئی اور دہلی کے راستے میں انتظام ڈاک کا قائم رکھا۔ گوالیار اور دھولپور میں بھی اس رئیس کی فوج نے خدمتیں کیں۔ زر نقد سے بھی یہ رئیس مددگار گورنمنٹ

ہند کا رہا۔ جب بندوبست سرکار انگریزی کا دوبارہ ہندوستان میں ہو گیا تو سوائے اور انعامات کے پرگنہ نارنول علاقہ جھجر جمعی دو لاکھ روپیہ سالانہ اور حکومت علاقہ بہدور کی اس مہاراجہ کو ملی۔ بعد ازاں دو علاقے ایک جزو علاقہ پرگنہ کنود واقع علاقہ جھجر، دوم تعلقہ کھاون اس مہاراجہ کے ہاتھ بہ عوض اس زرِ نقد کے جو گورنمنٹ ہند نے تمتہ اصل و سود دینا تھا۔ اس رئیس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے۔ غرض یہ ریاست، پنجاب کی ریاستوں میں قائم رہی۔

دوسری لڑی اولاد پھول کی ریاست نابھہ مگر اس کی شاخ علیحدہ ہے۔ اس طرح کہ پھول کا بڑا بیٹا تلو کا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا گوردت سنگھ، صاحب دولت و اقبال ہوا۔ اس نے آلا سنگھ (برادر چچا زاد) کے ساتھ مل کر ایک بڑا علاقہ اپنے زیر حکومت کر لیا۔ اس کے مرنے کے بعد صورت سنگھ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ صورت سنگھ کے بعد ہمیر سنگھ مالک بنا۔ ہمیر سنگھ نے نابھہ کی آبادی کی بنیاد رکھی۔ قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ اس کے مرنے کی بعد جسونت سنگھ رئیس بنا۔ اس کے وقت صاحب سنگھ والی پٹیالہ اور اس کے درمیان ایک قطعہ زمین پر، جو اس نے مسمات نور النساء رائے الیاس کی عورت سے خریدی تھی، تنازعہ برپا ہوا چونکہ رنجیت سنگھ خاندانِ ریاست جیند کا دوہتا تھا، جسونت سنگھ نے اپنا حامی سمجھ کر اس کو بلایا۔ مہاراجہ پٹیالہ کا وکیل بھی رنجیت سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس کی طلبی کے بہ موجب مہاراجہ رنجیت سنگھ فی الفور وہاں جا پہنچا اور زمین متنازعہ پر خیمہ زن ہو کر تینوں ریاستوں نابھہ و پٹیالہ و جیند سے نذرانے معقول وصول کیے اور زمین متنازعہ والی جیند کو دے کر لاہور کو چلا آیا۔ جسونت سنگھ کے بعد راجہ دیوندر سنگھ نے راج پایا۔ اس کے وقت معرکہ فوج سکھی کا صاحبان انگریز کے ساتھ وقوع میں آیا۔ اس ریاست کے رئیس نے انگریزوں کی اطاعت ترک کی اور سکھوں کا ساتھ دیا۔

جب انگریز فتح یاب ہوئے تو دیوندر سنگھ کو انگریزوں نے معزول کر کے تاحین حیات لاہور میں نظربند کر دیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ چنانچہ اس نے بہ حالت نظربندی لاہور میں وفات پائی۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ اس کا ذاتی خرچ ریاست کے خزانے سے ملتا رہا۔ نیز چہارم حصہ ریاست کا سرکار انگریزی نے ضبط کر لیا اس ریاست نے سرکار انگریزی کو اپنی جاں فشانی سے مال خوش کیا۔ جس کے عوض انگریزی سرکار نے علاقہ کانٹھے ملک منضبطہ نواب والی جھجر میں سے جمعی ایک لاکھ چھ ہزار روپیہ سالانہ اس رئیس کو مرحمت کیا۔ 1870ء میں راجہ بھرپور سنگھ لاولد مر گیا تو گورنمنٹ نے مہاراجہ پٹیالہ اور جیند کو اختیار دیا کہ وہ جس کو حق دار تصور کریں مسند نشینی کے لئے تجویز کریں ان دونوں نے راجہ ہیرا سنگھ کو مسند نشین کرنا تجویز کیا اور گورنمنٹ نے اس کو گدی نشین کیا۔

تیسری ریاست جیند کے پھول زمیندار کی اولاد سے تھا اس کا بڑا بیٹا تلو کا اور تلوکا کا بیٹا

نین سکھ ہوا۔ اس نے موضع "بالا والی" آباد کیا اور ریاست کی بنیاد رکھی۔ جب وہ مرگیا تو سردار گجپت سنگھ اس کا بیٹا صاحب ریاست بنا۔ اس نے بہت سا علاقہ فتح کر کے قصبہ گوہانہ میں سکونت اختیار کی۔ اس کے تین بیٹے مہر سنگھ، بھوپ سنگھ، بھاگ سنگھ تھے اور ایک دختر مسمات راج کور تھی۔ راج کور، سردار مہان سنگھ رئیس گوجرانوالہ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ) کے ساتھ بیاہی گئی جس کے پیٹ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ گجپت سنگھ کے تینوں بیٹوں نے الگ الگ ریاست قائم کی۔ مہر سنگھ مالک ریاست کھنہ کا ہوا۔ اس کے بعد ہری سنگھ اور ہری سنگھ کے بعد مسمات دیا کور جانشین ہوتے رہے۔ جب دیا کور زوجہ ہری سنگھ بھی لاولد مرگئی تو وہ ریاست سرکار انگریزی کی ضبطی میں آئی۔ بھوپ سنگھ نے اپنا قبضہ بارندہ پور کی ریاست پر کیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے دو بیٹے بساوا سنگھ و کرم سنگھ وارث ہوئے۔ سروپ سنگھ (کرم سنگھ کے بیٹے) نے آخر ریاست جیند کی پائی۔ گجپت سنگھ کا بیٹا بھاگ سنگھ باپ کے مرنے کے بعد رئیس ریاست جیند و لودھیانہ کا بنا۔ اس راجہ نے جنگ آزادی میں سرکار انگریزی کا ساتھ دیا۔

جب دہلی فتح ہوئی اور مرہٹہ فوج شکست کھا کر بھاگ گئی تو اس وقت بھی یہ رئیس لارڈ لیک صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور جب لارڈ لیک مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر کے تعاقب میں دریائے ستلج تک آیا، تب بھی یہ رئیس اس کے ہم رکاب تھا۔ لارڈ لیک صاحب نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر علاقہ فرید پور واقع ضلع پانی پت جمعی ستر ہزار روپے کا بطور جاگیر تاحین حیات کو اس کو دیا جو اس کی وفات کے بعد سرکار میں ضبط ہو گیا۔ بھاگ سنگھ کے تین بیٹے پرتاب سنگھ و مہتاب سنگھ و فتح سنگھ تھے۔ مہتاب سنگھ اور پرتاب سنگھ لاولد مرگئے اور فتح سنگھ گدی نشین ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے بہ لحاظ رشتہ داری کے کہ فتح سنگھ اس کا ماموں زاد بھائی تھا، کچھ جاگیر تاحین حیات اس کو دی جو اس کی زندگی تک واگزار رہی۔ فتح سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنگت سنگھ جانشین ہوا۔ مگر وہ لاولد مرگیا، اس لئے اس کا سارا علاقہ انگریزوں نے ضبط کر لیا۔

راجہ سروپ سنگھ بن کرم سنگھ بن بھوپ سنگھ بن گجپت سنگھ نے دعویٰ حصول اس ریاست کا نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں کیا۔ چنانچہ علاقہ سفیدون و جیند و سنگروڑ بالا والی واگزار کر دیا گیا اور اس طرح ریاست جیند دوبارہ بحال ہوئی۔ پھر 1857ء میں راجہ جیند اول شخص تھا۔ جس کی فوج بطور پیش گارڈ یعنی فوج مقدم کے انگریزی لشکر کے آگے آگے کوچ کرتی ہوئی جاتی تھی اور انگریزی لشکر کے ہمراہ عین معرکہ جنگ میں بھی اس کی فوج حاضر و شامل رہی، بلکہ کسی قدر فوج اس کی شہر کے حملے کے وقت بھی ہم رکاب تھی۔

ان خدمات کے عوض سرکار انگریزی نے ایک لاکھ سولہ ہزار آٹھ سو تیرہ روپے کا اور علاقہ پرگنہ دادری میں اس کو مرحمت کیا اور تحصیل کنور ضلع جھجر کا کچھ علاقہ بھی اس کے پاس

فروخت کر ڈالا- بعد میں رگھبیر سنگھ اس ریاست کا مالک ہوا-

12- **بارہویں مثل سکر چکیوں سکھوں کی:** اس مثل کی بنیاد سردار چڑت سنگھ نے قائم کی اور وہی سردار بنا- اس کے پاس دو ہزار پانسو سوار تھے- دوآبہ رچناب وچ و سندھ ساگر میں انھوں نے بڑے بڑے ڈاکے مارے اور شہروں و قصبوں کو لوٹا- چونکہ سردار چڑت سنگھ موضع سکر چک میں رہتا تھا' اس لئے اس مثل کا نام' سکر چکیہ' مشہور تھا- اس کے باپ کا نام نودھا' قوم جاٹ' گوت سانسی تھا جو نہایت ناداری و افلاس کی حالت میں وقت گزارتا تھا- اس نے چاہا کہ سکھ بن کر آسودہ حال ہو مگر اس کے باپ دیسو کو منظور نہ تھا کہ نودھا سکھ ہو کر چوٹی کٹوائے اور زنار توڑے- اس نے نودھا کو سمجھایا کہ ایک چاہ اور اس کے متعلقہ زمین کا تیسرا حصہ اور دو بیل میرے پاس ہیں وہ تو لے لے اور زمینداری کر کے اپنا گزارہ کر- سکھ ہو کر آخر تو بھی اور سکھوں کی طرح غارت گری پر کمر باندھے گا اور زمانے کو لوٹے گا یہ کام اچھا نہیں ہے- مگر یہ باز نہ آیا اور پاہل لے کر سکھ بنا- چند روز کے بعد دیسو مر گیا اور اس کی جائیداد پر نودھا قابض ہوا' لیکن شادی کے لئے غریب جان کر اس کو کوئی لڑکی نہیں دیتا تھا- آخر گلاب سنگھ زمیندار ساکن مجیٹھہ نے اپنی دختر کی شادی اس کے ساتھ کر دی- شادی کے بعد نودھا سنگھ نے زمینداری کا کام بالکل چھوڑ دیا اور بیل و ہل و زمین ورثہ پدری فروخت کر کے گھوڑا و تلوار و ڈھال وغیرہ خرید لیئے- پھر نواب کپور سنگھ فیض اللہ پوریہ کی مثل میں جا کر شامل ہوا- 1758ء میں جب نودھا سنگھ روہی کے ملک کی طرف فیض اللہ پوریوں کی مثل کے ساتھ گیا اور قتل ہوا- اس کے بعد چڑت سنگھ اس کا بیٹا وارث ہوا-

بعض مورخوں کا یہ قول ہے کہ نودھا غارت گری میں نہیں مارا گیا بلکہ اسے اپنی عورت مسمات مالاں کے ساتھ' جو بد صورت تھی' رغبت نہ تھی اور وہ اپنی خوبصورت سالی سے محبت بلکہ عشق رکھتا تھا- جب یہ راز فاش ہوا تو لالاں کے بھائیوں نے اس کو قتل کر ڈالا- اس کی مرنے کے بعد چڑت سنگھ دشمن داری کی وجہ سے موضع سکر چک سے اٹھ کر قصبہ راجہ سانسی میں (امرتسر سے پانچ کوس) سکونت پذیر ہوا- احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت چڑت سنگھ بھی اور سکھوں کے ساتھ مدت مدید تک خانہ بدوش پھرتا رہا- پھر قصبہ مجیٹھہ میں سکونت پذیر ہوا اور اپنے دوستوں و رفیقوں کو جمع کر کے اپنی مثل علیحدہ قرار دی اور خود افسر بن کر رہزنی میں مصروف ہوا-

بعد ازاں جودھا سنگھ و دل سنگھ اپنے سالوں کو ساتھ لے کر گوجرانوالہ گیا اور اپنی سسرال کے گھر رہنے لگا- وہاں اس نے ایک کچا قلعہ بنایا اور لوٹ کے مال سے گزارہ کرتا رہا- ان دنوں خواجہ عبداللہ خاں' احمد شاہ ابدالی کی طرف سے صوبہ دار لاہور برائے نام تھا- اس لئے سکھ چاہتے تھے کہ اس کو لاہور سے نکال دیں- اس گروہ میں سرگروہ و افسر یہی شخص تھا- جب وہ ...

آور ہوا۔ آخر خواجہ شکست کھا کر بھاگ گیا اور سکھوں نے لاہور کو خوب لوٹا اور بہت سی دولت حاصل کرکے گوجرانوالہ کو آیا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ نودھا سنگھ خود سکر چک سے اٹھ کر موضع راجا سانسی میں سکونت پذیر ہوا ...ر احمد شاہ درانی کے ڈر سے مدت تک خانہ بدوش پھرتا رہا پھر اس نے بمقام مجیٹھہ جہاں اس کی سسرال تھی، سکونت اختیار کی اور سالی سے عشق کرکے اپنے سالوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ بعد اس کے چڑت سنگھ اس کا بیٹا اس کے تھوڑے سے ترکے کا مالک بنا اور مجیٹھہ چاہتا تھا کہ گوجرانوالہ کو آئے، احمد شاہ کے آنے کی خبر ملی کہ چچا اور تمام سکھ جنگلوں میں بھاگ گئے ہیں۔ چڑت سنگھ بھی اپنے سالے گوربخش سنگھ کے ساتھ جنگل کو نکل گیا۔ جب احمد شاہ پنجاب سے چلا گیا تو یہ بھی گوجرانوالہ آیا جہاں اس کے خسر کا گھر تھا۔ وہاں اس کے ساتھ مسمیان دل سنگھ بدھ سنگھ، جو سکھوں میں بڑے جواں مرد مشہور تھے اور ان کی سواری کے گھوڑے ایک رات میں ساٹھ کوس تک راستہ طے کر لیتے تھے، اس کے ساتھ شامل ہوئے بڑھتے بڑھتے ایک سو سوار کے ساتھ ایمن آباد کو گئے۔ شاہی فوجدار چند آدمیوں کے ساتھ شہر کے باہر ان کو ملا اور حملہ کرکے اس کو قتل کر ڈالا او... شہر میں گھس کر جس قدر مال اٹھا سکے وہاں سے لوٹا۔ اچھے اچھے گھوڑے اور ہتھیار حسب پسند یہ ا... آباد سے لے آئے اور بادشاہی اسلحہ خانہ سب لوٹ لیا۔ پھر تو یہ مثل بڑی مالدار و دلاور مشہور ہو... روز لوگ چڑت سنگھ کے پاس آتے اور ساتھ دینے کی درخواست کرتے مگر یہ کہتا کہ ہم سوا... ...سی دوسرے کو شامل نہیں کریں گے۔ چنانچہ جو کوئی اس کے پاس آتا، پہلے یہ اپنے ہاتھ سے اس کو پاہل دے کر سکھ بناتا۔ جب بال اس کے بڑھ جاتے اور سکھوں کی سی شکل بن جاتی تو اس کو شامل کرتا۔ چنانچہ ایک سال میں بارہ سو سوار ہو گئے پھر لاہور آ کر خواجہ عبداللہ صوبہ لاہور کی ساتھ جنگ کی اور لاہور سے مال لوٹ کر لے گیا۔ جب لاہور سے واپس ہوا تو گوربخش نے شہر وزیر آباد کو بھی لوٹا اور ملازمان شاہی کو وہاں سے نکال دیا اور یہ شہر گوربخش سنگھ کو بخش دیا۔ پھر احمد آباد کو گیا وہاں سے شاہی ملازم بھاگ گئے اور اس نے شہر کو خوب لوٹا۔ پھر وہ قصبہ بطور جاگیر دل سنگھ کو بخش دیا۔ پھر چڑت سنگھ اپنی فوج لے کر قلعہ رہتاس پر حملہ آور ہوا، قلعدار نورالدین خاں ہار کر میدان سے بھاگ گیا اور شہر کو لوٹ کر چڑت سنگھ نے برباد کر دیا۔ وہاں سے چل کر اس نے دھنی کا ملک فتح کیا اور لاکھوں روپوں کا مال وہاں سے لیا۔ پھر چکوال و جلال پور و رسول پور وغیرہ سے معقول نذرانہ لے کر ان قصبوں کو اپنی ریاست میں داخل کیا۔ پھر پنڈ دادنخاں کو گیا، وہاں کے حاکم صاحب خاں کھوکھر نے اطاعت قبول کی اور نذرانہ ادا کیا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر اس نے قصبہ کوٹ صاحب خاں اور راجہ کا کوٹ دو قصبے فتح کیے۔ جب اس کی ترقی اور سکھوں نے دیکھی تو سب کو حسد پیدا ہوا۔ خصوصاً بھنگی مثل کے سردار اس کی ترقی دیکھ کر جل گئے اور چاہا کہ

کسی طرح چڑت سنگھ کے لوٹ لیں۔ یہ خبر چڑت سنگھ کو بھی پہنچ گئی اور آپس میں کمال عداوت و بغض و عناد پیدا ہوا۔ انہی دنوں راجہ رنجیت دیو جموں کا حاکم تھا۔ اس کی رعیت اس وقت کمال آرام میں تھی اور شہر جموں اس وقت تمام پنجاب کے لئے جائے امن و امان بنا ہوا تھا کیوں کہ بہ خوف غارت سکھوں کے بڑے بڑے اشراف و ساہوکار دولت مند پنجاب سے جلا وطن ہو کر وہاں قیام پذیر تھے۔ اس شہر پر سکھوں کی نظر تھی۔ سوئے اتفاق سے رنجیت دیو کا بڑا بیٹا برج راج دیو باپ کی اطاعت سے نکل گیا اور باپ بیٹے میں سخت نزاع برپا ہو کر نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ اِدھر برج راج دیو نے سردار چڑت سنگھ کی مثل کو بڑا بھاری نذرانہ دینا قبول کر کے اپنی مدد پر طلب کیا اور چڑت سنگھ نے سردار حقیقت سنگھ و سردار جے سنگھ کھنیا کو بھی اس مہم میں شامل کیا اور یہ دونوں مثلیں جموں کو روانہ ہوئیں۔ جب یہ خبر راجہ رنجیت دیو کو پہنچی تو بہت ڈرا اور اس نے مناسب جانا کو بھنگیوں کی مثل کو اپنی حمایت پر طلب کرے۔ چنانچہ اس نے جھنڈا سنگھ و گنڈا سنگھ پسرانِ سردار ہری سنگھ بھنگی کو اپنی مدد پر بلایا اور اس مثل کے سردار جموں کو روانہ ہوئے۔ اتفاق سے موضع داسو سہارا علاقہ ظفروال کے قریب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہو گیا اور چند روز فساد کی آگ مشتعل رہی۔ کوئی فریق مغلوب نہیں ہوا تھا کہ ایک روز چڑت سنگھ کی بندوق پھٹ گئی اور وہ مر گیا۔ چڑت سنگھ کے مر جانے سے سردار جے سنگھ و حقیقت سنگھ کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ فتح سے ناامیدی ہو گئے تو ایک مذہبی سکھ کو، جو جھنڈا سنگھ بھنگی کا خدمتگار تھا، اپنے ساتھ ملالیا اور اس کو کئی ہزار روپیہ دینا کر کے اس کے مالک سردار جھنڈا سنگھ کو قتل کروا دیا۔ جھنڈا سنگھ کے قتل ہوتے ہی بھنگیوں کا نظام بگڑ گیا اور راجہ رنجیت دیو اپنی مراد سے نااُمید ہو گیا اور سمجھا کہ اب جب تک سردار جے سنگھ کھنیا سے سازش نہ کی جائے، جان و مال و ملک کا بچنا محال ہے۔

چنانچہ پہلے اپنے بیٹے کو جانشینی کے وعدہ پر راضی کر لیا اور سردار جے سنگھ کھنیا کو ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ نذرانہ دے کر رخصت کیا۔ وہاں سے واپسی کے وقت سردار گنڈا سنگھ بھنگی برادر جھنڈا سنگھ مہلوک اور سردار مہان سنگھ سردار چڑت سنگھ کے بیٹے کی آپس میں صلح ہو گئی، کیونکہ اس سفر میں ان دونوں مثلوں کو کمال نقصان پہنچا تھا۔ سر گروہ بھی انہی دونوں مثلوں کے ہلاک ہوئے اور کچھ فائدہ اور نہ ہوا۔ جبکہ سوا لاکھ روپیہ نقد نذرانہ سردار جے سنگھ کھنیا لے گیا۔ ان دونوں آفت زدہ سرداروں نے آئندہ مناسب جانا کہ آپس میں صلح رہے۔

سال 1818ء میں نواب تکلم خاں بادشاہ کابل کے حکم سے ملتان کا صوبہ دار بن کر آیا (یہ غالباً مرزا شریف بیگ تکلو تھا۔) چونکہ پہلا صوبہ دار خود مختار تھا اور بادشاہ کو کبھی کچھ نہیں دیتا تھا، اس کو صوبے دار کا آنا ناگوار گزرا اور اس نے سردار گنڈا سنگھ بھنگی کو اپنی امداد پر بلایا۔ اس نے اپنی ہمراہی کے لئے سردار مہان سنگھ، سردار چڑت سنگھ کے بیٹے، کو طلب کیا اور دونوں کی فوج ملتان کو

روانہ ہوئی یہ خبر سنتے ہی نواب تکلم خاں فی الفور کوچ کر کے کابل کو چلا گیا۔ یہ فوج جب ملتان پہنچی تو، ملتان کے حاکم نے خالصہ کی بہت خاطر کی اور نذرانہ دے کر رخصت کیا۔ مگر انہوں نے فریب سے قلعہ ملتان کے اندر واقع "سری پہلاد جی" کے مندر کے درشن کرنا چاہے۔

یہ التماس سن کر ملتان کے سادہ لوح حاکم نے کہلا بھیجا کہ کیا مضائقہ ہے، خالصہ جی پچاس پچاس آدمی آئیں اور درشن کر جائیں۔ یہ اجازت سن کر پچاس پچاس آدمی کا غول قلعے میں جانے لگا۔ مگر جب وہ باہر نکلتے دس آدمی ان میں سے قلعے میں رکھ لیے جاتے۔ اس طرح سے بہت آدمی وہاں جمع ہو گئے۔ دروازہ قلعے کا تو کھلا ہی تھا، پھر سب فوج یک بار حملہ کر کے اندر چلی گئی اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ خزانہ و اسباب وغیرہ پر پہرے بٹھلا دیے، نواب کو پکڑ لیا گیا۔ جب وہ ہر ایک چیز سے دست بردار ہو گیا تو اس کو آزاد کر دیا۔ کچھ دن یہ سردار ملتان میں رہے اور شہر کو خوب لوٹا اور آخر ایک شخص جمیعت سنگھ کو وہاں صوبہ و قلعدار و حاکم اپنی طرف سے بنا کر وطن کو مراجعت کی، اور راستے میں پہلے موضع دھارا کو غارت کیا، پھر احمد آباد کے حاکم سے۔ وہ بڑی توپ چھین لی، جس کو قلعہ لاہور سے چڑت سنگھ لایا تھا اور بہ سبب اس کے وزن دار ہونے کے اپنے گھر تک نہ لے جا سکتا تھا۔ فتح ملتان اور توپ کے حاصل ہونے کے بعد گنڈا سنگھ مفرور ہو گیا کیونکہ سردار مہان سنگھ بھی اس وقت گویا اس کے ماتحت تھا اور فی الحقیقت گنڈا سنگھ کی اس وقت کمال ترقی کا وقت تھا۔ جس طرف نظر کرتا کوئی اس کے روبرو دم نہیں مارتا تھا۔ اس اثناء میں سردار منسا سنگھ بھنگی، جو قصبہ پٹھان کوٹ کا حاکم تھا۔ مر گیا اور اس کی زوجہ نے تارا سنگھ (سردار حقیقت سنگھ کہنیا کے بھائی) کو گھر بلا کر اس سے شادی کر لی چونکہ سردار منسا سنگھ بھنگی نزدیکی رشتہ دار سردار گنڈا سنگھ کا تھا، اس بات میں سردار گنڈا سنگھ کی بڑی ہتک تھی گویا اب ریاست پٹھان کوٹ اس کی مثل سے نکل کر کہنیا مثل کی حکومت میں آ گئی۔ سردار گنڈا سنگھ نے برافروختہ ہو کر حکم دیا کہ فی الفور دونوں مثلوں کے سوار پٹھان کوٹ کو کوچ کریں۔ چنانچہ جاتے ہی پٹھان کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

عین لڑائی میں کسی سکھ نے قلعے کے اندر سے ایسے تاک کر گولی لگائی کہ سردار گنڈا سنگھ بھنگی کے مغز میں لگی اور مغز پاش پاش ہو گیا۔ سردار گنڈا سنگھ بھنگی کے مارے جانے سے اس کے لشکر میں ابتری پھیل گئی، اور اس کا چھوٹا بھائی دیسو سنگھ بھائی کی جگہ فرماں فرما مثل کا بن گیا اور وہ پٹھان کوٹ کا محاصرہ چھوڑ کر امرتسر کو واپس چلا آیا۔ انہی ایام میں تیمور شاہ (احمد شاہ بادشاہ کابل کا بیٹا) ڈیرہ جات کے راستے ملتان میں داخل ہوا۔ اس کے آنے سے تمام سکھ ملتان سے جان بچا کر بھاگ گئے۔ چند روز شہزادہ ملتان میں رہا اور نواب شجاع خاں بہادر کو صوبہ دار بنا کر کابل کو واپس چلا گیا، اور یوں ملتان سے حکومت مثل بھنگیوں کی برخاست ہوئی۔

اِدھر دیسو سنگھ بھنگی، جو گنڈا سنگھ کی جگہ مالک ہوا تھا، عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس وقت

سردار مہان سنگھ سکر چکیا نے اس سے علیحدگی اختیار کی اور اپنی مثل کے سواروں کو لے کر گوجرانوالے آگیا اور فی الفور پنڈی بھٹیاں و ساہیوال و عیسیٰ خیل و موسیٰ خیل و علاقہ جھنگ پر یورش کر کے ان علاقوں کو لوٹا اور نذرانے وصول کیے اور دیسو سنگھ کچھ بھی اس کا تدارک نہ کر سکا۔ کیونکہ پنڈی بھٹیاں اور ساہیوال کو پہلے بھنگی سردار فتح کر چکے تھے اور وہاں ان کا تھانہ موجود تھا۔ چونکہ مہان سنگھ کے گھر ایک بہن راجکور ابھی کنواری تھی، اس کا رشتہ مہان سنگھ نے صاحب سنگھ بھنگی (گوجر سنگھ بھنگی کے بیٹے) کے ساتھ کر دیا یہ گوجر سنگھ سرداران بھنگی میں بڑا سردار معزز تھا اور تیسرا حصہ ریاست شہر لاہور کا بھی اس کے قبضے میں تھا اور شہر گجرات اور بہت سے علاقے دوآبہ رچناب میں اس کی حکومت میں تھے۔ صاحب سنگھ نے باپ کے برخلاف ہو کر سردار مہان سنگھ کی مدد سے گجرات پر قبضہ کیا، پھر وہ تمام علاقے جہاں اس کا باپ حکمرانی کرتا تھا، اپنے تصرف میں لے لئے۔

اس وقت گوجر سنگھ لاہور میں تھا۔ جب اس نے اپنے صلبی بیٹے کی یہ حرکت سنی تو کمال غضب میں آیا اور اپنا لشکر جمع کر کے گجرات کا محاصرہ کر لیا۔ باپ بیٹوں میں خوب لڑائی ہوئی، اور دو سو آدمی فریقین کے مارے گئے۔ اس وقت سردار مہان سنگھ نے درمیان میں آ کر دونوں میں صلح کرادی اور تمام علاقہ گوجر سنگھ نے اپنے بیٹے سے واپس لے لیا۔ اسے صرف تعلقہ سودھرہ گذارے کے لئے دیا۔ اس کام سے فراغت پا کر سردار مہان سنگھ قلعہ شادی وال پہنچا اور قلعہ دار کو فریب سے اپنے پاس بلا کر قید کر لیا۔ پھر وہ رہتاس کی طرف بڑھا، اس پر بھی قبضہ کیا، پھر قصبہ کوٹلی (سیالکوٹ) پر کہ وہاں کی بنی ہوئی بندوق بہت مشہور تھی، یورش کی اور قصبے والوں کو سخت مجبور کر کے نذرانہ لیا اور قبضہ کیا، پھر قصبہ رام داس پور کو گیا۔ وہاں کی رعیت نے اطاعت قبول کی اور نذرانہ کافی داخل کیا۔ دو ماہ تک سردار نے وہاں قیام رکھا اور وہاں رہ کر ایک بڑا کام ایسا کیا کہ جس سے اکثر سرداران سکھ ہر ایک مثل و فرقے کے دب گئے یعنی اس نے بائیس سرداران کو ملاقات کے بہانے بلا کر اپنے پاس قید کر لیا اور ہر ایک سے مطابق ان کی حیثیت کے نذرانہ و مصادرہ لے کر ان کو چھوڑا۔

بعد ازاں اس نے رام داس پور سے کوچ کر کے قصبہ رسول نگر کا محاصرہ کیا کہ وہ بڑی توپ (احمد شاہی) نے جو گنڈا سنگھ بھنگی احمد آباد سے لایا تھا وہ توپ اس نے پیر محمد خاں زمیندار و حاکم رسول نگر کے حوالے کر دی تھی۔ اس سے سردار مہان سنگھ نے وہ توپ طلب کی، اس نے کہلا بھیجا کہ یہ امانت میرے پاس سرداران مثل بھنگی کی ہے، ان کے حوالے کروں گا۔ یہ جواب سن کر مہان سنگھ فی الفور رسول نگر جا پہنچا اور قصبے کا محاصرہ کر لیا۔ ایک ماہ تک آپس میں لڑائی رہی۔ بہت سے آدمی مارے گئے اور پیر محمد خاں میدان میں لڑتا رہا، پھر محصور ہو گیا۔ تین ماہ تک سردار مہان

سنگھ نے اس قصبے کے محاصرہ رکھا۔ تمام علاقہ متعلقہ پیر محمد خاں کا سردار نے لوٹ لیا۔ کسی زمیندار کے گھر ایک دانہ غلہ کا باقی نہ چھوڑا۔ جب چار ماہ تک محاصرے کی مدت طول پکڑ گئی، پیر محمد خاں نے بہت سے خطوط اپنی امداد کے لئے دیسو سنگھ بھنگی کو لکھے مگر اس نے عیش و عشرت کی مستی میں جواب تک نہ دیا۔ جب مہان سنگھ بھی تنگ آ گیا تو صلح کی تجویز کی اور "گرنتھ" کے ورق پر مہر لگا کر پیر محمد خاں کے پاس بھیجا اور لکھا کہ میں ہرگز تجھ سے دغا نہ کروں گا، تو بے اندیشہ میرے پاس چلا آ۔ چنانچہ وہ ایماندار رئیس قسم پر اعتبار کر کے فی الفور حاضر ہو گیا مگر سردار مہان سنگھ نے آتے ہی اس کو نظر بند کر لیا۔ اور شہر میں داخل ہو کر غارت گری کا بازار گرم کیا۔

**رنجیت سنگھ کی پیدائش:** مہان سنگھ رسول نگر کے محاصرے میں مصروف تھا، راجہ جیند کی لڑکی کے بطن سے، جو زوجہ سردار مہان سنگھ کی تھی، بہ مقام گوجرانوالہ سردار کے گھر بیٹا ہوا۔ رنجیت سنگھ اس کا نام رکھا اور قصبہ رسول نگر کا نام بدل کر رام نگر رکھا کہ رسول کا نام زبان پر نہ آئے، اور دوسرا قصبہ علی پور، جو پیر محمد خاں کے قبضے سے چھڑایا تھا، اس کا نام بدل کر اکال گڑھ رکھا اور ان دونوں قصبوں کی حکومت دل سنگھ کو دے دی۔ تبرکاتِ اسلامیہ جو پیر محمد نے بہ مقام رسول نگر رکھے ہوئے تھے، وہ بھی سردار مہان سنگھ کے ہاتھ آئے اور اس نے بہ کمال ادب گوجرانوالہ میں محفوظ رکھوا دیئے۔

سمت 1839ء بکرمی میں راجہ رنجیت دیو والی جموں مر گیا اور برج راج دیو اس کا بڑا بیٹا جانشین ہوا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو قید کر لیا اور عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ سردار مہان سنگھ مدت سے دل میں آرزو رکھتا تھا کہ شہر جموں کو غارت کر کے بے انتہا دولت حاصل کرے، چنانچہ بے خبری میں جموں جا پہنچا۔ راجہ برج راج دیو، شہر چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ روسائے جموں سردار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نذرانہ دینا قبول کیا، مگر مہان سنگھ نے منظور نہ کیا اور کہا کہ ہم شہر لوٹنے نہیں آئے، تم خاطر جمع رکھو، ہم کو جموں کے راج سے غرض ہے۔ بعد ازاں شہر میں داخل ہو کر لوٹ مچا دی۔ تین دن تک شہر لٹتا رہا۔ شہر والے پارہ نان کے محتاج ہو گئے۔ بہت خلقت قتل ہوئی۔ بعد اس غارت و قتل کے مہان سنگھ رام نگر آیا۔ سمت 1844ء بکرمی میں سردار مہان سنگھ بہ تقریب غسل دیوالی کے امرت سر میں آیا۔ سردار جے سنگھ کہنیا بھی امرتسر میں پہنچا۔ مہان سنگھ کی دولت اور حشمت و ترقی دیکھ کر اس کو کمال حسد ہوا اور وکیل کی معرفت کہلا بھیجا کہ جو تم لاکھوں روپیہ نقد اور لاکھوں روپے کا اسباب و جواہرات جموں سے لوٹ کر لائے ہو وہ تمام خالصہ کا حق ہے۔ اس کا حصہ ہم کو بھی دو۔ مہان سنگھ نے انکار کیا تو دونوں سرداروں میں سخت لڑائی ہوئی۔

چونکہ یہ لڑائی امرتسر سے باہر نکل کر قصبہ مجیٹھہ کے قریب ہوئی تھی، عین معرکے سے سردار جے سنگھ نے مغلوب ہو کر پہلے قصبے میں پناہ لی، پھر وہاں سے بھاگ کر دریائے بیاسا سے پار اتر

گیا اور دو آبہ بست جالندھر میں پہنچ کر بہت سی فوج جمع کی اور چاہا کہ دوبارہ مہان سنگ کے ساتھ لڑے۔ اس اجتماع کی خبر سن کر مہان سنگھ نے سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو جگراؤں سے مدد کے لئے بلایا۔ جس کو سردار جے سنگھ کنہیا نے اس کے علاقے سے بے دخل کر کے ستلج پار اتار دیا تھا اور وہ بمقام جگراؤ (جگراؤں) پریشان حال سرگشتہ پڑا ہوا تھا۔

جسا سنگھ جب دریائے ستلج سے اترا تو پہلے سردار گوربخش سنگھ (ایک مصاحب سردار جے سنگھ کا تھا اور جے سنگھ نے اس کو اس بات کے لئے آگے روانہ کیا تھا کہ سردار جسا سنگھ کو اس طرف آنے سے روکے) اس کے مقابل ہوا اور لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ایک اور سردار گوربخش سنگھ (سردار جے سنگھ کا بیٹا) بڑی فوج کے ساتھ اس کے سد راہ ہوا۔ جسا سنگھ نے بڑی جواں مردی کے ساتھ اس کے ساتھ بھی جنگ کی جس میں دوسرا گوربخش سنگھ بھی قتل ہوا اور وہ سردار مہان سنگھ کی فوج کے ساتھ شامل ہو گیا اور بمقام نوشہرہ جنگ ہوئی جس میں سردار مہان سنگھ نے فتح پائی اور جے سنگھ نور پور بھاگ گیا۔ مہان سنگھ تعاقب میں گیا۔ وہاں سے وہ دینا نگر میں آیا۔ جہاں مہاراجہ سنسار چند والی کوہستان قیام پذیر تھا۔ دونوں میں تپاک کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ راجہ سنسار چند نے سردار مہان سنگھ سے یہ آرزو کی کہ اگر آپ قلعہ کانگڑہ، سردار جے سنگھ سے دوبارہ دلوا دیں تو میں کمال مشکور ہوں گا اور اس کام کے عوض نذرانہ دو لاکھ روپیہ خالصہ جی کی خدمت میں پیش کروں گا۔ سردار مہان سنگھ نے وعدہ کیا کہ جب میں گوجرانوالہ پہنچ جاؤں گا اپنی فوج قلعہ کانگڑہ کی فتح کے لئے مامور کروں گا۔

اس وعدے کے بعد سردار مہان سنگھ گوجرانوالہ گیا اور حسب وعدہ دیا رام و محمد صالح کو حکم دیا کہ مہاراجہ سنسار چند کو قلعہ کانگڑہ پر دخل دلا کر دو لاکھ روپیہ وصول کرلائیں۔ یہ فوج کانگڑہ جا پہنچی۔ چونکہ سردار مہان سنگھ کی فوج کے ساتھ خزانہ نہ تھا للہذا خرچہ کے لئے عرضی اپنے سردار کے نام لکھ بھیجی۔ سردار نے یہ لکھا کہ دو لاکھ روپیہ جو مہاراجہ سنسار چند نے دینا کیا ہے اس میں سے پچاس ہزار روپے لے کر خرچ کرو۔ اس پر دونوں افسروں نے مہاراجہ سنسار چند سے روپیہ طلب کیا تو اس نے کہا کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے، میں ایک کوڑی نہ دوں گا۔ اس جواب سوال میں بگاڑ پیدا ہو گیا اور تلوار چل پڑی اور خوب لڑائی ہوئی، جس میں محمد صالح مارا گیا اور دیا رام بہ حالت زار شکستہ دختہ فوج کو ہمراہ لے کر گوجرانوالہ میں آیا۔ سردار مہان سنگھ کو غصہ تو آیا چونکہ فی الحال راجہ سنسار چند سے بدلہ نہیں لے سکتا تھا خاموش رہا۔

راجہ سنسار چند نے قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا اور پھر سردار جے سنگھ کو فریب سے کہلا بھیجا کہ اگر تم قلعہ ہم کو خالی کر دو تو ہم اور تم دونوں مل کر سردار مہان سنگھ کو شکست دے کر پنجاب سے نکال دیں اور اس کا مال و اسباب باہم بانٹ لیں۔ اس فریب میں سردار جے سنگھ آ گیا اور با!

استحکام عہد و بیان کے قلعہ مہاراجہ سنسار چند کے حوالے کر دیا اور اس نے اپنے اقرار سے برگشتہ ہو کر صاف جواب دے دیا۔ یہ جواب پایا تو سردار جے سنگھ قلعہ دینے پر سخت پچھتایا اور وہ اور سردار مہان سنگھ دونوں مہاراجہ سنسار چند کے جانی دشمن ہو گئے۔ انہی ایام میں سردار مہان سنگھ نے سنا کہ شہر جموں دوبارہ آباد ہو گیا ہے۔ جو لوگ اپنا مال و اسباب لے کر شہر سے بھاگ گئے تھے وہ اب شہر میں آ گئے ہیں۔ راجہ برج راج دیو بھاگنے کے وقت اپنا خزانہ و املاک ساتھ لے گیا تھا وہ بھی سب جموں میں موجود ہے۔

یہ خبر پا کر سردار مہان سنگھ دوسری مرتبہ بے خبر جموں پر چڑھ گیا اور جاتے ہی اس نے شہر میں لشکر بھیج دیا اور غارت شروع کر دی۔ سکھوں نے ایک روز میں شہر لوٹ لیا۔ راجہ کا خزانہ بھی سب لے لیا۔ سامان ریاست کا بندوقیں، تلواریں سب اٹھالیں، بارود کو آگ لگا دی۔ غرض تمام شہر اور ریاست کو خاک میں ملا دیا، وہاں سے جب مراجعت کی تو قصبہ بہادر کی طرف توجہ کی۔ عالم سنگھ اکھنور وغیرہ سرداران دامن کوہ خدمت میں حاضر آئے اور سب نے نذرانہ دے کر اپنے ملک کو غارت و قتل سے بچایا۔

چونکہ رنجیت سنگھ مہان سنگھ کا بیٹا خرد سال بھی اس سفر میں ہمراہ تھا اس مقام پر اس کو چیچک نکل آئی، کہ زندگی کی امید باقی نہ رہی، اس وقت سردار بہت گھبرایا اور فی الفور رام نگر پہنچا۔ وہاں اس نے بہت سی خیرات کی اور بہت سا اسباب نقد و جنس جوالا مکھی دیوی کے آستان پر بھیجا۔ کانگڑہ کے قلعے میں جس دیوی کا استان ہے وہاں بھی بہت مال روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہاں جا کر غربا اور فقرا کو تقسیم کیا جائے۔ ایک گروہ برہمنوں کا بید خوانی کے لئے اور مسلمانو کو قرآن خوانی کے لئے بلا کر التجا کی کہ تمام دن خدا کا کلام پڑھیں اور بیمار کے حق میں شفا کی دعا مانگیں۔

اکیس روز کے بعد رنجیت سنگھ نے غسل صحت کیا۔ اس بیماری میں ایک آنکھ بالکل بیکار ہو گئی۔ بعد غسل صحت لڑکے کے سردار نے بڑا جشن کیا تھا اور دور دور سے سردار اس کے گھر مبارک باد دینے آئے تھے، سردار جے سنگھ کہنیا جو راجہ سنسار چند کے ہاتھ سے نالاں تھا بھی سردار مہان سنگھ کے پاس آیا اور التجا کی کہ آئندہ سردار مہان سنگھ اس کا حامی و دوست بنا رہے۔ سردار مہان سنگھ نے بھی اس کی التجا قبول کی اور کہا کہ سردار جے سنگھ کہنیا اپنی پوتی (سردار گوربخش کی بیٹی) کی نسبت اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ کر دے۔ یہ بات سردار جے سنگھ نے بخوشی خاطر منظور کی اور گوربخش سنگھ کی بیٹی مہتاب کور رنجیت سنگھ کے ساتھ بیاہی گئی، 1785ء میں یہ شادی ہوئی۔ مگر یہ رشتہ سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو برا لگا جس کی دشمنی جے سنگھ کے ساتھ تھی اور سردار مہان سنگھ کی مدد کی خاطر وہ ستلج پار سے آیا تھا اور میدان جنگ میں جے سنگھ کے ساتھ لڑ کر اس کے بیٹے گوربخش سنگھ کو قتل کیا تھا۔ سردار مہان سنگھ نے محسوس کر کے سردار جے سنگھ کو کہہ کر اس کا

تمام علاقہ بھی جو جے سنگھ کے قبضے میں تھا رہا کرادیا اور سردار جے سنگھ نے یہ بڑی مردانگی کی کہ سردار مہان سنگھ کے کہنے سے اتنا بڑا علاقہ مقبوضہ سالہا سال کے بعد چھوڑ دیا۔ چنانچہ فی الفور عمل درآمد ہو گیا۔ مگر سردار جسا سنگھ کے دل سے غبار نہ گیا۔ اگرچہ وہ بظاہر صلح و صفائی کر چکا تھا۔

جب مہان سنگھ شادی وغیرہ سے فارغ ہوا تو اس نے چاہا کہ اپنے ملک میں دورہ کرے۔ چنانچہ روانہ ہوا اور سردار جسا سنگھ کو رام نگر چھوڑا۔ دو روز بعد جسا سنگھ کا ارادہ ہوا کہ اپنی مثل کے سواروں کے ساتھ مہان سنگھ پر یورش کرے وہ اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ جودھ سنگھ رام گڑھیہ اس کا مصاحب بھی کمربستہ ہمراہ تھا۔ جسا سنگھ شکست کھا کر پسپا ہوا۔ 1791ء میں سردار گوجر سنگھ بھنگی مر گیا اور اس کا بیٹا صاحب سنگھ اس کی جگہ شہر گجرات میں گدی نشین ہوا۔ اور اپنے باپ کی جائیداد کے قبضے کے لئے وہ لاہور کو گیا۔ سردار مہان سنگھ نے موقع پا کر چاہا کہ قلعہ، سودھرہ، جو صاحب سنگھ کے قبضے میں ہے، چھین لے۔ چنانچہ اس ارادے پر بہت سی فوج لے کر قلعہ سودھرہ پر فوج کشی کی۔ اگرچہ صاحب سنگھ کے ساتھ سردار چڑت سنگھ کی بیٹی یعنی مہاں سنگھ کی ہمشیرہ بیاہی ہوئی تھی، مگر مہاں سنگھ نے کوئی لحاظ نہ کیا۔

اس لڑائی کے موقع پر سردار مہان سنگھ بیمار ہو گیا۔ جب جانا کہ اب زندگی باقی نہیں ہے تو رنجیت سنگھ کو بعمر دس سال اپنے ہاتھ سے دستار ریاست کی پہنا کر اور سردار دل سنگھ کالیانوالہ کو، رنجیت سنگھ کا اتالیق بنا کر خود گوجرانوالہ کو روانہ ہوا، اور بعد روانگی سردار مہان سنگھ کے رنجیت سنگھ بدستور قلعے والوں سے لڑتا رہا۔

اتنے میں خبر پہنچی کہ ایک لشکر سکھوں کا سردار کرم سنگھ دولو و دل سنگھ و جودھ سنگھ بھنگی سنگھ جسا سردار کی کمان میں آرہا ہے چنانچہ رنجیت سنگھ نے یہ خبر سنتے ہی قلعہ سودھرہ کا محاصرہ چھوڑ دیا اور ان کا راستہ روکنے کے لئے روانہ ہوا۔ موضع کوٹ مہاراجہ کے پاس دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور تین گھنٹے تک خوب لڑائی ہوئی۔ اگرچہ اس وقت فوج رنجیت سنگھ کی دشمن کی فوج سے آدھی تھی مگر فتح خداداد ہے۔ آخر دشمن بھاگ نکلے اور اس نے تین کوس تک ان کا تعاقب کیا۔ سردار چتر سنگھ کلاں والیہ اس لڑائی میں مارا گیا۔ ایک توپ خانہ اور زنبورک خانہ سرداران بھنگیوں کا مع بہت سے اسباب کے رنجیت سنگھ کے قبضے میں آیا۔

ابھی رنجیت سنگھ اسی مقام پر مقیم تھا کہ سردار مہان سنگھ کی موت کی خبر ملی۔ وہ فی الفور گوجرانوالہ میں آیا اور باپ کی نعش کو چتا کی نذر کیا۔

(کنہیا لال کی کتاب تاریخ پنجاب سے تلخیص و استفادہ کیا)

## باب 10

# رنجیت سنگھ کا دورِ حکومت

(1799ء تا 1839ء)

تیس سال تک سکھا شاہی کا دور دورہ رہا اور سکھوں کی غیر مستقل مثلیں اپنے اپنے دائرہ میں حکمرانی کے مزے لوٹتی رہیں۔ ان میں خانہ جنگیاں بھی ہوئیں اور فتح و شکست بھی بعض کا مقدر بنتی رہی۔ تیس سال کی اس غیر مستقل حکومت کے بعد رنجیت سنگھ اٹھا۔ وہ سکر چکیا مثل کا سربراہ تھا اور اس نے سکھوں کی بکھری ہوئی قوت کو مجتمع کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کی۔

رنجیت سنگھ: رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوا۔ بارہ سال کی عمر یعنی 1792ء میں اپنے باپ کے مرنے پر اس کی جاگیر کا وارث ہوا۔

1799ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے جو پنجاب کو اپنا علاقہ سمجھتا تھا اسے ایک شاہی فرمان کے ذریعے لاہور کی حکومت عطا کر دی۔ لاہور پر قبضہ کے بعد 1802ء میں امرتسر پر بھی رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح اس کی شخصیت نمایاں ہوگئی، اور اس کے وقار میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کہلانے لگا اور ملک گیری کی مہم جاری رکھی حتیٰ کہ اس نے آہستہ آہستہ تمام مسلوں کا الحاق جیسا کہ گزر چکا ہے اپنی حکومت سے کر لیا۔ ادھر انگریز دریائے ستلج تک کے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔

جن سے رنجیت سنگھ کے تعلقات دوستانہ تھے۔ 1809ء میں انگریزوں کے مابین ایک معاہدہ اتحاد ہوا۔ جس کی رنجیت سنگھ نے پابندی بھی کی۔ اس نے اپنی فوج کی مضبوط اور جدید بنیادوں پر تنظیم کی۔ اس کے فوجی اور جرنیل ان فرانسیسی جرنیلوں کے تربیت یافتہ تھے جو قبل ازیں نپولین بوناپارٹ کے تحت کام کر چکے تھے اور واٹرلو کی جنگ کے بعد مہاراجہ کی ملازمت کے لئے پنجاب آئے تھے۔ ایسی جدید تربیت یافتہ فوج کے بل پر رنجیت سنگھ نے آہستہ آہستہ تمام مسلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1819ء میں کشمیر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور 1834ء میں پشاور پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ 1839ء میں وہ ایک وسیع اور مستحکم حکومت چھوڑ کر مرا جو ستلج سے کوہ ہندوکش تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن اس کے جانشینوں میں کوئی بھی اس کے پائے کا نہ نکلا جو اس کا انتظام کا سنبھال سکے۔ اس کے تین بیٹے یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوئے، لیکن باہمی چپقلشوں اور

سرداروں کی سازشوں نے چین نہ لینے دیا۔ غارتگری، خانہ جنگی اور غیر معمولی خونریزی روزمرہ کا معمول تھی۔ فوج قابو سے باہر ہوگئی اور پورے ملک میں دہشت گردوں نے اندھیر مچادیا۔ آخر سکھ مملکت کی طرف سے انگریزوں کے علاقے پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ فوجی قوت کی سمت سیدھی کرکے اسے انگریزوں سے ٹکرا دیا جائے۔ آخر 1849ء انگریزوں نے سکھ حکومت ختم کرکے پنجاب کو انگریزی علاقے میں شامل کرلیا۔

## سکھ مسلوں کے اقتدار کی وجوہات

1716ء میں بندہ بیراگی کو قتل کردیا گیا۔ جس کے بعد سکھوں کا حال پتلا ہوگیا۔ مغلوں نے کپور سنگھ کو نواب کا خطاب دے کر ایک لاکھ کی جاگیر بھی عطا کی تاکہ وہ دہشت گردی اور سرکشی سے باز رہیں لیکن انہیں خودمختاری کا لپکا پڑ چکا تھا۔ للذا وہ کئی گروہ بن گئے اور مار دھاڑ کرتے ہوئے پنجاب کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تاکہ مغل حکومت کو کمزور اور ختم کیا جاسکے۔ مغلوں نے بھی ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی لیکن وہ حکمت عملی کے تحت روپوش ہو جاتے رہے اور خطرہ ٹلتے ہی دوبارہ کمین گاہوں سے نکل کر میدان میں آجاتے۔

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلوں کو کمزور ترین حالت تک پہنچا دیا۔ اس سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا۔ کئی بار احمد شاہ کے دستوں پر حملہ کرکے مال و اسباب (اور خزانہ تک) چھین لیا۔

1748ء میں نواب کپور سنگھ (سنگھ پوریہ مسل کا سردار) نے بھی سکھوں کی تنظیم کی اور سب گروہوں کو ملا کر "خالصہ دل" قائم کیا۔ جسا سنگھ آلو والیہ کو اس دل کا لیڈر بنا دیا گیا اور بارہ مسلوں کا قیام عمل میں آگیا۔ اس طرح سکھ تقریباً سارے پنجاب پر حکمرانی کرنے لگے۔

1764ء میں احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد یہ مسلیں بالکل خودمختار ہوگئیں، اور ان کے ہاں سے سکے بھی جاری کیے گئے۔ لگان جمع کرکے مقامی خزانے میں رکھا جانے لگا۔ عدالتیں بھی کام کرنے لگیں۔

**مسلوں کی تنظیم اور حکومت کرنے کا طریق کار:** ہر مسل کا سردار مسلدار کہلاتا تھا۔ مال غنیمت آپس میں بانٹ لیا جاتا۔ ان کے فوجی سب کچھ کرگزرنے میں مختار تھے۔ حتیٰ کہ وہ ایک مسلدار کو چھوڑ کر دوسرے کے ہاں ملازمت اختیار کرنے میں بھی آزاد تھے۔ فوجیوں کو تنخواہ کی بجائے گذارہ کے لئے زمین ملتی تھی۔

**پنچائتی نظام:** ہر گاؤں میں ایک پنچائیت ہوتی۔ وہ گاؤں کے معاملات نپٹاتی تھی۔ نمبردار، پٹواری اور چوکیدار اس میں سرکاری اہلکار ہوتے۔ جو لوگوں کی حفاظت کے لئے بھی

اقدامات کرتے۔

ذرائع آمدن: اراضی کا لگان--- تجارت پر محصول لوٹ کا مال اور جرمانے سے وصول ہونے والی بھاری رقوم آمدنی کا ذریعہ تھیں۔

فوجداری مقدمات کے فیصلے مسلدار خود کرتے یا ان کے نمائندے یہ معاملات نمٹاتے۔ سزائیں بڑی سخت دی جاتی تھیں۔ جرمانے بھی کئے جاتے، نذرانوں کا بھی رواج تھا جو رشوت کی مہذب شکل تھی۔

سرکاری اہلکاروں کی خاطر تواضع کے لئے "آیا گیا ٹیکس" وصول کیا جاتا تھا۔ فوج میں گھوڑ سوار اور پیدل دستے ہوتے۔ ہر دستے کا ایک سالار یا سردار ہوتا فاسٹر کے بقول 1783ء میں مسلوں کے پاس چوبیس ہزار آٹھ سو گھڑ سوار اور چالیس توپیں تھیں۔ البتہ ان کے ہاں فوجی تربیت کا کوئی خصوصی اور باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔ ہر فوجی اپنی تربیت کا خود ہی ذمہ دار تھا۔ وہ خود اپنی کوشش سے فوجی کرتب سیکھتا۔ تلوار چلانے کی مشق کرتا اور بندوق چلانا سیکھتا تھا۔

## رنجیت سنگھ اور مسلدار

حسد کی آگ میں جلنا بھی بعض مسلداروں کا شیوہ تھا۔ چنانچہ خانہ جنگیاں اسی وجہ سے ہوتی تھیں اور آخر رنجیت سنگھ نے ساری مسلوں کو ہڑپ کر لیا اور 1805ء میں "گورو متا" نامی مرکزی سکھ ادارہ ختم کر دیا۔ جس کا اجلاس امرتسر میں اکال تخت میں ہوتا تھا۔ یہ ادارہ ختم کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کو اختیارات استعمال کرنے کا موقع ہاتھ آگیا کیونکہ وہ طاقت پکڑ چکا تھا۔ وہ کسی مسلدار سے مخلص نہ تھا بلکہ اس کے تعلقات .. تان اپنی سلطنت کو وسیع کرنے پر ٹوٹتی تھی۔ جس طرح بھی ہوتا وہ اپنا کام نکال لیتا۔ وعدہ خلافی اس کے نزدیک کوئی برائی نہ تھی۔ وہ کمزور مسلداروں کو جارحیت کے ذریعے دبا لیتا اور طاقتوروں کو قابو میں لانے کے لئے کوئی اور مناسب سی حکمت عملی اپناتا صرف سردار فتح سنگھ آلو والیہ ہی رنجیت سنگھ کی جارحیت اور اس کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکا کیونکہ وہ بھی ہوشیار بیدار مغز اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔

خالصہ دل اور سکھوں کی فوجی تنظیم: بندہ بیراگی کے قتل کے بعد سکھ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بندہ کے پیروکار خود کو بندئی خالصہ کہتے تھے۔

دوسرا گروہ کٹر سکھوں کا تھا۔ جو پرانی تعلیمات پر عمل پیرا تھا۔ وہ خود کو "تتو خالصہ" کہتا تھا۔ 1720ء میں گورو گوبند سنگھ کی بیوہ "ماتا سندری" کے حکم پر دونوں خالصہ گروہ ایک ہو گئے۔ اس کے بعد سکھوں کے بہت سے جتھے وجود میں آ گئے جن کا کام لوٹ مار کر کے گزر اوقات کرنا تھا۔ جو کوئی غریب اور لاچار بھوکا مر رہا ہوتا وہ پاہل کی رسم ادا کر کے سکھ بن جاتا اور سکھوں کے ساتھ مل

کر رہزنی شروع کر دیتا۔ نیز یہ گوریلا جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد مغل حکومت کو ختم کرکے اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلوں کے سرداروں کے پاس جب بعض غیر سکھ حضرات ان کی مسل میں شمولیت کے لئے جاتے تو وہ ان کو شامل کرنے سے انکار کر دیتے اور کہتے کہ صرف سکھ ہی اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ سکھوں کی مذہبی تحریک تھی جو حکومت کے قیام کے لئے سکھوں میں قوت پذیر تھی۔ چنانچہ خالصہ دل کے بل بوتے پر سکھوں نے اپنی بارہ حکومتیں (مسلیں) قائم کرلیں۔ جن کا ذکر آچکا ہے۔

**رنجیت سنگھ اور مسلمان:** پورے سکھ عہد میں مسلمانوں پر جو قیامتیں توڑی گئیں اور جو لرزہ خیز مظالم روا رکھے گئے ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ نہ صرف سکھوں نے بلکہ جاٹوں اور مرہٹوں نے بھی حتی الوسیع خیر نہ گزاری۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں بھی مسلمانوں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہ ہوا۔ اس کے باپ نے بھی علی پور، رسول پور اور دوسرے مسلمان علاقوں میں نہ صرف مار دھاڑ کا سلسلہ قائم رکھا بلکہ مسلم دشمنی میں بعض قصبوں کے نام تک تبدیل کر دیئے تھے۔ مثلاً اکال گڑھ، رام نگر وغیرہ کے پہلے نام اسلامی نام تھے۔ البتہ رنجیت سنگھ نے موقع شناسی سے کام لیا۔ اس نے دیکھا کہ بعض مسلمان معززین بڑے قابل ہیں اور ان کی جگہ لینے والا سکھوں میں کوئی نہ تھا اس لئے رنجیت سنگھ نے اپنے عہد میں بعض مسلمانوں کو بھی عہدے دیئے۔ نیز اس میں ان مسلمانوں کی فراست اور حکمت عملی کا بھی ہاتھ ہے کہ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھا اور سکھ حکومت میں عہدے حاصل کرکے وہ سکھوں کی مسلمان دشمن پالیسی کے خلاف کسی حد تک ڈھال بن گئے۔ تاکہ مسلمانوں کو من حیث القوم زیادہ نقصان نہ پہنچایا جاسکے۔ رنجیت سنگھ نے ملازمت کا معیار قابلیت اور اہلیت کو مقرر کیا۔ کیونکہ سکھ قوم انتظامی معاملات میں تجربہ اور اہلیت سے بے بہرہ تھی۔ کیونکہ "پاہل شدہ" سکھوں کی بھرمار تھی۔ وہ گھوڑا اور تیغ خرید کر ہی "فوجی" بن گئے تھے۔ چنانچہ سردار فتح سنگھ نے نرائن گڑھ کے محاصرہ کے دوران رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سکھ قوم کو انتظامی ذمہ داریاں نہ سونپے۔ لہٰذا رنجیت سنگھ نے ہندوؤں، یورپین لوگوں اور مسلمانوں کو بھی اپنی ملازمت میں رکھنے کی پالیسی جاری کی اور اس پر عمل بھی کیا بہرحال سکھوں کے مسلمانوں پر مظالم ہی سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد کا باعث بنے تھے۔

رنجیت عہد میں مذہبی معاملات میں سکھ من مانیاں کرتے تھے۔ مسلمانوں کی جاگیریں چھین لی گئیں۔ خاص طور پر کشمیر ملتان اور شمالی مغربی سرحدی علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک ہوئے۔ ٹیکسوں کا بوجھ زیادہ تر مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑتا۔ اذان اور ذبیحہ گاؤ پر پابندی تھی۔ جس کی خلاف ورزی کی سزا موت تھی۔ گائے ذبح کرنے کی پاداش میں سرحدی علاقے

میں سکھ سپاہیوں نے مسلمانوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ کشمیر میں ذبیحہ گاؤ کی پاداش میں مسلمانوں کو پھانسی دی گئی اور ان کی لاشوں کو سرعام لٹکا دیا گیا۔

مسجدوں کی بے حرمتی بھی روز کا معمول تھا۔ مسجدوں اور مقبروں سے قیمتی پتھر اور سنگ مرمر اتار لیا گیا۔ مسجدوں کو بارود خانے بنا دیا گیا۔ بعض کو بطور اصطبل استعمال کیا گیا۔ بعض کو شہید کر دیا گیا۔ شاہی مسجد لاہور کو کبھی بطور چھاؤنی اور کبھی توپ خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مسجد وزیر خاں میں موسیقی ناچ گانے اور شراب نوشی کی محفلیں جمتی تھیں۔ اس کی سرائے میں توپ خانہ قائم کیا گیا۔ جبکہ مسجد خواجہ محمد سعید لاہوری کو شہید کر کے لاہور کے گرد بعض دروازے تعمیر کئے گئے۔ مسجد کانسی کار کو شہید کر کے اس کی جگہ باؤلی تعمیر کی گئی جس کے پانی سے غسل کر کے رنجیت سنگھ نے شفا پائی۔ کیونکہ بقول ان کے رنجیت سنگھ کو خواب میں ایسا اشارہ ہوا تھا یہ مسجد 1809ء میں شہید کی گئی۔ اس طرح دیگر مشہور مساجد کو بھی بطور بارود خانہ استعمال کیا گیا۔ اینٹوں کا کاروبار کرنے والوں نے بھی مساجد اور بعض تاریخی عمارات کو شہید کر کے اپنا کاروبار چمکایا۔ قصائیوں والی مسجد شہید کر کے راجہ گلاب سنگھ نے اپنا گھر تعمیر کروایا۔ پہلے وہ مسجد بیگم پورہ میں رہائش پذیر رہا۔ اکالیوں نے سنہری مسجد پر قبضہ کر کے اس کی دیواروں کو گائے کے گوبر سے لیپ دیا۔

**ثقافتی مظالم:** مسلمانوں کے مقبروں اور بزرگوں کے مزاروں کے ساتھ بھی سکھ عہد میں اچھا سلوک نہ ہوا ان کا سنگ مرمر اور دوسرا قیمتی سامان اکھاڑا گیا۔ مقبرہ جہانگیر کی چھت سے سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے اور ستون اکھاڑ کر دربار صاحب امرتسر میں نصب کر دیئے گئے۔ اس طرح پتھروں کو دوسری سکھ عہد کی تعمیرات میں بھی استعمال کیا گیا۔ مقبرہ جہانگیر اور آصف جاہ کے رنجیتی عہد میں مختلف افسران مثلاً ارجن سنگھ، فرانسیسی تربیت دہندہ ایمزن وغیرہ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ آصف جاہ کی مقبرہ کے قیمتی پتھر بھی بے دردی سے اتار لئے گئے۔ ایسا ہی سلوک نور جہاں، شہزادہ پرویز اور زیب النساء کے مقبروں کے ساتھ کیا گیا۔ انار کلی مقبرہ کھڑک سنگھ اور فرانسیسی جرنیل د۔ لتورا کی رہائش گاہ بنا رہا۔ قطب الدین ایبک کے مقبرہ کے قیمتی پتھر اتار کر امرتسر لے جائے گئے۔ شیخ عبدالرزاق (نیلا گنبد) شاہ عنایت قادری اور حضرت محمد صالح کے مقبروں میں بارود بھر دیا گیا۔ مسلمان مزارات سے سنگ مرمر اتار لیا گیا۔ چنانچہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ زمین بوس ہو گئے۔ مسلم آبادیوں اور محلوں کو بھی تہس نہس کر دیا گیا۔ لاہور کے شاندار شہر کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور جاہل مقتدروں نے یہ نہ سوچا کہ یہ ثقافتی نمونے روز روز تعمیر نہیں کئے جا سکتے۔ یہ رنجیت سنگھ کے عہد میں ہوتا تھا۔ جو سیکولر ریاست کا دعویدار تھا۔ سکھ مورخین نے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ جس کی مسلمان مورخین مثلاً سید محمد لطیف اور نور احمد چشتی نے (تحقیقات چشتی میں) تردید کی ہے۔ تاہم دوسرے سکھ سرداروں

کے مقابلے میں رنجیت سنگھ کا عہد مسلمانوں کے لئے کسی حد تک اچھا تھا۔ کیونکہ اس کی ملازمت میں کچھ مسلمان عہدیدار بھی تھی۔

**مقبرہ نورجہاں اور سکھ عہد:** مقبرہ نورجہاں کی بے حرمتی کے بارے میں سیف الحق شیخ ساکن فیصل آباد نے ہفتہ روزہ ندائے ملت لاہور (نوائے وقت کا ذیلی رسالہ) میں بنارسی داس بیدی کی گورمکھی املامیں تحریر کردہ کتاب "سکھ اتہاس" کے حوالہ سے ندائے ملت بروز جمعہ مورخہ 21-6-1996ء کے شمارہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"12 اپریل 1996ء کے ہفت روز "ندائے ملت" میں ایم حفیظ اللہ ناروال کا ایک مضمون "ملکہ نورجہاں حقائق کیا ہیں" شائع ہوا ہے۔ جس میں فاضل مضمون نگار کی جانب سے حقائق کی ترجمانی کی بھرپور کوشش بلاشبہ قابل تحسین ہے، لیکن مرور زمانہ کے باعث تابوت طلائی کے سربستہ رموز کی مکمل طور پر نقاب کشائی نہ ہو سکی ہے، جسے ہم آگے چل کر بے حد مختصر طور پر بیان کریں گے۔

اس ضمن میں راقم الحروف کو بھی 1952ء میں پہلی دفعہ ملکہ نورجہاں کے مزار پر جانے کا اتفاق ہوا تھا، سطح زمین پر مزار کی بارہ دری کے وسط میں دو پختہ قبریں موجود تھیں اور زیریں حصہ میں ایک حجرہ نما تہہ خانہ تھا جس میں داخل ہونے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور آمدورفت پر کوئی پابندی نہ تھی اور کوئی چوکیدار نہ تھا، ہم نے نیچے اتر کر دیکھا تو چاروں طرف گھٹاٹوپ اندھیرا محیط تھا، دیا سلائی جلا کر دیکھا تو معمولی قسم کی دو قبروں کے نشان موجود تھے جو نچلی سطح زمین سے تقریباً 1/4 فٹ اونچے تھے، نورجہاں کی تدفین کے متعلق گوناگوں روایات زبان زد خلائق ہیں، جنہیں طوالت پذیر ہونے کی وجہ سے قلم انداز کیا جاتا ہے ہم صرف اپنی تفصیلات کا مختصر خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جسے سال 1849ء میں بنارسی داس بیدی نے اپنی تاریخ "سکھ اتہاس" بزبان پنجابی بحروف گورمکھی تحریر کیا، اگرچہ دیگر مورخین نے اس کے متعلق کوئی خامہ فرسائی نہیں کی ہے تاہم آثار و قرائن کی روشنی میں بنارسی داس بیدی کے یہ مندرجات غیر معتبر، غلط یا خارج ازامکان نہیں ہیں۔

بنارسی داس مذکور رقمطراز ہے کہ 1672ء میں جہانگیر کی وفات کے بعد ملکہ نورجہاں شاہ جہاں کی بجائے اپنے داماد (لاڈلی بیگم کے خاوند) شہریار کو کشورہند کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر آصف خاں اور مہابت خاں جیسے جنگی سیاسی آزمودہ کار جرنیلوں نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور شاہجہاں تخت نشین ہو گیا اور ملکہ نورجہاں کو قید سے نکال کر شاہی قلعہ لاہور کے شیش محل میں زیر حراست رکھنے کا حکم دیا اور ڈھائی لاکھ روپے سالانہ تاحین حیات اس کا وظیفہ مقرر کیا گیا باقی امرائے دربار پر بھی خوب داد و دہش کی بارش کی گئی مگر اس کی

تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔

نورجہاں نے سیاست سے کنارہ کشی کر کے عزلت نشینی کی زندگی اختیار کرلی اور دن میں ایک دفعہ جہانگیر کی قبر پر حاضری دیتی، نورجہاں اپنے عہد شباب سے ہی عرق النساء کے مرض میں مبتلا تھی مگر 1611ء میں دوسری شادی کے بعد چنیوٹ کے ایک دیسی حکیم علم دین کے علاج سے صحتیاب ہوئی اور اس حکیم کو انعام و اکرام کے علاوہ نواب "وزیر خاں کے شاہی خطاب سے بھی نوازا گیا مگر سیاست سے کنارہ کشی کے بعد 67 سال کی عمر میں پھر اس پر اسی مرض کا شدید حملہ ہوا داروئے درماں کے باوجود اسے کوئی افاقہ نہ ہوا ملکہ کو زندگی سے مایوسی ہوگئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ اب اس کی موت کا وقت دور نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے دریائے راوی کے کنارے اپنی زندگی میں خود اپنا مقبرہ تعمیر کروایا اور اپنے لئے ایک من پختہ خالص سونے کا تابوت تیار کروایا، علاوہ بریں جہانگیر بادشاہ کے عہد کی "زنجیر عدل" جو قلعہ آگرہ کے شاہ برج تک دریائے جمنا کے کنارے فریادیوں کے لئے بندھوائی ہوئی تھی یہ تمام کی تمام خالص سونے سے تیار کی گئی تھی، یہ زنجیر عدل تیس گز لمبی اور ساٹھ گھنٹیوں سے مزین تھی اور اس کا وزن چار من تھا یہ پہلے ہی جہانگیر کی وفات کے بعد سے نورجہاں کی تحویل میں چلی آ رہی تھی ملکہ نورجہاں نے 8 دسمبر 1645ء بعمر 68 سال اس دار ناپائیدار سے بجانب عالم جاودانی رحلت فرمائی اور اس کی وصیت کے مطابق طلائی تابوت میں بمعہ زنجیر عدل اس کی خود اپنی تعمیر کردہ بارہ دری میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس سے آگے چل کر بنارسی داس لکھتا ہے کہ جب 1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے سب سے پہلے لوٹ مار کا منصوبہ بنایا چونکہ مہاراجہ انتہا درجہ کا حریص اور بندۂ درم انسان تھا اس نے لاہور میں مغلیہ عہد کی مساجدوں مقابر اور دیگر تاریخی عمارتوں کو خوب دل کھول کر تاخت و تاراج کیا اور تمام قیمتی جوہرات نکال کر امرتسر بھجوا دیئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے ہی نورجہاں کے طلائی تابوت اور زنجیر عدل کے متعلق کہیں سے سن رکھا تھا اور وہ موقعہ کا متلاشی تھا کہ کب موقعہ ملے تو میں نورجہاں کی قبر اکھڑوا کر اتنے بڑے سونے کا مالک بن جاؤں، آخر کار اس نے 1828ء میں نورجہاں کی قبر اکھڑوا کر یہ سونا نکالنے کا منصوبہ بنایا، اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کابینہ میں لاہور کے معروف سید خاندان کے فقیر سید عزیزالدین وزیر اعظم تھے، مہاراجہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا جب سید عزیز دین کو مہاراجہ کی اس جسارت کا پتہ چلا تو انہوں نے رنجیت سنگھ کو سمجھایا کہ قبروں کی اسقدر توہین اور بے حرمتی مناسب نہیں ہے، آپ کی یہ مذموم حرکت سکھ سلطنت کی تباہی کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ مہاراجہ نے اپنے وزیر اعظم کے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور اپنے اس مذموم اقدام سے باز آ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جب 29 جون 1839ء کو سرگباش ہو گیا تو اس کی جگہ اس کا بڑا لڑکا

کھڑک سنگھ گدی نشین ہوا یہ اپنے پتا سے بھی زیادہ لالچی قسم کا انسان تھا اس نے بھی یہ تمام گفتگو سنی ہوئی تھی اور اس قدر سونا حاصل کرنے کے لئے سخت بیتاب تھا آخر کار ایک دن اس نے نورجہاں کی قبر اکھڑوا کر سونے کے حاصل کرنے کا خفیہ منصوبہ بنایا جس کا وزیر اعظم فقیر سید عزیز الدین کو بھی پتہ چل گیا اس نے کھڑک سنگھ کو ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ راہ راست پر نہ آیا جس پر فقیر سید عزیزالدین نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ راجہ دھیان سنگھ وزیر مالیات کو وزیر اعظم اور شہر کے کوتوال شیخ امام دین کی بجائے سردار اودھم سنگھ کو کوتوال شہر مقرر کیا گیا مہاراجہ کھڑک سنگھ نے اپنی گدی نشینی کے ایک سال بعد اپنے بڑے لڑکے کنور نونہال سنگھ کوتوال شہر سردار اودھم سنگھ اور وزیر اعظم راجہ دھیان سنگھ کو ہمراہ لے کر رات کی تاریکی میں نورجہاں کی قبر کو اکھاڑ ڈالا اور مشعلوں کی روشنی میں تابوت کھول کر طلائی تابوت اور زنجیر عدل پر قبضہ کر لیا اور استخوان جسد خاکی (ملکہ نورجہاں) کو تقریباً 195ء سال بعد طلائی تابوت سے نکال کر ایک دوسرا چوبی تابوت جو کھڑک سنگھ وغیرہ ساتھ لے گئے تھے اس میں بند کر کے طلائی تابوت کی جگہ رکھ دیا اور زمین ہموار کر دی چونکہ یہ سکھ قوم اسلامی طریقہ تدفین سے ناآشنا اور بے بہرہ تھی اس لئے زمین پر اس کے معمولی نشان قائم کر کے واپس آگئے اور یہ تمام کاروائی گھڑیوں اور پلوں میں انجام دی گئی جس کی وجہ سے یہ دونوں مقبرے سکھوں کے ستم شعار زمانہ پر آج تک نوحہ کناں ہیں جن پر آج تک ہماری حکومت نے بھی کوئی توجہ نہیں دی ہے، دراصل سکھوں کی حکومت کوئی آئینی یا منظم حکومت نہ تھی بلکہ یہ ایک عارضی فوجی غلبہ تھا جس کو رنجیت سنگھ کے تدبر نے حکومت کا رنگ دے دیا تھا۔

اب ملکہ نورجہاں اور لاڈلی بیگم کے مقبروں کی بے حرمتی کے مرتکب متذکرہ بالا چاروں ملزمان یا سارقان تابوت طلائی کی عبرتناک تباہی کا مختصر حال بنارسی داس مذکور نے بایں الفاظ حوالہ قلم کیا ہے اسے بھی سنیئے امید ہے کہ قارئین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد نومبر 1840ء میں کھڑک سنگھ کو اس کے بڑے بیٹے کنور نونہال سنگھ نے زہر دے کر ہلاک کر دیا جب کنور نونہال سنگھ اپنے پتا (باپ) کھڑک سنگھ کی رسم کریا کرم یعنی ارتھی کو جلا کر شمشان سے ماتمی جلوس کی شکل میں واپس آرہا تھا تو اودھم سنگھ کوتوال شہر بھی اس کے ہمراہ تھا جب یہ دونوں حضوری باغ کے سامنے شاہی قلعہ لاہور کے روشنائی دروازہ سے گزر رہے تھے تو اس وقت اوپر والی چھت سے ایک بھاری بھرکم پتھر کی سل ان دونوں سکھوں (ملزمان) کے سروں پر گر پڑی اور اسی وقت یہ دونوں موقعہ پر ہی ہلاک ہو گئے چہرے اس قدر مسخ ہو گئے کہ ان کے لواحقین بھی ان کی شناخت سے عاری تھے چنانچہ کھڑک سنگھ کنور نونہال سنگھ کوتوال شہر اودھم سنگھ ان تینوں کو ایک ہی دن اور ایک ہی چتا میں جلا دیا گیا یعنی کھڑک سنگھ

بوقت صبح اور دوسرے دونوں کو بوقت شام سپرد آتش کیا گیا مقبرہ نورجہاں کی بے حرمتی کا چوتھا ملزم راجہ دھیان سنگھ جس کو وزیر مالیات سے وزیراعظم بنایا گیا تھا وہ ابھی بچا ہوا تھا اور اپنے تینوں ساتھیوں کا خوفناک انجام دیکھ کر ہروقت سراسمہ رہتا تھا اس پر دماغی دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے آخرکار پانچ سال بعد 1845ء میں اس کو بھی سردار چیت سنگھ ولہنا سنگھ سندھانوالیے جن سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے زبردستی لاہور کا قبضہ حاصل کیا تھا اور یہ مہاراجہ سے خاندانی رقابت رکھتے تھے۔ قلعہ میں داخل ہو کر راجہ دھیان سنگھ کو اپنی کرپان سے ہی پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اس طرح نورجہاں کے مقبرہ کی بے حرمتی کا یہ آخری ملزم بھی پانچ سال بعد اپنی عبرتناک ہلاکت کے ذریعے کیفر کردار کو پہنچ گیا' اب مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر قارئین حضرات یہ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ اصل حقائق کیا ہیں ملکہ نورجہاں کا مدفن کہاں ہے' اس کا طلائی تابوت کس نے نکالا' کس نے سرقہ کیا' کس نے بیچا تھا' طلائی تابوت کی جگہ چوبی تابوت کس نے رکھا تھا' مقبرہ کی بے حرمتی کے مرتکب ملزمان یا سارقان تابوت کا عبرتناک حشر کیا ہوا تھا۔"

(سیف الحق شیخ فیصل آباد)

**رنجیت سنگھ کے مسلمان عہدیدار:** رنجیت سنگھ کے عہد میں مسلمان افسروں کی تعداد 92 تھی۔ بعض ضلعی حکام بھی تھے۔ ایک گورنر اور کچھ وزرا تھے۔ بعض مسلمانوں کو جاگیریں بھی ملی ہوئی تھیں مثلاً عزیز الدین' نورالدین اور امام الدین اور دیگر خاندانوں کو جانثاری کے عوض شرقپور وغیرہ میں جاگیریں دی تھیں اور ماہانہ تنخواہ بھی ان کی مقرر تھی۔

1- فقیر عزیز الدین کو پہلے میر بخشی کا عہدہ دیا گیا۔ پھر اس کی وفاداری غیر مشکوک ثابت ہونے پر اسے وزارتِ خارجہ کے عہدے پر متمکن کر دیا۔ جس نے 1809ء میں انگریزوں کے ساتھ بات چیت کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور دوستی کا ایک معاہدہ کیا گیا۔ جس کی پابندی انگریزوں نے بھی کی اور رنجیت سنگھ نے بھی اسے نبھایا۔ 1835ء میں کابل کے امیر دوست محمد خاں نے پشاور کی طرف پیش قدمی کی۔ اس موقع پر اس سے بات چیت کے لئے بھی عزیز الدین کو بھیجا گیا۔ جس نے کمال ہوشیاری سے دوست محمد کو بات چیت میں الجھائے رکھا اور رنجیت سنگھ کے لشکر نے اس کی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ عزیز الدین کی دربار میں بڑی عزت تھی۔

- فقیر نورالدین جو عزیز الدین کا بھائی تھا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں اسے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی وہ سیالکوٹ' ڈسکہ اور وزیر آباد کا ناظم توپخانہ اور اسلحہ خانہ کا انچارج اور نگران تھا۔ لاہور شہر کی حفاظت' شاہی خاندان اور دربار کے معاملات اور انتظامات سب اسی کے ذمہ

تھے۔

3- ان کا بڑا بھائی فقیر امام الدین امرتسر کا ناظم تھا۔ نیز اسے خزانہ اور بارود خانہ کی نگرانی کا کام بھی سونپا گیا تھا۔

مفتی خاندان کا سربراہ مفتی محمد شاہ ممتاز عالم دین اور مفتی تھا۔ جس سے رنجیت سنگھ بعض مذہبی مسائل دریافت کرتا اور مشورے لیتا اسی طرح پولیس اور انصاف کے محکموں میں بھی بعض مسلمان اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جن میں پیر بخش، امام بخش اور خدا بخش شامل ہیں۔ قاضی خاندان کے بزرگ شیخ عبدالباقی کو لاہور کا قاضی مقرر کیا گیا تھا جسے مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کرنے کے اختیارات حاصل تھے توپخانہ پر بھی مسلمانوں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ اس فیلڈ میں میاں الٰہی بخش، میر مظہر علی اور میاں قادر بخش کے نام قابل ذکر ہیں۔ میاں قادر بخش کو اسلحہ سازی پر بھی عبور حاصل تھا۔ نیز اس نے لدھیانہ میں اسلحہ سازی کی ٹریننگ بھی لی تھی۔ اس نے مفتاح القلعہ کے نام سے اسلحہ سازی کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ دیگر مسلمان کارپردازوں میں روشن خاں امیر خاں، الٰہی بخش اور خدا یار ٹوانہ کے نام نمایاں ہیں۔

## رنجیت سنگھ کا انتظام سلطنت

**مرکزی حکومت:** وہ شخصی حکومت کا سربراہ تھا لہٰذا انتظامیہ کا محور بھی وہی تھا۔ اس کا حکم ہی قانون تھا۔ وہ مشورہ بھی کرتا تھا لیکن آخری فیصلہ اس کا ہوتا۔ اس نے اگرچہ وزیروں کی کونسل بھی مقرر کر رکھی تھی اور ہر وزیر کو فرائض بھی وہ خود ہی تفویض کرتا تھا۔ تاہم برخاستگی بھی اس کے اختیار میں تھی۔ وزرا کے محکمے کچھ اس طرح ہوتے تھے:

| | |
|---|---|
| وزیر اعظم | وزیر جنگ |
| وزیر خارجہ | وزیر داخلہ |
| وزیر مالیات | اور کمانڈر انچیف |

ان عہدوں پر مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں نے خدمات انجام دیں۔

**صوبائی اور شہری نظم و نسق:** رنجیت سنگھ کے دور میں اس کی مملکت کے چار صوبے تھے۔
1- لاہور 2- کشمیر 3- ملتان 4- پشاور۔

ہر صوبے کا گورنر ہوتا۔ جسے ناظم کہا جاتا کشمیر کا پہلا ناظم موتی چند تھا۔ پشاور کا ناظم ہری سنگھ نلوہ کو مقررہ کیا گیا۔ لاہور اور ملتان کے ناظموں نے ان کا بہتر انتظام کیا تھا۔ تاہم ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ جس کو سکھا شاہی نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ اکثر بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔

**کاردار:** ضلعی سطح کا حاکم کاردار (ڈپٹی کمشنر) کہلاتا تھا۔ وہ دیوانی اور فوجی مقدمات کی سماعت بھی کرتا اور ہر طرح کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار ہوتا۔

دیہات کا انتظام مقامی پنچائتیں چلاتی تھیں اور ہر طرح کے مقدمات کے فیصلے حتی الوسع ان کے دائرہ اختیار میں تھے۔

**لاہور شہر کا انتظام:** لاہور کا انتظام کوتوال کے سپرد تھا۔ جسے وسیع اختیارات حاصل ہوتے۔ کوتوال عموماً مسلمان ہوتا۔ امام بخش کوتوال کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ایک قاضی بھی مقرر تھا جو ان کے معاملات کے فیصلے قرآن سنت کی روشنی میں نمٹاتا۔

**مالیات کا نظام:** اس کا پہلے پہل کوئی خاص طریق کار نہ تھا۔ تاہم مسلمان ماہرین کے مشورہ سے اس میں انتظامی اور انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔

**مالیہ:** رنجیت سنگھ کے عہد میں دو کروڑ روپے سالانہ مالیہ کی مد سے وصول ہوتے ایک کروڑ دیگر ٹیکسوں کی شکل میں ملتے۔ اس طرح آمدن تین کروڑ سالانہ تھی۔ زرعی اراضی تین زمروں میں تقسیم کی گئی تھی۔

1- زرخیز 2- درمیانے درجہ کی 3- بنجر قدیم یا بارانی جسے مارو بھی کہتے تھے مالیہ سال میں دو بار وصول کیا جاتا تھا۔ جس کا سربراہ ہر ضلع کا ناظم یعنی کاردار ہوتا وہی اس کی وصولی اور اسے سرکاری خزانہ میں جمع کرانے کا ذمہ دار تھا۔ خشک سالی میں مالیہ کی شرح میں کمی کردی جاتی۔ رنجیتی عہد میں روپیہ کو نانک شاہی اور پیسہ کو نانک شاہی پیسہ کہتے تھے۔

**ٹیکس:** حکومت حسب ضرورت ٹیکس لگانے کی مجاز تھی۔ رنجیت سنگھ کے دور میں ہر چیز پر ٹیکس تھا۔ سڑکوں پر راہداری ٹیکس۔ شہروں میں شہری ٹیکس ہر بکاؤ مال پر سیلز ٹیکس وغیرہ نافذ تھا۔ اس کے علاوہ بڑے رئیسوں اور امراء سے نذرانوں کی شکل میں ٹیکس لیا جاتا۔ برآمدی اور درآمدی ٹیکس بھی لیا جاتا۔ نمک پر بھی ٹیکس لگایا گیا تھا۔ اس طرح ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ یہ شاید اس لئے تھا تاکہ لوگ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے رہیں اور حقوق کے لئے اٹھ نہ سکیں۔

**عدالتی نظام:** رنجیت سنگھ کا عدالتی نظام اگرچہ خامیوں سے خالی نہ تھا لیکن پھر بھی عام سکھا شاہی کے مقابلے میں بہتر ہو گیا تھا۔ اس کے عہد میں کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔ صرف زبانی اور اخلاقی اور ذاتی پسند نہ پسند کی بنا پر فیصلے کئے جاتے۔ ہر سطح پر عدالتیں قائم تھیں۔ لاہور کی عدالت بڑی عدالت تھی پھر گورنروں کی عدالتیں تھیں۔ ان کے بعد کارداروں کی ضلعی عدالتیں تھیں اور گاؤں کی سطح پر پنچائتیں عدالتی کام انجام دیتی تھیں۔ جاگیرداروں کی اپنی الگ عدالتیں تھیں۔

سزا کے عوض فدیہ یا جرمانہ دے کر خلاصی حاصل کی جا سکتی تھی۔ رہائی ملنے پر شکرانہ کا

ٹیکس وصول کیا جاتا۔ عدالت میں اگر مقدمہ طول کھینچتا تو عدالتی اخراجات پورے کرنے کے لئے فریقین پر جرمانہ کیا جاتا۔ جسے "تہ خانہ" کہا جاتا۔ مسروقہ مال مل جاتا تو شکرانے کے طور پر اس کا ایک خاص حصہ سرکاری خزانے میں شامل کر دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں عدالتی نظام بھی عوام سے روپیہ بٹورنے کا ذریعہ تھا۔

**امن وامان کی حالت:** سکھ دور میں رنجیت سنگھ کا زمانہ امن کی لحاظ سے قدرے بہتر تھا۔ اگرچہ یورپی مصنفین اسے "بہت اچھا" قرار دیتے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے۔ ان کے ساتھ نہ تو انصاف کو صحیح معنوں میں ملحوظ رکھا جاتا۔ نہ ان کے حقوق کو سمجھا جاتا۔ تاہم عام لوٹ مار اب کم ہو گئی تھی۔ تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ زرعی پیداوار میں بھی امن وامان کی وجہ سے اضافہ ہوتا۔ بشرطیکہ سازگار موسم بھی ساتھ دیتا۔

رنجیت سنگھ کی ریاست ایک لادینی ریاست کہی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک سکھ ریاست تھی جس میں سکھوں اور سکھ ازم کو بالادستی حاصل تھی۔ البتہ انتظامی مجبوریوں کے تحت رنجیت سنگھ کے بعض اہلکار غیر سکھ تھے۔ گویا اتنی بڑی ریاست میں 92 مسلمان افسر تھے۔ اگرچہ مسجد اور مزارات کے قیمتی پتھر سکھی دور میں اہل اقتدار کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے بعض مسلمان علماء کے وظائف مقرر کر رکھے تھے اور بعض مساجد کو اپنے خرچ پر تعمیر کروایا تھا، اور بعض کی مرمت بھی کروائی تھی۔

**فوجی نظام:** اس میں پیادہ فوج اور گھڑ سوار فوج کی زیادہ اہمیت تھی کیونکہ کسی علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے یہی دو فوجی زمرے اہم گنے جاتے تھے۔ گھڑ سواروں کی تنخواہ زیادہ ہوتی جبکہ پیادہ فوج کو کم تنخواہیں دی جاتیں۔ رنجیت سنگھ نے سادہ اور بھنگا انداز کی فوج کی جگہ فرانسیسی جرنیلوں کی زیر نگرانی باقاعدہ تربیت یافتہ فوج کو رواج دیا۔ اس کے تربیت دہندگان جرنیل نپولین کے تحت کام کر چکے تھے اور واٹرلو کی جنگ کے بعد نقل مکانی کرکے ہندوستان میں راجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں آگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز بھی رنجیت سنگھ کی فوج کے ساتھ ٹکر لینے سے گھبراتے تھے۔ اسی تربیت یافتہ فوج کے بل بوتے پر رنجیت سنگھ نے اپنے ہمعصر سکھ سرداروں کی مسلوں کو زیر کرکے اپنی راجدھانی میں شامل کیا۔ کشمیر اور ملتان اور پشاور کو فتح کیا پیادہ فوج کو زیادہ منظم کیا اور اسے اہمیت دی ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا اور بعض دیگر مراعات سے بھی نوازا فوج میں پریڈ اور نظم و نسق کو رواج دیا۔ دشمن پر حملہ آور ہونے اور دفاع کرنے کے طریقے سکھائے گئے۔ پسپائی اختیار کرنے اور پھر یکدم حملہ آور ہونے کا گر سکھایا گیا۔ نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے فوج کو رجمنٹوں اور کمپنیوں میں تقسیم کیا۔ برطانوی اور فرانسیسی فوجی تنظیم کو سامنے رکھتے ہوئے رنجیت سنگھ نے بھی فوج میں تنظیمی اصلاحات کیں۔ توپ خانے کو فوج کا اہم

ستون قرار دیا گیا۔ اسے قلعوں پر قبضہ کرنے کا اہم ذریعہ گردانا گیا۔ جبکہ پہلے توپخانہ فوج کا باقاعدہ حصہ شمار نہ ہوتا تھا۔ اسلحہ سازی اور بندوق سازی کے کارخانے لاہور اور امرتسر میں قائم تھے۔ اسی توپخانے نے آخر انگریزوں کو بہت خائف کر دیا اور جنگوں میں ان کا بھاری نقصان ہوا۔

خاص فوج پچھتر ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جسے جرنیل دنتورا نے تربیت دی تھی۔ خاص خاص اور مشکل مہمات میں یہ فوج بھیجی جاتی جو اکثر کامیاب لوٹتی عام فوج تین حصوں میں منقسم تھی۔ (1) پیادہ فوج (2) گھڑ سوار فوج (3) توپ خانہ۔

1- توپخانہ شتری یعنی اونٹوں پر لاد کر لیجانے والی توپیں۔
2- توپ خانہ فیلی یعنی ہاتھیوں پر لادی جانے والی توپیں۔
3- توپ خانہ اسپی یعنی گھوڑوں پر لاد کر لے جائی جانے والی توپیں۔
4- توپ خانہ گوالی۔ یعنی بیلوں کے ذریعے لے جائی جانے والی توپیں۔

توپ خانہ میں دس ہزار ملازم تھے۔ الٰہی بخش اور قادر بخش توپ خانہ کے سربراہ اور نگران تھے نیز یورپی ماہرین کورٹ اور گارڈنر اس شعبہ کے اعلیٰ افسر تھے۔

**بے قاعدہ فوج:** گورکھا، مسل دار سوار، جاگیرداری سوار اور اکالی سوار۔ یعنی بے قاعدہ فوج چار قسموں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ تنخواہ دار تھے اور جاگیر بھی پاتے ان کو مشکل مہمات میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ رضاکاروں جیسے کام ان سے لئے جاتے۔

## رنجیت سنگھ کی فتوحات اور اسلامی ریاستیں

1799ء میں جب رنجیت سنگھ نے اپنی ساس سدا کور کی فوجی مدد سے لاہور پر حملہ کیا تو اس وقت لاہور تین حاکموں کے زیر تسلط تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی حکمت عملی سے شہر پر قبضہ کیا۔ 6 جولائی 1799ء کو لاہور پر قبضہ کا عمل مکمل ہوا

پھر اس نے سوچا کہ جب تک وہ پنجاب میں قائم مسلم ریاستوں کو قبضہ میں نہ کرے گا اس کی حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس نے سکھ سرداروں سے ٹکر لینے کی بجائے مسلمان ریاستوں پر قبضہ کرنے کی پالیسی پر عملدر آمد شروع کر دیا۔ لاہور پر قبضہ کے بعد وہ قصور کی طرف متوجہ ہوا۔

**قصور کی فتح:** قصور میں ان دنوں نظام الدین خاں حاجب تھا۔ وہ لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن رنجیت سنگھ نے سبقت حاصل کر لی۔ نظام الدین خاں نے صاحب سنگھ بھنگی سے اتحاد کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے قصور پر حملہ کر دیا اور محصور کر کے اسے صلح پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے بھائی راجہ خاں اور واصل کو یرغمال کے طور پر لاہور بھیج دیا اور بھاری تاوان

جنگ بھی ادا کیا۔ اس طرح قصور کا الحاق لاہور کے ساتھ ہو گیا۔

یہ فروری 1807ء کا واقعہ ہے۔ قصور میں رنجیت سنگھ نے نہال سنگھ اٹاری والے کو اپنا نائب بنایا قصور کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

**چنیوٹ پر حملہ:** جھنگ اور چنیوٹ پر سردار احمد خاں سیال حکمران تھا۔ پنڈی بھٹیاں میں سکھ سردار جسا سنگھ بھنگی کی حکومت تھی اس نے چنیوٹ پر حملہ کرکے اسے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ جس کی شکایت لوگوں نے رنجیت سنگھ سے کی۔ اس نے حملہ کرکے چنیوٹ کو اپنی راجدھانی میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ نے احمد خاں سیال کو اطاعت اور سالانہ خراج گزاری کا پیغام دیا۔ نیز اس نے ملتان کے حاکم مظفر خاں سے دفاعی معاہدہ کر رکھا تھا اسے ختم کرنے کے لئے بھی زور ڈالا۔ احمد خاں نے انکار کیا اور جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے توپخانہ کا استعمال بھی ہوا۔ آخر جھنگ فتح کرکے رنجیت سنگھ نے اسے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ احمد خاں ملتان میں مظفر خاں کے پاس بھاگ گیا۔ بعد ازاں احمد خاں نے ساٹھ ہزار سالانہ خراج کے بدلے یہ علاقہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس فتح مندی میں سکھوں کو بھاری مال غنیمت ہاتھ لگا۔

**ملتان کی فتح:** رنجیت سنگھ نے ملتان پر کئی حملے کئے۔ پہلا حملہ 1803ء میں کیا اور وفاداری کی تحریر حاصل کرکے واپس آگیا۔ قصور کی فتح کے بعد 1807ء میں ہی اس نے دوسرا حملہ ملتان پر کیا لیکن بہاول پور کے حکمران نے دونوں میں صلح کرا دی۔ اس کے باوجود سکھ فوج نے ملتان کے نواح میں اندھیر مچا دیا۔ 20 فروری 1810ء کو اس نے ملتان پر تیسرا حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی رنجیت سنگھ غالب رہا اور تاوان جنگ اور ایک لاکھ اسی ہزار سالانہ خراج کی ادائیگی کے وعدے پر واپس لاہور آگیا۔

چوتھا حملہ 1816ء میں کیا گیا اور اسی (80,000) ہزار خراج جو بقایا تھا وصول کرکے واپس آگیا۔ 1817ء میں رنجیت سنگھ نے آخری بار حملہ کیا اور ملتان کو فتح کرکے بہت سا مال و دولت لے کر لوٹا۔ مظفر خاں اور اس کی ساتھی شہید کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح ملتان بھی رنجیت سنگھ کے زیر تسلط آگیا۔

**سیالکوٹ کی فتح:** سیالکوٹ پر جیون سنگھ حکمران تھا۔ رنجیت سنگھ نے ملتان کے بعد سیال کوٹ کو بھی فتح کرکے اپنی راجدھانی میں شامل کر لیا اور سردار جیون سنگھ کو گزارہ کے لئے چھوٹی سی جاگیر دے دی۔

**خوشاب کی فتح:** خوشاب اور ساہی وال (علاقہ خوشاب سرگودھا) میں مسلمان حکمران جعفر خاں بلوچ اور فتح خاں تھے فروری 1810ء میں حملہ کرکے اسے زیر کیا اور معقول جاگیر دے کر خوشاب کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ پھر وہ ساہیوال کی طرف بڑھا اور بھرپور

معرکے کے بعد فتح پائی اور فتح خاں کو گرفتار کرلیا اور پھر جنوری 1811ء میں اُسے رہا کر کے مناسب جاگیر دے دی اور ساہیوال کا الحاق بھی کرلیا گیا۔

**وزیر آباد کا الحاق:** وزیر آباد پر سردار جودھ سنگھ حکمران تھا۔ وہ نومبر 1809ء میں وفات پاگیا تو رنجیت سنگھ تعزیت کے لئے گیا اور اس کے بیٹے کو جانشین مقرر کر آیا۔ لیکن رشتہ داروں نے اس نئی جانشینی کو تسلیم نہ کیا۔ چنانچہ جون 1810ء میں خلیفہ نورالدین کی سرکردگی میں حملہ کروا کر وزیر آباد کا الحاق بھی کرلیا۔ اور اس کے بیٹے گنڈا سنگھ کو گزارا کے لئے جاگیر عطا کر دی۔

**عہد نامہ 1806ء:** 11 جنوری 1806ء کو انگریزوں، مرہٹوں اور سکھوں کے درمیان معاہدہ ہوا۔ کیونکہ مرہٹے انگریزوں سے ہار مان چکے تھے اور سکھ ان کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس معاہدہ میں درج ذیل امور طے پائے:

1- سکھ مرہٹوں کی فوجی امداد نہیں کریں گے۔ بلکہ انگریزوں سے دوستی نبھائیں گے۔
2- مرہٹے اپنے ان علاقوں سے بے دخل تصور ہوں گے جہاں سے وہ فرار ہو کر پنجاب پہنچ گئے ہیں۔
3- انگریز مزید فوج کشی نہیں کریں گے اور مرہٹوں کو ان کی سابقہ فوجی کاروائیوں کی سزا نہیں دیں گے۔

رنجیت سنگھ نے فتوحات کے نشے میں بعض سکھ ریاستوں نابھہ پٹیالہ وغیرہ کو بھی ہڑپ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے سرداروں نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ رنجیت سنگھ کو احساس ہوا کہ اس کے رویہ نے اس کے ساتھیوں کو انگریزوں سے مدد مانگنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ان ریاستوں کے سرداروں سے رابطہ قائم کر کے ان کو اعتماد میں لیا اور اپنی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

**انگریز اور رنجیت سنگھ:** 1808ء میں فرانسیسی بادشاہ نپولین بونا پارٹ کا اقتدار ترقی پر تھا روس نے اس کے ساتھ معاہدہ امن کر لیا جو انگریزوں کے لئے باعث تشویش تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر میٹکاف کو سفیر بنا کر رنجیت سنگھ کے دربار میں بھیجا۔ جس نے اپنے مؤقف کی وضاحت کی اور سکھوں کی طرف سے مطمئن ہو کر 11 ستمبر 1808ء کو قصور پہنچا اور یہاں بھی اپنی تجاویز دیں جن میں انگریزوں کے مفادات کا خیال رکھا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ان تجاویز کو قبول نہ کیا کیونکہ وہ سکھ ریاستوں کو رنجیت سنگھ کے علاقے ہی سمجھتا تھا۔ نیز اس نے مالیر کوٹلہ اور فرید کوٹ پر فوج کشی کر دی۔ مسٹر میٹکاف نے مہاراجہ کو ستلج پار نہ کرنے کے لئے کہا۔ جسے رنجیت سنگھ نے اپنی ہتک سمجھا۔ لہٰذا وہ انبالہ کی طرف بڑھتا گیا۔ آخر انگریز حکومت نے اسے

الٹی میٹم دیا کہ ستلج پار کی ریاستیں انگریزوں کے تحفظ میں ہیں۔ لہٰذا وہ ان علاقوں سے واپس چلا جائے، اور ساتھ ہی انگریزی فوج کو ستلج تک لے آئے۔ جس کی امداد سرہند کے راجہ جسونت سنگھ نے بھی کی۔ انگریز فوج امرتسر میں پہنچ گئی۔

**معاہدہ امرتسر:** 25 اپریل 1809ء کو رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان یہ عہد نامہ طے پایا:

1- سکھ ستلج پار کے علاقوں میں دخل اندازی نہیں کریں گے، اور آپس میں مل جل کر عزت سے رہیں گے۔

2- سکھ راجہ یا اس کا کوئی وارث ستلج پار کے علاقے پر فوج کشی نہیں کرے گا۔

3- ان شقوں کی خلاف ورزی پر معاہدہ امن کو منسوخ تصور کیا جائے گا۔

دونوں فریقوں نے اس معاہدے کی پابندی کی۔ اس معاہدہ کے بعد دونوں طرف سے سفیر مقرر کیئے گئے۔

**والئی افغانستان اور سکھ حکومت:** فروری 1810ء میں افغانستان کے بادشاہ شاہ شجاع نے فرانس سے معاہدہ کیا۔ جسے افغانوں نے قبول نہ کیا اور شاہ شجاع کو ملک سے نکال دیا۔ وہ پنجاب میں آیا اور 30 فروری 1810ء کو خوشاب میں رنجیت سنگھ سے ملا۔ اس کا جلاوطن بھائی شاہ زمان پہلے سے راولپنڈی میں تھا۔ دونوں بھائیوں نے اپنا تخت واپس لینے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے انگریزوں سے مدد مانگی لیکن یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ دوسری طرف افغانستان کے بادشاہ محمود شاہ نے رنجیت سنگھ سے دوستانہ ماحول میں بات چیت کی اور 1812ء میں کشمیر پر چڑھائی کردی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے جوان سال بیٹے کھڑک سنگھ کی سرکردگی میں سکھ دستے ساتھ بھیجے، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر رنجیت سنگھ نے اٹک کے افغان حاکم پر چڑھائی کردی۔ 13 جولائی 1813ء کو حضرو کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جس میں سکھوں کو فتح ہوئی لیکن افغان حکومت کی مداخلت پر قلعہ اٹک کو سکھوں نے واگزار کردیا اور لاہور آگئے۔ کشمیر بھی کئی سال تک نہ افغان حکومت اور نہ سکھ حکومت سے فتح ہو سکا۔ 1818ء میں افغانستان میں خانہ جنگی جاری تھی کہ 20 نومبر 1818ء کو رنجیت سنگھ پشاور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر 1819ء میں کشمیر کو بھی سکھوں کی راجدھانی میں شامل کر لیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے بحیلہ کوہ نور ہیرا حاصل کر لیا۔ جو پنجاب پر قبضہ کے بعد انگریزوں کے ہاتھ لگا۔

**شاہ شجاع کی کامیابی:** شاہ شجاع شکارپور میں بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک اس کی ملاقات ایک انگریز جرنیل سے ہو گئی۔ اس نے انگریز جرنیل کو سارا ماجرا سنایا اور امداد کی درخواست کی۔ انگریزوں کو بھی ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کے ذریعے وہ افغانستان میں رسوخ حاصل کر سکیں۔ انگریز جرنیل اپنی حکومت کی حمایت حاصل کرنے میں

کامیاب ہو گیا اور ساڑھے سات ہزار کا لشکر اسے دیا جو بنگال، بہار، اڑیسہ اور صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر کرنل ویڈ (Wade) کی قیادت میں 1839ء میں لاہور پہنچا۔ یہاں سے سکھ حکومت نے بھی ایک لشکر نونہال سنگھ کی قیادت میں اس کے ساتھ بھیج دیا کیونکہ سکھ بھی بے خانماں شاہ شجاع کو اپنے لئے ایک مسلسل خطرہ سمجھتے تھے۔ خود شاہ شجاع شکار پور سے براستہ کوئٹہ افغانستان کی طرف بڑھا۔ 25 اپریل 1839ء کو سکھ اور انگریز فوجیں قندھار پر حملہ آور ہو گئیں اور آخر 8 مئی 1839ء کو شاہ شجاع کو قندھار میں تخت نشین کر کے بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔

**رنجیت سنگھ کی موت:** 1834ء میں رنجیت سنگھ فالج کا شکار ہوا، لیکن علاج سے صحت یاب ہو گیا۔ جون 1839ء میں دوبارہ اس پر فالج کا حملہ ہوا لیکن کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ البتہ عارضی آفاقہ ہوا تو رنجیت سنگھ نے سارے عزیزوں رشتہ داروں کو بلا کر سب کے سامنے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کو جانشین مقرر کیا اور راجہ دھیان سنگھ کو وزیراعظم بنایا اور اس فیصلہ سے سارے گورنروں کو بھی اپنی زندگی میں ہی آگاہ کر دیا۔ 27 جون 1839ء کو رنجیت سنگھ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

اس کی چتا پر نہ صرف اس کی رانیاں ستی ہوئیں بلکہ اس کی بہت سی داشتاؤں کو بھی اس کے ساتھ بھسم کر دیا گیا۔

**رنجیت سنگھ کے جانشین:** اس کے بعد اس کے پانچ جانشین یکے بعد دیگرے اپنی باری پوری کر کے رخصت ہوئے۔ کھڑک سنگھ افیونی اور کمزور دل اور کمزور دماغ کا آدمی تھا۔ سازشوں کا شکار ہو کر دھیان سنگھ کو برطرف کر دیا اور چیت سنگھ کو وزیراعظم مقرر کیا۔ لوگ اس کے خلاف ہو گئے حتیٰ کہ اس کی بیوی چاند کور بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ آخر چند سکھ سرداروں کی مدد سے 18 اکتوبر 1839ء کو کھڑک سنگھ تخت سے معزول ہوا اور چیت سنگھ کو قتل کر دیا گیا اور کھڑک سنگھ کے اٹھارہ سالہ بیٹے نونہال سنگھ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ کھڑک سنگھ 5 نومبر 1840ء کو بیمار ہو کر مر گیا۔ چتا سے واپسی پر نونہال سنگھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جا رہا تھا کہ ایک عمارت کا چھجا اور دیوار ان پر آگری اور یہ لوگ ملبے تلے آکر مر گئے۔ اور چاند کور کو سربراہ حکومت تسلیم کرلیا گیا۔ جبکہ سکھ سردار شیر سنگھ ولد رنجیت سنگھ کی جانشینی کے حق میں تھے۔

آخر سکھ سرداروں کی خانہ جنگی کے بعد 17 جنوری 1841ء کو تخت سے الگ کر دیا گیا شیر سنگھ جنوری 1841ء سے ستمبر 1843ء تک برسراقتدار رہا۔ دھیان سنگھ اس کا وزیراعظم تھا۔ شیر سنگھ کو ایک سکھ سردار اجیت سنگھ نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جس کے بعد سکھ سرداروں کے درمیان خانہ جنگی سی شروع ہو گئی۔ جس میں اجیت سنگھ بھی مارا گیا، اور مزید تباہی سے بچنے کے لئے

متفقہ طور پر رنجیت سنگھ کے بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت کا والی بنا دیا گیا۔

**دلیپ سنگھ (ستمبر 1843ء تا 1849ء):** دلیپ سنگھ نے دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کو وزیر اعظم بنا دیا۔ اس کے دور میں سکھ سردار ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگے رہے اور کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ نے امن کے بہانے لاہور پر چڑھا کر دی پشورا سنگھ اور ہیرا سنگھ ولد رنجیت سنگھ نامی شہزادوں نے بھی سر اٹھایا، اور سیاسی بدامنی پھیل گئی۔ انگریزوں نے اسے اپنے لئے خطرہ تصور کیا اور گلاب سنگھ کو ساتھ ملایا۔ دلیپ سنگھ کی گارڈین اس کی والدہ ہی کاروبار سلطنت چلا رہی تھی، لیکن سکھ سرداروں کو ایک عورت کی سربراہی قطعاً پسند نہ آئی، وہ پھر الجھ پڑے اور ہیرا سنگھ مارا گیا اور رانی جنداں کا بھائی جواہر سنگھ وزیر اعظم بنا۔ جو خالصہ فوج کا سربراہ بھی بن گیا۔ آخر فتح خاں ٹوانہ اور سردار چتر سنگھ اٹاری والا نے کام دکھایا، اور دلیپ سنگھ نے فتح خاں ٹوانہ کو علانیہ طور پر پنجاب حکومت کا ایجنٹ مقرر کر دیا۔ اور پھر رانی جنداں کو وزیر اعظم بننے کا موقع بھی مل گیا۔

**پنجاب کا انگریزی علاقے سے الحاق (الحاق پنجاب):** دسمبر 1845ء میں انگریزی فوج ستلج عبور کرکے سکھ علاقے میں آگھسی کیونکہ اس کے خیال میں معاہدہ امرتسر کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ ادھر سکھ فوج بھی آپے سے باہر ہو رہی تھی جسے کنٹرول میں رکھنا ایک بی بی کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ رانی جنداں اور لال سنگھ نے سکھ فوج کو متحد کرکے انگریزوں کے خلاف تیار کر دیا تھا۔ سالار لال سنگھ نے جنگ میں حصہ لیا جو "مدکی" کے مقام پر لڑی گئی جس میں سکھ پسپا ہو گئے۔ 12 جولائی 1846ء کو فیروز پور کے مقام پر ایک اور جنگ ہوئی جس میں سکھوں کا پلہ بھاری رہا، لیکن ایک اور انگریز میجر جنرل سرہیری سمتھ فیروز پور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور علی وال تک انگریز فوجیں پہنچ گئیں۔ لال سنگھ نے تازہ دم سکھ فوج بھیجی لیکن وہ بھی انگریزوں کا راستہ نہ روک سکی اور سبراؤں کے مقام پر انگریزوں نے سکھ فوج کو بھگا دیا۔ آخر سکھوں نے لال سنگھ کو معزول کرکے کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ کو امرتسر طلب کرکے اسے وزیر اعظم بنا دیا اور شام سنگھ اٹاری سکھ فوج کا سربراہ بنا سکھوں کے حملے انگریزوں پر جاری رہے لیکن وہ روز بروز ناکامی کی طرف بڑھنے لگے۔ آخر سکھوں نے صلح کر لی اور 20 فروری 1846ء کو ایک عہد نامہ کی رو سے مندرجہ ذیل شرائط طے پائیں۔ اس کو معاہدہ لاہور کہا جاتا ہے۔

**عہد نامہ لاہور کی شرائط:**

1- دوآبہ بست جالندھر کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا گیا۔

2- سکھ فوج میں کمی کا وعدہ کیا گیا جو محض بیس ہزار پیادہ اور بارہ ہزار سواروں پر مشتمل ہوگی۔
3- خالصہ دربار میں ایک انگریز ریذیڈنٹ بٹھانے کی منظوری ہو گئی اور پہلا ریذیڈنٹ سرہنری لارنس تھا۔
4- امن قائم رکھنے کے لئے آٹھ ہزار انگریزی فوج کا لاہور میں قیام طے پایا۔
5- سکھوں کی طرف سے ڈیڑھ کروڑ روپے انگریزوں کو بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا معاملہ طے ہوا۔

انگریزی فوج کا خرچہ بھی سکھ حکومت کو دینا پڑا جو لاہور میں قیام امن کے لئے بٹھائی گئی۔

**کشمیر بیچ دیا:** حکومت پنجاب کے پاس روپیہ صرف پچاس لاکھ تھا جبکہ تاوان ڈیڑھ کروڑ دینا تھا لہٰذا راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ کشمیر کو 75 لاکھ میں فروخت کر دیا گیا اس وقت کشمیر کی آبادی بھی پچھتر لاکھ تھی دوسروں لفظوں میں ایک روپیہ فی کس کے حساب سے کشمیریوں کو ڈوگرہ حکمران راجہ گلاب سنگھ کے پاس بیچ دیا گیا اور 25 لاکھ روپیہ انگریز حکومت پنجاب کا پہلے سے دبائے بیٹھے تھے اس طرح اسے بھی محسوب کر کے کل تاوان کی رقم کی ادائیگی کی گئی۔

معاہدہ لاہور نے انگریزوں کی بالادستی قائم کر دی اور سکھ اسے اپنی ہتک محسوس کرنے لگے اب اگر وہ کوئی سازش کرتے تو انگریز ریذیڈنٹ کو بھی اس کی خبر ہو جاتی تھی لال سنگھ اور رانی جینداں دلیپ سنگھ کے گارڈین اور کارمختار بن کر انتظام سنبھالے ہوئے تھے انگریز ریذیڈنٹ نے دربار میں چند اصلاحات کیں جن کی وجہ سے کئی سکھ سردار انگریزوں کی دانشمندی کے گرویدہ ہو گئے لال سنگھ نے انگریزوں کے خلاف خفیہ تحریک شروع کر دی جس کا مقصد کشمیر کی بازیابی بھی تھا اور سکھ حکومت کو پہلے جیسے اقتدار سے مالامال کرنا بھی تھا سرہنری لارنس نے اس کا نوٹس لیا اور لال سنگھ وغیرہ کو سمجھایا مگر بات نہ بنی۔ آخر لال سنگھ کو اپنے حامی سکھ سردار کی رائے سے ہنری نے معزول کرا دیا۔ اور حکومت پنجاب کو چلانے کے لئے ایک ریجنسی کونسل کا تقرر عمل میں آیا جس کے ذریعے پنجاب حکومت انتظاماً سرہنری لارنس کے کنٹرول میں آ گئی۔ پھر وہ رانی جنداں کو بھی برطرف کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے جلاوطن کر دیا اس طرح وہ سیاہ و سفید کا مالک بن کر ابھرا۔ یہ بات سکھوں کو بری طرح کھٹکی اور سارے سکھ سرداروں کو خیال آیا کہ انگریز چرب زبانی کے ذریعے پنجاب کو اپنا محکوم بنانے میں مصروف ہیں کیونکہ اس کی کارروائی سکھ دربار میں براہ راست مداخلت گردانی گئی۔ رانی جنداں کی برطرفی اور جلاوطنی کے حکم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انگریز نئے پروگرام کے مطابق پنجاب پر اپنی گرفت روز بروز سخت تر کرنے لگے اور سکھ اور مسلمان اہلکاروں کی جگہ انگریز افسر مقرر کئے جانے لگے۔ اور ریجنسی کونسل کی تشکیل کے بعد پنجاب بھر میں انگریز افسر چھا گئے آخر سکھوں نے انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

## سکھوں کی دوسری جنگ 1848ء تا 1849ء:

ادھر ملتان میں سکھ حکومت کے گورنر مولراج سے حساب مانگا گیا تو 1848ء میں اس نے حساب دینے کی بجائے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس کی جگہ کاہن سنگھ کو گورنر لگا دیا۔ جس کی حفاظت کے لئے دو انگریز افسر بھی ساتھ بھیجے گئے یہ معزولی بھی سکھوں کو ناگوار گزری۔ چنانچہ ملتان پہنچتے ہی دونوں انگریز افسروں کو دو سکھ سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ جس سے ایک ہیجان برپا ہو گیا اور ملتان کے علاقے میں مقیم انگریز افسروں پر حملے ہونے لگے اور انگریزوں کے خلاف نفرت کی لہر پیدا ہو گئی ملتان کے انگریز فوجی افسر ایڈورڈ نے معزول گورنر مولراج کے محل کا محاصرہ کر لیا جس کے بارے میں شبہ کیا گیا تھا کہ اسی نے دو انگریز افسروں کو قتل کرایا ہے۔ لاہور سے شیر سنگھ اٹاری والا بغاوت فرو کرنے کے بہانے کثیر فوج لے کر ملتان پہنچا اور انگریزوں کے خلاف لڑنے لگا۔ مولراج پہلے ہی انگریزوں سے جلا بیٹھا تھا اس کمک نے اس کی ڈھارس بندھا دی اور پورے پنجاب میں سکھ انگریزوں کے درپے ہوئے۔ آخر فریقین نومبر 1848ء میں ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے دونوں فوجیں چناب کے کنارے رام نگر کے مقام پر جمع ہونے لگیں اور دسمبر میں بھرپور جنگ ہوئی۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ایک اور معرکہ سعد اللہ پور کے مقام پر بھی ہوا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ تیسرا معرکہ چیلیانوالہ کے مقام پر ہوا کئی دن جنگ جاری رہی۔ مگر فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر مسٹر گف کی جگہ نیا انگریز کمانڈر مقرر کیا گیا جس کا نام چارلس نیپئر تھا جس نے آتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا پہلے انگریزوں نے مارچ 1849ء میں ملتان پر اپنی حاکمیت کا اعلان کیا پھر راولپنڈی کی سکھ پلٹن نے بھی ہتھیار ڈال دئے اور اس طرح ہر طرف سکھ فوج کو مکمل شکست ہو گئی ان دنوں ہندوستان میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھا جس کے دور میں پنجاب پر انگریزی تسلط قائم ہو گیا۔ پشاور کی طرف افغان سپاہ کو بھی انگریزی فوج نے پسپا کر دیا جو سکھوں کی حمایت کے لئے آگے بڑھی تھیں اس کے نتیجے میں:

1- مہاراجہ دلیپ سنگھ کو پچاس ہزار پونڈ سالانہ پنشن دے کر رانی جنداں کے ہمراہ انگلستان بھیج دیا جہاں اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔
2- سکھوں سے ہتھیار چھین لئے گئے۔
3- باغی سکھوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔
4- مولراج کو پہلے پھانسی، پھر عمر قید کی سزا ہوئی آخر اس نے خودکشی کر لی۔
5- پنجاب سے سکھ حکومت ختم ہو گئی۔ اس کا انتظام براہ راست انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

# رنجیت سنگھ کا کردار

رنجیت سنگھ چیچک کی وجہ سے ایک آنکھ سے نابینا ہو گیا تھا اس لئے اس کا ہمعصر بیرن ہیگل اسے "بدصورت ترین شخص" لکھتا ہے۔ جس کی ناک کا سرا پھولا ہوا تھا۔ گردن موٹی بازو اور ٹانگیں پتلی تھیں جبکہ بایاں بازو خمیدہ تھا تاہم اس کا چہرہ بھدا اور بدنما ہونے کے باوجود رعب اور دبدبہ رکھتا تھا۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے وہ عالمانہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ لیکن جفاکشی اور متجسس طبیعت کا مالک تھا اور ہروقت تدبیر اور کام کاج میں منہمک رہتا تھا اس کی یادداشت بھی غیر معمولی تھی جب کوئی غیر ملکی اس کے دربار میں آتا تو رنجیت سنگھ سوالات کی بوچھاڑ کر کے اسے بوکھلا دیتا تھا وہ ایک عقلمند سیاست دان تھا جس نے انگریزوں کو اپنے سے کم تر جان کر ان سے مصلح کن رویہ اختیار کیا۔

**ماہر جنگجو:** رنجیت سنگھ ایک ماہر حرب اور بہادر شخص تھا شکار، گھڑسواری اور قدرتی مناظر کا شوق رکھتا تھا ولیم بنٹنگ کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران اس نے حاضرین کو اپنے فوجی کرتبوں سے بہت متاثر کیا۔

وہ اپنے وقت کے ادیبوں کو بھی نوازتا رہتا۔ میاں شاہ محمد منشی سوہن لال منشی موہن لال، امرناتھ، گنیش داس وغیرہ اسکے درباری ادیب تھے منشی سوہن لال نے عمدۃ التواریخ لکھی۔ جو فارسی زبان میں ہے دیوان امرناتھ نے مہاراجہ کی فرمائش پر ظفر نامہ لکھا۔ اور ایک کتاب "فتح نامہ گورو خالصہ جی کا" نامی لکھوائی جس میں اسکی فتوحات کا ذکر ہے رنجیت سنگھ اگرچہ سکھ کہلواتا تھا اور گرنتھ صاحب پڑھوا کر سنتا۔ لیکن اس کے اندر باباجی نانک کی تعلیمات کی جھلک کم ہی ملتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ذبیحہ گاؤ کا سخت مخالف تھا اور اس کی موت کے بعد یوں لگتا ہے کہ ایک سکھ کی بجائے ایک ہندو حکمران کا وہانت ہوا تھا کیونکہ اس کی چتا میں اس کی رانیاں اور کنیزیں بھی ستی ہو گئی تھیں اور یہ بات گورو نانک صاحب کی تعلیمات کے مطابق نہیں۔

وہ شرابی اور افیونی بھی تھا۔ رقاصاؤں اور طوائفوں کا رسیا تھا گل بیگم اور موراں نامی خوبصورت عورتوں کا اس پر بہت اثر تھا۔ اس کی دوسری کمزوری اس کی بددیانتی تھی وہ وعدہ کر کے پھر جاتا اور اپنے مقصد کو ہزار فریب سے بھی حاصل کر کے چھوڑتا۔ وہ ابن الوقت قسم کا حکمران تھا اور جن مسلم سرداروں نے اس سے وفا کی اور اس کا ساتھ دیا ان کو بھی موقع پا کر اس نے ڈنگ مارنے سے گریز نہ کیا۔

باب 11

# سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور پنجاب

سید احمد بن سید محمد عرفان نومبر 1786ء کو رائے بریلی (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب چھتیس واسطوں سے علی المرتضی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد التمش کے زمانے میں کڑہ مانک پور میں آباد ہوئے۔ شاہی عہدے بھی پائے۔ سید احمد کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ تعلیم کی بجائے مردانہ کھیلوں سے زیادہ شغف تھا' تواریخ عجیبہ (یا تاریخ احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ دہلی 1891ء) کی رو سے ہم عمر لڑکوں میں لشکر بنا کر کھیلنا اور جہاد کی تکبیریں بلند کرتے رہنا ان کی کھیل کود کے مشاغل تھے۔ جوانی میں لکھنؤ گئے اور سات ماہ تک وہاں عزیزوں کو نوکریاں دلاتے رہے پھر وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں دہلی آ گئے۔ جنہوں نے آپ کو شاہ عبدالقادر (قرآن حکیم کے اردو مترجم) کے سپرد کر دیا جو اکبر آبادی مسجد میں ہوتے تھے۔ وہاں انہوں نے میزان' کافیہ اور مشکوا ۃ پڑھی (ارواح ثلاثہ اردو' سہارن پور 1370ھ) تصوف میں سلوک کی منزلیں بھی طے کیں اور سال ہا سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نمازیں ادا کرتے رہے۔ (وصایا الوزیر) 1807ء میں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کا شرف پایا جنہوں نے سید احمد کے رتبہ تصوف و سلوک کی تعریف کی ہے (آثار الصنادید) 1808ء میں واپس وطن آ گئے' اور شادی کے بندھن میں جکڑے گئے۔ آپ برصغیر میں اسلامی حکومت کے احیاء اور استقامت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ وہ 1224ھ (1808ء) میں راجپوتانے کی ریاست ٹونک کے نواب امیر خاں کے پاس گئے۔ جن کے پاس بھاری توپ خانہ اور زبردست فوج بھی موجود تھی۔ تاکہ وہ تحریک جہاد میں ان کی مدد کر سکیں' اور سات آٹھ برس تک یہاں مقیم رہے' لیکن 1817ء میں نواب کو انگریزی حکومت کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا۔ تو اس نے انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی فوج کو منتشر کر دیا اور ٹونک کی ریاست قبول کر لی۔ چنانچہ مایوس ہو کر سید احمد 1818ء میں دہلی پہنچ گئے اور وہاں مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تنظیم جہاد کے لئے کوشاں رہے۔ یہاں انہیں شاہ اسمٰعیل (شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے بیٹے) اور ان کے داماد مولانا عبدالحی کی رفاقت حاصل ہو گئی۔ ان تینوں بزرگوں نے جہاد کی اہمیت اور فضیلت پر خطبات اور وعظ کہنا شروع کئے اور دینی اصلاحی کام بھی کرتے رہے' لیکن ان کی دینی اصلاح کی تحریک کو "وہابی تحریک" کا نام دیا گیا

کیونکہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات کے زیر اثر برصغیر میں تحریک چلا رہے ہیں۔ انہوں نے بیوگان کے نکاح ثانی پر زور دیا اور سید احمد نے اسی جذبہ کے تحت اپنی بیوہ بھاوج سے شادی کر لی۔ ادھر سمندروں پر فرنگی جہازوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے حج کا سفر غیر محفوظ تصور ہونے لگا اور بعض علماء نے رسک نہ لینے میں عافیت خیال کی لیکن سید احمد اور ان کے ساتھیوں نے حج کی فرضیت نبھانے پر زور دیا اور 1821ء میں ساڑھے سات سو رفقاء کے ساتھ خود بھی حج کو گئے اور 1822ء میں حج کی سعادت حاصل کی اور 29 اپریل 1824ء کو حج سے مراجعت کر کے وطن واپس پہنچے اور آتے ہی تحریک جہاد شروع کر دی۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 2 صفحہ 137ء تا 139ء)

**سکھ یورشیں اور تحریک جہاد:** تحریک جہاد کی تنظیم کے بعد 17 جنوری 1826ء کو سید صاحب نے ہند سے ہجرت کی اور شمالی مغربی سرحد کے علاقہ کو مرکز بنا کر سکھوں کے خلاف تحریک جہاد شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ غازیوں کی تعداد پانچ چھ صد کے درمیان تھی اور اثاثہ پانچ ہزار روپے تھا چنانچہ رائے بریلی سے یہ مجاہدین کالپی، گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی، امرکوٹ حیدر آباد (سندھ) پیر کوٹ، شکارپور، ڈھاڈر، بولان، کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد ہوتے ہوئے پشاور پہنچ گئے۔ اثنائے سفر میں عام مسلمانوں کے علاوہ سندھ، بہاول پور، بلوچستان، قندھار اور کابل کے امراء رؤسا اور حاکموں کو دعوت جہاد دیتے رہے۔ اور اللہ پر توکل کے سہارے آگے بڑھتے رہے۔

سید احمد کے جہاد کا شہرہ سن کر رنجیت سنگھ نے بدھ سنگھ کی سالاری میں دس ہزار فوج دے کر اسے اکوڑہ بھیج دیا۔ 20 دسمبر 1826ء کو نو سو غازیوں نے سکھوں پر شبخون مارا اور سات سو سکھ قتل کر ڈالے۔ چنانچہ سکھ لشکر "شیدو" تک پسپائی اختیار کر گیا اس کامیابی نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ بہت سے خوانین اور علماء نے 11 جنوری 1827ء کو "ھنڈ" کے مقام پر سید احمد کے ہاتھ پر جہاد کے لئے بیعت کی۔ جن میں پشاور کے درانی سردار یار محمد اور سلطان محمد وغیرہ بھی شامل تھے اور اس طرح سکھوں کے خلاف مسلمانوں کا ایک لاکھ کا لشکر فراہم ہو گیا۔ سکھوں نے خفیہ تدابیر سے یار محمد کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس نے سید صاحب کو لڑائی سے ایک رات پہلے زہر دلوا دیا مگر وہ جانبر ہو گئے۔ لڑائی میں سکھوں میں بھگدڑ مچنے لگی تو خفیہ معاہدہ کے تحت یار محمد اور اسکے بھائی "شکست شکست" کا شور مچاتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ نکلے اور مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور سکھ کامیاب رہے۔ اب سید احمد نے پنجتار (خدو خیل) کو تحریک کا مرکز بنا لیا۔ اور بنیر اور سوات کے دورے کئے ادھر ہندوستان سے مسلمان مجاہدین بھی پہنچ گئے نیز پشاور اور مردان کے میدانی اور کہستانی علاقوں سے بھی اچھی خاصی نفری جہاد میں شریک ہو گئی۔ چنانچہ غازیوں نے ہزارہ کے محاذ پر

سکھوں کو ڈمگلہ اور شنکیاری کے مقامات پر شکستیں دیں لیکن بعدازاں درانی سرداروں کی دوغلی پالیسی کی وجہ سے بعض خوانین بھی دورخی کا شکار ہو کر تحریک جہاد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن گئے 1830ء کی سردیوں میں سلطان محمد درانی نے خفیہ سازش کے ذریعے مختلف دیہات میں بکھرے ہوئے ڈیڑھ دو سو مجاہدوں کو شہید کر دیا۔ یہ لوگ تحریک جہاد کا لب لباب تھے۔ اب سید احمد نے سرحد کی بجائے کشمیر کو مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے راج دواری (بالاء ہزارہ) میں وارد ہوئے اور غازی بھوگڑا منگ، گونش، اور بالاکوٹ میں مراکز قائم کرتے ہوئے مظفر آباد (کشمیر) تک پہنچ گئے۔ اور علاقے کے مسلمانوں کو سکھوں کی زد سے بچانے کے لئے سکھوں سے فیصلہ کن معرکہ کی غرض سے بالاکوٹ (تحصیل مانسہرہ) میں اقامت گزیں ہو گئے۔

ادھر رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ دس ہزار کی فوج کے ساتھ مانسہرہ اور مظفر آباد کے درمیان چکر لگاتا پھر رہا تھا۔ اسے اسلامی لشکر کی خبر ملی تو وہ لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی پگ ڈنڈیوں کے راستے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر اپنی فوج کی بڑی تعداد پہنچانے میں کامیاب ہو گیا جو بالاکوٹ کے عین بالمقابل مغرب میں واقع ہے۔ 6 مئی 1831ء کو بروز جمعہ چاشت کے وقت بالاکوٹ اور مٹی کوٹ کے درمیانی میدان میں بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ سکھ تعداد میں غازیوں سے کئی گنا زیادہ تھے۔ یہ لڑائی دو گھنٹے جاری رہی۔ تین سو غازی اور بے شمار سکھ اس جنگ میں کام آئے، نیز سید احمد اور شاہ اسمٰعیل بھی شہید ہو گئے۔

سکھوں نے سید صاحب کی لاش تلاش کرائی۔ سر اور دھڑ الگ الگ تھے۔ بدن کے دونوں حصے ایک قبر میں اعزاز کے ساتھ دفن کر دیئے۔ (عمدہ التواریخ جلد 3 صفحہ 35 از سوہن لال سوری)

دوسرے تیسرے دن نہنگ سکھوں نے سید صاحب کی لاش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی۔ چنانچہ دھڑ کو کسانوں نے گڑھی حبیب اللہ سے تین میل شمال کی جانب دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر دریا سے نکال کر ایک غیر معروف جگہ دفن کر دیا اور سر گڑھی حبیب اللہ کے سردار کی وساطت سے گڑھی حبیب اللہ میں دریا کے کنارے دفن کرا دیا گیا۔ یہ قبر مانسہرہ سے مظفر آباد جاتے ہوئے پل سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ ملتی ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید کی لاش سید صاحب کی شہادت گاہ سے نصف میل دور بالاکوٹ سے شمال میں "ست بنے" نالے کے پار سے ملی۔ جسے وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سکھوں کے خلاف تحریک جہاد دراصل سکھوں کی مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ تحریک کا جواب تھی۔ جس کی رو سے وہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن ہو گئے تھے۔ اللہ اور رسول کا نام سنتے ہی آگ بگولہ ہو جاتے۔ رسول پور، رسول نگر وغیرہ قصبات کے نام تک انہوں نے بدل دیئے تھے

مسلمانوں کو اذان کہنے کی اجازت نہ تھی۔ ذبیحہ گاؤ پر بھی پابندی تھی۔ پا کپتن کے علاقہ میں مسلمان ذبیحہ گاؤ پر آزادی سے عمل کرتے تھے۔ کیونکہ اس علاقہ کا انتظام شیخ سبحان قریشی سجادہ نشین آستانہ پا کپتن شریف کرتے تھے۔ چنانچہ نکئیوں کی مسل کے سردار ہیرا سنگھ نے اس اسلامی علاقہ کے مرکز پا کپتن پر حملہ کر دیا تاکہ گاؤ کشی کے جرم کی سزا دے سکے، لیکن خود ہیرا سنگھ اس معرکے میں گولی لگنے سے مر گیا۔ جب ملتان پر سکھوں نے فتح پائی تو وہاں مسلمان خواتین کی بے حرمتی کے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھی لرزہ براندام ہیں۔ چنانچہ سکھوں کی ایسی ظالمانہ روش کے خلاف سید احمد اور شاہ اسمٰعیل اس علاقے میں جہاد کے لئے آئے لیکن جس طرح نواب امیر خاں کو انگریزوں نے اپنے دام میں جکڑ لیا تھا اور وہ ریاست ٹونک لے کر مطمئن ہو گئے تھے اسی طرح سکھوں نے بھی بعض خوانین (واحد۔ خان) کو شیشے میں اتار لیا تھا اور وہ سید احمد کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور اس کے نتیجہ میں سکھوں کا پشاور تک پر قبضہ ہو گیا۔ اس تحریک کی ناکامی میں غالباً سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کے مصلحانہ عقائد کو بھی بڑا دخل تھا جو وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ظاہر کرتے تھے اور جن سے سواد اعظم کو اختلاف تھا۔ اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ مخالفانہ رویہ رکھنے والے مسلمان زعما نے ان بزرگوں کے کارناموں کے ڈانڈے کہیں اور ملانے کی کوشش ہے۔ بہرحال یہ تحریک جہاد اپنوں کی منافقت اور اغیار کی چالبازی اور دشمنی کی وجہ سے راستے میں ہی دم توڑ گئی۔ اور برصغیر میں انگریزوں کو سو سال تک قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

## باب 12

# ایسٹ انڈیا کمپنی اور پنجاب

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھا جسے مغلوں کے عہد میں تجارت کی اجازت مرحمت ہوئی تھی، لیکن آہستہ آہستہ اس ادارہ نے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے اور اس کی سرگرمیاں سیاسی حدود بھی پھلانگنے لگیں۔ چنانچہ اورنگزیب عالمگیر نے ان کا نوٹس لیا، لیکن انہوں نے حکمت عملی کا راستہ بدل لیا اور اپنا کام جاری رکھا۔ ملک میں طوائف الملوکی نے اپنا رنگ دکھایا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے موقع کو سنہری جانا اور اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جس نے آہستہ آہستہ مغلوں کا اقتدار ختم کر دیا حتیٰ کہ پنجاب کو بھی الحاق کی سند سے نواز دیا۔ جس کا مختصر تذکرہ اوپر کے صفحات میں آچکا ہے۔ پنجاب ایک ایسا علاقہ تھا جہاں سکھوں کے دور میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ خاص کر کے اہل اسلام کو بے جا مذہبی پابندیوں کے علاوہ ظلم و ستم کا شکار بھی ہونا پڑتا تھا اور ملکی حکومت کی بجائے انگریز حکومت امن و امان کا زیادہ پاس کرتی تھی اس لئے لوگ آئے دن کی غنڈہ گردی اور لوٹ مار سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سیاسی انتشار کے مقابلے میں امن قائم کرنے والی حکومت کو ترجیح دی۔ اور سکھوں کے بعد انگریزی راج کو امن و امان کے قیام کے حوالے سے زیادہ بہتر پایا اور سکون محسوس کیا۔

**انتظامی امور:** 1848ء میں لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بنا۔ جو توسیع پسندانہ عزائم میں لاجواب تھا۔ چنانچہ اس نے ہر حیلے بہانے سے انگریزی مقبوضات میں توسیع کی پالیسی جاری رکھی اور 29 مارچ 1849ء کو الحاق پنجاب کے بعد بعض اصلاحات بھی کیں۔ خالصہ فوج معزول کر دی گئی۔ پنجاب کے تمام لوگوں کو غیر مسلح کر دیا گیا اور پنجاب کا نظم و نسق چلانے کے لئے تین ارکان پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جس کے ممبر سر ہنری لارنس، سر جان لارنس اور سر چارلس میتل تھے۔ ان تینوں کو الگ الگ شعبوں کا انچارج بنایا گیا۔ سر ہنری لارنس کے پاس دفاع کا شعبہ تھا۔ سر جان لارنس کو مالگزاری کا محکمہ دیا گیا اور چارلس میتل کو دیوانی امور کا سربراہ بنایا گیا۔ یہ بورڈ دو سال تک اپنا کام کرتا رہا۔ دو سال بعد اسے توڑ کر پنجاب کا انتظام چیف کمشنر کے سپرد کر دیا گیا اور سر جان لارنس کو پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ جبکہ سر ہنری لارنس کو راجپوتانہ میں گورنر جنرل کا ایجنٹ مقرر کیا گیا اور چارلس میتل کو واپس انگلینڈ بلا لیا گیا۔ جس کی جگہ رابرٹ منٹگمری نے لی۔

اس دور میں پنجاب کے چار ڈویژن بنائے گئے جہاں ڈویژنل کمشنر تعینات کیے ہر ڈویژن

میں چند اضلاع تھے جہاں ڈپٹی کمشنروں کا تقرر ہوا۔ ضلعوں کو تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن کے تحت قصبات اور دیہات کو رکھا گیا۔ پنجاب کے تمام لوگوں سے اسلحہ لے کر انہیں غیر مسلح کر دیا گیا سکھوں سے خاص طور پر انگریزوں کی وفاداری کا حلف لیا پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا جس کا سربراہ انگریز افسر تھا۔ تعلیم کی اشاعت کے لئے محکمہ تعلیم کی داغ بیل ڈالی اور ہر ضلعی صدر مقام پر ایک گورنمنٹ سکول کا اجرا ہوا۔ ملک میں ریلوے نظام کا اجرا ہوا۔ شمال مغربی سرحد پر بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لئے فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور کئی قلعے تعمیر کئے گئے۔ دیوانی اور فوجداری قانون کو سادہ اور موثر بنایا گیا۔ مالیہ کی شرح کم کر دی گئی اور مالگزاری کے نظم میں اصلاحات کا ڈول ڈالا گیا۔ دیہاتی زندگی کو پرامن رکھنے کے لئے نمبرداری سسٹم کا اجرا کیا گیا اور نمبرداروں کو پولیس کے بعض اختیارات بھی دیئے گئے۔

لارڈ ڈلہوزی 1848ء تا 1856ء بطور گورنر جنرل ہندوستان میں فرائض انجام دیتا رہا۔ اس کو ملکی اصلاحات کا بھی بہت شوق تھا۔ 1856ء تک وہ اس عہدے پر رہا۔ اس کے بعد آنے والا انگریز حاکم وائسرائے کہلایا۔ لارڈ ڈلہوزی نے ملک گیر اصلاحات کیں۔ جن کا تعلق پنجاب سے بھی تھا۔

1- محکمہ ٹیلی گراف قائم کیا گیا۔
2- محکمہ تعمیرات عامہ (بلڈنگز اینڈ روڈ) تشکیل پذیر ہوا۔
3- شملہ کو فوجی ہیڈ کوارٹر کا مرکز بنایا گیا۔
4- محکمہ تعلیم میں سرکاری سطح پر اصلاحات کی گئیں۔
5- ہندو بیوگان کو دوسری شادی کی اجازت دی گئی اور رسم ستی کا انسداد کیا گیا۔
6- پنجاب سول کورڈ تیار کی گئی تا کہ پنجاب کو خوبصورت اور ماڈل صوبہ بنا کر پیش کیا جا سکے۔ پہاڑی علاقوں میں صحت افزا مقامات مقرر کئے گئے، اور وہاں مناسب تعمیرات کی گئیں اور پنجاب کی خوشحالی کے لئے مختلف سکیمیں شروع کی گئیں۔

مغربی تعلیم جاری کی گئی مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور انہیں ملازمتوں سے محروم رکھا گیا۔ سکھوں سے فیاضانہ سلوک ہوا کیونکہ آخری سکھ حکمران دلیپ سنگھ نے عیسائیت قبول کر کے ایک مصری عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی۔ نیز سکھوں سے وفاداری کا عہد نامہ بھی لکھوایا گیا تھا۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

## 1857ء کی جنگ آزادی اور پنجاب

سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد مسلمان زعما اسلامی حکومت کا احیا چاہتے

تھے۔ ہندو بھی مرہٹوں کی سرکوبی کے بعد انگریزوں کے خلاف تھے۔ ناناصاحب اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی جیسے غیر مسلم زعما بھی اپنی حکومت چھن جانے کے باعث انگریزوں کو اچھا نہ جانتے تھے۔ مسلمان زعما۔ اسلامی حکومت کی بحالی کے خواہشمند تھے۔ ان میں مولانا احمد اللہ مدراسی اور مولوی عظیم اللہ خاں ممتاز تھے۔ لارڈ ڈلہوزی کے توسیع پسندانہ عملی اقدامات نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ جس نے ہر طرح کی سینہ زوری اور بے آئینی کا ثبوت دیا تھا۔ جس نے الحاقات کے ذریعے مقامی ریاستوں کو ہڑپ کر لیا تھا۔ ایک طرف انگریزوں نے جاگیریں ضبط کرکے ملک کے خوشحال طبقے کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا اور دوسری طرف ولائیت سے درآمدات کے منہ کھول دیئے جس سے ملکی صنعت مفلوج اور بے سکت ہو کر رہ گئی۔ نیز انگریز ہر مذہب کی تضحیک کرکے، لوگوں میں ترغیب و تحریص کے ذریعے تبدیلی مذہب کے حربے استعمال کرنے لگے۔ نئی اصلاحات نے بھی رنگ دکھایا اور لوگ اپنے اپنے مذہبی جذبات اور دینی اقدار کے لئے انہیں سم قاتل سمجھنے لگے، فوجی اعتبار سے لارڈ کیننگ نے متاثر کیا جس کے "جنرل سروسز انلسٹمنٹ ایکٹ" نے فوج میں بے چینی پھیلا دی۔ جس کے تحت فوجیوں سے یہ حلف لیا جانے لگا کہ وہ بیرون ملک بھی فوجی خدمات انجام دینے کے پابند ہوں گے اور کام بھی اسی تنخواہ پر کریں گے۔ یعنی کوئی فالتو عوضانہ کی بھی منظوری نہ ہوئی۔ اس پر بعض فوجیوں نے احتجاج کیا۔ جن کو کڑی سزائیں دی گئیں حتیٰ کہ گولی سے بھی اڑا دیا گیا۔ ان اسباب کے علاوہ فوری سبب اس بغاوت کا وہ کارتوس بنا۔ جس کو چلانے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا کیونکہ اس پر چربی کی جھلی چڑھی ہوئی تھی۔

9 مئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی کے کچھ سپاہیوں کو یہ کارتوس، جن کی چربی کو گائے اور سور کی چربی بتایا گیا تھا، استعمال نہ کرنے کی پاداش میں دس دس سال کی قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ ان کے ساتھیوں نے 10 مئی 1857ء سے بغاوت کر دی اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور پانچ ہزار سپاہی دہلی پہنچ گئے۔ جہاں انہوں نے 11 مئی 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا، کئی نامور سالار مثلاً بریلی کا بخت خاں وغیرہ، بھی ان کے ساتھ مل گئے اور بغاوت ہر جگہ پھیل گئی۔

11 مئی 1857ء کو لاہور میں یہ خبر ملی کہ میرٹھ میں لاتعداد گوروں کو قتل کر دیا گیا۔ لاہور کے جوڈیشنل کمشنر سر رابرٹ منٹگمری نے فوراً سول اور فوجی حکام کا اجلاس طلب کیا جس میں فیصلہ ہوا کہ میاں میر چھاؤنی میں فوج کو الرٹ رکھا جائے اور لاہور کے اطراف میں دستے متعین کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ساڑھے تین ہزار سپاہ میاں میر میں متعین کر دی گئی۔ آزادی کے متوالے لاہور کی بجائے فیروزپور پہنچے اور طاقت کا مظاہرہ کیا چنانچہ بریگیڈیئر جونز لاہور سے فیروزپور پہنچا جس نے حالات پر قابو پالیا اور باغی لاہور اور امرتسر کی طرف فرار ہو گئے۔ لدھیانہ میں بھی آزادی کے

پروانوں پر قابو پالیا گیا۔ یہی صورت حال ملتان میں رونما ہوئی اور تین چار روز میں ان علاقوں میں امن قائم ہو گیا۔ اسی طرح سیالکوٹ، جہلم میں بھی شورش کو ایک آدھ دن میں ختم کر دیا گیا اس موقع پر سکھوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ جس کی وجہ سے یہاں آزادی پسندوں کی کامیابی ناکامی میں بدل گئی۔

ساہیوال کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف خوب معرکے مارے اور کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ لیکن مجموعی طور پر وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پنجاب مسلسل بد نظمی کا شکار رہا تھا۔ لوگ آئے دن کی شورشوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ آخر پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل انگریزی فوج دہلی کی طرف بھیجی گئی جس میں مہاراجوں نے سات ہزار اور راجہ کشمیر نے ڈھائی ہزار فوجی جوان دیئے' اور پنجاب میں ساڑھے چار ہزار گورے فوجی امن کے لئے رکھے گئے۔ پنجابی فوج نے دہلی پہنچ کر حالات پر قابو پالیا۔ 16 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کو تخت سے معزول کر دیا گیا۔ اور اس کے دو بیٹوں کو اس کے سامنے قتل کر دیا گیا اور اس کی بیوی زینت محل کے ساتھ اسے جلاوطنی کا حکم ہوا۔ اس کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں نے انگریز جرنیل سرجان نکلسن کو قتل کر دیا کیونکہ اس جرنیل نے بھی قتل وغارت کا بازار گرم کئے رکھا تھا۔ یہ جنگ وسطی ہند میں شروع ہوئی' لیکن پنجاب کے لوگوں نے انگریزوں سے مفاہمت کر کے جنگ آزادی کے پروانوں کا ساتھ نہ دیا۔ یہاں کے لوگوں کو انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیریں دیں' اور جاگیرداری نظام نے پنجاب میں اپنے پاؤں جمالئے۔ ریاست داروں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا اور پنجاب کے چیف کمشنر نے جس تدبر سے جنگ آزادی کو ناکام بنایا تھا۔ اس کے صلہ میں ملکہ برطانیہ نے چیف کمشنر پنجاب کو "شاباش" دی اور اسے خصوصی تہنیتی سند سے نوازا گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ "جیند" نابھہ کشمیر اور کپور تھلہ کے راجوں کو بھی خصوصی انعامات سے نوازا گیا۔ اس طرح انگریزوں نے پنجاب کے لوگوں کو اپنا وفادار تسلیم کر لیا اور پنجاب کی بہبود و فلاح اور تعلیمی ترقی کے کئی منصوبے شروع کیئے۔

20 ستمبر 1857ء کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ لکھنؤ میں مجاہدین کی قیادت مولوی احمد اللہ نے کی۔ 16 مارچ 1858ء کو انگریز دوبارہ اودھ پر قابض ہو گئے۔ نانا صاحب اور مولوی عظیم اللہ کو کانپور میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح 1858ء تک آزادی کی جنگ کے سارے شعلے سرد ہو کر رہ گئے۔

البتہ جنگ آزادی نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریزوں کو یہاں حکومت کرنے کے لئے حکمت عملی تبدیل کرنا پڑے گی۔ چنانچہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دی گئی اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں آگیا۔ جس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858ء جاری کیا اور لارڈ کیننگ کو

اس کا پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا جو پہلے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ برطانوی مجلس وزراء میں ایک وزیر مملکت برائے ہندوستانی امور کا تقرر عمل میں آیا۔ جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی پندرہ رکنی مجلس مشاورت کا سربراہ تھا۔ جسے ہندوستانی امور نپٹانے ہوتے تھے۔

**ملکہ وکٹوریہ کا اعلان:** یکم نومبر 1858ء کو برطانوی ملکہ وکٹوریہ نے اہم اعلان کیا جس کے اہم نکات یہ تھے:

1- دیسی راجاؤں کی ریاستوں کو برطانوی سلطنت میں ملحقہ تصور نہیں کیا جائے گا۔
2- رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی، اور ہر کوئی اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزارنے کا حقدار ہوگا۔
3- سرکاری عہدوں پر صرف قابلیت کی بنا پر تقرریاں ہوں گی۔
4- جنگ آزادی میں ایسے حصہ لینے والوں کو سزا دی جائے گی جنہوں نے انگریزوں کو قتل کیا ہوگا۔

یکم جنوری 1859ء کو پنجاب میں چیف کمشنر کا عہدہ ختم کرکے اس کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر کی اسامی رکھی گئی جس پر سرجان لارنس کو ہی تعینات کر دیا گیا۔ جس نے فروری 1859ء میں خرابی صحت کی بنا پر استعفیٰ دے دیا اور 26 فروری 1859ء کو وہ انگلستان واپس چلا گیا۔ اس کی جگہ سر رابرٹ منٹگمری پنجاب کا گورنر بنا۔

1857ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کے لئے نیا عتاب اور عذاب لائی۔ ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ اوقاف چھین لئے گئے۔ ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ معاشی ترقی کی تمام راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں۔ ہزاروں مجاہدوں کو پھانسی دی گئی۔ بہتوں نے میدان جنگ میں شہادت پائی۔ سینکڑوں کو جلاوطن کرکے کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں اور سکھوں پر نوازشیں خوب ہونے لگیں۔ ہندو نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے اب مسلمان حکمرانوں کی بجائے انگریز حکمرانوں کی خوشامد کو شعار بنا لیا۔ ان کے علوم سیکھے۔ زبان سیکھی اور مختلف خدمات انجام دینے لگے۔ تجارت تو پہلے بھی ان کے قبضہ میں تھی اب انہوں نے دیگر میدانوں میں پاؤں رکھا اور جلدی جلدی آگے بڑھنے لگے۔

سکھ تو پہلے ہی مسلمانوں کو دشمن سمجھتے تھے۔ اب ہندوؤں نے بھی انہیں صدیوں تک اپنا آقا بننے کی سزا دینے کا اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ گویا ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مشترکہ دشمن بن کر آگے بڑھے اور وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر انہیں زک پہنچانے کا کوئی دقیقہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ جن کی اس روش نے آخر مسلمانوں کو جداگانہ تشخص اختیار کرنے میں مدد دی اور جس کے نتیجہ میں آخر پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

**پنجاب پر انگریزوں کی حکمرانی:** 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی میں جکڑ دیا- پنجاب بھی اس میں شامل ہو چکا تھا- چنانچہ ہندوستان پر 1856ء سے 1947ء تک بیس وائسرائے مقرر ہوئے جو برطانیہ کے ماتحت تھے- ان کی تفصیل یوں ہے-

| | |
|---|---|
| 1- لارڈ کیننگ | 1856ء تا 1862ء |
| 2- لارڈ ایلگن | 1862ء تا 1863ء |
| 3- لارڈ لارنس | 1863ء تا 1869ء |
| 4- لارڈ میو | 1869ء تا 1872ء |
| 5- لارڈ نارتھ بروک | 1872ء تا 1876ء |
| 6- لارڈ لٹن | 1876ء تا 1880ء |
| 7- لارڈ رپن | 1880ء تا 1884ء |
| 8- لارڈ ڈفرن | 1884ء تا 1888ء |
| 9- لارڈ لینس ڈاؤن | 1888ء تا 1894ء |
| 10- لارڈ ایلگن دوم | 1894ء تا 1899ء |
| 11- لارڈ کرزن | 1899ء تا 1905ء |
| 12- لارڈ منٹو | 1905ء تا 1910ء |
| 13- لارڈ ہارڈنگ | 1910ء تا 1916ء |
| 14- لارڈ جیمس فورڈ | 1916ء تا 1921ء |
| 15- لارڈ ریڈنگ | 1921ء تا 1926ء |
| 16- لارڈ ارون | 1926ء تا 1931ء |
| 17- لارڈ ولنگڈن | 1931ء تا 1936ء |
| 18- لارڈ لتھلنگو | 1936ء تا 1943ء |
| 19- لارڈ ویول | 1943ء تا مارچ 1947ء |
| 20- لارڈ مونٹ بیٹن | مارچ 1947ء تا اگست 1947ء |

1858ء میں الہ آباد میں شاہی دربار کا انعقاد ہوا جس میں لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کی منظوری سے اہم اعلانات کئے- جن کا ذکر آچکا ہے- یہی اعلان اسی روز لاہور سے بھی شائع کیا گیا- اور اس کے بعد ان اعلانات کی روشنی میں مختلف وقتوں میں اصلاحی اور تعمیری کام کئے گئے-

**پنجاب کا نیا صوبہ:** 1859ء میں پنجاب کو الگ صوبہ کا درجہ دیا گیا جس کا سربراہ سر جان لارنس کو مقرر کیا گیا- جو ازیں پیشتر یہاں چیف کمشنر تھا- اس نے محکمہ تعلیم محکمہ

پولیس، محکمہ ریلوے قائم کرکے ترقی کی طرف قدم بڑھانے شروع کئے۔ سرجان لارنس نے امرتسر اور ملتان کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا افتتاح کیا۔ 1859ء میں ہی سر رابرٹ منٹگمری کو اس کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا اس نے بھی آبپاشی کے شعبہ کو ترقی دی۔ اس کے دور میں نہر اپرباری اور لوئرباری دوآب تعمیر کی گئیں اور ان کی شاخیں بھی نکالی گئیں جس پر ایک کروڑ پینتیس لاکھ پچاسی ہزار پانچ سو دو (1,35,85,502) روپے لاگت آئی۔

61-1860ء میں پنجاب میں شدید قحط رونما ہوا۔ جس میں بہت سے مویشی اور انسان اللہ کو پیارے ہوگئے۔ حکومت نے قحط زدہ علاقوں میں ریلیف کمیٹیوں کے ذریعے متاثرین کو امداد بہم پہنچائی۔

1862ء میں لاہور کی شاہی مسجد کو مسلمانوں کے لئے واگزار کردیا گیا۔ ازیں پیشتر اس کو ضبط کر لیا گیا تھا۔ 1864ء سرجان لارنس (سابق لیفٹیننٹ گورنر لاہور) جو اب ہندوستان کا وائسرائے تھا نے لاہور کا دورہ کیا اور اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر لوگوں نے اس کی پذیرائی کی، اور لارنس ہال کی تعمیر کا افتتاح بھی اسی کے ہاتھوں کروایا گیا۔ اس موقع پر دیسی راجوں اور نوابوں نے بھی شرکت کی۔

سر رابرٹ منٹگمری کے عہد میں ضلع گوگیرہ کی جگہ موجودہ ساہیوال کو منٹگمری کا نام دے کر ضلعی صدر مقام کا درجہ دیا گیا۔ نیز لاہور میں منٹگمری ہال کی تعمیر اس کی یادگار کے طور پر ہوئی سر رابرٹ منٹگمری نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا جس کے بعد سر ڈونلڈ میکلوڈ نے پنجاب میں سربراہی کا کام سنبھالا۔

**پنجاب چیف کورٹ کا قیام:** 1865ء میں صوبہ پنجاب میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کی خصوصی عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ جسے پنجاب چیف کورٹ کا نام دیا گیا اور اس میں دو جج مقرر کیئے گئے۔

1868ء لاہور یونیورسٹی کالج کے نام سے تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا جس کا سربراہ لیفٹننٹ گورنر خود تھا 1882ء میں اسے ترقی دے کر "پنجاب یونیورسٹی" کا درجہ دے دیا گیا۔

سر میکلوڈ کے دور میں کئی نہریں کھودی گئیں۔ ریلوں اور سڑکوں کا نظام بہتر ہوا۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے متعدد غیر ملکی ماہرین سے مشورہ کرکے اقدامات کئے گئے اور اس کے استعفیٰ کے بعد اس کی جگہ سرہنری ڈیورنڈ پنجاب کا گورنر مقرر ہوا لیکن وہ سات ماہ کے بعد حادثاتی موت مرگیا۔ جس کی جگہ سرہنری ڈیوس اس منصب پر فائز ہوا۔

1876ء میں پرنس آف ویلز نے پنجاب کا دورہ کیا اور لاہور کے تاریخی مقامات دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ سر رابرٹ ایجرٹن کے دور میں کشمیر میں قحط پڑا جس کی وجہ سے کشمیری نقل مکانی

کر کے پنجاب میں آ بسے۔ سر چارلس ایچی سن کے عہد میں نومبر 1882ء میں وائسرائے ہند نے نہر سرہند کا افتتاح کیا اور نہری نظام سے 10 لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہونے لگی جو اس دور کا اہم کارنامہ شمار کی جاتی ہے۔

14 اکتوبر 1882ء کو پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی، اور پنجاب یونیورسٹی ایکٹ کے تحت قائم ہونے والی اس یونیورسٹی کی سرپرستی وائسرائے ہند نے قبول کی اور پنجاب کے گورنر کو اس کا چانسلر بنایا گیا۔

1886ء میں ہندوستانی امراء اور نوابوں وغیرہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے پنجاب چیف کالج کا قیام عمل میں آیا۔

1882ء میں لاہور میں مویشیوں کے علاج معالجہ اور اس سلسلے میں تعلیم و تربیت کے لئے لاہور وٹرنری سکول کا اجرا ہوا۔ جبکہ 31 دسمبر 1885ء کو پنجاب پبلک لائبریری قائم کی گئی جس کا افتتاح گورنر چارلس ایچی سن نے خود کیا۔

دیسی لوگوں کو ملازمتیں دینے کے لئے دسمبر 1886ء میں فیصلہ ہوا کہ ان کو انتظامی اور عدالتی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

1887ء میں لاہور میں لیڈی ایچی سن ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ تاکہ خواتین کا علاج بطریق احسن کیا جاسکے۔ 2 اپریل 1887ء کو ایچی سن کی جگہ سر جیمز براڈ ووڈ لائل نے گورنر پنجاب کا عہدہ سنبھالا۔ جس کا تعلق سول سروس سے تھا۔ اس کے عہد سے قابل اور اہل طلبا کو وظائف تعلیمی سے نوازا جانے لگا۔

نومبر 1888ء میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے پنجاب کا دورہ کیا اور اس کی اہلیہ لیڈی ڈفرن نے اب تک تعمیر ہو چکنے والے لیڈی ایچی سن ہسپتال کا افتتاح کیا۔

3 فروری 1889ء کو برطانوی شاہی خاندان کے فرد شہزادہ البرٹ وکٹر آف ویلز نے لاہور میں عجائب گھر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کی عمارت پر ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت آئی۔ جس کے لئے جگہ جگہ سے نوادرات اکٹھے کئے گئے۔

1890ء میں بٹھنڈہ بہاولپور ریلوے لائن کی تعمیر کا آغاز ہوا۔

## باب 13

# 1900ء کا قانون انتقال اراضی (پنجاب)

اس ایکٹ کا لب لباب یہ ہے کہ ہندو ساہو کار غریب کاشتکاروں کو قرضہ اور سود در سود کے چکر میں پھنسا کر آخر ان کی جدی پشتی اراضی اپنے نام لگوا لیتے تھے۔ اس طرح چھوٹا کاشتکار طبقہ مصائب و آلام کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس قانون کی رو سے دکانداروں، ساہو کاروں اور پیشہ وروں کو زمین کی خریداری سے روک دیا گیا اور رہن بھی بیس سال سے زیادہ عرصہ کے لئے نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ نیز اس قانون کے تحت کسانوں کو قرضہ کی فراہمی کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں بنا دی گئیں جن میں شرح سود معمولی ہوتی۔ اس طرح پنجاب میں زرعی پیداوار اور کسانوں کی خوشحالی کی لہر دوڑ گئی۔ اور کاشتکاروں کی محرومیوں کا خاتمہ ہوا۔

دیہاتی لوگ اس ایکٹ کی وجہ سے ساہو کارانہ قرضے کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آئے۔ ہندو ساہو کار قرضہ کی رقوم پر چھتیس فیصد (36%) سود لیتے تھے۔ جبکہ امداد باہمی کی انجمنوں کی شرح سود چھ فیصد سالانہ تھی۔ اس قانون کو ختم کرانے کے لئے ہندو مہا سبھا کے ذریعے ہندوؤں نے بہت کوشش کی، لیکن مسلمانوں کی مخالفت کے وجہ سے ناکام رہے۔

1909ء میں لارڈ منٹو کے سامنے بھی اس قانون کو ختم کرنے کے لئے واویلا کیا گیا۔ جس کے خلاف 1909ء میں پنجاب مسلم لیگ کے اجلاس میں میاں شاہ نواز بیرسٹر نے اس قانون کو برقرار رکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ہندوؤں کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور امداد باہمی انجمنوں کی تحریک کے نتیجہ میں قرضوں کی سہولت کو مزید بہتر بنانے کے لئے دیہات میں کوآپریٹو بنکوں کی 316 شاخیں قائم کی گئیں۔

اس قانون کے تحت لدھیانہ اور جالندھر کے اضلاع میں مستقل انتقال ملکیت کی منظوری سے انکار کر دیا گیا۔ خصوصاً غیر کاشتکار قبائل کو زمین کی منتقلی روک دی گئی۔ اس ایکٹ کا مقصد یہ تھا کہ زرعی اراضی کاشتکار خاندانوں کے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

## مختلف کاشتکار خاندانوں کی ضلعی گروپ بندی

مختلف کاشتکار خاندانوں کی ضلعی گروپ بندی کر دی گئی۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ضلع حصار کے کاشتکار قبائل: آہیر، آرائیں، بشوئی، ڈوگر، گجر، جٹ، ملی، مغل، پٹھان، راجپوت، سید۔

ضلع روہتک کے کاشتکار قبائل: آہیر، بلوچ، گجر، جٹ، ملی، مغل، پٹھان، راجپوت، سید، اوڈ۔

ضلع گوڑگاؤں کے کاشتکار قبائل: آہیر، بلوچ، گجر، جٹ، خان زادہ، قریشی، ملی، میو، مغل، پٹھان، سید، راجپوت۔

ضلع دہلی کے کاشتکار قبائل: آہیر، آرائیں، بلوچ، چوہان، گجر، گاڑا، جٹ، ملی، میو، مغل، پٹھان، راجپوت، تگہ، سید اور سینی۔

ضلع کرنال کے کاشتکار قبائل: عباسی، آہیر، انصاری، ارائیں، ڈوگر، گاڑی، گجر، کمبوہ، جٹ وغیرہ۔

ضلع انبالہ کے کاشتکار قبائل: آہیر، ارائیں، بلوچ، گاڑا، گجر، جاٹ، کمبوہ، ملی، مغل، پٹھان، سید، راجپوت، ساہنی وغیرہ۔

ضلع ہوشیار پور کے کاشتکار قبائل: اعوان، ارائیں، بھٹی، ڈوگر، گجر، جاٹ، مغل راجپوت، پٹھان، لبانہ، سینی وغیرہ۔

ضلع جالندھر ولدھیانہ کے کاشتکار قبائل: اعوان، ارائیں، ڈوگر، گجر، جاٹ، مغل راجپوت، پٹھان، لبانہ، سینی وغیرہ۔

ضلع فیروزپور کے کاشتکار قبائل: ارائیں، بودلے، ڈوگر، گجر، کمبوہ، لبانے، ماہتم، مسلمان جاٹ، اور دیگر۔

ضلع ملتان کے کاشتکار قبائل: آہیر، ارائیں، اعوان، بلوچ، گجر، جاٹ، کمبوہ، کھرل، کھوکھر، قریشی، ماہتم، مغل، اوڈ، بھٹی، پٹھان، راجپوت، سید۔

ضلع جھنگ کے کاشتکار قبائل:

بلوچ، جاٹ، کھوسہ، قریشی، نکوکارا، راجپوت، سید، ترک۔

ضلع فیصل آباد کے کاشتکار قبائل: ارائیں، بھٹی، بلوچ، گجر، جاٹ، کمبوہ، کھگا، کھرل، کھوکھر، ساہنی، سید وغیرہ۔

ضلع لاہور و سیالکوٹ کے کاشتکار قبائل: ارائیں اعوان، بودلے، ڈوگر، جاٹ، کمبوہ، کھرل، لبانے، قریشی، ماہتم، مغل، پٹھان، راجپوت، سید گکھڑ، ساہنی۔

**شاہ پور، سرگودھا، خوشاب:** ملیر، پٹھان، مغل، سید، راجپوت وغیرہ۔

**جہلم، راولپنڈی، اٹک:** آکڑا، چوہان، چب، گکھڑ، گجر، جنجوعہ، جاٹ، اعوان، کہوٹ، کھنڈویا، کھوکھر، قریشی، منہاس، ملیر، مغل، سیال، سولہن، للہ، پنوار، پھاپھڑا، ارائیں یا مہر، جودھرا، جودھ وغیرہ۔

اسی طرح ہر ضلع کے کاشتکار قبائل کے نام دیئے گئے تاکہ غیر کاشتکاروں اور پیشہ وروں کی نشاندہی میں آسانی پیدا کی جاسکے۔ اور زرعی زمین کو غیر کاشتکاروں کی دست برد سے محفوظ رکھا جاسکے۔

اس قانون کے تحت دکاندار، ساہوکار اور پیشہ ور گروہوں کے لوگ جدی زمینوں کے مالکوں سے زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ رہن کی مدت بیس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی اس کے لئے بھی سرکاری حکام کے اجازت لازمی قرار دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غریب کاشتکار اپنی جدی زمینوں کی ملکیت سے محروم ہونے سے محفوظ ہو گئے۔ کسانوں میں کفایت شعاری کا جذبہ پروان چڑھا۔ تمسک کی میعاد تین سال سے بڑھا کر چھ سال کردی گئی۔ اس طرح مقدمہ بازی میں خاصی کمی آگئی۔ پٹواری کے کاغذات میں انتقال اراضی کا اندراج مستند تصور کیئے جانے سے کسان عدالتوں میں جانے سے بچ گئے۔ اس قانون کے اور بھی بہت سے فوائد ظاہر ہوئے۔ پنجاب میں آسودگی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ کسانوں کی حالت بہتر ہونے لگی ساہوکاروں اور بنیا حضرات کی لوٹ کھسوٹ سے کسانوں کو نجات ملی۔ ان سے قرضہ لینے کے رجحان میں کمی ہوئی اور امداد باہمی کی انجمنوں وغیرہ کو فروغ حاصل ہوا۔

باب 14

# مسلم لیگ کا قیام

یکم اکتوبر 1906ء کو آغا خاں کی قیادت میں شملہ میں مسلمان لیڈروں کا پینتیس رکنی (35) وفد وائسرائے سے ملا اور سیاسی مطالبات پیش کئے۔ اسی سال ڈھاکہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی ارکان میں ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ، محسن الملک، اور وقار الملک کے نام قابل ذکر ہیں۔ شملہ میں ملنے والے وفد میں آٹھ ہستیاں پنجاب کی نمائندہ تھیں۔ ان میں سے:

(1) سر محمد شفیع بار ایٹ (2) میاں محمد شاہ دین (بیرسٹر) (3) خواجہ محمد یوسف شاہ (امرتسر) (4) شیخ غلام صادق (امرتسر) کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی اس کا نام سر محمد شفیع کی تجویز پر آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔

**پنجاب مسلم لیگ:** اس کے بعد سر محمد شفیع نے نواب وقار الملک سے خط و کتابت کر کے پنجاب مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے کی تجویز دی۔ چنانچہ 24 مارچ 1907ء کو نو ممبروں کی ایک کمیٹی بنادی گئی جس کا کام اس بارے میں رپورٹ تیار کرنا تھا۔ آخر 30 نومبر 1907ء کو سر محمد شفیع کی کوٹھی کے ایک اجلاس میں پنجاب مسلم لیگ کے قیام کی اجازت دی گئی جس میں 49 مندوبین شریک ہوئے اس میں صدر میاں شاہ دین کو چنا گیا، جنرل سیکرٹری میاں محمد شفیع تھے۔ جائنٹ سیکرٹری عبدالعزیز (ایڈیٹر آبزرور) منشی محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار) خزانہ کا مہتمم شیخ گلاب دین کو چنا گیا۔ اس کے اغراض مقاصد یہ قرار دیئے گئے۔

1- پنجاب کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ان کی ترقی اور فلاح و بہبود۔
2- اسلامی فرقوں میں ربط و ضبط نیز اغیار کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصول پر روابط بڑھانا۔
3- سارے مسلمانوں کی ترقی کے لئے مرکزی لیگ سے مل کر کام کرنا۔
4- مسلمانوں کو برطانوی وفاداری کا احساس دلاتے رہنا۔
5- برطانوی قوانین میں مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کا خیال رکھنا۔

**آئین:** صوبائی لیگ کا آئین منظور کیا گیا۔ اس میں اٹھارہ سال یا زیادہ عمر کے لوگ ممبر بننے کے اہل تھے۔ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے دو کمیٹیاں بنائی گئیں۔ یعنی سنٹرل ایسوسی

ایشن اور مجلس عاملہ، سنٹرل ایسوسی ایشن کے ذمہ ہر تین سال بعد صوبائی لیگ کے الیکشن کرانے کی کام لگایا۔ جبکہ مجلس عاملہ کے 15 تا 35 ممبر ہو سکتے تھے۔

**جداگانہ انتخابات کے طریقہ کو منوانے کی کوشش:** 1909ء کے ایکٹ میں مسلمانوں کی جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ لیکن پنجاب میں اس کا اطلاق نہ ہوا تھا۔ چنانچہ مئی 1909ء کو صوبائی لیگ نے یادداشت کے ذریعے آئینی اطلاق کی خاطر ایک سب کمیٹی مقرر کردی اور نومبر 1909ء میں صوبائی لیگ نے جداگانہ انتخاب کا حق پنجاب میں نافذ کرانے کے لئے برطانوی وزیر مملکت کو تین ٹیلیگرام دیئے۔ کیونکہ جمہوری انداز میں مسلمان ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر تھے۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور جداگانہ حق انتخاب تسلیم کرلیا گیا۔

- صوبائی لیگ میں ملازمتوں میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی دلائی اور 1912ء میں سر محمد شفیع نے اس بارے میں حوصلہ افزا رپورٹ پیش کی اور شیڈول کاسٹ کے لئے نرم شرائط ملازمت منظور ہوئیں۔
- اردو زبان کے تحفظ اور ترویج کی کوشش کی گئی، اور علامہ اقبال کی سرکردگی میں اردو کمیٹی تشکیل دی گئی۔
- تجارت کے میدان میں مسلمانوں کو آگے بڑھانے کے لئے اور 1912ء میں صوبائی لیگ کے تحت صنعتی شعبہ قائم کردیا گیا جس کا کام مسلمانوں کے لئے تجارت میں ترقی کرنے کی راہیں نکالنا تھا۔
- قانون انتقال اراضی برقرار رکھنے کے لئے صوبائی لیگ کا وفد وائسرائے ملا اور کامیاب ہوا۔
- کشمیری مسلمانوں کی حمایت بھی صوبائی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کی جانے لگی۔
- بیرونی ممالک کے مسلمانوں کی خیرخواہی اور بہتری کے لئے کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ طرابلس پر حملہ ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے بڑا احتجاج کیا۔
- صوبائی لیگ نے تخریبی کاروائیوں کی مذمت کی 1916ء میں سکھوں کی طرف سے تحریک غدر میں پنجابی مسلمانوں کو ملوث کرنے کے خلاف تدابیر اختیار کی گئیں۔

**پنجاب مسلم لیگ کی مقبولیت:** تھوڑے ہی عرصہ میں پنجاب مسلم لیگ کی ایک سو اسی (180) شاخیں قائم ہوگئیں۔ یہ لیگ مسلمانوں میں روز بروز مقبول ہوتی چلی گئی۔ سید امیر علی اور سر آغا خاں نے بھی اس لیگ کے کام کی تعریف کی۔

**لیگ میں پھوٹ:** 12-1911ء میں آبزرور اور زمیندار میں میاں محمد شفیع کے خلاف لیگ کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بارے میں مضامین شائع ہوگئے۔

چنانچہ میاں صاحب نے 1912ء میں بد دل ہو کر استعفیٰ دے دیا، لیکن ممبروں نے اسے منظور نہ کیا آخر استعفیٰ واپس لے لیا گیا۔

**متوازی لیگ کا قیام:** میاں محمد شفیع کے مخالفین مختلف الزامات عائد کرتے تھے کہ میاں صاحب لیگ کے اجلاس باقاعدگی سے نہیں بلاتے۔ کبھی کہتے کہ کانگرس کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ تاہم جنوری 1916ء میں متوازی صوبائی لیگ قائم ہو گئی۔

**مرکز سے اختلاف:** جنوری 1916ء میں قائم ہونے والی متوازی لیگ کے ممبر پُرجوش تھے اور وہ اعتدال پسندی کے حق میں نہ تھے۔ جس کے صدر سردار عبدالرحمٰن اور سیکرٹری پیر تاج الدین بن گئے۔ ادھر مرکزی اور صوبائی لیگ کے درمیان بعض اختلافات پائے جاتے تھے۔ سر محمد شفیع نے مرکزی لیگ پر صوبائی لیگ کے خلاف کارگزاری کا الزام لگایا پنجاب لیگ کی حمایت میں روزنامہ پیسہ اخبار تھا۔ جبکہ اس کے مخالفین میں زمیندار، آبزور اور کامریڈ جیسے اخبار تھے 13 فروری 1916ء کو لاہور میں صوبائی لیگ کا اجلاس ہوا جس میں محمد شفیع نے تقریر کی اور صوبائی لیگ کے قواعد و ضوابط میں چند ترامیم کو منظور کروالیا۔ جس میں متوازی لیگ کے قیام کی مذمت کی گئی، لیکن مرکزی مسلم لیگ نئی لیگ کو جائز ماننے لگی۔ اس طرح گڑبڑ ہو گئی۔ چنانچہ میاں محمد شفیع نے مارچ 1917ء میں ایک اجلاس میں پرانی لیگ کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور مرکزی مسلم لیگ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کیا گیا جس کے تحت نئی لیگ کو پنجاب میں حق نیابت دے گیا تھا۔ چنانچہ میاں محمد شفیع نے آل انڈیا مسلم ایسوسی ایشن قائم کر لی جس میں پرانی صوبائی لیگ کے بہت سے ارکان شامل ہو گئے۔ اس طرح صوبائی مسلم لیگ کی قیادت میں تبدیلی ہو گئی۔

# پنجاب پراونشل مسلم لیگ

## (1907ء تا 1917ء تک کا خصوصی مطالعہ)

اس موضوع پر جناب ڈاکٹر محمد انور امین نے اپنی کتاب "پنجاب تحریک پاکستان میں" میں سیر حاصل بحث کی ہے اور پنجاب میں مسلم لیگ کے قیام اور اس کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے جو کام کئے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب 1969ء میں نعمت پبلیکشنز لاہور نے شائع کی تھی۔ ڈاکٹر محمد انور امین مسلم لیگ کے قیام کے وقت سیاسی حالات اور پس منظر کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز کے وقت مسلمانان برصغیر کی سیاسی حالت اس حد تک بدتر ہو چکی تھی کہ ہر باشعور تعلیم یافتہ اور حساس مسلمان اس کے لئے فکر مند و پریشان نظر آتا تھا، اور یہ

احساس عام ہوتا جارہا تھا کہ اگر مسلمانان ہند اسی طرح بے حس و حرکت پڑے ظلم کی چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان پستے رہے تو یہ بعید نہیں کہ مسلم انڈیا میں بھی سپین کا ڈرامہ دہرایا جائے۔ چنانچہ دردمند اور حساس زعماء اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو اس کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ کرسکے اور غیر ملکی اقتدار سے اپنی قوم کے لئے جینے کا حق حاصل کرسکے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمان کی اگرچہ چند معاشرتی مذہبی تنظیمیں قائم تھیں لیکن ان سب کا دائرہ کار عملی سیاست سے یکسر مختلف تھا۔ جبکہ مسلمان سب سے زیادہ چوٹ اسی میدان میں کھا رہے تھے۔ اس لئے ان کی سیاسی شیرازہ بندی کی سخت ضرورت تھی۔ اسی اثناء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا اعلان کیا جسے ہندوستان میں سیاسی حالات اور ضروریات کا جائزہ لے کر برٹش گورنمنٹ کو رپورٹ مہیا کرنا تھا۔ تو دردمند ملت نے اس موقع پر مسلمانوں کے مسائل و حقوق کے مطالبات کو حکومت ہند کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور نواب محسن الملک کی تحریک پر ہندوستان کے مسلم زعماء کے ایک وفد کا وائسرائے ہند سے ملنے اور اسے ایک یاد داشت پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر باہم صلاح مشورہ کرنے اور یادداشت کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ستمبر 1906ء میں لکھنؤ میں مسلم قائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں میاں محمد شفیع اور خواجہ محمد یوسف شاہ نے مسلمانان پنجاب کے نمائندگان کی حیثیت سے شرکت کی اور مسلم رہنماؤں کے ساتھ مل کر اس مجوزہ وفد کے لئے ایڈریس تیار کیا۔ ایڈریس یکم اکتوبر 1906ء کو سر آغا خاں کی قیادت میں جس 35 رکنی مسلم وفد نے وائسرائے ہند کو شملہ میں پیش کیا اس میں پنجاب سے حصہ لینے والی آٹھ شخصیتوں میں میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء، میاں محمد شاہ دین بیرسٹر لاء (لاہور) خواجہ محمد یوسف شاہ (امرتسر) شیخ غلام صادق (امرتسر) حکیم محمد اجمل خاں (دہلی) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (بحوالہ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 3 دسمبر 1907ء)

بہرحال اس وفد کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کو مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی میں ایک اہم اور خوشگوار موڑ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی اجلاس لکھنؤ (ستمبر 1906ء) میں جبکہ شملہ وفد کے لئے یادداشت کا مسودہ تیار کیا جارہا تھا۔ اور مابعد وائسرائے کو یادداشت پیش کرنے کے بعد شملہ میں وفد مذکورہ کے ارکان نے باہم مشورہ کیا کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم بھی قائم کی جائے۔ (بحوالہ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 3 دسمبر 1907ء)

چنانچہ اسی سال (1906ء) ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے انعقاد کے بعد 30

دسمبر 1906ء کو نواب وقار الملک کی زیر صدارت مسلمان لیڈروں کا سیاسی جلسہ منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کی مذکورہ صدر مجوزہ سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور میاں محمد شفیع کی تجویز پر اس کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" رکھا گیا۔ (بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا صفحہ 53 سید حسن ریاض)

سیاسی پلیٹ فارم میسر آ گیا تھا جہاں سے ان کے حقوق و مفادات کے لئے آواز اٹھائی جا سکتی تھی اور آگے چل کر اس عظیم تحریک نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ملت اسلامیہ ہند کو نجات دلانے کے لئے جو عظیم کردار ادا کیا اس کا نتیجہ اس عظیم وطن عزیز کی صورت میں نمودار ہوا جس کی آزاد فضاؤں میں آج ہم سانس لے رہے ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا یقیناً لازمی ہو گا کہ اس تنظیم کے قیام کا محرک بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حق تلفی، کانگریس کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت تھی اسی لئے محسن ملت سرسید احمد خاں مرحوم نے بھی کانگریس کی اسی بیمار ذہنیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے اور اس فرقہ پرست جماعت میں شرکت کرنے سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیا تھا اور مرحوم کے اس نظریئے کی تصدیق تقسیم بنگال (جو مسلمانوں کے مفاد میں تھی) کی مخالف میں کانگریس کے شدید ہنگاموں اور ہر روز کے احتجاجات نے خود کر دی اور مسلمانوں نے کلیتہ یہ محسوس کر لیا کہ۔

"مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس (بیس فیصد) کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہی تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار گنا زیادہ ہے۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہو گی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہو گا۔" (بحوالہ "پاکستان ناگزیر تھا" صفحہ 54)

چنانچہ یہی احساس مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی شیرازہ بندی پر منتج ہوا اور مسلم لیگ کے نام سے جو نئی سیاسی تنظیم وجود میں آئی وہ خالصتہ مسلم سیاسی جماعت تھی اس تنظیم کا جو مینی فیسٹو تھا وہ قابل توجہ ہے (بحوالہ "پاکستان ناگزیر تھا" صفحہ 54)

(ا) ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی آئندہ تدبیر کی نسبت حکومت کے ارادوں کے متعلق اگر کوئی بدگمانی پیدا ہو تو اس کا رفع کرنا۔

(ب) مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا اور انہیں آگے بڑھانا اور ان کی ضروریات اور تمناؤں کی حکومت کے سامنے ادب سے ترجمانی کرنا۔

(ج) دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں مخالفت کے جذبات کی نشوونما کا اس طریقے۔

. انسداد کرنا کہ لیگ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو ضرر نہ پہنچے۔

ان اغراض و مقاصد پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم لیگ انگریز حکومت کی خوشامد یا چاپلوسی کے لئے قائم کی گئی تھی یا مسلمانوں نے انگریز کی غلامی کو برداشت اور گوارہ کر لیا تھا کہ اس تنظیم میں اتنی محتاط اور نرم روح کار فرما تھی؟ اور انقلابی اور خودداری نہ روح کا عنصر نظر نہ آتا تھا۔ ایسا نظریہ قائم کرنے سے پہلے ہمیں ان حالات کا ایمانداری اور عمیق نظر سے جائزہ لے لینا چاہئے۔ جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے۔۔ مسلمان اس وقت، سیاسی، معاشی، معاشرتی غرض کسی لحاظ سے بھی اس قابل نہ تھے کہ انگریزی حکومت یا فرقہ پرست اور قوت پکڑی ہوئی ہندو کانگریس سے براہ راست ٹکر لے سکتے۔ ان کے پاس پہلے سے کوئی سیاسی قوت نہ تھی، شیرازہ بندی منتشر تھی اور ان کو باہم منظم کرنے کا یہ پہلا عملی قدم تھا جو ڈھاکہ میں اٹھایا گیا تھا اور جس کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی حیلے بہانے سے مسلمانوں کو منظم کیا جائے ان کی صفوں میں اتحاد قائم کیا جائے۔ انہیں ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جائے جہاں وہ باہم مل کر اپنے مسائل اور اپنے حقوق و مفادات کا جائزہ لے سکیں اور ان کا محاسبہ کر سکیں۔ عام مسلمانوں میں ابھی اتنا شعور پیدا نہیں ہوا تھا جو انگریز کی شاطرانہ سیاست کو سمجھ کر نپٹ سکتے۔

محسن ملت (سرسیدؒ) کی عظیم تحریک اور مساعی نے مسلمانوں میں بیداری کی جو لہر پیدا کر دی تھی اس نے صف اول کے طور پر چند جانباز سپاہی تیار کر دیئے تھے لیکن ان کے پاس ابھی اتنا سامان حرب اور تجربہ نہ تھا کہ وہ کوئی سیاسی جنگ لڑ سکتے۔ چنانچہ سیاسی منصوبہ بندی کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ انگریز حکومت اور ہندو کانگریس ۔جسے انگریز کی اعانت بھی حاصل تھی) میں سے کسی ایک کا تعاون حاصل کر کے اپنی صف بندی کی جائے۔ فرقہ پرست ہندو کے ساتھ اتحاد کسی صورت ممکن نہ تھا۔ وہ مسلمانوں سے اپنی دس سو سالہ غلامی کا بدلہ لینے پر تلا ہوا تھا اور مسلمانوں کو ہندوستان سے ختم کرنے کی ہر تجویز اور حربہ بروئے کار لا رہا تھا۔ اور انگریز؟ مسلمانوں کا خیرخواہ تو وہ بھی نہیں تھا بلکہ حقیقت اس سے بھی تلخ ہے کہ وہ ہندو سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کا دشمن تھا۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد تو اس نے اپنی آتش غضب کو جس شدت سے مسلمانوں کے خون سے ٹھنڈا کیا تھا اس کے بعد اسے اپنا خیر خواہ سمجھنا مسلمانوں کے لئے کیونکر ممکن تھا، لیکن چند دور اندیش اور ہوش مند مسلم راہنماؤں نے جن کی قیادت سرسید نے فرمائی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف انگریز کی اس انتقامی آگ کو بہت حد تک نرم کر دیا تھا۔ اور اب صورت ایسی نہ تھی کہ وہ (انگریز) مسلمانوں کا قلبی دوست اور ہمدرد ہو سکتا۔ لیکن ایسا البتہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کو اسی غیر ملکی حکومت کی مزید آتش انتقام سے بچایا جا سکتا۔ فطری طور پر اپنی تعریف کے بھوکے اور نسوانی ذہنیت کے مالک انگریز کی یہی کمزوری تھی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی سیاسی شیرازہ بندی

کرنے کے لئے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون و وفاداری کا وقتی اعلان کرتی۔
ورنہ معترضین آگے چل کر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس قدر نرم پالیسی پر قائم ہونے والی یہی وہ تنظیم تھی کہ جب مسلمان سیاسی طور پر کسی قدر باشعور اور تجربہ کار ہو گئے، ان کی صفوں میں کسی حد تک اتحاد اور مضبوطی پیدا ہو گئی تو انہوں نے اسی مسلم لیگ کے پرچم تلے غیر ملکی سامراج اور کثیر التعداد، منظم، مسلح اور طاقتور ہندو کانگریس اور ہر ایسی طاقت سے جو مسلمانوں کی تحریک کی مخالف تھی بیک وقت ٹکر لی۔ ہر طاقت کا منہ توڑ جواب دیا اور نتیجتاً دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی عظیم اسلامی مملکت وجود میں آئی اور اس ہندوستان کے سینے پر قائم ہوئی جہاں مسلمان کبھی اس قدر بے بس اور مجبور تھا کہ حق کی آواز تک بلند نہ کر سکتا تھا۔
آمدم بر سر مطلب ڈھاکہ میں قیام مسلم لیگ کے بعد تمام مسلم زعماء جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آئے تھے اپنے اپنے صوبوں اور علاقوں کو واپس چلے گئے۔ پنجاب سے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لاہور کے میاں برادران میاں محمد شاہ دین بیرسٹرایٹ لاء اور میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء نے (معہ چند دیگر ساتھیوں کے) پنجاب کی نمائندگی کی تھی اور مؤخرالذکر اس تحریک میں پیش پیش رہے تھے۔ یہ ہر دو برادران انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ باشعور، وقت کی نزاکت اور زمانے کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے اور مسلم لیگ ان کے نزدیک مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور صف بندی کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ انہیں اس بات سے انتہائی دلچسپی تھی کہ اس آرگنائزیشن کو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیا جائے تا کہ اس سے عالم گیر نتائج بر آمد ہو سکیں میاں محمد شاہ دین قانون و سیاست کے علاوہ علم و ادب سے زیادہ گہرا شغف رکھتے تھے اور ان کا نام اس، میدان میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میاں محمد شفیع کو ایک ماہر قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست سے گہری دلچسپی تھی اور مسلمانوں کی پسماندگی اور کسمپرسی ان کے سینے کا گہرا درد تھی۔ ان کے حساس اور دردمند دل کو قوم کی اس حالت یعنی۔ حقوق کی تلفی اور سیاست معاشرت اور معیشت میں مسلمانان ہند کی پسماندگی نے بہت متاثر کیا تھا اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر حرف کر دیا۔ درد ملت کی یہ چنگاری شعور کی حدود کے اندر داخل ہوتے ہی پھوٹ نکلی تھی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سلگتی رہی اور بالآخر ایک شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ میاں صاحب نے ایام کالج میں ہی لاہور کی عوامی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ذہن میں ملی سیاسی خیالات جنم لینے لگے تھے اور ان خیالات کی آبیاری کے لئے آپ پائینر (Ploneer) سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مسلم ہیرالڈ ٹرائبون وغیرہ ایسے جرائد میں مضامین لکھنے لگے۔ کالج سے فارغ ہو کر جب مقصد حیات پانے کے لئے انگلستان کی فضائے علم ریز میں پہنچے تو وہاں جسٹس میاں محمد شاہ دین، (سر) عبدالرحیم، (سر) علی امام، مولوی رفیع الدین مسٹر حسن امام ایسے

فرزندان ملت جو آگے چل کر ہندوستان کے آسمان سیاست پر آفتاب بن کر چمکے کی دوستی و صحبت میسر آئی جس نے ان کے خیالات و نظریات کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کیا۔ برطانوی قانون سیاست کی گتھیوں کا بنظر غور مطالعہ کیا اور انہیں سلجھانے کا عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے دارالعوام کے اجلاسوں میں بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ شریک رہنے لگے۔ برٹش کانسٹی ٹیوشن اور برٹش پولیٹیکل لائف کا بھی مطالعہ کرتے اور اس موضوع پر انہیں جس قدر مواد ملتا اس کو بہ نظر عمیق دیکھتے۔ اس چالاک اور شاطر سیاست دان قوم کے بڑے بڑے مدبروں اور قانون سازوں کی تقاریر سنتے اور بحث و تمحیص کا مطالعہ کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ برطانوی نظام حکومت اور انگریزی سیاست کی باریکیوں اور الجھنوں کو احسن طریقے پر سمجھنے لگے۔ لنڈن میں انجمن اسلامیہ ہند کی کاروائیوں میں بڑی دلچسپی لیتے۔ حتیٰ کہ 1890ء میں میاں شاہ دین کے وطن واپس آجانے کے بعد انجمن مذکور کے صدر منتخب ہو گئے۔ بیرسٹری سے فارغ ہو کر واپس لوٹے تو پھر سیاست وطن کی وادی پرخار میں داخل ہو گئے، اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے لگے ہوشیار پور میں جہاں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا 1892ء میں انجمن اسلامیہ ہوشیار پور کی بنیاد رکھی ساتھ ہی تحریک علی گڑھ میں شریک ہو گئے اور سرسید احمد خاں کی محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی روح رواں بن گئے، اور انجمن حمایت اسلام میں نئی روح ڈالی۔

1895ء میں مسلمانوں کی ضروریات کے پیش نظر ایک کمیٹی تشکیل میں آئی جس نے لاہور سے مشہور اخبار "آبزور" جاری کیا تو میاں شفیع اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ (بحوالہ ماہنامہ الراعی سر شفیع نمبر شمارہ دسمبر 1967ء)

1901ء میں اسی اخبار میں آپ نے سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کی جائے اور اس کا نام انڈین مسلم لیگ رکھا جائے۔ سیاست میں میاں محمد شفیع سرسید کے پیروکار اور جداگانہ قومیت و نمائندگی کے زبردست حامی تھے، اور مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے قیام کے لئے سخت بے چین تھے۔ انہیں جہاں اور جب بھی خواص و عوام سے براہ راست ملنے کا اتفاق ہوتا اس کی ضرورت پر زور دیتے۔

اجلاس ڈھاکہ سے واپس پہنچتے ہی آپ نے صوبہ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جب کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی صوبائی شاخیں قائم کرنے کے بارے میں ابھی تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اور پنجاب میں صوبائی شاخ قائم کرنے کا یہ فیصلہ ہر دو میاں برادران کی خواہش و کوشش کا نتیجہ تھا جس کی تفصیلات آگے آئیں گی اسی اثناء میں 26 اگست 1907ء کو شملہ میں ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں اپنے خطبہ صدارت میں مسلم لیگ کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتے میاں محمد شفیع نے فرمایا۔

"ملک کی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے اب وقت آگیا ہے کہ سربرآوردگان موجودہ کمزوری کی اصل وجوہات کی درست تشخیص کریں اور ان بواعث کو جو اس ضعف کا باعث ہو رہے ہیں دور کرنے میں صداقت کے ساتھ کوشاں ہوں۔"

(بحوالہ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 31 دسمبر 1907ء) فرمایا:

"مسلمانان پنجاب کی موجودہ سیاسی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمسایہ اقوام کے مقابلہ میں ہماری پسماندہ قوم کی حالت ہرگز ایسی نہیں کہ بہی خواہان قوم کے لئے تسلی بخش ہو۔ جس پہلو سے بھی اس کی حالت پر نظر ڈالی جائے آنکھوں کے سامنے ایک ایسی تصویر کھنچ جاتی ہے جو دلوں کو مایوسانہ خیالات سے بھرتی اور ہمدردان قوم کی رگوں میں سچے قومی جوش کو مجوزن کرتی ہے۔ الغرض ان تمام وسائل اور ذرائع میں جو ایک قوم کے لئے پولٹیکل قوت کا باعث ہوتے ہیں ہماری قوم مقابلتاً بہت کمزور ہے جس کے بارے نتائج قومی زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس ہو رہے ہیں۔" پنجاب میں مسلمانوں کی افرادی طاقت کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے صوبہ میں مسلمان بہ نسبت دیگر اقوام کے تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور شخصی و مجموعی عزت و وقار کو مد نظر رکھ کر مسلمانان پنجاب در حقیقت دیگر اقوام سے اگر برتر نہیں تو ان کے ہم پلہ ضرور ہیں۔ اگر شخصی وقعت کو ملحوظ رکھا جائے تو شہروں میں مسلمانو اپنی وجاہت اور انفلوئنس میں کم نہی۔ تعلیمی میدان میں مسلمان خاطر خواہ ترقی کر رہے ہیں۔ اگرچہ مغربی تعلیم کے لحاظ سے مسلمان اپنے ہم وطنوں سے پیچھے ہیں مگر گذشتہ چند سالوں میں انہوں نے خاطر خواہ ترقی کی اور تعلیمی میدان میں ان کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش ہے۔ صوبے میں ایسے دردمندان ملت موجود ہیں جو ملت کا درد رکھتے ہیں۔ صوبہ (پنجاب) میں ایسا اسلامی پریس موجود ہے جس کے ذریعے قوم کی درست طور پر راہنمائی کی جاسکتی ہے' اور جو ایک مہذب قوم کی ترقی کے لئے لابدی ہو سکتا ہے جس کا اثر قوم کی زندگی کے ہر شعبہ پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ پریس قوم کو بہبود اور ترقی کے راستہ پر لانے میں قابل قدر حصہ لے سکتا ہے۔ انگریزی اخبارات میں "ابزرور" اور اردو اخبارات میں "پیسہ اخبار" "وطن" "وکیل" "ناظم الہند" وغیرہ ایسے مؤقر جریدے موجود ہیں۔ جب یہ حالات و ذرائع موجود تھے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانان پنجاب کی سیاسی کمزوری کی وجہ کی تھی؟ اس سوال کا جواب میاں محمد شفیع ہی کے الفاظ میں یہ تھا کہ "مسلمانان پنجاب پولیٹکل کمزوری کی اصل وجہ ان کی قومی زندگی کے کسی پہلو میں بھی باضابطہ آرگنائزیشن کا نہ ہونا۔ ان کا سرمایہ اور تجارت بے طریقہ اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے ان کی سب کوششوں کا غیر متحد ہونا ہے۔" اس مسئلے کا حل تجویز کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اگر مختلف طاقتیں جو اس وقت منتشر ہیں ایک جگہ جمع ہو کر مناسب اصولوں کو مد نظر

رکھ کر بالاتفاق قومی ترقی کی غرض سے کام کریں تو ہر صاحب عقل قیاس کر سکتا ہے کہ اس کا قوم کے حق میں کس قدر مفید اثر ہو سکتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ایسی مختلف اقوام آباد ہوں کہ ان کی تعداد میں فرق ان کے مذاہب میں اختلاف۔ ان کے لٹریچر الگ۔ ان کی گذشتہ تاریخ علیحدہ اور اسی باعث ان کے مفادات بہرحال کسی عرصہ تک مختلف ہوں پھر جبکہ ہر قوم کی پولیٹکل طاقت کا انحصار بہت حد تک کچھ اس امر پر منحصر ہوتا ہے کہ ملک کی پبلک سروس میں اس قوم کا پورا حصہ ہو اور اگر یہ نہیں تو ظاہر ہے وہ قوم بمقابلہ ہمسایہ اقوام کے یقیناً کمزور ہو گی، اور اس کی یہ کمزوری قومی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر مناسب اثر انداز ہو گی۔ ان حالات کی پیش نظر ہمارے صوبے میں ایک مستقل آرگنائزیشن قائم ہونا چاہیئے جو ہماری قوم کے حقوق کی حفاظت اور اس کے آئندہ ترقی اور بہبود کی تجاویز سوچنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے موجود ہو۔ تو اس کا نتیجہ یقیناً خوشگوار بر آمد ہو گا۔" ڈاکٹر محمد انور امین لکھتے ہیں:

"درد ملت کے یہی خیالات و جذبات تھے جو میاں صاحب پر جنون کی طرح سوار تھے۔ ملکی و اجتماعی حالات و مسائل پر گہری دلچسپی رکھنے کے ساتھ اپنے علاقائی مسائل اور قومی ضروریات و ذمہ داریوں میں ان کا دلچسپی رکھنا قدرتی بات تھی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم للیگ کے اجلاس قیام ڈھاکہ کے بعد اس تنظیم کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے اور اس کی جڑوں کو مضبوط اور گہرا بنانے کے لئے سب سے پہلا قدم اہالیان پنجاب میں میاں محمد شفیع کا نام بالخصوص لیا جائے گا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ موصوف نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پنجاب میں مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میاں صاحب نے نواب وقار الملک سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی، اور انہیں اپنے ارادہ و فیصلہ سے آگاہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں 24 مارچ 1907ء کو میاں صاحب موصوف کی قیام گاہ پر لاہور میں دریں سلسلہ ایک ابتدائی جلسہ ہوا اور نو ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مجوزہ صوبائی شاخ مسلم لیگ کے قیام کے لئے ابتدائی تنظیمی مراحل کا انتظام کرے گی۔ میاں صاحب اس کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی نے مجوزہ صوبائی مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد تجویز کر کے پنجاب کے مختلف شہروں کے مسلم زعماء کو ارسال کیئے۔ پھر ایک سرکلر چھٹی ان کی توجہ اس مقصد کی طرف مبذول کرانے اور تائید مزید کی خاطر ارسال کی گئی، نیت نیک اور جذبہ مخلص ہو تو نتیجہ یقیناً خوشگوار ہوتا ہے چنانچہ عوام نے ان کے تجویز کو تسلیم کرتے ہوئے اس کمیٹی کی حوصلہ افزائی کی۔ چھ ماہ تک اس کمیٹی کے مختلف اجلاس ہوئے اور عوامی شعور و توجہ کو اس قومی ضرورت کی خاطر بیدار کیا گیا۔ جس سے حوصلہ افزا نتائج بر آمد ہوئے اور انفرادی طور پر کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں کی مختلف سماجی انجمنوں نے جلسے منعقد کیئے اور اس تجویز کی تائید میں ریزولیوشنز پاس کیئے۔ پنجاب کے پچیس بڑے بڑے شہروں سے

قریباً ایک صد سربر آوردگان نے صوبائی مسلم لیگ کی اس تجویز پر خوشی کا اظہار کیا اور اپنی پوری امداد و تعاون کا یقین دلایا۔ بالآخر 30 نومبر 1907ء کو مسلم زعمائے پنجاب کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور مسلمانان پنجاب نے کل مسلمانان ہند کی واحد سیاسی تنظیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے پہلا بنیادی پتھر رکھا۔ یہ اجلاس لاہور میں میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء کی قیام گاہ متصل چیف کورٹ پر منعقد ہوا۔

(بحوالہ روزانہ رپورٹ جنرل سیکرٹری روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 3 دسمبر 1907ء)

# مذکورہ اجلاس کے شرکاء کی فہرست

لاہور:

1- خان بہادر میاں محمد شاہ دین، بیرسٹرایٹ لاء۔
2- میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء و چیرمین اسلامیہ کالج کمیٹی۔
3- مسٹر احمد حسین، بیرسٹرایٹ لاء، منیجنگ ڈائریکٹر اوریئنٹ بنک آف انڈیا۔
4- مرزا جلال الدین، بیرسٹرایٹ لاء۔
5- میاں شاہ نواز، بیرسٹرایٹ لاء۔
6- شیخ عمر بخش بے۔اے، پلیڈر، منیجنگ ڈائریکٹر پائیز لیدر کمپنی۔
7- مولوی احمد دین بے۔اے، پلیڈر۔
8- شیخ گلاب دین، پلیڈر۔
9- شیخ تاج الدین بی۔اے، میونسپل کمشنر۔
10- میاں سراج الدین، میونسپل کمشنر۔
11- شیخ محمد بخش ٹھیکیدار۔
12- مرزا محمد اسد بیگ۔
13- مرزا اسلم بیگ رئیس۔
14- میاں نظام الدین۔
15- میاں علم الدین پنشنر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔
16- مولوی محمد انشاء اللہ خاں، ایڈیٹر روزنامہ "وطن" لاہور۔
17- میر ناظم حسین ناظم، ایڈیٹر "ناظم الہند" لاہور۔
18- مولوی محبوب عالم، ایڈیٹر روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور۔

19- منشی عبدالعزیز، مینجر "پیسہ اخبار" لاہور۔
20- خان صاحب ڈاکٹر غلام جیلانی۔
21- منشی نظام الدین۔
22- شیخ عبدالعزیز بی۔اے، ایڈیٹر "آبزرور" لاہور۔
23- خان صاحب میاں غلام محی الدین، سابق سپرنٹنڈنٹ۔
24- شیخ دین محمد۔
25- سید محمد علی جعفری ایم اے، قائم مقام پرنسپل، اسلامیہ کالج لاہور۔
26- حکیم محمد شریف۔

امرت سر:

27- خان بہادر خواجہ یوسف شاہ، آنریری مجسٹریٹ۔
28- میر حبیب اللہ آنریری مجسٹریٹ، سیکرٹری انجمن رفیق الاسلام۔
29- شیخ محمد عمر بی۔اے، بیرسٹرایٹ لاء۔
30- بابو نظام الدین اسسٹنٹ سیکرٹری انجمن اسلامیہ امرت سر۔
31- شیخ غلام محمد پروپرائٹر۔
32- میر سید محمد، ایڈیٹر "وکیل"۔

لدھیانہ:

33- شیخ محمد نصیب بیرسٹرایٹ لاء۔
34- مولوی حسن محمد ڈیلیگیٹ انجمن حمایت اسلام لدھیانہ۔

انبالہ:

35- مرزا اعجاز حسین بی۔اے، پلیڈر صدر انجمن اسلامیہ انبالہ۔

شملہ:

36- شیخ شہاب الدین تاجر۔

دہلی:

37- شیخ عبدالقادر، بیرسٹرایٹ لاء، ڈیلیگیٹ انجمن بہبود مسلمانان دہلی۔
38- مسٹر ذکرالرحمٰن بی۔اے، قائم مقام منجانب پنجابی مسلمانان دہلی۔

قصور:

39- شیخ میراں بخش پنشنر اسسٹنٹ انجینئر۔

پٹی:

40- مرزا مبارک بیگ، آنریری مجسٹریٹ۔

فیروزپور:

41- خواجہ غلام محمد۔
42- کمال الدین۔

فاضلکا:

43- خان شمس الدین ٹھیکیدار۔

منٹگمری (موجودہ ساہیوال):

44- خان صاحب غلام محی الدین۔

ملتان:

45- شیخ عبدالقادر بی۔اے، پلیڈر، رئیس، صدر ملتان میونسپل کمیٹی۔

لائل پور (موجودہ فیصل آباد):

46- میاں غلام باری پلیڈر۔
47- میاں غلام جیلانی پنشنر منصف۔

راولپنڈی:

48- مسٹر عبدالمجید، بیرسٹرایٹ لاء و سیکرٹری انجمن اسلامیہ راولپنڈی۔

بٹالہ:

49- میاں فیض غلام محی الدین رئیس و صدر انجمن اسلامیہ بٹالہ۔

مندرجہ ذیل اصحاب اجلاس میں شرکت نہ کر سکے جس کی معذرت کرتے ہوئے انہوں نے لیگ کے مقاصد سے ہمدردی اور تعاون اور اجلاس کی کامیابی کی تمناؤں کے پیغام ارسال کئے جو اجلاس میں پڑھ کر سنائے گئے۔

1- خاں بہادر احمد شاہ، آنریری ڈسٹرکٹ جج، جالندھر۔
2- میاں عبدالعزیز، بیرسٹرایٹ لاء، ہوشیار پور۔
3- میاں احسان الحق، بیرسٹرایٹ لاء، جالندھر۔
4- شیخ غلام یسین، پلیڈر، جھنگ۔
5- مولوی الف دین، پلیڈر، کیمبل پور۔
6- سردار یار محمد خاں، پنشنر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، گجرات۔
7- مولوی عبدالحق، پلیڈر، گوجرانوالہ۔
8- خواجہ ضیاء الدین، پلیڈر، لاہور۔
9- شیخ عبدالغنی، پلیڈر، کرنال۔
10- خواجہ احمد شاہ، رئیس، لدھیانہ۔
11- شیخ دین محمد، پلیڈر، لاہور۔
12- مولوی عبدالقادر، پلیڈر، لاہور۔
13- چودھری شہاب الدین، پلیڈر، لاہور۔

(بحوالہ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 6 دسمبر 1907ء)

**اجلاس کا آغاز:** جب اجلاس شروع ہوا تو مولوی محبوب عالم ایڈیٹر روزانہ پیسہ اخبار لاہور کی تحریک پر میاں محمد شاہ دین بیرسٹرایٹ لاء (مابعد جسٹس پنجاب چیف کورٹ) نے اجلاس کی صدارت کی۔ میاں محمد شفیع نے جو ابتدائی کمیٹی کے سیکرٹری اور کنوینر کی حیثیت رکھتے تھے اپنی درج ذیل رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

## میاں محمد شفیع بار ایٹ لاء کا

## خطبہ بحیثیت سیکرٹری: افتتاحی اجلاس پنجاب پروانشل مسلم لیگ لاہور (30 نومبر 1907ء):

"صاحبان! ابتدائی کمیٹی کی طرف سے میں آپ سب کا تہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہم ممبران ابتدائی کمیٹی آپ کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ نے ہم لوگوں کی استدعا پر آج کے جلسے میں شمولیت کی تکلیف فرمائی، اور خصوصاً وہ صاحبان جو پنجاب کے مختلف حصوں سے سفر کی تکالیف گوارہ کر کے آج یہاں اس قومی کام میں حصہ لینے کے لئے تشریف لائے ہیں ہمارے، خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

صاحبان! ہماری پس ماندہ قوم میں پولیٹیکل اغراض کے لئے ایک قومی انجمن قائم کرنے کی ضرورت مدتوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس بزرگ قومی لیڈر کی زندگی میں ہی، جس نے مسلمانان ہندوستان کو خواب غفلت سے جگایا، اس ضرورت کو سربر آوردگان قوم نے تسلیم کیا اور سرسید احمد خان مرحوم کی پاکیزہ اور مقدس عمر کے آخیر سالوں میں اس بزرگ کے مشورے سے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا نام "اینگلو محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" رکھا گیا تھا۔ جس کے آنریری سیکرٹری مسٹر محمود اور مسٹر تھیورڈ بیک صاحبان مقرر ہوئے تھے۔ چند سال تک وہ انجمن اپنی طرز پر جو اس وقت کے حالات کے مناسب تھی، کام کرتی رہی، مگر ان تینوں بزرگوں کی وفات کے بعد، جو اس انجمن کے روح رواں تھے، اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین بہادر نے صوبجات متحدہ میں مسلمانوں کی ایک قومی پولیٹیکل آرگنائزیشن بنانے کا کام شروع کیا اور مختلف مقامات پر تشریف لے جا کر مقامی مجلسیں قائم کیئے جانے کی تجویز کی۔ جن دنوں ہز رائل ہائینس شہزادہ ویلز اپنے سفر ہندوستان میں علی گڑھ تشریف لے گئے مسلمانان ہندوستان کے سربرا آوردگان وہاں جمع ہوئے اور اس موقع پر اس مضمون کے متعلق گفتگو ہوئی۔ ابھی لیڈران قوم اس بارے میں اپنے خیالات کا تبادلہ کر رہے تھے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ ہندوستان کی موجودہ طرز حکومت میں کیا، کیا اصلاحیں ہو سکتی ہیں۔ اس موقع پر ہماری قوم کے مرحوم لیڈر نواب محسن الملک کی کوششوں کا نتیجہ اس آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے یکم ماہ اکتوبر 1906ء کو حضور وائسرائے کی خدمت میں ہماری پس ماندہ قوم کی طرف سے ایک میموریل پیش کیا جس میں مسلمانوں کے قومی حقوق اور ضروریات کا بالتشریح اظہار تھا۔ جن دنوں میں اس میموریل کے مسودے کی بابت باہمی مشورہ ہو رہا تھا مسلمانان ہند کے قائم مقاموں کا ایک جلسہ

بمقام لکھنؤ بماہ ستمبر ہوا جس میں امرتسر کی طرف سے خان بہادر خواجہ یوسف شاہ اور لاہور کی طرف سے یہ نیاز مند موجود تھے۔ وہاں پر بھی مسلمانان ہندوستان کی پولیٹیکل آرگنائزیشن قائم کرنے کا مشورہ کیا گیا تھا جس میں نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقار الملک و دیگر سربرآوردگان قوم موجود تھے اور قرار پایا کہ اس امر کی نسبت بمقام شملہ، جس وقت آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن کے ارکان جمع ہوں، پھر مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق شملہ میں ہزہائنس سر آغا خاں کی موجودگی میں اس مسئلے پر گفتگو ہوئی اور سب عالی قدر بزرگان قوم نے جو اس وقت موجود تھے فیصلہ کیا کہ بماہ دسمبر، جب مختلف اطراف ہند سے قوم کے قائم مقام ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے بمقام ڈھاکہ جمع ہوں اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ دسمبر گزشتہ میں اس قرار داد کے مطابق بمقام ڈھاکہ قائم مقامان قوم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس کے صدر نواب وقار الملک بہادر تھے، اور اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کا بنیادی پتھر رکھا گیا اور ایک کمیٹی اس کے قواعد تیار کرنے کے لئے مقرر کی گئی جس کی محنتوں کا نتیجہ اس سال بمقام کراچی سالانہ جلسے کے موقع پر قوم کے روبرو پیش ہو گا۔

ے ڈھاکہ کے جلسے کے بعد نواب وقار الملک بہادر کے ساتھ میری خط و کتابت پنجاب پراونشل مسلم لیگ قائم کئے جانے کے متعلق شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بتاریخ 24 مارچ 1907ء کو ایک مختصر جلسہ لاہور میں اس امر پر غور کرنے کی غرض سے اس جگہ منعقد ہوا جہاں آپ سب جمع ہیں۔ اس جلسے میں پراونشل مسلم لیگ کے قیام کا کام ہاتھ میں لینے کی غرض سے 9 ممبران کی ایک ابتدائی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی کہ وہ ابتدائی مرحلوں کا بندوبست کرے اور حاضرین نے مہربانی سے مجھے اس کمیٹی کا سیکرٹری منتخب کیا۔ گزشتہ چھ ماہ میں اس کمیٹی کے وقتاً فوقتاً متعدد اجلاس ہوئے۔ جن میں اول اغراض و مقاصد لیگ تجویز کرکے ان کو پنجاب کے جملہ سربرآوردگان کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔ اور ایک سرکلر چٹھی بزرگان کو اس کام کی طرف توجہ دلانے کے لئے جاری کی گئی۔ اس چٹھی کے جو جواب پنجاب کے مختلف شہروں سے آئے انہوں نے ابتدائی کمیٹی کی اس تجویز کی کامیابی کی کماحقہ امید دلائی۔ پنجاب کے پچیس شہروں سے قریباً ایک صدر سربرآوردگان نے تحریری اور زبانی اظہار مسرت کیا اور مسلم لیگ قائم کرنے میں امداد دی، وعدے فرمائے، علاوہ ازیں بہت سی انجمنوں نے جلسے کرکے اس تجویز کی تائید میں ریزولیوشن پاس کئے۔ بعدازاں اس ابتدائی کمیٹی نے لیگ کی کاروائی کے متعلق چند قواعد تجویز کیے جو اس نیاز مند نے چھپوا کر تمام ضلعوں میں تقسیم کیے اور جو غالباً حاضرین کی خدمت میں ارسال ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ تجویز کی کہ ماہ نومبر کے آخیر ہفتے میں چیدہ احباب کا ایک خاص جلسہ لیگ کے اغراض و مقاصد پاس کرنے اور دو تین اور قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے منعقد کیا جائے۔ لیگ کے

اغراض اور حالات موجودہ کو مدنظر رکھ کر سب احباب کی متفقہ رائے ہوئی کہ اس پہلے مجمع میں باہر کے مقامات کے چیدہ چیدہ قائم مقاموں کو مدعو کیا جائے اور لاہور سے ان صاحبان کا انتخاب کیا جائے جن کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اس قومی کام کے متعلق خاص مذاق رکھتے ہیں اور قوم مسلمانان کی اس عام پالیسی کے، جو لیڈران قوم نے قوم کے لئے قرار دے رکھی ہے، نہ صرف مؤید ہی ہیں بلکہ اس نئے کام کو پورے شوق کے ساتھ شروع کریں گے، اور چونکہ ایک ایسے قومی کام کے متعلق ابتدا میں ہر طرح پس و پیش کا خیال کر کے کاروائی شروع کرنا ہی کامیابی کا ذریعہ ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں ملک کی موجودہ حالت میں ایک عام کانفرنس یا جلسے کا پولیٹیکل آرگنائزیشن کے لئے جمع کرنے مناسب نہیں تھا اس لئے ابتدائی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق میں نے بیرونجات میں جو خطوط جاری کئے ان میں اپنے دوستوں سے استدعا کی کہ وہ اپنے اپنے شہروں سے ایک یا دو قائم مقام اس جلسے میں شمولیت کے لئے منتخب فرما دیں۔ البتہ امرتسر کے بزرگان کی خواہش کے مطابق ان کو اس عام قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ الحمدللہ کہ ان جملہ کوششوں کا نیک نتیجہ اس تشفی بخش صورت میں ظاہر ہوا ہے جو اس وقت آپ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ میں آپ کو صدق دل سے یقین دلاتا ہوں کو جو دلی خوشی مجھے اور ابتدائی کمیٹی کے دیگر ممبران کو اس قوم کام کو شروع کرنے اور پنجاب کے اس قدر معزز احباب کے یہاں جمع ہونے سے ہوئی ہے اس کا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہو سکتا۔ آج کا جلسہ ہمیں اس بات کا قطعی یقین دلا رہا ہے کہ آخر کار ہماری قوم کے سربرآوردگان اس قومی فرض کو بخوبی محسوس کرنے لگے ہیں اور کمر ہمت باندھ کر اس کار عظیم کو بوجھ کمال دلچسپی سے اپنے کندھوں پر لینے کے لئے تیار ہیں۔

میرے بھائیو! تجربے نے دکھایا ہے کہ اپنی پسماندہ قوم کی بہبودی کے لئے بہی خواہانِ قوم کتنی ہی صداقت کے ساتھ کسی کام کو شروع کیوں نہ کریں خود ہم میں سے ہی اس کے مخالف پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جوانمردان قوم کو ایسی مخالفتوں کی پرواہ نہیں کرنا چاہئے اور خداوند کریم پر بھروسا کر کے اپنے قومی فرائض کی ادائیگی میں نیک نیتی کے ساتھ سرگرم رہنا چاہئے۔ اگر ہم اس نئی آرگنائزیشن کے ذریعے وہ نیک نتائج جن کی ہم کو امید ہے بہم پہنچا کر قوم کے سامنے رکھیں گے، اگر ہم اپنی کوششوں سے قوم کو یہ دکھلا دیں گے کہ یہ اہم بوجھ محض قومی خیر خواہی اور قومی ترقی کی غرض سے آپ صاحبان نے اپنے سر پر لیا ہے تو یقین جانیے کہ قوم بالاتفاق پروانشل لیگ کی نہ صرف تائید کرے گی بلکہ آپ کی کوشش کو کامیابی کی حد تک پہنچانے میں پوری امداد کرے گی۔ سلطنت عالیہ انگلستان نے اپنی فیاضی سے جو وسائل اور ذرائع قومی ترقی کے لئے ملک ہندوستان میں بہم پہنچائے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان وسائل اور ذرائع سے فائدہ اٹھائیں! قوم کی توجہ ان کی طرف مبذول کریں تاکہ ہمسایہ قوموں کی طرح ہماری پس ماندہ قوم بھی خواب غفلت سے بیدار

ہو کر اپنی پولیٹیکل ضروریات کو سمجھے اور ان کو بہم پہنچانے کی مناسب طریقے پر کوشش کرے۔ اگر ہم صداقت کے ساتھ اس قومی فرض کی ادائیگی میں کوشاں ہوں گے تو خداوند کریم جو نیتوں کو سمجھنے اور دلوں کو جاننے والا ہے یقیناً ہمتوں میں برکت دے گا اور ہماری کوششوں کو کامیابی کی حد تک پہنچا دے گا۔ آخر میں ممبرانِ ابتدائی کمیٹی کی طرف سے پھر میں آپ صاحبان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدواند کریم اس مجمع کو قوم کے لئے چشمۂ فیض بنادے اور آپ کی کوشش کے وہ نیک نتائج ہوں جن کی ہم سب کو دل سے امید ہے اور جن کا ہم سب کو انتظار ہے۔"

(مطبوعہ: روزنامہ پیسہ اخبار لاہور، مورخہ 3 دسمبر 1907ء)

## میاں محمدؒ شاہ دین کا خطبہ صدارت:

## افتتاحی اجلاس پنجاب پراونشل مسلم لیگ لاہور

(مورخہ 30 نومبر 1907ء)

حضرات! آج ہم اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی، جو گذشتہ سال میں ڈھاکہ قائم ہوئی تھی، ایک شاخ صوبہ پنجاب میں کھولی جائے۔ جن خاص حالات کیوجہ سے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی تھی ان کے اعادے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی بالخصوص اس لئے کہ آپ سب صاحبان ان حالات سے کم وبیش واقف ہیں۔ مگر اس قدر عرض کرنا شاید ناموزوں نہ ہوگا کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں ہندوستان کی مختلف اقوام اور دور دراز حصوں میں جو مادی اور اخلاقی ترقی ہوئی ہے اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر گوشے میں ایک حیرت انگیز حرکت کے آثار نمایاں ہیں اور ان جماعتوں میں جو احساس پیدا ہو گیا ہے جو یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ قوموں کے ملکی کارناموں کی بنیاد ہیں، اپنے حقوق کی شناخت اور ان کی حفاظت کی خواہش بڑی شدو مد سے جوش زن ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اس نئی تحریک کے احاطۂ اثر میں داخل ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ امر بلاشبہ قابل افسوس اور تعجب انگیز ہوتا اگر ہم اس نئی روشنی اور نئی ترقی کے عمدہ اور صحت بخش خیالات اور اثرات سے علیحدہ اور غیر مانوس رہتے۔ اہل ہند کے ذہنی قواء پر مغربی علوم و فنون کا اثر ایسا گہرا پڑا ہے کہ ان کی اخلاقی و معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا ہے اور ان متحرک خیالات کی وجہ سے، جو مغربی طرز تعلیم سے وابستہ ہیں، قومیت کا شوق بعض تیز رفتار فرقوں کے رگ وریشے میں خون کی طرح سرائیت کر گیا ہے۔ اس زمانے کو گزرے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ جبکہ مغرب و مشرق میں ان سیاسی خیالات اور تمدنی آئینوں کے

اعتبار سے، جن کو قوموں اور ملکوں کی ترقی اور تنزل میں بہت بڑا دخل ہے، زمین و آسمان کا فرق تھا اور وہ فرق خواہ بوجہ دیرینہ تاریخی حالات اور روایات اور خواہ بہ سبب طبعی اور قومی اور اخلاقی اختلافات کے اس قدر بین اور اصولی تھا کہ اس کا رفع ہونا قریباً محال معلوم ہوتا تھا، مگر انقضاء زمانہ اور اس کی رفتار میں وہ جادو ہے جو ناممکن کو ممکن اور محال کو آسان ثابت کر دکھاتا ہے۔ خدا کی شان دیکھو کہ جزیرہ نمائے عرب کے خشک اور گرم ریگستان سے ایک ایسی طلسم آمیز ہوا اٹھی کہ کوہ و بیاباں اور بحروبر کی نامتناہی مسافتوں کو طے کرتی ہوئی مغرب اقصیٰ تک پہنچی اور اپنے خوشگوار اور دل خوش کن جھونکوں میں ملکوں اور قوموں کو سمیٹتی ہوئی ایک سفید اور شفاف ابر رحمت کی طرح مہذب دنیا کے بڑے حصے پر چھا گئی۔ خوابیدہ مغرب کو بیدار مشرق نے میٹھی نیند سے جگایا اور دونوں حریف کچھ عرصے کے لئے ترقی کے چمن میں باہم مل کر گل گشت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد زمانے نے پھر کروٹ بدلی اور اب جو دیکھا تو کتاب ترقی کا دوسرا ورق پیش نظر تھا۔ خفتہ نصیب ممالک یکایک جاگ اٹھے اور بیدار مغز قومیں عیش کے خمار میں چور ہو کر سو گئیں اور ایسی گہری نیند سوئیں کہ ان کا پھر بیدار ہونا محال معلوم ہوتا تھا۔

"کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کے حشر تک جاگنا قسم ہے۔"

کچھ اور زمانہ گزر گیا اور اب تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ مغرب دبے پاؤں مشرق کی خواب گاہ میں آیا ہے اور شب گزشتہ کی بلاخیز اور ہوش رُبا غنودگی سے اپنے پرانے دوست کو ہلا ہلا کر بیدار کرنے میں مصروف ہے۔ یہ قابل قدر کام ایسے مرحلے کو پہنچ چکا ہے کہ مشرق نے کروٹ بدلی ہے، آنکھیں مل کر کھولی ہیں اور اٹھنے کو تیار ہے اور اور اس سوچ میں ہے کہ اٹھ کر کیا کرے؟ یہ حالت ایک نہایت نازک حالت ہے اور اہل ہند کو، جو مشرقی قوموں میں چند وجوہات سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں، اس حالت کو نہایت مصلحت بینی، عاقبت اندیشی اور عالی حوصلگی سے نباہنا ضروری ہے۔

آیئے ہم ایک لحظے کے لئے غور کریں کہ ہندوستان میں اس خاص حالت کے ساتھ ہم مسلمانوں کا کیا اور کیسا تعلق ہے اور ہمارا طریق عمل اس کی نسبت کیا ہونا چاہئے۔

اس امر کے متعلق سب سے پہلا سوال جو ہم کو مد نظر رکھنا چاہئے یہ ہے کہ جو پولیٹیکل تعلق انگریزی قوم کو اہل ہندوستان کے ساتھ ہے۔ اس کا قائم رہنا اور مستحکم ہونا ہماری بہبودی اور ہر دو اقوام کی آئندہ بہتری کے لئے لابدی ہے اور جو عمارت قومی اور ملکی ترقی کی ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لئے بنا رہے ہیں اور بنانا چاہتے ہیں اس کا بنیادی پتھر یہی خیال ہے۔

دوسرا اصول جس پر ہم مسلمانوں کا عمل مبنی ہونا چاہئے یہ ہے کہ مغربی تعلیم و خیالات اور جدید آئین ہائے ترقی کا ہم کو پورا فائدہ اٹھانا ہے کیونکہ یہ امر ناممکن ہے کہ آج کل کے زمانے میں

جدید علوم و فنون اور ترقی کے نئے اسلوبوں کا جو سیلاب زوروں پر چڑھا ہے اس کے تلاطم سے خوف کھا کر ہم اپنی ناؤ اپنے بعض قدیم خیالات کے بیکار اور پایاب نالے میں لے جائیں اور وہاں آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ ہمیں اپنی قوم کی کشتی عین منجدھار میں کھینی پڑے گی اور ہمیں ان مشقتوں اور دقتوں اور خطروں کے لئے مردانہ وار تیار رہنا چاہئے جو ایک قومی بازو حوصلہ مند باہمت اور شیر دل ملاح کو طوفان کے زور اور بجلی کی کڑک میں ایک ناپیدا کنار سمندر پر پیش آتے ہیں۔ زمانۂ جدید میں باہم مقابلے سے اپنی مدد آپ کر کے ترقی کرنا شخصی اور قومی فلاح کے لئے اکسیر کا اثر رکھتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ جس قوم کا طریق عمل اس اصول کے مطابق نہ ہو گا وہ ایک دن قعر تنزل میں گر کر رہے گی۔ ہماری خوش قسمتی سے ہماری ہمسایہ قوم ہنود جو پہلے سے اس ملک کی علمی اور تمدنی خزانوں کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اس اصول پر جان توڑ کر عمل کر رہی ہے اور یہ مہذب دنیا کو دکھا رہی ہے کہ گذشتہ ادبار اور پست ہمتی نے مشرق کی کمر توڑ دی ہے تاہم ہندوستان کی ایک ممتاز قوم اپنے ملک کی بوسیدہ ہڈیوں میں جدید علمی ترقی کی نئی روح پھونکنے کی قابلیت رکھتی ہے۔

ہم مسلمانوں کو اس روشن خیالی کی تقلید کرنا لازمی ہے تاکہ ہم بھی اپنی گمشدہ تہذیب کو پھر حاصل کر سکیں اور اس پر جدید اصولِ ترقی کا رنگ چڑھا کر زمانہ موجود کی طاقتور قوموں کے ہم قدم ہو کر چل سکیں اور تمدن اور شائستگی کی دشوار منزلیں طے کریں۔

مغربی تعلیم کے متعلق، جو جدید تہذیب کے حصول کے لئے اک لازمی ذریعہ قرار دی جا چکی ہے، ہم مسلمان کچھ کر چکے ہیں اور کچھ کر رہے ہیں مگر موجودہ طرزِ حکومت کے نتائج سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم محض تعلیمی ترقی پر اپنی قومی فلاح کا مدار نہ رکھیں بلکہ ضروریات زمانہ کے مطابق اپنے پولیٹیکل حقوق کا احساس حاصل کر کے ان کی کافی نگہداشت کریں، اور اس غرض کے لئے سب قسم کے لوازمات جو انگریزی سلطنت کے قیام کے کسی نہج سے مغائر نہ ہوں مہیا کریں اور یہ امر یدیہی ہے کہ گذشتہ ملکی حالات اور چند قومی اور مذہبی اختلافات کی وجہ سے، جو ہر حصہ دنیا میں کم و بیش پائے جاتے ہیں، ملک ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے بعض قومی اغراض ان اغراض سے متحد نہیں ہیں جو دیگر اقوام ہند کے پیش نظر ہیں اور اس لئے ان اغراض کی تکمیل کے لئے ہمارا طریق عمل کسی حد تک بہت عرصے کے لئے جداگانہ رہے گا۔ علاوہ اس کے حکمران قوم کے مفتوح قوموں کے ساتھ جو باہمی ملکی اور اخلاقی تعلقات ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں ان کی کیفیت اور وسعت کے متعلق ہم مسلمانوں کے خیالات بعض دیگر ترقی یافتہ قوموں کے خیالات سے مختلف ہیں اور اگر موجودہ حالات میں ملک میں کوئی بہت بڑی تبدیلی واقع نہ ہوئی تو غالباً ایک عرصے تک مختلف رہیں گے۔ پس یہ امر لازمی ہے کہ ہم مسلمان اپنی خاص قومی

ضروریات کا احساس کسی حد تک ایک علیحدہ بنیاد پر اور ایک مخصوص پیمانے پر کریں اور ان کے پورا کرنے کے وسیلے ایسے اختیار کریں جو ان وسیلوں سے نسبتاً علیحدہ ہوں جو دوسری ہمسایہ قوموں نے اپنے حالات اور خیالات کے مطابق اختیار کر رکھے ہیں۔ ہم کو از روئے تجربہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کے باشندے ابھی تک اس امر کے ناقابل ہیں کہ ان کو اس قسم کے پولیٹیکل حقوق اور اختیارات دیئے جائیں جو اعلیٰ درجے کی مہذب اور خود مختار قوموں کو یورپ میں حاصل ہیں کیونکہ جو محدود اختیارات اور حقوق ان کو دیئے جا چکے ہیں ان کے استعمال کرنے میں بدقسمتی سے ہمارے تعلیم یافتہ ہم وطنوں کی بعض جماعتوں نے اعتدال، خوش اسلوبی اور عالی حوصلگی سے کام نہیں لیا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری پولیٹیکل خواہشات ہماری قومی اور شخصی استعداد کی حد تک محدود رہیں اور ان کی تکمیل کے ذرائع اختیار کرنے میں ملکی اور انتظامی دقتوں کا خیال ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے۔

یہ اصول مجملہ ان چند اصولوں کے ہیں جن کی بناء پر آل انڈیا مسلم لیگ گزشتہ سال میں قائم کی گئی تھی، اور انہی اصولوں کے مطابق اپنی قومی اغراض حاصل کرنے کے لئے اس لیگ کی ایک شاخ اس صوبہ پنجاب میں ہم کو آج قائم کرنا ہے۔

لاہور چونکہ اس صوبے کا نہ صرف دارالحکومت بلکہ علمی و تمدنی مرکز ہے اس لئے ایسی شاخ کے قائم کرنے کے لئے اور کوئی شہر لاہور سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا۔ اس شہر میں اس سے پہلے بعض ایسی اسلامی انجمنیں موجود ہیں جو کم و بیش کامیابی کے ساتھ بعض خاص خاص اغراض کی تکمیل کر رہی ہیں اور امید ہے، کرتی رہیں گی۔ اِن سب میں "انجمن اسلامیہ" ایک ایسی انجمن ہے جس نے اپنے وقت میں چند پولیٹیکل معاملات کے متعلق، جن کا اثر پنجاب کے مسلمانوں پر پڑتا تھا، خاص معین حدود کے اندر نہایت عمدہ اور قابل تعریف کام کیا ہے۔ مگر جدید ملکی حالات اور ہماری بعض نوزائیدہ پولیٹیکل ضروریات کے لحاظ سے انجمن اسلامیہ کانسٹی ٹیوشن کافی وسیع نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس کے ممبران کے معزز گروہ میں ایک معقول تعداد عہدیداران سرکاری کی شامل ہے۔ ہم اس کو آل انڈیا لیگ کی شاخ نہیں بنا سکتے۔ نئی ضروریات اور اغراض کی تکمیل نئے ذرائع سے ہونا لازمی ہے اور اس لئے مجبوراً ہم کو اس شاخ کے علیحدہ قائم کرنے کا خیال دامن گیر ہوا ہے۔ اس نئی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:

1- مسلمانان پنجاب کے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کرنا اور انہیں ترقی دینا اور مسلمانوں میں محبت قوم و وطن کی روح پھیلانا۔
2- مسلمانانِ ہندوستان کی ترقی اور بہبود کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر شاخوں سے مل کر کام کرنا۔

3- مسلمانوں کے درمیان برٹش گورنمنٹ کی نسبت سچی وفاداری کا خیال رکھنا اور بڑھانا۔ ملک معظم کی رعایائے ہندوستان کے متعلقہ قوانین و احکام کی نسبت مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کرنا۔

4- مسلمانان ہندوستان کے تمام مختلف فرقوں اور نیز مسلمانوں اور ملک کی غیر مسلم اقوام کے مابین رشتہ اتحاد و مودت قائم رکھنا اور بڑھانا۔

اس موقع پر ان مقاصد پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں، صرف اس قدر عرض کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان اغراض کی تکمیل میں اس نئی انجمن نے حسن عقیدت اور نیک نہادی کے ساتھ کوشش کرنا اپنا فرض سمجھا اور کسی حد تک عملاً اس کوشش میں کامیاب ہوئی تو قوم سمجھے گی کہ اس کے قائم کرنے میں ہمیں اپنا عزیز وقت اور روپیہ ضائع نہیں کرنا پڑا اور اگر اس کی آئندہ کاروائی سے کوئی عملی نتیجہ مرتب نہ ہوا تو سمجھا جائے گا کہ ہم نے بھی بعض دیگر مجلسوں کی طرح اپنے تئیں قابل مضحکہ ثابت کر دکھایا ہے۔ خدا ہم کو کارِ نیک کی توفیق دے۔"

(متن خطبہ صدارت میاں محمد شاہ دین اجلاس بتاریخ 30 نومبر 1907ء مطبوعہ پیسہ اخبار لاہور بمورخہ 3 دسمبر 1907ء و ماہ نامہ نصرت لاہور جنوری 1968ء)

# اغراض و مقاصد پنجاب پراونشل مسلم لیگ

اس صوبائی مسلم لیگ (پنجاب) کے اغراض و مقاصد جن کی وضاحت میاں محمد شاہ دین نے اپنے خطبہ صدارت میں بھی کی تھی مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ دی تھی جو آل انڈیا مسلم لیگ اپنے اجلاس ڈھاکہ میں منظور کر چکی تھی اور وہی روح تھی جو مرکز میں کار فرما تھی یعنی۔

1- مسلمانانِ پنجاب کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کرنا انہیں ترقی دینا اور مسلمانوں میں محبت قوم و وطن کی روح پھیلانا۔

2- مسلمانانِ ہندوستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر شاخوں سے مل کر کام کرنا۔

3- مسلمانوں کے درمیان برٹش گورنمنٹ کی نسبت سچی وفاداری کا خیال رکھنا ملک معظم کی رعایا ہندوستان کے متعلقہ قوانین واحکام کی نسبت مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کرنا۔

4- مسلمانانِ ہندوستان کے تمام مختلف فرقوں اور نیز مسلمانوں اور ملک کی غیر مسلم اقوام کا مابین رشتہ اتحاد و مؤدت قائم رکھنا اور بڑھانا۔

**عہدیداران وانتظامی کابینہ:** انتخابات کے بعد صوبائی لیگ جو انتظامی شکل وجود میں آئی وہ یہ تھی۔ (مطبوعہ در روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 6

دسمبر1907ء)

یہ انتخابات 19 دسمبر1907ء کے بعد میں ہوا۔

صدر — خان بہادر میاں محمد شاہ دین بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)

نائب صدر — (1) نواب محمد علی خان قزلباش رئیس (لاہور)
(2) حکیم محمد اجمل خان رئیس (دہلی)
(3) خان بہادر سیٹھ آدم جی صاحب انجمن اسلامیہ و آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی۔

جنرل سیکرٹری — میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء صدر انجمن حمایت اسلام لاہور۔

جوائنٹ سیکرٹریز — (1) مولوی محبوب عالم ایڈیٹر روزانہ پیسہ اخبار لاہور۔
(2) شیخ عبدالعزیز بی-اے ایڈیٹر "ابزرور" لاہور۔

فنانشل سیکرٹری — مرزا جلال الدین بیرسٹرایٹ لاء۔

## مجلس عاملہ:

1- میاں سراج الدین میونسپل کمشنر۔
2- شیخ عمر بخش بی-اے پلیڈر۔
3- مولوی احمد دین بی-اے پلیڈر۔
4- چودھری شہاب الدین بی-اے-ایل-ایل-بی پلیڈر۔
5- خواجہ کمال دین بی-اے ایل-ایل-بی پلیڈر۔
6- شیخ تاج دین بی-اے ایل-ایل-بی پلیڈر و میونسپل کمشنر۔
7- خواجہ ضیاء الدین پلیڈر۔
8- مولوی محمد انشاء اللہ خان ایڈیٹر "وطن" لاہور۔
9- منشی عبدالعزیز مینجر پیسہ اخبار لاہور۔
10- میر ناظم حسین ناظم ایڈیٹر ناظم الہند۔
11- حکیم غلام نبی۔
12- حکیم محمد شریف۔
13- خان صاحب غلام جیلانی شمس الاطباء۔
14- شیخ محمد بخش کنٹریکٹر۔
15- خواجہ غلام محمد (فیروزپور)

16- مرزا اعجاز حسین بی-اے ایل-ایل-بی پلیڈر انبالہ-
17- خواجہ احمد شاہ رئیس و میونسپل کمشنر لدھیانہ-
18- شیخ محمد نعیب بیرسٹرایٹ لاء (لدھیانہ)
19- شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء (دہلی)
20- شیخ عبدالحق بی-اے ایل-ایل-بی-

## قرار دادیں:

(1) اس اجلاس میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں ان میں پہلی قرار داد آل انڈیا مسلم لیگ کو تسلیم کرتے ہوئے صوبائی لیگ کے اس سے الحاق کے بارے میں تھی- یہ قرار داد شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء نے پیش کی- کہ "یہ جلسہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ضرورت کو پہچانتا ہے- اس کے قیام کو مسلمانان ہند کے لئے معتبر سمجھتا ہے- پنجاب میں اس کی شاخ قائم کرنے کی اشد ضرورت سے واقف ہو کر پروانشل مسلم لیگ صوبہ پنجاب قائم کرتا ہے-" جس کی محمد عمر (امرتسر) خواجہ گل محمد (فیروز پور) مرزا اعجاز حسین (انبالہ) شیخ تاج الدین (لاہور) اور میاں غلام جیلانی (لائل پور) نے تائید کی- شیخ عبدالقادر نے اپنی قرارداد کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے آرگنائزیشن کے فوائد اور مسلمانوں کو اپنے مفادات کی نگہداشت و تحفظ کی ضرورت پر سخت زور دیا- اس دوران میاں محمد شاہ دین (بوجہ سخت بیاری دُختر) چلے گئے اور بقیہ اجلاس کے صدارت شیخ عبدالقادر نے کی-

اتفاق رائے سے قرار پایا کہ اس لیگ کا نام "پنجاب پراونشل مسلم لیگ" ہو- بعد میں لیگ کے مقاصد پر جو ابتدائی کمیٹی نے قرار دیئے تھے بحث ہوئی اور آخر کار وہ منظور ہوئے-

پھر قواعد و ضوابط جلسہ کے سامنے پیش ہوئے اور ایک سب کمیٹی قائم کی گئی کہ وہ ان قواعد و ضوابط پر غور کرکے دوسرے روز جلسہ کے سامنے پیش کرے- کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے-

1- شیخ عبدالقادر 2- شیخ عبدالعزیز 3- مولوی محبوب عالم 4- مولوی احمد دین 5- کمال الدین 6- میاں گل محمد 7- غلام محمد 8- مولوی اعجاز حسین 9- سید محمد 10- مولوی انشاء اللہ خان 11- میاں محمد شفیع- اس کے بعد اجلاس اگلے روز کے لئے ملتوی کر دیا گیا-

(بحوالہ روزانہ "پیسہ اخبار" لاہور شمارہ 6 دسمبر 1907ء)

**جلسہ کی دوسری نشست:** اتوار یکم دسمبر 1907ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس کی دوسری نشست حسب سابق زیر صدارت میاں محمد شاہ دین ہوئی- گذشتہ روز قائم شدہ سب کمیٹی کی رپورٹ پیش ہو کر بحث ہوئی اور مناسب ترمیمات

کے ساتھ اس کی سفارشات منظور کرلی گئیں۔
یہ قرار پایا کہ حاضرین جلسہ اس پنجاب پروانشل مسلم لیگ کے ممبر قرار دیئے جائیں۔ جن کے نام رجسٹر ہوئے ان کے علاوہ صوبہ کے ہر ضلع کے مزید پچاس اصحاب کے نام یکے بعد دیگرے پیش ہوئے اور وہ درج رجسٹر کئے گئے۔

(2) میاں محمد شفیع نے مسلمانان پنجاب کے دو انتہائی اہم مسائل کی طرف ایوان کی توجہ مبذول کرانے کے لئے دو قرار دادیں پیش کیں۔ پہلی قرارداد میں انہوں نے کہا کہ حکومت نئی اصلاحات کا نفاذ کرنے والی ہے جس پر مسلمانوں کو سخت توجہ دینے کی ضرورت ہے چنانچہ کونسلوں کی اصلاحات کی مجوزہ سکیم کے متعلق مسلمانان پنجاب کی رائے ایک عرضداشت تمیز کر کے حکومت کے پاس بھیجی جائے یہ قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی اور ایسی عرضداشت تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے ارکان حسب ذیل نامزد ہوئے۔

(1) میاں محمد شاہ دین (2) میاں محمد شفیع (3) خواجہ یوسف شاہ (4) محمد عمر (امرتسر) (5) شیخ غلام احمد (6) شیخ عمر بخش (7) مولوی محبوب عالم (8) شیخ عبدالعزیز۔

(3) پنجاب میں ملازمتوں میں مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی۔ مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہونے کے باوجود ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا اور عام تعلیم یافتہ مسلمان بیروزگاری کا شکار ہو رہے تھے۔ میاں محمد شفیع نے مسلمانوں کے اس تکلیف دہ اور حق تلف پہلو پر نظر رکھتے ہوئے حاضرین جلسہ کی توجہ مبذول کرائی کہ "صوبے کے مختلف صیغوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے قرار پایا کہ ایک وفد اس سلسلہ میں لفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ملے اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کے متعلق ایک عرضداشت پیش کرے۔ اس سلسلہ میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی وہ یہ تھی:

(1) میاں محمد شفیع (2) میاں محمد شاہ دین (3) شیخ عمر بخش (4) مولوی احمد دین (5) میاں نظام الدین (6) مولوی انشاء اللہ خاں (7) شیخ عبدالعزیز (8) مولوی محبوب عالم۔

اس سلسلہ میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس کے متعلق مسلمان امیدواروں کے نام رجسٹر میں درج کیئے جائیں اور مختلف صیغوں میں لائق اور قابل مسلمانوں کو ملازم ہونے میں مدد دی جائے۔

## ڈاکٹر محمد انور امین کا تحقیقاتی تجزیہ بسلسلہ

"کیا اس سے قبل بھی کوئی صوبائی لیگ موجود تھی؟"

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ ذکر قارئین اور خصوصاً محققین کے لئے یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے قیام کے وقت ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ چند حضرات نے ایک متوازی صوبائی مسلم لیگ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن چند سربر آوردگان ملت کی دانشمندی اور ہوشمندی کی وجہ سے یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ مسٹر عظیم حسین نے اپنے باپ کی سوانح عمری "فضل حسین" انگریزی صفحہ 97 میں ایک اور صوبائی مسلم لیگ کے وجود کا ذکر کیا ہے جو بقول ان کے مذکورہ صدر "پنجاب پراونشل مسلم لیگ" کے قیام سے قبل قائم تھی، لیکن موصوف کے اس بیان کی ان کی اپنی کتاب کے علاوہ کسی اور ذرائع سے تائید نہیں ہوتی۔ جبکہ اس کی تردید پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے قیام سے قبل و مابعد میاں محمد شفیع اور نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین کے مابین خط و کتابت اور ہم عصر مؤقر جریدگان سے ہوتی ہے۔

پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے قیام کے فوراً بعد اگلے روز یعنی 2 دسمبر 1907ء کو میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء منتخب سیکرٹری صوبائی لیگ سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو مندرجہ ذیل تار کے ذریعے اطلاع دی۔

(حوالہ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 6 دسمبر 1907ء)

"منجانب میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء جنرل سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ بخدمت نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ امروہہ (داد آباد)

تار مورخہ 2 دسمبر 1907ء۔

پراونشل مسلم لیگ قائم ہوگئی ہے۔ جناب کو مبارک ہو۔"

اور وقارالملک مولوی مشتاق حسین نے اس کا جواب برقیہ سے دیا:

"منجانب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ بنام میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء لاہور

تار مورخہ 3 دسمبر 1907ء

پنجاب پراونشل مسلم لیگ قائم کرنے پر آپ کو بہت مبارک باد پہنچے۔"

یہ دونوں برقیے روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور کی 6 دسمبر 1907ء کی اشاعت میں اپنے متن کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، اور 9 دسمبر کی اشاعت میں مؤقر روزنامہ اپنے اداریہ میں "پنجاب پروانشل مسلم لیگ" کے جلی عنوان سے رقمطراز ہے کہ:

"اوائل گذشتہ ہفتہ میں اس ناگوار و افسوس ناک واقعہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے باضابطہ قائم ہونے پر عین اس روز کہ جس دن اس کا افتتاحی جلسہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا چند اشخاص نے اس کا نام معلوم کرکے اپنی ایک انجمن کا بھی یہی نام رکھ لیا اور اشتہار

چھاپ کر راتوں رات تقسیم کر دیا اور پبلک پر یہ ظاہر کیا کہ ان کی انجمن آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے پراونشل مسلم لیگ قرار پا چکی ہے۔ حالانکہ یہ بیان حقیقت سے کوسوں دور ہے جیسا کہ نواب وقار الملک بہادر سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک چٹھی بنام مسٹر محمد شفیع صاحب بیرسٹر سیکرٹری پنجاب پروانشل مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل حصہ سے ثابت ہوگا۔ یہ نواب صاحب موصوف کی اصل رسم الخط میں بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔ یہ چٹھی اس امر کا قطعی فیصلہ کرتی ہے کہ کونسی لیگ درحقیقت آل انڈیا مسلم لیگ کی پراونشل شاخ ہے:

(حوالہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ 9 دسمبر 1907ء جس میں یہ خط اپنے عکس کے ساتھ شائع ہوا۔)

مخدومی و محترمی میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لاء و سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ۔ محترمی کا گرامی صحیفہ نے ورود مسئول فرمایا اور بے انتہا خوشی ہوئی کہ آخر آپ بزرگوں کی کوشش سے پنجاب پراونشل مسلم لیگ قائم ہو گئی ہے۔ تاربرقی میں اس کے بارے میں یہ آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔ اور اب یہ بارے عرض کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کے مساعی سے جو شاخ پنجاب میں قائم ہوئی ہے یہ تمام دوسرے صوبوں میں بھی پراونشل لیگوں کو نتائج کرنے کے لئے بحث نظر ہوگی اور آل انڈیا مسلم لیگ کو مضبوط کر دے گی۔ مجھ کو مطلق یاد نہیں جو میں نے بحیثیت سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ یا اپنی انفرادی حیثیت میں پنجاب کی ایسی کسی (انجمن کو) انڈیا مسلم لیگ کی شاخ کے طور پر کچھ لکھا پڑھا اور اس کو اس حیثیت میں تسلیم کیا ہو۔ بہت ضروری ہے کہ جس وقت مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ پنجاب میں دو جداگانہ کوششیں ایک ہی غرض سے ہو رہی ہیں تو میں نے بعض خطوط لکھے تھے تاکہ حتیٰ الامکان ایک ہوں۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کی ایسی کوشش تھی کہ جس کے نتیجہ میں پراونشل لیگ قائم ہوئی دوسری کوشش ہمارے مقاصد کے خلاف ہے تو اس کے بعد میں نے دوسرے صاحب کو کوئی خط نہیں لکھا اور مجھ کو تو یہ کرنے کے بعد بھی یقین نہیں آتا کہ اُس موقعہ پر ایسا کوئی خط میں نے بھیجا ہو تو اس سے نہ کوئی یہ مطلب اخذ کرے کہ اِس کے پاس بطور پراونشل مسلم لیگ کے تسلیم کر لی گئی ہے۔۔۔ الخ۔"

لہٰذا میاں محمد شفیع اور نواب وقار الملک کے درمیان برقیہ تاروں کے تبادلہ اور موقر روزنامہ کے تبصرے اور نواب وقار الملک کے مذکورہ خط بنام میاں صاحب موصوف سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں اس سے قبل کوئی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی صوبائی شاخ کے طور پر قائم نہ تھی، اور اگر ایسی کوئی جماعت زیر زمین یا ذہنوں میں موجود تھی تو اس کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔ جیسا کہ نواب وقار الملک نے بحیثیت سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ خود ایسی کسی جماعت

کی صحت کو تسلیم کرنے کی تردید کی ہے۔ علاوہ ازیں میاں محمد شفیع کی زیر سرکردگی قائم ہونے والی پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس کی کاروائی روزانہ "پیسہ اخبار" لاہور کے علاوہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے بھی باتفصیل شائع کی، اور اس کے متعلق ایک مدلل اداریہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ "پانیر" "وکیل" امرتسر روزنامہ وطن اور ناظم الہند لاہور، سول اینڈ ملٹری گزٹ لدھیانہ اور مخبر دکن مدارس نے بھی مذکورہ صوبائی لیگ کے احیاء پر اس کے بانیوں کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس کے حق میں تائیدی مضامین و تبصرے لکھے۔

چنانچہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ، مسلمانان پنجاب کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم کی حیثیت سے معرض وجود میں آئی اور اس طرح مسلمانان ہند نے اپنے مفادات و حقوق کے تحفظ کے لئے جس سیاسی آرگنائزیشن کے قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا اس میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔

**آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس:** اسی سال (1907ء میں) آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس کراچی میں دسمبر کے آخری ہفتہ میں منعقد ہوا۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو فخر حاصل تھا کہ اس مرکزی سالانہ اجلاس میں کسی صوبائی لیگ کی نمائندگی کرنے والا یہ پہلا وفد تھا۔"

چنانچہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی مجلس انتظامیہ کا پہلا اجلاس 19 دسمبر 1907ء کو منعقد ہوا اور اس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے جس وفد کا اعلان کیا گیا وہ مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

(بحوالہ پیسہ اخبار 22 دسمبر 1907ء)

(1) میاں محمد شادین بیرسٹرایٹ لاء (2) میاں محمد شفیع بریسٹرایٹ لاء (3) مولوی محبوب عالم (4) شیخ بعدالعزیز ایڈیٹر ابزور (5) مرزا جلال دین بیرسٹر (6) چوہدری شہاب دین پلیڈر (7) شیخ محمد بخش جنرل کنٹریکٹر (8) شیخ تاجدین پلیڈر (9) احمد دین پلیڈر (10) منشی عبدالعزیز مینجر پیسہ اخبار (11) حکیم غلام نبی (12) حکیم محمد شریف (13) مرزا اسلم بیگ (14) میاں نظام الدین بیرسٹر (15) میاں دین محمد رئیس باغبانپورہ (16) حق نواز بیرسٹر (17) ڈاکٹر غلام جیلانی (18) خاں بہدر سیٹھ آدم جی آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی (19) مرزا اعجاز حسین انبالوی (20) خواجہ گل محمد (21) شیخ عبدالقادر بیرسٹر (دہلی) (22) خواجہ یوسف شاہ (امرتسر) (23) شیخ عبدالحق پلیڈر (ملتان) (24) سید میر حسن (ملتان) (25) خان عبدالقادر (ملتان)۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا مذکورہ صدر اجلاس مجوزہ پروگرام کے مطابق 30 دسمبر 1907ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اصل ریکارڈ کے مطابق 26

ڈیلیگیٹس نے شرکت کی جن میں سے آٹھ ڈیلیگیٹ پنجاب کی نمائندگان تھے اور جن کے نام یہ ہیں۔

1- (میاں) محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)
2- مسٹر فضل حسین بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)
3- عبدالعزیز روئداد "آبزرور" (لاہور)
4- خان بہادر خواجہ یوسف شاہ (امرتسر)
5- خان بہادر شیخ غلام صادق (امرتسر)
6- خان بہادر مولوی محمد شاہ دین بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)
7- شیخ عبدالقادر بی-اے بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)
8- مسٹر حسام الدین بیرسٹرایٹ لاء (لاہور)

(نوٹ: اور یہ ریکارڈ کراچی یونیورسٹی میں محفوظ ہے)

اس اجلاس میں کوئی خاص اہم بات نہ ہوئی بہرحال اس سے مسلم لیگ کی باقاعدہ سالانہ نشست کا آغاز ضرور ہوا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس 18 مارچ 1908ء کو علی گڑھ میں میاں محمد شادین جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے کی صدارت میں ہوا۔ یہ اجلاس مسلم لیگ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا اور خاص اہمیت کا حامل ہے اور اس اجلاس کو آئینی اجلاس کی حیثیت حاصل ہے کہ اس میں مسلم لیگ کا باقاعدہ آئین منظور ہوا اور انتظامی کابینہ قائم ہوئی ہیں اور جو صوبوں سے منتخب شدہ ارکان پر مشتمل تھی ہزہائنس سر آغا خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر میجر حسین بلگرامی سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ تمام صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ جو پہلے ہی قائم ہو چکی تھی مرکزی لیگ (آل انڈیا مسلم لیگ) سے اس کا الحاق کیا گیا۔

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے فاضل مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ نے اپنی مذکورہ صدر تصنیف میں "آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس علیگڑھ (مارچ 1908) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس اجلاس میں" خاص بات یہ ہوئی کہ ایک سال کے اندر ہی صوبہ پنجاب میں دو لیگیں قائم ہو گئیں اور (سر) محمد شفیع مرحوم کی اور دوسری (سر) فضل حسین مرحوم کی، علی گڑھ کے اجلاس میں یہ دونوں لیگیں ملائی گئیں۔

(کتاب مذکور بزبان انگریزی مطبوعہ 1940ء بدایوں تیسرا ایڈیشن صفحہ 362)

لیکن مسٹر عظیم حسین کا بیان ہے کہ "1907ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ

کراچی میں میاں محمد شفیع اور مسٹر فضل حسین اپنی اپنی صوبائی تنظیموں کے الحاق کے لئے رجوع ہوئے۔ میاں محمد شفیع اس سلسلہ میں پہلے سے امید رکھتے ہوئے اپنے ساتھ اپنی تنظیم کے حامیوں کا ایک بہت بڑا وفد لے کر گئے اور کراچی میں انہی راجہ غلام حسین کا قابل قدر تعاون حاصل ہوا۔ دوسری طرف مسٹر فضل حسین کسی قسم کا اندیشہ نہ رکھتے ہوئے اپنے ساتھ "اپنے صرف چند ایک پیروکاروں کو لے کر پہنچے اور بحث کے دوران میں جو وہاں ہوئی انہیں مولانا محمد علی اور (مابعد سر) علی امام کی تائید حاصل ہوئی۔ "مسٹر عظیم حسین لکھتے ہیں۔" جب اجلاس ترقی پر تھا تو مسٹر فضل حسین نے اپنے ذاتی مفادات کی قیمت پر اپنے دعاوی واپس لینے کا فیصلہ کر لیا اس لئے کہ وہ پنجاب کے مسلمانوں میں نااتفاقی کا بیج نہ بونے کے لئے بے قرار تھے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تنظیم کو ختم کرنے کی رضامندی ظاہر کی اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ جس کے میاں محمد شاہ دین (مابعد جسٹس منتخب صدر اور میاں محمد شفیع جنرل سیکرٹری تھے۔ کے جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے کی رائے ظاہر کی۔" مسٹر عظیم حسین مزید لکھتے ہیں۔ "فضل حسین نے بہرحال صوبائی مسلم لیگ کی اس نئی الحاق شدہ تنظیم میں سرگرم حصہ لینے(Active Participation) سے احتراز کیا اور میاں محمد شفیع 1916ء تک اس کے سربراہ رہے۔" عظیم حسین اس صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ بہرحال حقیقت ہے کہ آمدہ اصلاحات میں مسلم مفادات کے سلسلہ میں جدوجہد کا سب سے زیادہ حصہ میاں محمد شفیع اور میاں شاہ دین کی کوششوں اور مساعی کا نتیجہ ہے۔"

(فضل حسین (انگریزی) مطبوعہ مئی 1946ء صفحہ 97-98)

آخر میں ڈاکٹر محمد انور امین لکھتے ہیں:

"ان ہر دو حضرات (سید طفیل اور عظیم حسین کے بیانات کو جو بھی حیثیت دی جائے لیکن مختلف واقعات اور وضاحتوں سے یہ حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ پنجاب میں پراونشل مسلم لیگ کے قیام کے وقت اس کی مخالفت پیدا ہوئی تھی، لیکن مسلم زعماء جن میں میاں محمد شفیع اور میاں شاہ دین اور فضل حسین کو نمایاں مقام حاصل ہے اور مسلم عوام کے لئے ان کی مخلصانہ مساعی و جدوجہد کی وجہ سے پبلک میں ان ہیں جو مقام حاصل ہو چکا تھا اس کی وجہ سے اس وقتی ناخوشگوار صورت حال پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ انتشار اور تفرقہ بندی سے نکل کر واحد صوبائی لیگ کی حیثیت سے کام کرنے لگی، اور مسلمانان پنجاب کی سیاسی شیرازہ بندی آل انڈیا مسلم لیگ میں اہم اور نمایاں کردار کا باعث ثابت ہوئی۔

(بحوالہ پنجاب تحریک پاکستان میں از محمد انور امین صفحہ 63)

## باب 15

# 1919ء سے بعد کے اہم واقعات

**1919ء میں پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی اور اس کے اسباب:** اس کا آغاز سکھوں کی طرف سے ہوا۔ فروری 1919ء میں سکھوں نے حکومت کے خلاف باغیانہ روش اختیار کی اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

1890 تا 1910ء کے دوران سکھوں کی بڑی تعداد تلاش معاش کے سلسلے میں مشرق بعید ہانگ کانگ، ملایا، امریکہ، اور کینیڈا کے ممالک میں چلی گئی۔ جہاں انہیں نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا اور تحقیر و تضحیک کا نشانہ بننا پڑا ادھر کمیونسٹوں نے تحقیر کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام کو ظالمانہ بتا کر معاملہ کو ہوا دی اور آزادی وطن کے ترانے گائے گئے 1913ء میں واشنگٹن میں بارہ سو سکھوں کی ایک کنونشن منعقد ہوئی۔ جس میں ہندی ایسوسی ایشن قائم کر کے اس کا مرکزی دفتر سان فرانسکو میں قائم کیا گیا۔ اس تنظیم کا مقصد آزادی ہند تھا جس کے صدر سوہن سنگھ بھکنا، نائب صدر کیسر سنگھ اور سیکرٹری ہردیال سنگھ تھے اس تنظیم نے متعدد اخبار چھاپنے شروع کئے مثلاً غدر نامی اخبار اردو گورمکھی اور گجراتی میں چھپتا تھا غدر دی گونج، اعلان جنگ اور نیا زمانہ قسم کے بعض رسالے بھی اس تنظیم نے شائع کئے اس سے خاص کر کے سکھوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ مئی 1914ء میں کینیڈا کی حکومت نے ہندوستانیوں کی آمد پر ناروا پابندی لگا دیں جن کے خلاف احتجاج ہوا۔ ایک شرط کے تحت صرف بحری سفر کرنے والے ہی کینیڈا میں داخل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک سکھ بابا گوردت سنگھ نے بحری جہاز کرایہ پر لے کر کینیڈا کے لئے 300 مسافروں کو بھجوایا۔ لیکن ان مسافروں مین سے چند سابقین تارکین وطن کے سوا کسی کو اترنے کی اجازت نہ ملی یہ جہاز وہیں لنگر انداز رہا لیکن معاملہ حل نہ ہو سکا جہاز کے مسافروں کی واپسی کا بندوبست ہوا جنہیں زبردستی پنجاب میں بذریعہ ٹرین پہنچایا گیا۔ لیکن مسافر مفلوک الحالی کی وجہ سے واپس آنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اس کشمکش میں پولیس کے ہاتھوں 21 مسافر ہلاک ہو گئے۔ اور باقی کو قیدی بنا کر پنجاب بھیجا گیا ادھر حکومت نے سکھوں کے "کرپان" رکھنے پر پابندی عائد کر دی تھی پھر 1914ء کے آغاز میں رکاب گنج کے گوردوارہ کی دیوار گرا دی گئی۔ اس طرح کے حالات نے سکھوں کو اچھالا آخر 30 نومبر 1914ء کو غدر برپا کرنے کا پروگرام بنایا لیکن بعد میں یہ تاریخ تبدیل کر دی گئی پروگرام کے تحت

فوج میں سکھ سپاہیوں کو بغاوت میں شامل کرنے کا منصوبہ تھا لاہور میں گھڑ سوار رجمنٹ کے سپہ سالار لچھمن سنگھ نے اس تنظیم کا ساتھ دینے کی ہامی بھی بھرلی۔ بعض انقلابیوں نے سرحد سے اسلحہ خریدنے کا پروگرام طے کیا جس کا علم حکومت کو بھی ہو گیا اور 24 افراد کو سزائے موت سنائی گئی نیز ان کی جائیداد ضبط کرلی گئی جبکہ 26 افراد کو عمر قید کی سزا ہوئی مشتبہ فوجیوں کا کورٹ مارشل ہوا بعد ازاں 19 نومبر 1914ء کو صرف سات افراد سولی دے گئے باقی کی سزا عمر قید میں تبدیل کردی گئی اور بعض کو کالے پانی کی سزا دی گئی اسی اثنا میں ہدو ساہو کاروں کے خلاف مسلمان کاشتکاروں کی نفرت نے ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا رنگ اختیار کرلیا چنانچہ پنجاب کے جنوبی اور جنوب مغربی اضلاع میں پچاس کے قریب ایسی وارداتیں ہوئیں پھر برطانیہ کی شکست اور جرمنی کی فتح کی افواہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کی آگ تیز کردی۔ چنانچہ چار پانچ ہزار افراد کو گرفتار کرلیا گیا اور مقدمات کی سماعت خصوصی عدالتوں میں کرنے کا حکم صادر ہوا۔ ادھر 1918ء میں خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑا جس میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں کیونکہ وبا نے بھی آن گھیرا تھا۔ ادھر حکومت نے انکم ٹیکس کا نیا قانون لاگو کردیا۔ اور بعض مدوں میں اس کی شرح میں سو سے دو سو فیصد تک اضافہ کیا گیا۔

چنانچہ صوبے میں بدامنی اور بے چینی کی کیفیت کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اوپر سے رولٹ ایکٹ نے اپنا کام دکھادیا۔

**رولٹ ایکٹ:** 1917ء میں سر سڈنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی کو حکومت کے خلاف سازشوں کی نوعیت اور اس کی وجوہات معلوم کرنے کا کام سونپا گیا اور اجتماعی تحریکوں کو دبانے کے لئے تجاویز بھی پوچھی گئیں چنانچہ رولٹ نے اپنی رپورٹ پر مبنی مسودہ قانون تیار کیا جس کی رو سے:۔

1۔ کسی بھی ہندوستانی کو بغیر وجہ بتائے گرفتار کیا جاسکتا تھا۔
2۔ استغاثہ ملزم پر الزام ثابت کئے بغیر اسے سزا دلوا سکتا تھا۔
3۔ بری شہرت یا محض مخبری کی بنا پر کسی کو گرفتار کرکے سزا دی جاسکتی تھی۔
4۔ ایسے ملزموں کے کیسوں کی سماعت بند کمرے میں ہوتی۔ اور سزا کے بعد اپیل کا حق بھی نہیں تھا۔

فروری 1919ء میں یہ مسودہ قانون اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش ہوا۔ جس کی جنگ عظیم ختم ہونے پر قطعاً ضرورت نہ تھی چنانچہ اس کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے قائداعظم نے بھی اس بل کے خلاف تقریر کی اور اس کے اثرات سے حکومت کو آگاہ کیا ادھر گاندھی نے بھی اس کے خلاف بیان دیا۔ لیکن 18 مارچ 1919ء کو یہ مسودہ قانون منظور کرلیا گیا۔ جو (1) انڈین کریمنل

لا (ایمنڈمنٹ) ایکٹ 1919ء اور (2) دی کریمنل ایمرجنسی پاورز ایکٹ 1919ء کی شکل میں نمودار ہوا۔ 23 میں سے 22 غیر سرکاری ارکان نے اس کی مخالفت کی لیکن "طاقتور کو کون روکے" کے مصداق جبراً یہ ایکٹ منظور کرلیا گیا۔ اور سرکاری ممبران اس کا ذریعہ بنے۔

اس ایکٹ کے پاس ہوتے ہی ہندوستان اور پنجاب میں آگ لگ گئی قائداعظم نے اس کے خلاف وائسرائے کو خط بھی لکھا۔ لیکن بے سود ان تمام حالات نے غریب اور متوسط طبقہ کے پنجابیوں اور ہندوستانیوں کو حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کردیا اور جب لوگ احتجاج کرتے تو ان پر ہر طرح کی سختی کی جاتی امرتسر میں بھی اس وقت بڑی گھمبیر صورت حال تھی ادھر پولیس کے خفیہ رپورٹر جلتی پر تیل کے مصداق خطرناک ترین رپورٹیں بھیج رہے تھے جس سے رعایا کے خلاف حکومت کا غم و غصہ بڑھتا جارہا تھا اور سول انتظامیہ کی بجائے فوج کو حالات کی درستی کے لئے موزوں خیال کیا جانے لگا ہندو مسلم اتحاد کے اعتبار سے یہ دن بڑے موزوں تھے گاندھی نے 30 مارچ 1919ء کو ملک بھر میں ہڑتال کا اعلان کردیا۔ دہلی اور لاہور احتجاجات کے مرکز تھے 30 مارچ کو دہلی میں پولیس کے ساتھ تصادم ہوا اور 9 اپریل کو بھی وہاں سے جلوس نکالا گیا۔ ادھر لاہور میں بھی 30 مارچ اور 6 اپریل 1919ء کو ہڑتال ہوئی اور جلسے جلوس نکالے گئے 9 اپریل کو ہندوؤں کا تہوار "نومی" تھا اور اس روز بھی ہڑتال کا سماں رہا۔ اور جلوس نکلے اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اتحاد کے مظاہرے کیے یعنی ایک ہی برتن سے پانی پیا اور اکٹھے پوریاں اور مٹھائیاں کھائیں۔ مائیکل اڈوائر پنجاب کا گورنر تھا اس نے اپنے چیف سیکرٹری ٹامس سے مل کر سخت گیری کا منصوبہ بنایا لاہور اور امرتسر میں فوجی دستے تعینات کردیئے۔ ادھر ریلوے سٹیشن پلوڑ (ضلع گوڑگاؤں) سے گاندھی کو گرفتار کرکے بمبئی لے جایا گیا اگلے دن امرتسر میں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو بہانے سے گرفتار کرکے دھرمسالہ بھیج دیا گیا۔ احتجاجاً لوگ ڈپٹی کمشنر امرتسر کی کوٹھی کی طرف جانے لگے اتنے میں مجمع کا رخ ریلوے سٹیشن کی طرف ہوتا دیکھ کر سٹیشن کے قریب پڑاؤ ڈالے ایک فوجی کیمپ کے ایک سپاہی نے گولی چلادی۔ جس کی آواز سے لوگ مشتعل ہوگئے اور پولیس کے ساتھ جھڑپیں ہوئیں۔ لوگوں نے دو انگریزی بنکوں کو آگ لگادی اور پانچ انگریز اہلکاروں کو قتل کردیا گیا۔ فرنیچر جلادیا۔ حتیٰ کہ ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر بھی جو بائیسکل پر سوار تھی۔ عوامی اشتعال کا نشانہ بن کر بری طرح پٹ گئی جس کا نام مس شروڈ تھا۔ تاہم رحمدل لوگوں نے اس کی جان بچائی۔

10 اپریل 1919ء کو لاہور (انار کلی لوہاری) میں لوگ اکٹھے ہوگئے، اور جلوس کی شکل میں مال روڈ پر آگئے۔ مجمع پر گولی چلادی گئی تاہم یہ جلوس منتشر ہوگیا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ چنانچہ بادشاہی مسجد میں لوگ جمع ہوگئے۔ جہاں سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو لیڈروں نے بھی خطاب کیا نماز کے بعد لوگ گھروں کو جانے لگے تو بعض نوجوان ڈنڈوں سے مسلح تھے۔ جس سے حکومت کے اہلکاروں نے

رپورٹ دی کہ بلوائیوں نے ڈنڈا فورس قائم کرلی ہے۔ جواباً شاہی مسجد کے قریب فوجی چوکی کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے 12 اپریل کو احتجاج کرنے والوں پر گولی بھی چلائی۔ ادھر امرتسر کو بھی فوج کے حوالے کر دیا گیا جس کا سربراہ بریگیڈیئر ڈائر کو مقرر کیا گیا جس نے سرکاری اہلکاروں کو ہر قسم کا فری ہینڈ دے دیا اور ہنس راج نامی سابق ٹکٹ کلکٹر کے پراسرار کردار نے لوگوں کو بری طرح دھوکہ دیا جس نے سلطانی گواہ بن کر انگریزی عدالتوں سے لوگوں کو سزائیں دلوائیں۔ 13 اپریل کو جلیانوالہ باغ میں عوامی جلوس پر گولی چلا دی گئی جس سے سینکڑوں ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے یہ دراصل سارا رول -- رولٹ ایکٹ -- کی جبری منظوری نے ادا کیا تھا۔

**جلیانوالہ باغ کا المیہ اور مختصر واقعات:** رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے اور احتجاج جاری تھا مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ 20 مارچ 1919ء بروز اتوار ستیہ گرہ کی تحریک کا اعلان کیا جائے گا۔ لیکن پھر یہ تاریخ 6 اپریل 1919ء کر دی گئی چنانچہ سارے پنجاب اور ہندوستان میں ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہوئے اور پرامن جلوس نکالے گئے 9 اپریل کو پڑنے والا ہندوانہ تہوار "رام نومی" سیاسی رنگ کا زیادہ حامل تھا۔ جس میں مسلمان بھی شریک ہوئے یہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا ہر طرف مل کر انگریزوں کو نکالنے کے جتن زوروں پر تھے۔ انگریز کو یہ اتحاد کھل رہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کا دن بمبئی میں منایا اور پنجاب کی طرف آتے ہوئے انہیں پلوڑ (گوڑ گاؤں) کے مقام پر روک دیا گیا۔ اور اس طرح وہ پنجاب میں داخل نہ ہو سکے اور لوگوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔

11 اپریل 1919ء کو امرتسر میں ستیہ گرہ کا دن منانے کا اعلان ہو چکا تھا اسی دن ایک جلسہ عام بھی ہونا تھا لیکن مخدوش حالات کے پیش نظر سیاسی رہنماؤں سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو ڈپٹی کمشنر امرتسر نے بہانے سے بات چیت کے لئے بلایا اور گرفتار کر لیا اس گرفتاری نے بھی لوگوں کو اشتعال دلایا اور دور دور سے لوگ جلسہ میں شرکت کے لئے امرتسر کی طرف آنے لگے۔ اور گرفتاریاں پیش کیں۔ جلوس پر کسی پولیس مین نے گولی چلا دی جس نے حالات کو اور بگاڑ دیا لوگ مشتعل ہو گئے۔ دو انگریزی بنک لوٹ لئے گئے دو انگریزوں کو ہلاک کر دیا گیا اور ہجوم زیادہ اور مشتعل ہونے کی وجہ سے حالات ڈپٹی کمشنر امرتسر کے کنٹرول میں نہ رہے۔ اس لئے 12 اپریل 1919ء کو جالندھر چھاؤنی سے فوج طلب کرلی گئی جس کا کمانڈر بریگیڈیئر ڈائر تھا چنانچہ سول انتظامیہ سے اختیار لے کر فوج کو کارروائی کا حکم دے دیا گیا اور مسٹر ڈائر امرتسر کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔

13 اپریل کو بیساکھی کے جلسہ پر جو امرتسر میں ہونا تھا مسٹر ڈائر نے پابندی لگا دی اس کے باوجود لوگ دور دراز دیہات سے امرتسر آنا شروع ہو گئے بیساکھی کا یہ جلسہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ

میں ہونا قرار پایا تھا لہٰذا لوگ اس باغ میں اکٹھے ہونے لگے اس باغ کے تین طرف مکانات وغیرہ ہیں اور صرف ایک راستہ ہے جب ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تو مسٹر ڈائر نے چوتھی سمت کا راستہ روک کر مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیا اور اس کام کے لئے صرف دو منٹ دیئے حالانکہ مجمع پر امن تھا لیکن مسٹر ڈائر لوگوں کا قتل عام کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ چنانچہ دو منٹ کے بعد مجمع پر مشین گن سے فائر کھول دیا گیا اور سترہ سو گولیاں چلائی گئیں جن سے ہزاروں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان چار سو سے زیادہ تھے جبکہ زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ تھی اس فائرنگ کے بعد لاشیں اٹھانے کی اجازت بھی نہ دی گئی اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا اس طرح زخمی افراد کو مرہم پٹی اور طبی امداد بھی نہ مل سکی اور اس طرح بے شمار زخمیوں کو بھی موت کے منہ میں دھکیل دیا یہ واقعہ انگریزوں کے زوال کی پہلی کڑی تھا۔ اس واقعہ کے بعد لاہور میں بھی ہنگامے شروع ہو گئے اور جنرل ڈائر پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ زور پکڑ گیا کیونکہ بریگیڈیر ڈائر کو اس واقعہ کے بعد جنرل بنا دیا گیا۔

گوجرانوالہ میں مظاہرین نے ریلوے اسٹیشن کو نذر آتش کر دیا۔ اسی طرح بمبئی، کلکتہ، احمد آباد اور دہلی وغیرہ میں انگریزوں کے خلاف مظاہرے زور پکڑ گئے جس کے نتیجہ میں پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔

**1919ء کا مارشل لاء:** انگریزوں نے جلیانوالہ میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد پورے پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا اور کڑی سزاؤں کے اعلانات کئے اور بار بار پانچ انگریزوں کے مارے جانے کا ذکر کر کے غم و غصہ کا اظہار کیا مارشل لاء کے ضابطے پمفلٹوں کی شکل میں دیواروں پر چسپاں کرا دیئے گئے اور گھروں کے باہر والے پوسٹروں کی حفاظت گھر والوں کی ذمہ داری قرار دی۔ اگر کوئی پوسٹر پھٹ جاتا تو سزا دی جاتی حتی کہ چودہ چودہ سالہ بچوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ بعض بے گناہ افراد پر جھوٹے مقدمے بنائے گئے۔

مارشل لاء کی خلاف ورزی کی پاداش میں بے شمار لوگوں کو سزائے موت اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ ایک انگریز خاتون مس شروڈ کو جلیانوالہ سانحہ کے دنوں میں زخمی کر دیا گیا تھا جو بعد ازاں واپس انگلستان چلی گئی تھی جنرل ڈائر نے اس کا انتقام بھی لوگوں سے لیا اور انہیں ہر طرح سے تنگ کیا۔

اس مارشل لا اور انگریز کے رویہ نے برصغیر کے لوگوں کو ایک نیا ولولہ دیا انہوں نے جان لیا کہ انگریز آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ بہرحال جنرل ڈائر کو بھی بعد میں انگلستان میں کسی نے قتل کر دیا۔

# غازی علم الدین شہید کا کارنامہ

لاہور میں راج پال نامی ایک ہندو آریہ سماج کی کتابوں کا ناشر اور فروخت کنندہ تھا- جو اپنی مذہبی تبلیغ کو ذریعہ نجات سمجھتا تھا- مسلمانوں کے بارے میں وہ تعصب کا شکار رہتا تھا- اس نے "رنگیلا رسول" نامی ایک کتاب شائع کی- جس پر مصنف کا نام درج نہیں تھا- اس کتاب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ تحریریں تھیں- مسلمان یہ کتاب پڑھ کر سخت طیش میں آگئے، اور اہل اسلام نے ناشر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا- جس کے نتیجہ میں عدالت سے معمولی سی سزا ہو گئی- جس کے خلاف توہین رسالت کا کیس ہائی کورٹ میں لے جایا گیا- ہائی کورٹ کے سکھ جج کنور دلیپ سنگھ نے چیف جسٹس شادی لال کے کہنے پر فیصلہ یہ سنایا کہ اس طرح کی کتاب کی اشاعت پر کوئی تعزیر لاگو نہیں ہوتی- لہٰذا راج پال کے خلاف مزید کوئی کاروائی نہ کی گئی- اس فیصلہ نے مسلمانوں میں ہیجان کی کیفیت پیدا کر دی، اور فضا میں کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی-

اسی اثنا میں علم دین نامی ایک مسلمان نوجوان نے 19 اپریل 1929ء ایک تیز دھار خنجر سے راج پال کو واصل جہنم کر دیا تھا، پھر علم دین پر مقدمہ چلا اور سکھوں، ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت سے اسے سزائے موت سنائی گئی- مسلمانوں نے ہر ہر مرحلہ پر سخت احتجاج کیا لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی حالانکہ مذہبی معاملات پر اشتعال انگیزی کی بنا پر تعزیرات ہند کے تحت اس قسم کی کتاب کی اشاعت پر سرکاری طور پر پابندی لگائی جا سکتی تھی- مگر علم الدین غازی کو میانوالی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا- اس روز سے غازی علم الدین کو شہید بھی کہا جانے لگا- بعد ازاں علم الدین مرحوم کا تابوت میانوالی سے لا کر لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا- اس ایمان افروز واقعہ کی تفصیلات محترم اسرار بخاری نے اس طرح بیان کی ہیں- (بحوالہ روزنامہ مشرق لاہور مورخہ 30 اکتوبر 1988ء)

"غازی علم الدین شہید کے بے تاب جذبوں سے شہادت کے منصب پر سرفرازی تک کی روح پرور داستان کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب سوامی دیانند کے چیلے اور پرتاب اخبار کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن نے ایک نہایت ہی دل آزار کتاب "رنگیلا رسول" لکھی اس ننگ انسانیت نے ہادی برحق کے بارے میں اتنی دل آزار باتیں لکھیں کہ مسلمان تڑپ اٹھے، مسلمانوں نے کتاب کے ناشر راج پال سے مطالبہ کیا کہ اس دل آزار کتاب کو تلف کر دے اس مقصد کے لئے احتجاجی جلوس بھی نکالے گئے اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مسلمانوں نے راج پال کے خلاف دفعہ 153 الف کے تحت مقدمہ دائر کر دیا جس پر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لوئیس نے راج

پال کو چھ ماہ قید کی سزا دی اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی جہاں انتہائی متعصب چیف جسٹس شادی لال کی ذاتی سفارش پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے اسے رہا کر دیا ان دنوں مسلمانوں کا ایک ہی انگریزی اخبار "مسلم آؤٹ لک" تھا جس نے جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلے پر نکتہ چینی کی اور لکھا کہ۔

"اس سے بڑھ کر اور کیا دل آزاری ہو سکتی ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان کبیدہ خاطر ہے بلکہ ناموس حبیب کبریا پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک نثار کرنے کے لئے تیار ہے اور ہر مسلمان اپنی زندگی کو امام المرسلین ؑ پر قربان کرنا فخر سمجھتا ہے۔ قانون میں اس امر کی وضاحت اور کافی گنجائش موجود ہے کہ وہ راج پال جیسے دریدہ دہن اور ملیچھ کا محاسبہ کرے، مسلمان ایک زندہ اور فعال قوم ہے اگر عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو کوئی عاشق رسول ﷺ اس منہ زور کا پیٹ چاک کر دے گا۔"

لیکن فرنگی حکومت نے مسلمانوں کے جوش ایمانی کا صحیح اندازہ نہ کیا اور اپنی طاقت کے زعم میں اس تعمیری نکتہ چینی اور بروقت انتباہ سے صورت حال کو بگاڑ سے بچانے کے بجائے اخبار کے مالک نورالحق اور ایڈیٹر سید دلاور شاہ کو دو دو ماہ قید اور ایک ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا سنا دی جس پر مسلمانوں کا ردعمل شدید تر ہو گیا۔

راج پال کو واصل جہنم کرنے کے لئے غازی عبدالرحمٰن خان کوہاٹ سے لاہور آیا اور لوگوں سے پتا پوچھ کر اس خبیث کی دکان پر پہنچ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے راج پال کی بجائے اس کا ایک دوست جتندر دکان پر بیٹھا ہوا تھا جسے غازی عبدالرحمٰن نے راج پال سمجھا اور تلوار کے ایک ہی وار سے اسے واصل جہنم کر دیا تاہم مسلمانوں کے ردعمل اور بعض مصلحتوں کے تحت انگریز حکومت نے موت کی بجائے غازی عبدالرحمٰن کو چودہ سال قید کی سزا دی تاہم جب تک راج پال کا ناپاک وجود دھرتی پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں کو صبر و قرار کس طرح آسکتا تھا چنانچہ لاہور کے ایک دودھ فروش خدا بخش نے اس نابکار کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نکلا اور خدا بخش کو سات سال کے لئے جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔ مسلمانوں کے اس ردعمل نے راج پال کو خوفزدہ کر دیا اس کی درخواست پر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دو ہندو کانسٹیبلوں کو اس کی حفاظت کے لئے مامور کر دیا کچھ عرصہ بعد وہ اس پہرے کی زندگی سے اکتا گیا اور لاہور سے دوسرے شہر چلا گیا۔ چار ماہ کے بعد واپس آیا تو اس نے سمجھا کہ اب مسلمانوں کے جذبات سرد پڑ چکے ہوں گے چنانچہ اس نے پولیس کی مدد طلب نہ کی اور کتب فروشی کا دھندا پھر سے شروع کر دیا لیکن یہ اس کی بھول تھی اس کی ناپاک جسارت نے مسلمانوں کی روح پر زخم لگائے تھے جو اتنی آسانی سے مندمل نہیں ہو سکتے تھے۔

درگاہ حضرت شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ لاہور کے پاس ایک بڑا احتجاجی جلسہ ہوا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنے خطاب کے دورانِ اچانک انتہائی جوشیلے انداز میں کعبہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے مفتی کفایت اللہ سے فرمایا۔

لیجیے وہ دیکھیے ام المومنین حضرت خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کے دروازے پر تشریف لا کر پوچھ رہی ہیں کہ میری ناموس اور حرمت کی حفاظت کے لئے کیا انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ یہ الفاظ مسلمانوں کے دلوں پر برق بن کر گرے ان کی غیرت ایمانی جوش میں آ گئی جلسہ گاہ میں موجود تمام مسلمان شہادت کے جذبہ سے سرشار ہو کر راج پال اور جسٹس دلیپ سنگھ کے بلکہ حکومت کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے سول سیکرٹریٹ کی جانب چل پڑے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوری طور پر دفعہ 144 کا نفاذ کر کے جلوس کو منتشر ہونے کے لئے کہا لیکن جو لوگ ناموس مصطفیٰ کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنے نکلے ہوں وہ بھلا قید و بند کی صعوبتوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ انہوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا جس پر جلوس کے سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

اِدھر غازی علم الدین اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ یہ الفاظ کانوں میں پڑے "ہے کوئی جانباز جو حضرت خدیجتہ الکبریٰ کے ناموس کی حفاظت کرے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی غازی علم الدین نے فرط عقیدت سے پکار البیک یا ام المومنین لبیک۔

یہ تقریباً ایک بجے دوپہر کا وقت تھا غازی علم الدین نے ایک تیز دھار چھرا ہاتھ میں لیا اور ہسپتال روڈ پر مزار قطب الدین ایبک کے نزدیک واقع اس موذی کی دکان پر پہنچ گئے راج پال اس وقت دکان میں لیٹا ہوا تھا۔ غازی علم الدین نے اسے للکارا اور کہا کہ اپنے جرم کی معافی مانگو، یہ دل آزار کتاب تلف کردو اور آئندہ ایسی کمینی حرکتوں سے باز آنے کا یقین دلاؤ ورنہ مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ راج پال نے غازی علم الدین کی اس للکار کو محض گیدڑ بھبکی سمجھا اور خاموش بیٹھا رہا۔ جس پر غازی علم الدین نے آگے بڑھ کر اس پر ایک بھرپور وار کیا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی جہنم رسید ہو گیا۔ اس وقت راج پال کے دو ملازم کیدار ناتھ اور بھگت رام دکان میں موجود تھے لیکن ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ اپنے آقا کو بچانے کی کوشش کرنا تو درکنار کوئی آواز تک نہ نکال سکے۔ اس موذی کا خاتمہ کرنے کے بعد وہ ایک ٹال پر پہنچے اور نلکا چلا کر اپنے ہاتھوں کو راج پال کے خون سے پاک کیا اور ابھی پانی ڈال رہے تھے کہ اچانک راج پال کے قتل کا شور بلند ہوا وہ اطمینان سے کھڑے ہو گئے اور با آواز بلند کہا کہ اس خبیث راج پال کو میں نے عشقِ رسولؐ میں واصل جہنم کیا ہے۔ اس اثناء میں راج پال کے ملازم کیدار ناتھ نے انار کلی پولیس کو قتل کی اطلاع دی غازی علم دین نے جب ٹال پر کھڑے ہو کر راج پال کے قتل کا اعلان کیا تو پرمانند اور نانک چند نے انہیں پکڑا۔ تھانے میں اپنے بیانات درج کرائے انار کلی کے دکاندار آتما رام نے گواہی دی کہ چھری اس کی دکان

سے خریدی گئی تھی۔ پولیس نے راج پال کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوایا خون آلودہ بستر اور چٹائی کا پارسل بنا کر سر بمہر کیا اور علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیج دیا۔ ملزم کیونکہ اقبالی تھا اس لئے مقدمہ کی تفتیش اور چالان میں کوئی دقت یا رکاوٹ پیش نہ آئی۔ مقدمہ کا چالان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لوئیس کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ سول سرجن نے عدالت کو بتایا کہ راج پال کی موت پیٹ میں چھرا گھونپنے کی وجہ سے ہوئی ہے زخم کی گہرائی ساڑھے چھ انچ اور چوڑائی پونے چار انچ ہے۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے غازی علم الدین پر فرد جرم عائد کر دی اور بغیر صفائی لئے مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔ سیشن کورٹ میں ایسے مقدمات کی سماعت کے لئے کم از کم ایک سال کے بعد باری آتی ہے لیکن یہ مقدمہ ایک ہفتے کے بعد ہی سماعت کے لئے پیش کر دیا گیا اور سیشن جج دلیپ نے سلیم بار ایٹ لاء کے معقول دلائل کے باوجود 22 مئی 1929ء کو غازی علم الدین کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا اس وقت ان کی عمر اکیس برس تھی مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

قائداعظم محمد علی جناح ان دنوں بمبئی میں وکالت کرتے تھے انہیں اس مقدمہ کے لئے طلب کیا گیا۔ لاہور کے ماہر قانون فرخ حسین بار ایٹ لاء نے ان کی معاونت کی۔ مقتول راج پال کی طرف سے لال کپور اور سرکار کی طرف سے دیوان رام لال پیش ہوئے۔ جسٹس براڈوے اور جان اسٹون نے مقدمہ کی سماعت کی۔ قائداعظم نے فاضلانہ بحث کی ٹھوس دلائل پیش کئے اور عدالت کو بتایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر رکیک حملے کرنا اور اس طرح عوام کے مختلف فرقوں میں نفرت پھیلانا زیر دفعہ 135 الف جرم ہے۔ کتاب رنگیلا رسول انتہائی دل آزار ہے اسے پڑھ کر کوئی بھی مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی عصمت کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہ سکتا چنانچہ ملزم کا یہ فعل فوری اشتعال پر مبنی ہے اس لئے ملزم غازی علم الدین کے خلاف زیر دفعہ 302 قتل عمد کی بجائے 708 قتل بوجہ اشتعال کاروائی کی جانی چاہئے اور ملزم کو موت کی بجائے سات سال قید کی سزا کا مستوجب سمجھنا چاہئے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سزا دفعہ 304 کے تحت پھانسی کی بجائے دس سال ہے۔

15 جولائی 1929ء کو انگریز ججوں نے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غازی علم الدین کی اپیل خارج کر دی اور سیشن جج کے فیصلے کو برقرار رکھا شام کو جب غازی علم الدین کو ہائی کورٹ کا فیصلہ سنایا گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

شکر الحمد للہ میں یہی چاہتا تھا کہ بزدلوں کی طرح جیل میں گلنے سڑنے کی بجائے تختہ دار پر چڑھ کر رسالت مآبؐ پر جان قربان کر دینا ابدی سکون اور راحت کا باعث ہے۔

اگرچہ مسلمان انگریزی حکومت سے پر امید نہیں تھے لیکن اتمام حجت کے طور پر پریوی کونسل لندن میں اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں نے جی کھول کر چندہ دیا اس اپیل کا مسودہ

قائداعظم کی زیر نگرانی تیار ہوا لیکن پریوی کونسل لندن نے بھی یہ اپیل نامنظور کر دی۔ یہ فیصلہ غازی علم الدین کو سنایا گیا تو انہوں نے کہا۔

"شہادت کا رتبہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اب مجھے دربار رسالتؐ میں حاضری دینے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔"

غازی علم الدین کو 31 اکتوبر 1929ء کو تختہ دار پر چڑھایا جانا تھا۔ مجسٹریٹ نے آخری خواہش دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ صرف دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے، انہوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے تختہ دار چڑھ گئے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے۔ سر پر ٹوپ چڑھا دیا گیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس وقت انہوں نے کہا۔

اے نادانو۔ تم یہ کیا کر رہے ہو وہ دیکھو میری روح کے استقبال کے لئے سینکڑوں فرشتے آئے ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے کہ اس پروانہ شمع رسالت کو تخت دار پر کھینچ کر واصل باللہ کر دیا گیا۔

## تختہ دار سے پہلے:

جناب اسرار بخاری لکھتے ہیں:

**1- خالی کوٹھری:** غازی علم الدین کو 31 اکتوبر 1929ء کو تختہ دار پر چڑھانا تھا، 30 اور 31 اکتوبر کی درمیان شب ساری رات انہوں نے سجدوں اور تلاوت میں گزاری صبح چار بجے اچانک جیل کے اس سیل میں سنسنی پھیل گئی جب وارڈنوں نے دیکھا کہ غازی علم الدین کی کوٹھڑی خالی ہے ایک وارڈن نواب دین کے بقول ہم نے غور سے کوٹھڑی میں دیکھا وہ غائب تھے اور ہم انہیں ادھر ادھر تلاش کر رہے تھے کہ اچانک کوٹھڑی روشنی سے منور ہو گئی اور ہم نے دیکھا کہ وہ مصلے پر بیٹھے ہیں اور ایک نورانی صورت بزرگ ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں ہم نے جونہی کوٹھڑی کے اندر جھانکا تو وہ بزرگ غائب ہو گئے اور غازی علم الدین تسبیح پڑھ رہے تھے۔

**2- انوکھی بات:** ڈسٹرکٹ جیل میانوالی میں دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ سجادہ نشین سیال شریف نے بھی غازی علم الدین سے ملاقات کی۔ وہ ان کے جمال و جلال سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ کوئی بات نہ کر سکے اور سورہ یوسف کی تلاوت شروع کر دی تاہم وفور جذبات میں تلاوت میں روانی برقرار نہ رکھ سکے جس پر غازی علم الدین نے کہا آپ بسم اللہ پڑھ کر ایک دفعہ پھر پڑھیں پیر صاحب نے دوبارہ تلاوت کا آغاز کیا لیکن پھر رُک رُک جاتے حالانکہ وہ بہت اچھے قاری اور حافظ تھے وہ تلاوت کرتے ہوئے گلوگیر ہو کر کسی اور عالم میں پہنچ جاتے ادھر غازی علم الدین جو قرآن شریف پڑھے ہوئے نہیں تھے اور انہیں سورۃ یوسف نہیں

آتی تھی، بار بار صحیح لقمہ دے رہے تھے اور سورہ یوسف پڑھنے میں انہیں پوری مدد دی۔ پیر صاحب ملاقات کر کے واپس آئے تو حیرت و استعجاب کے عالم میں تھے اور اتنا ہی کہہ سکے۔

"مجھے علم الدین کے لبادے میں کسی اور ہستی کا گمان ہوا ہے کون کہتا ہے کہ غازی علم الدین ان پڑھ اور جاہل ہیں انہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ کائنات کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہیں۔"

پنجاب کے ناعاقبت اندیش گورنر کے حکم پر غازی علم الدین کی میت کو قیدیوں کے قبرستان میں بغیر کفن کے دبا دیا گیا۔ یہ اطلاع لاہور پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ مسلمانوں نے تمام کاروبار بند کر دیئے اور ایک وفد نے گورنر ڈی مونٹ مورنس سے ملاقات کی اور غازی علم الدین شہید کی میت لاہور منتقل کرنے کا مطالبہ کیا جس پر گورنر نے پہلا سوال کیا کہ اگر نعش لاہور آنے پر ہندو مسلم فساد ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا۔ علامہ اقبال نے بلا توقف کہا کہ "اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میری گردن اڑا دیجئے گا۔" اس پر گورنر نے چند مزید شرائط پیش کر کے میت کو لاہور لانے کی اجازت دی۔

13 نومبر 1929ء کو مسلمانوں کا ایک وفد میانوالی پہنچا، دوسرے دن علی الصبح شہید کی نعش کو گڑھے سے نکال کر بصد احترام ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لایا گیا اور وہاں ایک صندوق میں بند کیا گیا جو سید مراتب علی شاہ گیلانی نے بنوایا تھا۔ اس کے اندر جست لگا ہوا تھا جست پر روئی کی دبیز تہہ تھی سرہانے نرم و ملائم تکیئے رکھے ہوئے تھے جن لوگوں نے شہید کی میت کو دیکھا ہے ان کے مطابق دو ہفتے گزرنے کے باوجود میت میں ذرا بھی تعفن نہیں تھا۔ جسم صحیح سالم تھا، چہرے پر جلال و جمال کا امتزاج تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی میت کو سپیشل ٹرین کے ذریعہ 14 نومبر 1919ء کو پانچ بج کر پینتیس منٹ پر لاہور چھاؤنی سے ذرا پرے نہر کے پل کے پاس اتارا گیا اور محکمہ جیل نے وہ صندوق جس میں حضور اکرم ﷺ کا شیدائی استراحت فرما رہا تھا علامہ اقبال اور سر محمد شفیع کے حوالے کر کے رسید حاصل کی۔ اس موقعہ پر علامہ اقبال نے اخبار سیاست کے مالک و مدیر سید حبیب سے مشورہ کیا کہ شہید کا جنازہ پڑھانے کا شرف کسے حاصل ہونا چاہئے۔ جس پر سید حبیب نے کہا کہ یہ شہید کے والد طالع مند کا حق ہے اس کے جواب میں میاں طالع مند نے کہا کہ اگر یہ حق مجھے حاصل ہے تو میں اسے علامہ اقبال کو تفویض کرتا ہوں، جس پر علامہ اقبال نے سید حبیب کے مشورہ سے جید عالم سید دیدار علی شاہ الوری کا نام تجویز کیا لیکن وہ بروقت تشریف نہ لا سکے جس پر پہلی نماز جنازہ مسجد وزیر خان کے خطیب قاری محمد شمس الدین نے اور دوسری نماز جنازہ سید دیدار علی شاہ نے اور تیسری نماز جنازہ سید احمد شاہ نے پڑھائی۔ غازی علم الدین شہید کے جنازے میں تقریباً چھ لاکھ مسلمان شریک ہوئے۔ جنازہ کا جلوس تقریباً ساڑھے پانچ میل لمبا تھا۔"

(ہر سال 31 اکتوبر کو غازی علم دین شہید کا عرس منایا جاتا ہے۔)
(بحوالہ روزنامہ مشرق لاہور مورخہ 1988-10-30)

# تین گول میز کانفرنسیں

(1930ء تا 1932ء)

برصغیر کے لوگوں کو آئینی مراعات دینے کے لئے برطانوی حاکموں نے گول میز کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ پہلی کانفرنس 12 نومبر 1930ء تا 31 جنوری 1931ء لندن میں منعقد ہوئی۔ دوسری کانفرنس ستمبر 1931ء تا دسمبر 1931ء اور تیسری اور آخری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس نومبر و دسمبر 1932ء میں منعقد ہوئی۔

یہ کانفرنسیں جون 1929ء کے برطانوی انتخابات میں لبرل پارٹی کی شکست کے بعد لیبر پارٹی کے برسراقتدار آنے والے وزیراعظم سر میزے میکڈ انلڈ کے دور میں منعقد کی گئیں۔ پہلی کانفرنس میں پنجاب سے سر شاہ نواز، میاں محمد شفیع بیگم شاہ نواز اور سر ظفراللہ خاں نے نمائندگی کی اور مسلم لیگ کی طرف سے سر آغا خان، محمد علی جوہر، مولوی فضل حق، غلام حسین ہدایت اللہ، علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح شریک ہوئے۔ اس وفد کے سربراہ سر آغا خاں تھے۔

کانگریس نے پہلی کانفرنس میں شرکت نہ کی۔ البتہ دوسری اور تیسری کانفرنسوں میں ہندو لیڈر بھی شامل ہوئے، لیکن دوسری کانفرنس کے موقع پر گاندھی نے مسلم دشمن رویہ اختیار کیا اور کانگریس کو سارے ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت کے طور پر منوانا چاہا۔ چنانچہ تیسری کانفرنس میں گاندھی کے خلاف احتجاج کے طور پر محمد علی جناح نے شرکت نہ کی، اور برطانیہ کی حزب اختلاف نے بھی اس کانفرنس میں شمولیت اختیار نہ کی، تاہم 17 نومبر تا 24 دسمبر 1932ء یہ کانفرنس گذشتہ کانفرنس کی رپورٹوں پر غور کر کے ختم ہوگئی، اور بعدازاں انڈیا کی سیاسی صورتحال کے بارے میں برطانوی حکومت نے ایک قرطاس ابیض (White-Paper) بھی جاری کیا۔ جس میں تینوں گول میز کانفرنسوں کے حوالے سے نتائج پر روشنی ڈالی گئی، اور گاندھی کے فلسفہ کے خلاف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا تاثر ابھارا اور فیصلہ کیا کہ مسلمان بھی اپنی آبادی کے تناسب سے حکومت میں متناسب نمائندگی کے حق دار ہیں۔ جس کے نتیجہ میں برطانوی حکومت کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کا اجراء عمل میں آیا۔

جس میں ہندوستانیوں کو آئینی مراعات اور حکومت میں نمائندگی کی وضاحت کی گئی۔ یہ ایکٹ اگرچہ 1935ء میں پاس ہوگیا تھا لیکن عملی طور پر اس پر عمل درآمد 1937ء میں ہوا۔

اس ایکٹ کی رو سے صوبائی خودمختاری زیادہ سے زیادہ دی گئی۔ جس میں وائسرائے کے مقرر کردہ صوبائی گورنروں کو ویٹو کی پاور سے بھی نوازا گیا تھا۔ چنانچہ اس ایکٹ پر اعتراض کئے گئے اور قائداعظم نے اسے نقائص کا پلندہ اور ناقابل عمل قرار دیا۔

**علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد:** علامہ اقبالؒ کی شاعری میں درد دل اور مسلمانوں سے محبت کا عنصر نمایاں ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا<br>
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

کی گھاٹیوں کو پار کرکے مسلمانوں کی مملکت قائم کرنے کے نظریہ کے خالق بن کر ابھرے اس سے پہلے انہوں نے مسلم لیگ میں شرکت فرمائی پھر قائداعظم محمد علی جناح سے خط و کتابت کرکے اس کی سربراہی پر آمادہ کیا اور 1930ء میں مسلم لیگ نے اپنے الہ آباد کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال کو صدارت کی دعوت دی۔ جس میں علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں ایک نئی مسلمان مملکت کے قیام کا نظریہ پیش کیا۔ جو برصغیر کے ان علاقوں پر مشتمل ہونی چاہئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کا حتمی اور مستقل حل یہ ہے کہ پنجاب کی انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے کیونکہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور پنجاب کے باقی سارے علاقے اور صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان کو ملا کر ایک علیحدہ مسلم مملکت کی داغ بیل ڈالی جائے کیونکہ ان علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس مملکت میں مسلمانوں کی حکمرانی ہوگی جہاں وہ اسلامی اقدار اور رسم و رواج کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہوں گے۔ (مفہوم)

علامہ اقبال کے اس خطبے نے مسلمانوں کی تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی منزل کے حصول کو قریب کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی منزل "پاکستان" کا پتہ چل گیا اور بعدازاں مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کو اجاگر کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ حتیٰ کہ 1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ آواز بن کر سامنے آئی۔ یہ دو قومی نظریہ کی فتح تھی جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی اور برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اسی نظریہ کی آبیاری کی تھی پھر سرسید اور دوسرے مسلمان زعما نے اپنے اپنے دور میں ہندو کی متعصبانہ روش کو بھانپتے ہوئے مسلمانوں کی کھلم کھلا حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا اور علی گڑھ کالج کو ترقی دے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ دلوایا تھا۔ اس خطبہ کے بعد آج تک علامہ اقبال کو مفکر پاکستان اور مصور پاکستان کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ وہ قرارداد پاکستان

کی منظوری سے بھی دو سال پہلے 21 اپریل 1938ء کو انتقال فرما گئے تھے۔ پھر اگست 1947ء میں مملکت خداداد پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو کر رہا۔

# 1935ء کی آئینی اصلاحات اور مسلم لیگ

سیاسی بے چینی نے انگریزوں کی نیندیں حرام کردی تھیں اور ہندوستان پر حکومت کو آسان گولی سمجھ کر نگلنا ان کے لئے روز بروز مشکل ہو رہا تھا۔ عدم تعاون سول نافرمانی، بھوک ہڑتال اور اور ستیہ گرہ جیسی تحریکوں نے حکومت کے خلاف ایک انقلابی صورت پیدا کر دی تھی۔ ان حالات سے نپٹنے کے لئے انگریز نے کبھی نہرو رپورٹ کا سہارا لیا کبھی محمد علی جناح کے چودہ نکات پر آگے بڑھا اور کبھی گول میز کانفرنسوں کی صورت میں ہندوستانیوں کو مصروف رکھا، لیکن اسے آخر یہ احساس ہو گیا کہ منتخب نمائندگان کو آئینی امور میں حصہ دار بنانا پڑے گا۔ چنانچہ 1935ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے اہل ہند کو بعض حکومتی امور میں نمائندگی کا حق مل گیا۔ 1935ء میں پاس ہونے والا یہ ایکٹ جزوی طور پر لاگو ہوا، اور مکمل طور پر اس کا نفاذ یکم اپریل 1937ء سے ہوا۔ کیونکہ جارج پنجم کی وفات کی وجہ سے کچھ قانونی امور اس کی تاخیر کا باعث بنے تھے۔ اس ایکٹ میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں پر کڑی تنقید کی گئی تھی اس کی بعض خصوصیات اس طرح تھیں۔

1- اس ایکٹ کے تحت تمام صوبوں کو صوبائی خودمختاری دے دی گئی، اور پارلیمانی طرز جمہوریت کو اپنایا گیا۔ نامزد ارکان ختم کر دیئے گئے۔
2- صوبائی ممبروں کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کے اجازت مل گئی بشرطیکہ وہ آئینی دائرہ میں رہیں۔ اسمبلی میں پاس ہونے والے قانون کی توثیق اسمبلی کے سربراہ کے سپرد ہوئی جو کہ گورنر تھا۔ گویا انگریز گورنر سے توثیق کرانا تھی جسے جمہوریت کے علی الرغم خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔
3- صوبائی وزارت کی تشکیل اکثریتی پارٹی کا لیڈر کرے گا۔ اس کی ناکامی کی صورت میں حزب اختلاف حکومت بنائے گی۔
4- حق رائے دہی ووٹرز کو جمہوری اصول سے تحت دے دیا گیا اور 1919ء کے ایکٹ کی بعض پابندیاں نرم کردی گئیں۔ البتہ مندرجہ ذیل زمروں کے اشخاص ووٹ نہ دے سکتے تھے۔
(1) فاترالعقل شخص (2) دیوالیہ شخص (2) سرکاری ملازم (4) غیر ملکی باشندہ۔
5- رائے دہی کے لئے خفیہ پرچی کا طریقہ قرار دیا گیا۔

## صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے اختیارات:

ا۔ صوبائی حکومت کے اختیارات کی ایک فہرست دی گئی۔
ب۔ دوسری فہرست مرکزی حکومت کے اختیارات سے متعلق تھی تیسری فہرست جسے "کنکرنٹ لسٹ" کا نام دیا گیا مشترکہ قسم کے امور سے متعلق تھی۔ مثلاً ایکسائز اور تعمیرات وغیرہ اس لسٹ کے تحت آتے تھے۔ نیز طے پایا کہ جن امور کا ان فہرستوں میں ذکر نہیں ان کے متعلق صوبائی گورنر۔ وائسرائے بات چیت کر کے اسے نپٹائے گا اور اس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ البتہ تجارت، امور خارجہ، ریلوے، دفاع اور پولیس کے محکمے مرکزی حکومت کے پاس رکھے گئے۔

**فیڈرل کورٹ کا قیام:** دہلی مرکزی دارالحکومت تھا۔ یہاں ایک اعلیٰ عدالت قائم کی گئی جسے لندن کی پریوی کونسل میں سنے جانے والے تمام مقدمات کی سماعت کا اختیار دے دیا گیا۔ نیز اس عدالت کو قانون کی بعض شقوں کی تشریح کا اختیار بھی دیا گیا۔ کسی الجھن کی صورت میں وائسرائے بھی اس عدالت سے رجوع کر سکتا تھا۔

**سروس کمیشن کا قیام:** صوبائی اور مرکزی اعلیٰ ملازمین کے انتخاب کے لئے سروس کمیشن قائم کیا گیا۔ جو مقابلے کے امتحان منعقد کراتا اس سروس میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم تھی۔

**ریلوے اتھارٹی:** ریلوے کا محکمہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ اسے اچھی طرح چلانے کے لئے ایک بااختیار ادارہ قائم کیا گیا۔ جسے "ریلوے اتھارٹی" کا نام دیا گیا۔

**ریزرو بینک آف انڈیا:** کو قائم کیا گیا۔ جسے ہندوستان میں چالو کرنسی کے اجرا کا اختیار دیا گیا۔ ازیں پیشتر کرنسی کے اجرا کا کام امپیرل بینک آف انڈیا کی وساطت سے ہوتا ہے۔

**سندھ صوبہ کی علیحدگی:** مسلمانوں کی دیرینہ مطالبہ پر سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبہ سندھ تشکیل دیا گیا۔ چنانچہ ایکٹ 1935ء کے تحت سندھ کو خود مختار صوبے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح مسلم اکثریت والا ایک اور صوبہ معرض وجود میں آگیا۔ اسی طرح "شمال مغربی سرحدی صوبہ" کے نام سے سرحدی صوبہ کو خود مختاری دی گئی اور مشرق میں اڑیسہ کو بھی ایک الگ صوبہ قرار دے کر خود مختاری دے دی گئی۔ ادھر قبائلی علاقوں اور بلوچستان کو برطانوی پولیٹکل ایجنٹ کے زیر نگرانی ہی رہنے دیا گیا۔

**وفاقی نظام کا قیام:** مرکزی حکومت کی مضبوطی کے لئے ہندوستان کی متعدد ریاستوں کے سربراہوں کی متفقہ رائے سے پورے ہندوستان میں ایک وفاقی نظام قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں، لیکن دو سال تک یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ادھر 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، اور یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

**فیڈرل اسمبلی کی ہیئت مقتدرہ:** یہ دو ایوانوں پر مشتمل تھی 1۔ ایوان عام 2۔ ایوان خاص۔

1۔ ایوان خاص کو کونسل آف سٹیٹس کا نام دیا گیا اس کے ارکان کی تعداد 156 تھی جن میں سے 104 ارکان دیسی ریاستوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

2۔ ایوان عام کو فیڈرل اسمبلی کا نام دیا گیا۔ اس کے ارکان کی تعداد 250 تھی۔ ان میں 125 ایسے ارکان حکومت کو شامل کرنے کی اجازت تھی جو دیسی ریاستوں کی طرف سے نامزد کئے گئے۔ اس اسمبلی کی مدت پانچ سال تھی، لیکن وائسرائے اسے وقت سے پہلے ختم یا معطل کر سکتا تھا۔

**مرکزی وزراء:** 1919ء کے ایکٹ والی مراعات قائم رکھی گئیں اور مرکز میں دو عملی کی پالیسی جاری رکھی گئی 1935ء کے ایکٹ کی رو سے اگرچہ صوبوں کو خود مختاری مل گئی لیکن مرکز میں پہلے والے مخصوص حالات قائم رکھے گئے۔ دفاع، خارجہ مذہبی اور قبائلی امور وائسرائے کے تحت کام کرنے والی تین ارکان پر مشتمل ایگزیکٹو کونسل کی سپرداری میں ہی رہے۔

صوبائی گورنروں کا تقرر وائسرائے خود کرتا تھا۔ اور نئے ایکٹ کے تحت گورنروں کو وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ یعنی انتظامی اور قانون سازی کے اختیارات جن کی حتمی منظوری وہی دے سکتا تھا۔ نیز گورنروں کو اسمبلی کے پاس کردہ قوانین کی توثیق یا عدم توثیق کا اختیار بھی حاصل تھا۔ نیز انہیں خاص حالات میں وائسرائے کی طرف دیکھنے کی بجائے "خصوصی ذمہ داریاں" بھی اس کی ایکٹ کے تحت سونپی گئیں۔ تاکہ انگریزی حکومت کے مفاد کے خلاف کوئی امر پنپ نہ سکے۔ ریاستی امور میں گورنر اپنی مرضی مسلط کر سکتا تھا اور کسی وزیر یا اسمبلی سے مشورہ کا پابند نہ تھا۔ اسے اس کے "ذاتی فیصلہ" کا نام دیا گیا۔

ہنگامی حالاتِ گورنر اسمبلی کی معطل یا برطرف کر سکتا تھا اور سول سروس کے ذریعے حکومت چلا سکتا تھا۔ البتہ اپنے مشیر بھی مقرر کر سکتا تھا۔

**1935ء کے ایکٹ کے بارے میں آراء:** قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس ایکٹ کے بارے میں فرمایا۔

"نیا آئین سراسر بے ہودہ اور نکما ہونے کے علاوہ نقائص کا پلندہ اور قطعی طور پر ناقابل

عمل اور ناقابل قبول ہے۔

راج گوپال اچاریہ نے اسے 1919ء کے ایکٹ سے بھی بدتر قرار دیا۔

انگریز مورخ اے۔بی کیتھ نے 1935ء کے ایکٹ کو فیڈرل سکیم کی حرامی وفاق (BASTA RD FEDERATION) کی خصلتوں کا مظہر قرار دیا۔

جواہر لال نہرو نے اسے بغیر انجن کے۔ نری بریکوں والی خوبصورت موٹر گاڑی کا نام دیا۔ جبکہ شیر بنگال اے کے فضل حق نے اسے برطانوی سامراجیت کا مظہر کہا۔

بہرحال 1935ء کا انڈیا ایکٹ۔ خود مختاری کی طرف ایک قدم تھا۔ جو سائمن کمیشن کی سفارشات سے بھی آگے نکل گیا۔ صوبائی خود مختاری بھی کافی آگے بڑھی تھی۔ البتہ گورنر کو خصوصی اختیارات حاصل تھے۔ جن کو کسی نے بریکیں کہا اور کسی نے برطانوی سامراج کا مظہر قرار دیا۔ البتہ گورنروں نے ان اختیارات کو بہت ہی کم استعمال کیا۔

**1936ء کے انتخابات:** اس ایکٹ کے تحت 1936ء میں انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ غلط حلقہ بندی اور ہندو اکثریت تھی۔ جس کا علاج جمہوری نظام میں ممکن نہ تھا۔ نیز مسلمان اقتصادی مالی اور سماجی کمزوریوں کی وجہ سے ہندوؤں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑے گئے تھے۔ ان انتخابات میں 484 میں سے مسلم لیگ 108 نشستیں حاصل کر سکی۔ پنجاب میں 84 میں سے صرف دو سیٹیں مسلم لیگ کو ملیں۔ البتہ بنگال میں وہ 117 میں سے 40 سیٹیں لے گئی۔ یوپی میں 64 میں سے 27 مسلم لیگ کو ملیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی 34 میں سے کوئی سیٹ نہ جیت سکی۔ اسی طرح سندھ کی 35 مسلم نشستیں بھی اغیار کے ہاتھ لگیں۔ بہرحال 1937ء میں ان نتائج کا اعلان کیا گیا اور کانگریس نے حکومت بنائی۔ اس پر قائداعظم نے ہندو اکثریت کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے۔ آئندہ ہونے والے مظالم کی تصویر دکھا کر متنبہ کیا کہ اگر مسلمانوں کو ان حق نہ دیا گیا تو امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یوپی میں کانگریس کو 228 میں سے ایک نشست ملی تھی۔ جبکہ 64 مسلم نشستوں میں سے 27 مسلم لیگ کو ملی تھیں اور باقی آزاد امیدوار لے گئے تھے، لیکن ابوالکلام آزاد مرحوم نے مسلم لیگ کے ساتھ کانگریس کی شمولیت کے لئے مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کرنے کی شرط لگانے کی بڑھک لگائی۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ نہیں بلکہ ان کے پیچھے کانگریس کی ذہنیت بول رہی ہے۔ نیز کانگریس کے مہروں نے مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کو بری طرح شکست سے دوچار کیا تھا۔ اب مسلم لیگ نے اپنی تنظیم اور کارکردگی بڑھانے پر توجہ دی اور مسلمانوں کو اتحاد کے لئے ابھارا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مسلمان زعما کو بھی کانگریس نے بری طرح استعمال کیا۔ اور ترنگا پرچم لہرانے کی کوشش کی۔ نیز ہندی کی ترویج کا حکم بھی جاری کیا اور اسے سرکاری زبان قرار دے دیا اور

گاؤ کشی کی ممانعت کر دی و دیا یا مندر سکیم کے تحت تعلیم کو مندروں کے ذریعے عام کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور کانگریسی ترانہ بندے ماترم کو رواج دیا۔

اب مسلمان زعما کی آنکھیں کھلیں اور کانگریس میں کام کرنے والے مسلم رہنماؤں کو ہندو کی بالا دستی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ بعد کے چند سالوں میں مسلم لیگ کی رکنیت میں کافی اضافہ ہوا۔ ادھر مسلمان لیڈروں نے ہندوؤں کے آئندہ عزائم کی قلعی کھول دی اور مسلمانون کی آنکھیں کھولنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

13 اکتوبر 1937ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہونا قرار پایا جسے کانگریس نے جلانے اور قائداعظم کو قتل تک کی دھمکیوں سے روکنا چاہا' لیکن یہ جلسہ ہوا اور قائداعظم نے ہندو کی مکاریوں کا پردہ خوب چاک کیا۔ ایسا ہی ایک جلسہ بمبئی میں بڑا کامیاب رہا۔ اور اس طرح کانگریس بوکھلا اٹھی۔

1938ء میں قائداعظم نے سندھ کا دورہ کیا۔ نیز گاندھی سے بذریعہ خط و کتابت بھی اسلامی کاز کے لئے جنگ جاری رکھی۔ 21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال کی وفات سے مسلمانوں کو بڑا دھچکا لگا اور پھر نومبر 1938ء میں مولانا محمد علی کے بھائی مولانا شوکت علی کی وفات بھی حسرت آیات تھی تاہم قائداعظم کا وجود ایک نعمت ثابت ہوا اور مسلمانوں کی کشتی کو ڈولنے نہ دیا گیا۔ 1937ء سے 1939ء تک مسلم لیگ نے بڑی جدوجہد کی اور ایسا جوش مسلمانوں میں بھرا کہ وہ مارچ 1940ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کرانے میں کامیاب ہو گئی۔

**دوسری جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست:** یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ 3 ستمبر کو برطانیہ نے ہٹلر کے خلاف اعلان جنگ کر کے پولینڈ کا ساتھ دیا۔ اسی روز فرانس نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس جنگ کو دوسری جنگ عظیم کا روپ دینے میں حالات کی مدد کی۔ ہندوستان میں کانگریسی راج 1937ء میں قائم ہوا تھا۔ 4 ستمبر 1939ء کو حکومت ہند کے لاء ممبر سر محمد ظفر اللہ خاں نے مرکزی اسمبلی میں اعلان کیا کہ ہم ہندوستانی لوگ شہنشاہ برطانیہ کے ہر حکم کی تعمیل من و عن کریں گے 5 ستمبر 1939ء کو ہندوستانی وائسرائے نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا مسودہ مرکزی اسمبلی میں پیش کر کے 27 ستمبر کو اس کی منظوری حاصل کر لی جس کی رو سے ہندوستان کی طرف سے بھی برطانیہ کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا گیا۔

اس غیر متوقع اعلان نے کانگریس کی نیندیں حرام کر دیں۔ وہ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھ رہے تھے' لیکن جنگ نے معاملہ خراب کر دیا۔ انہوں نے وائسرائے سے ملاقات میں یک طرفہ آزادی کا مطالبہ کیا کہ جنگ کے بعد انگریز۔ حکمران کانگریس کو نمائندہ مان کر حکومت ان کے

حوالے کر دیں گے، لیکن حکومت نے 1935ء کے دستور کے وفاقی حصے کو معطل کر دیا۔ جسے جنگ خاتمے کے بعد بحال کرنے کا وعدہ کیا اس موقع پر مسلم لیگ نے انگریزوں کی مدد کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا بشرطیکہ آزادی دیتے وقت مسلمانوں کے مؤقف کو بھی اہمیت دی جائے، اور صرف کانگریس کو ہی ہندوستانی سیاسیات کا مرکز نہ مان لیا جائے۔

کیونکہ کانگریسی مولویوں نے ہندوؤں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اس کی راہ ہموار کر دی تھی۔ کانگریس نے انگریزوں پر دباؤ بڑھانے کے لئے اجتماعی استعفیٰ دینے کا پروگرام بنایا۔ 18 اکتوبر 1939ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ آزادی دینے کے وقت اقلیتوں کے مطالبات کو قانونی اہمیت دے کر منصفانہ فیصلے کئے جائیں گے۔ اس لئے کانگریس کو اپنی چودھراہٹ خطرے میں نظر آئی اور فیصلہ کے تحت 27 اکتوبر 1939ء کو مدراس کی کانگریسی وزارت مستعفی ہو گئی حتیٰ کہ 14 نومبر تک سب کی سب کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں، اور گورنروں نے اختیارات سنبھال لئے۔ صرف پنجاب آسام بنگال اور سندھ میں وزارتیں کام کرتی رہیں۔ چنانچہ 22 دسمبر 1939ء کو ہندوؤں کے غلبہ سے نجات کے لئے یوم نجات منایا گیا۔ اس روز جمعہ تھا۔ دوسری اقلیتوں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح قائداعظم اور مسلم لیگ کی عظمت کا اعتراف کانگریسی زعما کو بھی کرنا پڑا۔

## پنجاب کے بعض مسلمان رہنما

**محمد شفیع (میاں):** آپ 10 مارچ 1869ء کو لاہور کے آرائیں خاندان میں پیدا ہوئے، اور مشن ہائی سکول رنگ محل سے میٹرک اور ایف سی کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر چند سال کے لئے برطانیہ چلے گئے اور بار ایٹ لاء بن کر لاہور واپس آئے۔ آپ سرسید کے ہم خیال تھے۔ لہٰذا ان سے ملاقات بھی کی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے سرسید کا پیغام پنجاب میں گھر گھر پہنچایا اور سرسید کے ساتھ مل کر چندہ بھی جمع کرتے رہے۔ آپ کی خدمات کو مسلمانوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ 1998ء میں آپ کو علی گڑھ کالج کا ٹرسٹی چنا گیا۔

سیاسی میدان میں بھی آپ نے بڑی خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کو ہندو اور انگریز کے مشترکہ نقصان رساں چالبازی سے محفوظ رکھنے کے لئے آپ نے بڑی جدوجہد کی۔ 1906ء میں لارڈ منٹو سے ملاقات کرنے والے وفد میں شامل تھے اور مسلمانوں کو ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے حصہ دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ 1906ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس میں شمولیت اختیار کی اور پنجاب میں مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم کرنے میں مستعدی دکھائی۔ وکالت کا آغاز ہوشیار پور سے کیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے لئے بھلائی کی سکیموں میں کوشاں

رہے اور دفائی انجمن اسلامیہ کی ضلعی شاخ کے زیر اہتمام ہوشیار پور میں ایک مڈل سکول کا اجرا کروایا اور بطور کامیاب وکیل بڑی شہرت حاصل کی۔

1895ء میں لاہور منتقل ہوگئے۔ 1898ء میں لاہور بار کے سیکرٹری اور 1907ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ 1912ء میں آپ کو ہائیکورٹ کے جج کے عہدہ کی پیشکش ہوئی۔ جسے آپ نے قبول نہ کیا اسی طرح 1910ء میں بھی ایسی ہی ایک پیشکش نامنظور کر دی۔ 1907ء میں پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کی شاخ قائم کی اور بطور جنرل سیکرٹری 1916ء تک خدمات انجام دیں۔ 1913ء لکھنؤ میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی اور اس کے سالانہ جلسے کی صدارت بھی کی، اور صدارتی خطبے میں بڑی اہم باتیں بیان کیں جن کو شہرت اور پذیرائی ملی۔ کچھ عرصہ اور انجمن اسلامیہ لاہور کے سیکرٹری بھی رہے۔

1916ء میں پنجاب مسلم لیگ کی سیکرٹری شپ سے بوجوہ مستعفی ہوگئے اور آل انڈیا مسلم ایسوسی ایشن قائم کرلی جس کے آپ جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ دسمبر 1911ء میں پنجاب کی طرف سے آپ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن چنے گئے۔ 1914ء میں اس کونسل کی رکنیت مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر حاصل ہوگئی۔ جولائی 1919ء میں آپ کو وائسرائے ہند کی انتظامی کونسل میں تعلیمی شعبہ کا سربراہ رکن متعین کیا گیا۔ 1907ء تا 1919ء آپ اسلامیہ کالج لاہور کی مجلس منتظم کے اہم رکن کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ 1919ء میں آپ کی ہمہ گونہ خدمات کے عوض "سر" کا خطاب ملا۔ دہلی یونیورسٹی نے آپ کو ایل ایل ڈی کے اعزازی ڈگری بھی دی۔ جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف ڈی۔ ایڈ کی اعزازی ڈگری ملی۔

1927ء میں آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر چنا گیا۔ 20 مارچ 1927ء کو قائداعظم نے مسلمان زعما کی کانفرنس دہلی میں طلب کی۔ جس میں آپ بھی شریک تھے، اور تجاویز دہلی کے نام سے مسلمانوں کو اسمبلیوں میں نمائندگی کا فارمولا حاصل ہوا لیکن سر محمد شفیع نے ان تجاویز کی مخالفت کی اور اس طرح شفیع لیگ اور جناح لیگ کے طور پر مسلم لیگ بٹ گئی۔

چنانچہ سائمن کمیشن کی جناح لیگ مخالف تھی لیکن سر شفیع کی لیگ نے اس کا بائیکاٹ نہ کیا اور کمیشن سے تعاون کیا تا کہ کمیشن کو مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کرکے اس کی حمایت حاصل کی جائے۔ کانگریس وغیرہ نے بھی بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نمائندگی نہ دی گئی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے دونوں گروپوں میں شکر رنجی 1929ء تک قائم رہی۔

دوسری طرف دیگر اسلامی انجمنیں مثلاً خلافت کمیٹی وغیرہ بھی داخلی انتشار کا شکار تھیں۔ ادھر نہرو رپورٹ کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ شفیع لیگ سمیت اسلامی انجمنوں کی میٹنگ دہلی میں سر آغا خان کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جس میں جناح

لیگ شامل نہ ہوئی۔ تاہم باہمی اتحاد کی فضا استوار ہو گئی اور مارچ 1929ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس بلایا جس میں سر محمد شفیع بھی شریک ہوئے اور قائداعظم کے چودہ نکات والی قرار داد منظور کی گئی۔ 1931ء میں میاں صاحب نے لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ واپسی پر بیمار ہوئے اور 7 جنوری 1932ء کو وفات پا گئے۔ آپ علامہ اقبال اور دیگر مسلمان رہنماؤں کے گہرے دوست تھے۔

علامہ اقبالؒ: اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نور محمدؒ صوفیانہ خیالات کے حامل بڑے زیرک اور نیک مسلمان تھے۔ رزق حلال کی سعادت نے انہیں بہت عقلمند اور نکتہ سنج بنا دیا تھا۔ اسی لئے شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی نے ان کو "ان پڑھ فلسفی" کا خطاب دے رکھا تھا۔ پاکیزہ فضا میں پلنے والا اقبال سیالکوٹ میں ابتدائی تعلیم پانے لگا پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظیفہ لیا۔ ایف اے سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کرکے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور 1899ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا اور تمغہ پایا۔

علامہ اقبال 1905ء میں انگلستان چلے گئے اور فلسفہ میں ڈگری لی اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی چھ ماہ تک لنڈن میں آرنلڈ کی جگہ پروفیسر بھی رہے۔ مارچ 1907ء میں انگلستان میں ہی ایک نظم لکھی جس میں یورپی تہذیب کی بے ثباتی اور بے اساسی اجاگر کی گئی نیز اسلام کے درخشاں مستقبل کی نوید سنائی گئی اور ان کے کردار کی جھلک اس طرح نمایاں کی گئی ملتی ہے:

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا
اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری
نفس مرا شعلہ بار ہوگا

ولایت میں انہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لاہور میں گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر لگ گئے، لیکن حکومت نے ان کو پریکٹس کی اجازت (بطور بیرسٹر) بھی دے دی تھی۔ اٹھارہ ماہ بعد پروفیسری چھوڑ دی اور وکالت کو پیشہ بنالیا۔ شاعری کے میدان میں قدرت نے ان کو بڑی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ لہٰذا بڑی پرشکوہ نظمیں لکھ کر شہرت کے بام عروج تک پہنچ گئے۔ ان میں شکوہ۔ جواب شکوہ شمع اور شاعر، طلوع اسلام۔ خضر راہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1915ء میں اسرار خودی کی مثنوی (فارسی) منظر عام پر آئی۔ 1918ء میں رموز بیخودی چھپ گئی وہ گویا اسرارِ خودی کا تتمہ تھی۔ بانگ درا 1924ء میں چھپی، پھربال جبریل وغیرہ بھی شائع ہوئیں جو ایک الگ موضوع ہے۔

**اقبال اور سیاسیات:** علامہ اقبال کو سیاست میں ان کا وہ نصب العین لے آیا جس کا حصول اسلامی مقاصد کے تحفظ اور مسلمانوں کی بہبود کے لئے نہایت ضروری تھا۔ مسلم لیگ کی بھی انہوں نے اس لئے حمایت کی تھی کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں تھی۔ پنجاب کے بارے میں علامہ اقبال بہت پر امید تھے' اور ان کے خیال میں اسلام کے لئے آئندہ لڑی جانے والی لڑائیاں پنجاب میں ہی لڑی جائیں گی۔ (مکاتب اقبال حصہ دوم صفحہ 9)
1926ء میں وہ پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر چنے گئے جہاں انہوں نے پہلی بار پاکستان کے قیام کی ضرورت پر اپنے خطبہ میں زور دیا۔ گول میز کانفرنسوں کے آخری دو اجلاسوں میں بھی وہ شریک رہے۔ مسلم کانفرنس کے صدر کے طور پر مسلمانوں کے قومی حقوق اور اسلامی نصب العین کے تحفظ کے لئے بڑی استقامت سے کام کیا۔ مسلمانوں کو اتحاد اور یک جہتی کا سبق دیا۔ وہ اسلامی تحریکوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے' لیکن ساتھ ہی پائیدار مقصدیت کے حصول کے بھی زبردست موید تھے۔ علامہ اقبال کانگریس کے ہمنوا بھی کچھ عرصہ تک رہے' لیکن جلد ہی انہوں نے اس کی حقیقت کو بھانپ لیا۔ چنانچہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے وہ ہر سطح پر ڈٹ گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے سٹیج پر سے بھی انہوں نے اسلامی عہد رفتہ کو آواز دی اور مسلمانوں کو دینی تعلیمات پر پختگی سے عمل پیرا ہونے کے لئے کہا۔ انگلستان یا جرمنی میں بھی وہ اسلامی تعلیمات اور اسلامیات کو نہیں بھولے۔ خضر راہ اور طلوع اسلام ایسی نظموں میں بھی ان کا اسلامی پیغام سمویا گیا ملتا ہے۔ 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں بھی انہوں نے منطقی انداز میں مسلمانوں کی آزادی کی تاریخ کو روشن کیا اور انگریزوں پر واضح کر دیا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں جو اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔

علامہ اقبال نے قائداعظم جیسے دلیر اور نڈر قائد کو مسلمانوں کی قیادت کے لئے آمادہ کیا اور پھر مل کر ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ جب عمر نے وفا نہ کی تو علامہ اقبال کے ہمخیال جو لاکھوں کی تعداد میں وجود میں آچکے تھے' قائداعظم کے شانہ بشانہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں شریک رہے۔

8 مئی 1936ء کو وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر چنے گئے اور کشمیر میں نمائندگی کا حق بھی انہوں نے ادا کیا۔ تاہم 1937ء میں وہ عملی طور پر مسلم لیگ کی خدمات انجام دینے سے معذور ہوگئے کیونکہ ان کی نظر جواب دے گئی تھی۔ البتہ انہوں نے آخری دم تک اسے ہر طرح کے مشوروں سے بوقت ضرورت ضرور نوازا۔ آخر یہ دانائے راز جن کی مثل صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں' 21 اپریل 1938ء کو لاہور وفات پاگیا' اور شاہی مسجد کے باہر سیڑھیوں کے ایک طرف محو خواب ہے۔ کئی سالوں سے ان کے مزار پر سرکاری مسلح گارڈ کا ہروقت پہرہ رہتا ہے۔ انہوں نے

سچ ہی کہا تھا۔

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری

اور واقعی اہل عزم و ہمت آج بھی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

**علامہ اقبال اور تحریک پاکستان:** علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں زندگی کی روح پھونک دی، اور اجتماعی مسلم مفادات کے لئے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کا آغاز کیا 1930ء الہ آباد کے مسلم لیگی اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کے قیام کی تجویز دی اور انبالہ کے سوا سارے پنجاب وغیرہ پر مشتمل مسلمان مملکت قائم کرنے کے لئے کیا۔

اِدھر چوہدری رحمت علی نے مجوزہ مسلمان مملکت کا نام پاکستان تجویز کیا اور اپنی تحریر Now or Never میں اس کی اہمیت واضح کی۔ مارچ 1940ء کی قرارداد میں پاکستان کا نام لے کر الگ مملکت کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ پاکستان کا نام مسلم لیگ نے اپنے 1946ء کے اجلاس میں اپنانے کا فیصلہ کیا۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں پسماندگی سے نکالنے کے لئے بھرپور کوشش کی۔ وہ اسلام کے روشن مستقبل کے بارے میں بہت پُرامید تھے۔ اسلامی نظام کے غلبہ کے لئے کبھی انہوں نے افغانستان کے حکمرانوں کے قصیدے لکھے اور جب امید بر آتی دکھائی نہ دی تو مایوس ہونے کی بجائے ہندوستان کی مسلم مملکت کے بارے میں بڑی امیدیں لگائیں، اور عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کی یکجہتی کے لئے کوششوں کے علاوہ اپنی معجزانہ شاعری سے بھی کام لیا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر۔

**میاں محمد شاہ دین (جسٹس):** آپ 2 اپریل 1868ء کو باغبان پورہ لاہور کی آرائیں فیملی میں پیدا ہوئے۔ 1883ء میں مشن ہائی سکول رنگ محل سے میٹرک اور بعد ازاں 1887ء میں بی۔اے کیا اور پھر انگلینڈ میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس لاہور آ گئے اور وکالت شروع کر دی۔

1890ء میں ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جس کی صدارت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ سرسید کو پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے، کیونکہ ان کی نگرانی میں ایسی ہی ایک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کے مفادات کے لئے کام کر رہی تھی۔ دسمبر 1893ء میں آپ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تعلیم کے بارے میں مقالہ پڑھا جس کو بہت پسند کیا گیا چنانچہ اگلے سال یہ کانفرنس آپ کی صدارت میں ہی منعقد کی گئی اور اس طرح انہوں تعلیمی ترقی کے لئے سرسید کے خطوط پر پنجاب میں بھی کوششیں مزید زور و شور سے شروع کر دیں۔ 1893ء میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کا فیلو منتخب کیا گیا۔ اور دو سال بعد یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے رکن مقرر ہوئے، اور پھر لاء کالج کمیٹی کے

سیکرٹری بھی چن لئے گئے اور انجمن حمایت اسلام کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ آپ قابل ترین وکیل تھے۔ 1903ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1906ء میں آپ کو چیف کورٹ پنجاب کا جج مقرر کیا گیا اور عارضی علیحدگی کے بعد 1908ء میں اس عہدہ پر دوبارہ فائز ہوئے اور دس سال تک بطور جسٹس خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ کیلئے قائمقام چیف جسٹس بھی رہے۔ آپ کے فیصلے آج بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے 2 جولائی 1918ء کو پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔

**ملک برکت علی:** آپ یکم اپریل 1858ء کو ملک عبدالعزیز گگے زئی کے ہاں ایک متوسط گھرانے میں لاہور میں پیدا ہوئے 1900ء میں میٹرک کے بعد ایف۔سی کالج سے بی۔اے کرلیا۔ اور پھر ایم۔اے انگلش میں دوسری پوزیشن حاصل کی جبکہ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے طالبعلم کا صرف ایک نمبر زیادہ تھا۔ اکتوبر 1905ء کو ایف۔سی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر لگے، پھر اسلامیہ کالج آگئے جہاں سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چنے گئے اور اس دور میں پانچ ہزار روپے چندہ جمع کیا 1907ء میں ایل۔ایل۔بی کرکے منصفی اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے مقابلتی امتحان پاس کیے۔ تاہم 1909ء میں کیمبل پور میں لٹریری آفیسر لگ گئے۔ 1911ء میں لائل پور ٹرانسفر ہوگئی۔ پھر جبراً جہلم ٹرانسفر کیا اور بعدازاں چھ ماہ کی جبری رخصت پر بھیج دیا گیا اور یہ حالات ملک برکت علی کو پنجاب کی سیاست میں لانے کا باعث بنے۔ چنانچہ مستعفی ہوگئے اور 18 جنوری 1912ء کو آپ کا استعفیٰ منظور کرلیا گیا۔

فارغ ہوتے ہی آپ نے ویکلی آبزرور میں بطور ایڈیٹر ملازمت کرلی۔ سیاست دانوں سے پالا پڑا تو سیاسی سوجھ بوجھ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آپ مسلمانوں کے ترقی پسند گروپ کے ترجمان بن کر ابھرے۔ آپ کے ساتھیوں میں پیر تاج دین اور خلیفہ شجاع الدین کے نام قابل ذکر ہیں 1916ء تک آپ منجھے ہوئے مسلمان سیاستدان بن چکے تھے۔ 1913ء میں پنجاب کی گورنری سنبھالنے والا سرمائیکل ایڈوائر بڑا خود سر گورنر تھا۔ تاہم ملک برکت علی اور سر فضل حسین نے ہمیشہ اس کی پالیسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور 1918ء 9 مئی سے 11 مئی تک اس کی بجٹ تقریر کے خلاف زبردست اداریے لکھے جن کو پڑھ کر سرمائیکل غضبناک ہوگیا۔ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت آبزرور کی اشاعت بند کرنا پڑی۔ اور انہوں نے نیو ٹائمز کا اجراء کیا، لیکن یہ آبزرور کے مقابلے میں کمتر حیثیت کا اخبار تھا۔

**خدمات:** 1919ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت میڈیکل کالجوں میں 40 فیصدی نشستیں مسلمان طلبا کے لئے مختص کی گئیں ان دنوں وزیر تعلیم میاں فضل حسین تھے۔ یہ سفارشات ملک برکت علی نے ہی پیش کی تھیں۔ اسی طرح میونسپل کارپوریشن لاہور میں مسلمانوں کو بلحاظ آبادی

زیادہ نمائندگی حاصل ہوئی، اور ہندو پریس نے بہت شور مچایا۔ جس کا جواب مسلم پریس نے خوب دیا۔ دسمبر 1932ء میں اورینٹل کالج میں عربی اور فارسی کی تدریس کی حوصلہ شکنی کا پروگرام بنایا گیا تو ملک صاحب کی صدارت میں قرار داد مذمت پاس کر کے تجویز کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔

تحریک کشمیر میں بھی آپ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا لیکن اس تحریک کے صدر مرزا بشیرالدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحیم قادیانی تھے اس لئے علامہ اقبال اور ملک برکت علی نے نئے عہدیداروں کے چناؤ پر زور دیا۔ اور آخر علامہ اقبال کو اس تحریک کا صدر چن لیا گیا لیکن اس تحریک کے ممبران زیادہ تر قادیانی تھے جو تحریک کی آڑ میں قادیانیت کا پرچار کرتے تھے چنانچہ علامہ اقبال اور ملک صاحب نے نئی کشمیر کمیٹی قائم کر کے تحریک کشمیر سے علیحدگی اختیار کر لی۔

علامہ کی صحت ٹھیک نہ رہتی تھی چنانچہ ملک برکت علی کو مسلم لیگ کا منشور متعارف کرانے کی خدمات بھی انجام دینا پڑیں۔ اسی دور میں مسلم لیگ کی حمایت کے لئے روزنامہ احسان کا اجراء کیا گیا۔

1936ء میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ نے آپ کو اپنا ٹکٹ دیا۔ جس میں آپ کو کامیابی حاصل ہوئی اور 1945ء تک آپ کو مسلم لیگ کا فعال لیڈر تسلیم کیا جانے لگا۔ چنانچہ نئے الیکشن میں آپ بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔

اکتوبر 1945ء میں آپ کو دل کا پہلا دورہ پڑا 15 اپریل 1946ء کو آپ ایک کیس کی وکالت کرتے ہوئے عدالت کے اندر ہی دل کا دورہ پڑنے سے گر پڑے اور دو منٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون○

ملک برکت علی کے فرزند افتخار علی لکھتے ہیں:

ملک برکت علی نے مسلم لیگ کے 1917ء اور 1918ء کے اجلاسوں میں نمایاں حصّہ لیا اور قائداعظمؒ کے شانہ بشانہ مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنانے کے لئے متواتر کام کرتے رہے۔ جب ملک صاحب نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا تب انہوں نے لاء کالج لاہور میں داخلہ بھی لے لیا تھا چنانچہ انہوں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کر لی وہ ایف۔ای۔ایل اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات میں پنجاب یونیورسٹی میں اول رہے 22 دسمبر 1919ء سے انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

جب مسلم لیگ کا اجلاس 1924ء۔1925ء اور 1926ء میں علی الترتیب بمبئی، علی گڑھ اور دہلی میں منعقد ہوا تو انہوں نے ان اجلاس کی کارروائیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ 1924ء میں بمبئی کے اجلاس میں انہوں نے قائداعظمؒ کی اس قرارداد کی پُرزور تائید کی جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے جو ایسی تدابیر مرتب کرے جن سے مسلمانانِ

ہند کو نہ صرف قانون ساز اداروں میں مناسب نمائندگی حاصل ہو جائے بلکہ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کو ان کی آبادی کے تناسب سے جائز حصہ مل سکے۔ ملک برکت علی اس خصوصی کمیٹی کے کنویز مقرر ہوئے۔

قائداعظمؒ کو ملک برکت علی کی ذات پر مکمل اعتماد تھا اور سیاسی امور میں وہ ان کی رائے کو خاصی اہمیت دیتے تھے۔ لیاقت علی مرحوم نے راقم الحروف کو ایک نجی ملاقات میں بتایا کہ قائداعظمؒ نے انہیں یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جب بھی کوئی اہم معاملہ یا قرارداد مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش ہونے کا نوٹس موصول ہو اس کے متعلق ملک برکت علی کی رائے سے ان کو مطلع کیا جائے۔

ملک صاحب کو علم قانون کے تمام شعبوں پر پورا عبور حاصل تھا اس وقت کے ہندو اور مسلم وکلاء میں ان کا شمار صف اول میں ہوتا تھا خصوصی طور پر آئینی معاملات میں وہ خاص ملکہ رکھتے تھے۔ انہوں نے قانون کی مختلف شاخوں پر کئی کتابیں تصنیف کیں جن سے اس زمانے کے قانون کے طلباء استفادہ کیا کرتے تھے جب لاہور ہائیکورٹ میں مسجد شہید گنج کا مقدمہ پیش ہوا تو اس کی وکالت کے لئے قائداعظمؒ نے بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر کی خدمات حاصل کیں۔ انگریز بیرسٹر کے دلائل سننے کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے میرے والد مرحوم سے کہا کہ اگر وہ اس مقدمہ میں مزید دلائل پیش کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اجازت ہے۔ چنانچہ ملک برکت علی مرحوم نے اس مشہور مقدمے میں ایسے نقاط پیش کئے جو انگریز بیرسٹر پیش نہ کر سکا تھا۔ انہی نقاط کی بقاء پر جسٹس دین محمد مرحوم نے اختلافی فیصلہ لکھا جس میں میرے والد مرحوم کے دلائل کو صحیح تسلیم کیا گیا۔ جسٹس دین محمد مرحوم کا یہ تاریخی فاضلانہ فیصلہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلوں میں ایک خاص اہمیت کا حامل بنے یہ 1937ء کی بات ہے ملک برکت علی مرحوم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے لئے انتخاب میں حصہ لیے رہے تھے تو مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار' زمیندار" میں ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

اگر سرکار مرشد تھی تو احراری ولی نکلے
اور ان کی گوشمالی کو ملک برکت علی نکلے

مرحوم پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں کامیاب ہوئے تو قائداعظمؒ نے ایک بیان میں فرمایا کہ اب پنجاب میں مسلم لیگ کا جھنڈا قائم ہو گیا ہے' وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرا ایک واحد نمائندہ پنجاب اسمبلی میں سو مخالف نمائندوں پر بھاری ہے۔

آپ نے پنجاب میں مسلم لیگ کے جھنڈے کو بلند رکھا اور وہ اکیلے یونینسٹ وزارت کے خلاف ڈٹے رہے۔

ملک برکت علی علامہ اقبالؒ کے زبردست حامیوں میں سے تھے، اور یہ مراسم اس وقت تک قائم رہے جب علامہ اقبالؒ 21 اپریل 1938ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ علامہ صاحب سیاسی معاملات میں ملک صاحب کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے، اور اکثر ان سے تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کو لندن میں ایک مراسلہ بھیجا۔ تو یہ مراسلہ میرے والد مرحوم کے مشورہ سے لکھا گیا تھا۔ اس مراسلے میں قائداعظمؒ سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ واپس اپنے وطن تشریف لائیں، اور مسلمانان ہند کی قیادت فرمائیں۔ چنانچہ قائداعظمؒ انگلستان سے واپس بمبئی تشریف لائے اور 12 اپریل 1936ء میں مسلم لیگ کا اجلاس قائداعظم کی صدارت میں بمبئی میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ہونے والی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں حِصّہ لے گی۔ بمبئی کے اجلاس کے بعد قائداعظم لاہور تشریف لائے علامہ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین نائب صدر چنے گئے۔

23 مارچ 1940ء کے بعد پاکستان کے منصوبہ کو مقبول بنانے کے لئے ایک انگریزی ہفت روزہ اخبار "نیو ٹائمز" جاری کیا۔ پاکستان کی حمایت میں اس وقت پنجاب میں تین اخبار تھے۔ نیو ٹائمز، نوائے وقت اور احسان۔

ملک برکت علی انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی منسلک رہے اور اسلامیہ کالج لاہور کے انتظامی امور میں انہوں نے گہری دلچسپی لی۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور کے انتظامی کمیٹی کے صدر کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ ملک برکت علی نے اپنی زندگی کا بیشتر حِصّہ مسلمانانِ ہند کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، اِقتصادی اور ثقافتی فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حِصّہ لیتے رہے یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ جب قائداعظم کو گاندھی جی نے ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ آخر مسلمانان ہند کے مطالبات کیا ہیں۔ تو قائداعظمؒ نے ایک مختصر سا جواب گاندھی جی کو ارسال کیا اور اس جواب میں "نیو ٹائمز" کے ایک اداریئے کا تماشا شامل تھا۔ اس اداریے میں مسلمانان ہند کے اہم مطالبات کو گنوایا گیا تھا۔ قائداعظمؒ نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ اس اداریے کا بغور مطالعہ کریں تو ان کو مسلمانان ہند کے مطالبات سے کافی حد تک آگاہی ہو جائے گی۔ قائداعظمؒ نے اپنے جواب میں لکھا کہ گاندھی جی کے سوال کا جواب اس اداریے میں موجود ہے، اور وہ یعنی قائداعظمؒ مزید وضاحت کرنا مناسب نہیں سمجھتے، اور انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ اداریہ گاندھی جی کے دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھولنے میں کافی حد تک ممد و معاون ثابت ہو گا۔

مرحوم کی وفات پر قائداعظمؒ نے ان کی ان الفاظ میں تحسین کی۔ "مجھے ان کی وفات سے

سخت صدمہ پہنچا ہے وہ ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے سچے مخلص اور وفادار رکن تھے اور تمام موقعوں پر انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کا مشورہ اور ان کی حمایت میرے لئے اور مسلم لیگ کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ ان کی ناگہانی اور بے موقع وفات سے مسلمانانِ ہند ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں اور میں ایک رفیق کار معتمد ساتھی اور مخلص دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔ میری گہری اور دلی ہمدردیاں سوگوار خاندان کے ساتھ ہیں۔"

(بحوالہ ملک افتخار علی ولد ملک برکت علی کا مضمون)

(نوائے وقت لاہور 05 اپریل 1979ء)

## خاکسار پارٹی اور اس کے بانی عنایت اللہ مشرقی

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی امرتسر میں 25 اگست 1888ء کو خان عطا محمد خاں کے ہاں پیدا ہوئے، امرتسر میں ایف۔اے کے بعد 1909ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی کا ٹرائی پوس آنرز پاس کر کے رینگلر کہلائے، فزکس میں بی۔ایس۔سی اور میکینکل انجینئرنگ کا سب سے بڑا امتحان بھی 1912ء میں پاس کیا اور السنہ شرقیہ یعنی عربی اور فارسی میں بی۔او۔ایل بھی کیا۔

غرض پانچ سال کی مختصر مدت میں چار اعلیٰ اعزاز حاصل کئے 1913ء تا 1915ء اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل اور 1917ء تک پرنسپل رہے۔ 1917ء تا 1920ء حکومت ہند کے انڈر سیکرٹری رہے۔ پھر انڈین ایجوکیشن سروس میں تبدیلی ہوگئی۔ جہاں ان کو مخاصمانہ طور پر ان کو ہیڈ ماسٹر لگا دیا گیا۔ چنانچہ 1931ء میں ملازمت چھوڑ دی اراضی اور اپنی کتاب پیش کی اور ساتھ ہی خاکسار تحریک کے تحت مسلمان رضاکاروں کی ایک فوج تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان رضاکاروں کی خاکی وردی ہوتی۔ بیلچہ ان کا ہتھیار تھا۔ جسے وہ دفاع کے علاوہ بوقت ضرورت بطور توا۔ روٹی پکانے کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ عسکری تنظیم انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں کو اور سکھوں کو بھی کھٹکتی تھی۔ اچھرہ لاہور میں اس تنظیم کا مرکزی دفتر تھا۔ اور 1940ء کے اوائل تک یہ تحریک پشاور سے رنگون تک مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ خاکسار رضاکار ملک بھر میں دورے کرتے اور انتظامی اور نظم و ضبط کے لحاظ سے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے۔ بعض اوقات مظاہرہ کے وقت ان کی تعداد ایک ایک لاکھ تک پہنچ جاتی۔ حکومت اس تنظیم کے سخت خلاف تھی لیکن اسے کوئی بہانہ نہیں مل پا رہا تھا۔ 19 مارچ 1940ء کو 313 خاکساروں کا ایک دستہ لاہور کی شاہی مسجد کی جانب جا رہا تھا جس پر حکومت نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ بہت سے خاکسار جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ علامہ مشرقی کو گرفتار کر کے مدراس کی ویلور جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ مجموعی طور پر دس برس اسیر رہے۔ پاکستان کی تحریک میں علامہ مشرقی نے عموماً مسلم لیگ کی مخالفت کی اور پاکستان بنے

کے بعد پاکستان میں رہائش پذیر رہ کر 25 اگست 1963ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

خاکسار پارٹی مسلمانوں کے لئے واقعی بڑی جاندار اور قومی تحریک تھی۔ نواب بہادر یار جنگ اس جماعت کو مسلم لیگ کی بہ نسبت زیادہ فعال خیال کرتے تھے۔ وہ علامہ مشرقی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر 1938ء میں انہوں نے خاکسار پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ شروع شروع میں علامہ اقبال اس پارٹی کی تنظیمی صلاحیتوں کو مسلمانوں کے لئے بہتر سمجھتے تھے اور مخالفت نہ کرتے تھے، لیکن دشمنوں کی ریشہ دوانیوں نے اسے مسلم لیگ سے ہم آہنگ ہو کر نہ چلنے دیا، اور حکومت برطانیہ نے اس تنظیم کو فاشسٹ تحریک قرار دے دیا۔ علامہ مشرقی بھی مسلم لیگ دشمنی میں کافی آگے تک چلے گئے۔ حتیٰ کہ بمبئی میں 1943ء میں ایک خاکسار نے قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا تھا۔ جس کے بعد نواب بہادر یار جنگ نے اس پارٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ لاہور میں 20 مارچ 1940 کو مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان پیش کرنا تھی۔ 19 مارچ 1940ء کو خاکسار پارٹی کے جیش نے اس قرارداد کے جلسہ کو ناکام بنانے کے لئے شاہی مسجد کا رخ کیا تاکہ امن عامہ تباہ کر دیا جائے، لیکن پنجاب حکومت نے موقع کو غنیمت جان کر اس جیش پر فائرنگ کر کے اسے بہت نقصان پہنچایا۔ اس کا قائداعظم سمیت تمام مسلمانوں کو بہت دکھ ہوا۔ کیونکہ اہل اسلام کی ہلاکت بہرحال ملت اسلامیہ کا نقصان تھا۔

11 جنوری 1946ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان جلسے سے قائداعظم نے خطاب کیا۔ ان کی تقریر کے بعد علامہ مشرقی جو اس جلسہ میں شریک تھے۔ تقریر کرنے کے لئے اُٹھے، لیکن قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر انہیں بٹھا دیا کہ یہ جلسہ مسلم لیگ کا ہے۔ جس میں لیگی کارکن ہی خطاب کر سکتے ہیں۔ اس پر خاکساروں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لڑتے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ قائداعظمؒ اس ہنگامہ آرائی سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ تاہم مسلم لیگی کارکنوں نے صورت حال کو سنبھالا اور علامہ مشرقی کو اٹھا کر لے گئے اور اسلامیہ کالج ہال میں پہنچا آئے۔ اس طرح خاکسار پارٹی کا وقار مسلمانوں کے ہاتھوں خاک میں مل گیا اور ایک ایسی تحریک جو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔ مسلمان بھائیوں سے اختلاف کی پالیسی کی وجہ سے ناکام رہی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں اور اپنے سابقہ کردار کو فراموش کر کے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں کوشاں ہوئی۔ اسلامی نظام نافذ کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام بھی اس پارٹی کے منشور کی بنیاد ہے۔ تاہم حالات ابھی سازگار نہیں۔ یہ جماعت اب بھی قائم ہے اور بیلچہ پارٹی کے نام سے بھی مشہور ہے، لیکن علامہ مرحوم کی وفات کے بعد اب اس کی وہ شان نہیں۔

## خاکسار پارٹی کے رہنما اصول:

1- خاکساروں کا اولین اور اہم ترین فریضہ یہ تھا کہ رنگ، نسل اور ذات کے جھگڑوں سے بالا تر رہ کر ملت اسلامیہ کی یکجہتی اور بقا کے لئے کام کیا جائے۔
2- قرآن حکیم کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے بھرپور کوشش کی جائے۔
3- اختلافی مسائل سے دور رہ کر باہمی اخوت اور محبت کی اسلامی جذبے کو فروغ دیا جائے تا کہ اہل اسلام کی خدمت اور ترقی کے لئے کام کیا جاسکے۔
4- خاکسار تحریک اسلامی اخوت کے تحت مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے لگا تار کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس تنظیم پر علامہ مشرقی کا مکمل کنٹرول تھا۔ اس تحریک کے محلہ اور گاؤں کی سطح پر بھی تنظیمی یونٹ قائم کئے گئے تھے۔ جس کا سربراہ سالار ہوتا تھا اور سب خاکسار اپنے حلقہ میں سالار کی متابعت کے پابند قرار دیئے گئے تھے۔ یہ تنظیم ایک لحاظ سے غیر سرکاری اسلامی فوجی تنظیم تھی۔ جسے فوجی قواعد کی تربیت دی جاتی۔ لیفٹ رائٹ کی جگہ چپ راست کہہ کر پریڈ کروائی جاتی۔ ہر خاکسار کو ایک بیلچہ دیا گیا۔ جس سے وہ روٹی پکانے کے لئے توا کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا۔ اور ہتھیار کے طور پر بھی اس سے کام لیتا تھا۔ خاکساروں کی تربیت اعلیٰ اخلاقی اور اسلامی اصولوں پر کی گئی تھی لیکن افسوس کہ دشمنوں نے سازش کر کے اسے مسلم لیگ جیسی فعال جماعت کے خلاف لا کھڑا کیا اور یہ اپنی افادیت کھو بیٹھی۔

# میاں فضل حسین اور نیشنل یونینسٹ پارٹی

(بطور صوبائی وزیر اس کا کردار بطور مسلمان رہنما۔ ان کے مسلم لیگ سے تعلقات، سکندر حیات خاں وزارتی دور مسجد شہید گنج کی تحریک اور سکندر جناح پیکٹ)

1919ء کی آئینی اصلاحات کے تحت پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل میں مسلمان ہندو اور سکھ ارکان کو شامل کیا گیا، لیکن مسلمانوں کی اکثریت کی بناء پر فیصلے مسلمانوں کے ہاتھ میں دیئے گئے۔ 1921ء میں پنجاب کا گورنر سر میکلیگن تھا۔ اس سال کونسل میں دو ارکان سر فضل حسین اور لالہ لال چند نمودار ہوئے۔ سر فضل حسین مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں بڑا کام کرتے تھے۔ اس کی شخصیت نے گورنر صاحب کو بہت متاثر کیا تھا۔ ادھر کانگریس اپنی من مانیوں میں مست ہو رہی تھی اور اس کی ہر تان ہندو قوم کے مفادات کے تحفظ پر ٹوٹتی تھی۔ سر فضل حسین نے سوچا کہ ہندو کو شکست دینے کے لئے ایک نیا پلیٹ فارم ہونا چاہئے۔ چنانچہ 1924ء میں "یونینسٹ پارٹی" کے نام

سے ایک سیاسی پارٹی تشکیل دی گئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مل جل کر پنجاب کے حکومتی امور انجام دیئے جائیں۔ سر فضل حسین نے ہندوؤں کی جگہ پر کرنے کے لئے رہتک کے ہندو جاٹ چوہدری لال چند کو اس پارٹی میں شامل کیا۔ اور اس کے منشور میں آبادی کی بنیاد پر ہر شعبہ میں نمائندگی کے اصول کو اپنانے کا عزم کیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی تعداد کے مطابق ان کے لئے ملازمتوں میں "کوٹا" رکھنا منظور ہوا۔ 1927ء تا 1930ء کے عرصے میں علامہ اقبال لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن تھے۔ انہوں نے اس پارٹی کی مسلمانوں کے حقوق سے متعلقہ خدمات کا اعتراف تو کیا، لیکن پھر بھی اس کی خدمات کو مسلمانوں کی مفادات کی مکمل ضمانت کے قابل نہ سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ 1935ء کے ایکٹ کے بعد سکندر حیات خان احمد یار خان دولتانہ اور راجہ غضنفر علی کی ہمدردیاں سر فضل حسین سے وابستہ ہو گئیں۔ جبکہ دوسری طرف قائداعظم مسلم لیگ میں نئی روح پھونک رہے تھے۔ پنجاب میں قائداعظمؒ نے ملک برکت علی علامہ اقبال اور میاں عبدالعزیز سے رابطے قائم رکھے۔ 9 جولائی 1936ء کو سر فضل حسین لاہور میں وفات پا گئے اور یونینسٹ پارٹی کی قیادت سکندر حیات خاں کو سونپ دی گئی، لیکن سر فضل حسین والا جذبہ اور کارکردگی وہ قائم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ لوگ یونینسٹ پارٹی سے بدظن ہو کر مسلم لیگ کا رخ کرنے لگے اور سکندر حیات اور اس کی پارٹی کو انگریزوں کی پروردہ خیال کیا جانے لگا اور اس کے حامیوں کو انگریزوں کا "ٹوڈی" تک کہا گیا۔ آخر "ٹوڈی" حضرات نے طعنہ سے بچنے کی راہیں نکالنا شروع کردیں، اور وہ مسلم لیگ سے مفاہمت پر زور دینے لگے۔ 1937ء کے انتخابات میں کانگرس کی جانبداری اور ہندو پروری کا پردہ بھی مزید انکشافات کے ساتھ چاک ہونے لگا اور مسلم قومیت کے ساتھ اس کے وعدوں کی قلعی کھل گئی۔ سر سکندر حیات نے مختلف وجوہ کے بناء پر مسلم لیگ سے مصالحت پر رضامندی ظاہر کی۔ جس کے بعد 13 اکتوبر 1937ء کو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے دونوں پارٹیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ جس کے بعد یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کی مخالفت ترک کردی اور مل کر کام کرنے کی طرح ڈالی۔

سر سکندر حیات خاں کی وفات کے بعد سر خضر حیات خاں ٹوانہ یونینسٹ پارٹی کا سربراہ اور پنجاب کا وزیراعلیٰ مقرر ہوا۔ اب تک قرارداد پاکستان منظور ہو کر اس کے حصول کے لئے جدوجہد جاری تھی جس سے انگریز حکومت بوکھلا گئی تھی۔ 1944ء میں 21 مارچ کو قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کو اسمبلی میں پارٹی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ تاکہ اس کو نمائندگی مل سکے کیونکہ کولیشن حکومت کے دعویٰ کے باوجود مسلم لیگ اپنے متناسب حق سے محروم تھی۔ اس مطالبے نے خضر وزارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر اندر مسلم لیگ پورے برصغیر میں اپنی طاقت منوانے میں کامیاب ہو گئی اور اسی کی کوششوں سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان کی

اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی۔

**احرار پارٹی اور مسلم لیگ:** 1928ء کی نہرو رپورٹ نے کانگرس کی غیر جانبداری کا بھرم کھول دیا اور اسے ایک ہندو جماعت ہونے کا عوامی سرٹیفکیٹ مل گیا چنانچہ مسلمان زعماہندوؤں کے اس رویہ سے نالاں ہوئے چنانچہ 1930ء میں مجلس احرار کے نام سے مسلمانوں نے نئی سیاسی جماعت بنالی اس کے بانی ارکان میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری صاحب اس کے صدر چنے گئے تو احرار پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔

یہ سیاسی جماعت جلسے کرنے کی حد تک بڑی کامیاب رہی لیکن حکومت سے کوئی مطالبہ منظور نہ کروا سکی۔ کیونکہ اصل پاور مسلم لیگ اور کانگریس کے پاس تھی۔ ادھر کانگریس نے احرار پارٹی کی کشتی کو ڈولتے دیکھا تو سہارا دے کر اپنے ساتھ ملانے کا جتن کیا چنانچہ 1937ء میں کانگریس کے جنرل سیکرٹری آچاریہ کرپلانی نے اس پارٹی کو کانگریس میں ضم ہونے کا پیغام بھیجا۔ تا کہ مل جل کر آزادی حاصل کی جائے، دوسری طرف مسلم لیگ میں کیڑے نکالے گئے۔ چنانچہ احرار پارٹی کانگریس کے چکر میں آکر تقسیم ملک اور حصول پاکستان کے خلاف ہوگئی اور کھل کر مسلم لیگ کی مخالفت پر اتر آئی، لیکن مجموعی طور پر کانگریس کی ہمنوا ابھی نہ بن سکی کیونکہ عوامی لہر مسلم لیگ کی ساتھ تھی۔ پھر احرار نے حکومت الہیہ کی تحریک شروع کی اور اس کے لئے کشمیر کے شیخ عبداللہ کو اپنا حامی بنایا۔ اور اس کی حمایت کی۔ نیز انہوں نے ترکی لیڈر رشید علی جیلانی کی حمایت میں آواز بلند کی۔ نیز ایران پر روسی حملہ کی مذمت کی۔ انڈونیشیا میں سکارنو کی حمایت کی جو آزادی کی جنگ کا اپنے ملک میں ہیرو تھا۔ اسی طرح ترکی کی خلافت کے تحفظ کے لئے تحریک خلافت چلائی، اور انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جو ترکوں کو پے در پے مار رہے تھے۔ اس جماعت کو دنیا بھر کے مسلمانوں سے ہمدردی اور محبت ضرور تھی، لیکن اپنے گھر کی مسلم لیگ سے سخت اختلاف تھا۔ اس جماعت نے کشمیر کی آزادی کے لئے بھرپور کا کام کیا لیکن جب جولائی 1935ء میں مسجد شہید گنج کا سانحہ سامنے آیا تو چپ سادھ لی جبکہ مسلم لیگ نے اس واقعہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ احرار کا اس معاملے میں خاموش تماشائی بننا۔ یہ ثابت کر گیا کہ یہ پارٹی محض تقریروں سے زور پر قائم ہے اور تقریروں کے بل پر ہی اس نے اخبارات اور لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مولانا ظفر علی مرحوم بھی اس کے حامی تھے لیکن شہید گنج کے واقعہ کے بعد عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی اس کی افادیت کو مشکوک سمجھنے لگے۔ چنانچہ پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالف یہ جماعت کافی حد تک بے اثر ہو کر رہ گئی تاہم تقریر سننے کے شائقین سالوں تک اس پارٹی کے جلسوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری مرحوم کی شعلہ بیانی مسلمہ تھی۔ ان کے بہت سے ساتھی بھی ایسی ہی تقاریر کیا کرتے تھے۔ کانگریس نے بھی تحریک خلافت میں اس پارٹی کا کافی ساتھ دیا، لیکن ان کو

مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی کہاں ہو سکتی تھی کانگرس والے تو انگریزوں کو ناک آؤٹ کرنے کا بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے جبکہ احرار کا سٹیج اور پلیٹ فارم بھی اس کام کے لئے بڑا موزوں تھا۔

پاکستان بننے کے بعد احرار پارٹی کی شعلہ بیانی شورش کاشمیری کے حصہ میں آئی۔ جسے بجا طور پر سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور ظفر علی مرحوم کا نعم البدل سمجھا جانے لگا وہ ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر تھے۔ حکومت کی غلط پالیسیوں پر بے لاگ تنقید ان کا شیوہ تھا اور مسئلہ ختم نبوت کو زندہ رکھنے میں شورش نے اہم کردار ادا کیا۔ اور بالآخر مسلمانوں کی خواہش اور ان کے متفقہ مطالبے کے مطابق پاکستان کی قومی اسمبلی نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قادیانیوں کے دونوں گروہوں (لاہوری اور قادیانی گروپ) کو خارج از اسلام قرار دے کر اجماع امت کی مہر اس پر ثبت کر دی۔

**مسجد شہید گنج کا واقعہ اور مسلم لیگ کا کردار:** لاہور میں نو لکھا بازار کے آخر میں لنڈا بازار کے شروع میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں پر سکھوں کی ساتھ لڑائی میں سکھوں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ پنجاب میں رنجیت سنگھ کے عہد سے پہلے کا ہے۔ اس جگہ پر ازیں پیشتر ایک مسجد بنی ہوئی تھی، لیکن سکھوں کے دور حکومت میں سکھوں نے اس مقام پر جہاں سکھوں کو قتل کیا گیا تھا ایک گوردوارہ بنا لیا تھا اور اس کے ارد گرد کی دکانوں کو گوردوارہ کی دکانیں قرار دے دیا تھا حتیٰ کہ مسجد کا معتدبہ حصہ بھی گوردوارے میں شامل کر لیا گیا۔ انگریزوں کے دور میں مسلمانوں نے مسجد کی واگزاری کی کوششیں شروع کر دیں اور دیوانی دعوے تاخیر کے قانون (Time Barred) کی زد میں آ کر خارج ہو گئے۔ 1935ء میں سکھ گوردوارہ ایکٹ کے بعد گوردواروں کی املاک مہنتوں سے لے کر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی تحویل میں دینے کے ضابطہ پر عمل شروع ہوا۔ چنانچہ شہید گنج سے منسلکہ مسجد پر بالخصوص سکھوں نے مسجد کو بھی ذاتی ملکیت ظاہر کر کے عذرداری کر دی۔ جس کے جواب میں انجمن اسلامیہ پنجاب کے سیکرٹری سید محسن شاہ نے مسجد کی واگزاری کے لئے درخواست دے دی، اور مسجد کو انجمن کی تحویل میں دینے کی گذارش کی۔ جسے لاہور کے ڈی سی پرتاب سنگھ نے اپنے رسوخ سے متعلقہ ٹریبونل کی طرف سے مسترد کرا دیا اور مسجد کو گوردوارے کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ پھر عدالت عالیہ نے بھی ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے مارچ 1935ء میں گوردوارہ اور اس سے ملحقہ جائیداد گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سکھوں نے مسجد کو منہدم کرنے کا منصوبہ بنایا جس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ پھر ایک سکھ معمار کام کرتے ہوئے اس مسجد کے قریب دیوار سے گر کر مر گیا۔ اس واقعہ کو سکھوں کی بدنیتی پر محمول کیا گیا۔ جس کی سزا معمار کو ملی۔ چنانچہ انہدام مسجد سے روکنے کے لئے مسلمان اس طرف جانے لگے اور مسجد شہید گنج کو گھیرے میں لے لیا مگر ڈی سی نے سکھوں کی حمایت میں حکم دیا کہ سکھ معمار اپنا

کام جاری رکھیں اس طرح مسلمانوں کا غیض و غضب بڑھتا چلا گیا۔ اور حالات تشویشناک ہو گئے ادھر سکھوں کے ٹولے بھی موقع پر جمع ہونے لگے اور تصادم کا خطرہ بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ پنجاب کے گورنر ایمرسن شملہ سے لاہور آئے اور 6 جولائی 1935ء کو انہوں نے لاہور کے سرکردہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور صورت حالات کو قابو میں کرنے کے لئے اصلاحی تدابیر کیں۔ کہ اس عمارت کو آثار قدیمہ کے سپرد کر دیا جائے، لیکن فریقین راضی نہ ہوئے اور سکھوں نے 8 جولائی کو مسجد منہدم کر کے آتش انتقام کو بھڑکا دیا اس پر مسلمان بپھر گئے۔ حکومت نے فوج طلب کر لی اور رات کو کرفیو لگا دیا۔ اس واقعہ میں مجلس احرار نے مسلمانوں کا بالکل ساتھ نہ دیا بلکہ خاموشی اختیار کر لی۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی ان کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی، لیکن احرار کے اراکین چپ سادھے تماشا دیکھتے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کی کوئی رہنمائی نہ کی۔ جبکہ تقاریر میں وہ اسلام کے لئے سب کچھ کر گزرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کے برخلاف مسلم لیگ نے نہ صرف مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ بلکہ میدانِ عمل میں نکل کر عام مسلمانوں کے شانہ بشانہ ظلم کے خلاف ڈٹ گئے۔ اس طرح احرار پارٹی کا وقار ختم ہونے لگا۔ دوسری طرف 15۔ 16 جولائی کو مسلمان گروہ در گروہ ہر طرح کی قدغن سے بے نیاز مسجد شہید گنج کی طرف بڑھنے لگے۔ جن پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ مسلمان رہنماؤں ظفر علیخاں، سید حبیب، ملک لال خاں، ملک فیروز دین وغیرہ کو پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ اب مسلمانوں کا ہجوم غضب ناک ہو کر انگریزوں پر جانبداری کا الزام لگانے لگا۔ جس کی تردید گورنر ایمرسن نے کی۔ 19 جولائی کو جمعہ تھا۔ اس روز مسلمان اکٹھے ہو کر مسجد شہید گنج کی طرف بڑھے۔ فوج اور پولیس نے راستہ روکا اور رات تک مسلمان دھرنا مارے بیٹھے رہے۔ رات کو کرفیو کے باوجود مسلمانوں نے کسی خوف کا مظاہرہ نہ کیا۔ شہر کے لوگ دیگیں پکا کر ہجوم میں بھجواتے رہے۔ اس طرح یہ ہجوم اپنے مقصد کے لئے ڈٹا رہا۔ جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ مسلمانوں نے مردانہ وار جانوں کے نذرانے دیئے، لیکن مسلمانوں کی عزوار احرار پارٹی نے بے حسی کا مظاہر جاری رکھا۔ جس پر یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ ستمبر 1935ء کو پیر جماعت علی شاہ نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مصالحت کی کوشش کی لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ 1936ء میں قائداعظم لاہور آئے، اور انہوں نے اس کیس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس تحریک کو ختم کروا دیا۔ اس طرح شہید گنج کی تحریک کئی جانوں کا نذرانہ لے کر بھی ناکام ہی رہی۔

## پنجاب میں ہندو اور مسلم تحریکیں

(I) **پنجاب میں ہندوانہ مفاد کی تحریکیں:** ہندوستان میں جو تحریکیں چلیں۔ پنجاب میں بھی وہ جاری رہیں اور یہاں بھی ان کے

اثرات پڑے۔ انگریز، مسلمانوں کو اپنا اولین دشمن سمجھتا تھا اور لارڈ ایلن برو کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمانو کے بجائے ہندو اکثریت کو خوش کر کے اپنا کام نکالو۔ ہندو تو پہلے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ مرہٹوں اور سکھوں نے ان کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ چنانچہ ہندوؤں میں ترقی اور سیاسی بیداری کے لئے مندرجہ ذیل تحریکیں چلیں۔

1- **تحریک آریہ سماج (1875ء):** اس تحریک کا بانی دیانند سرسوتی (اصل نام مول شنکر) گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا تھا۔ اس کی تحریک کا مقصد ہندومت کا احیا تھا۔ نیز اس نے ذات پات کی تمیز اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی گائے کا تقدس اجاگر کیا وہ ہندوازم کے سوا کسی بھی مذہب کو مقدس نہ سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کی مخالفت اس کا مشن تھا۔ مسلمانوں کے خلاف اس تحریک نے نفرت کی آگ لگادی۔ ستیارتھ پرکاش نامی ایک کتاب بھی مسلمانوں کے خلاف لکھی گئی جس میں اسلام اور بزرگان دین پر حملے کئے گئے۔ وہ خدا اور نبی رسول کا بھی منکر تھا۔ وہ مسلمانوں کو اسلام نہ چھوڑنے کی صورت میں عرب جانے کا مشورہ دیتا تھا۔ وہ ہندو کے علاوہ ہر ایک کو ناپاک اور واجب الخاتمہ سمجھتا تھا۔

**شدھی کی تحریک:** یہ تحریک مسلمان ہونے والے ہندوستانی باشندوں کو دوبارہ ہندوازم قبول کرنے پر زور دینے کے لئے وجود میں آئی۔ اس کا بانی منشی رام پنجاب پولیس میں تھانیدار تھا۔ وہ قنوطیت پسند تھا۔ تھانیداری چھوڑ کر ہردوار کی راہ لی اور اپنا نام سوامی شردھانند رکھ لیا۔ رولٹ ایکٹ کی خلاف ورزی میں جیل گیا۔ باہر آیا تو "شدھی" یعنی مسلمانوں کو مرتد کرنے کی تحریک شروع کردی اور اس تحریک نے بڑا زور پکڑا یہ تحریک مسلمانوں کو مرتد تو نہ کر سکی البتہ ان کے خلاف زہر اگلنے کی ہندو پالیسی کے لئے مدد معاون ثابت ہوئی۔

**بال گنگادھر تلک کی تحریک:** یہ تحریک بھی مسلمانوں کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھی تھی مسلمانوں کو غیر ملکی شاطر اور ظالم قرار دے کر ان کو ہندوستان کے کونے کونے سے بھگا دینے پر زور دیا جاتا تھا۔ اس کی تحریک کے نتیجہ میں ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے جن میں بہت سے افراد مارے گئے۔ 1935ء تک اس تحریک کا بڑا زور تھا۔ آخر یہ کمزور ہو کر رہ گئی۔

**تحفظ گاؤ تحریک:** اس تحریک کا آغاز 1937ء میں ہوا۔ کیونکہ 1935ء کی اصلاحات کے تحت انتخابات میں کانگریس کو فتح حاصل ہوئی تھی جو درحقیقت ایک ہندو پارٹی تھی۔ لیکن جب مسلم لیگ آگے بڑھی اور سکندر جناح پیکٹ کے بعد مسلمانوں کا اتحاد رنگ لایا تو گائے ذبح نہ کرنے کی تحریک خود بخود ختم ہو کر رہ گئی۔

**بندے ماترم تحریک:** یہ ایک گیت تھا جو ہندوؤں کے مطالبہ کے مطابق ہر جگہ گایا جاتا۔ اس میں بت پرستی کی ترغیب تھی۔ یہ گیت بنکم چٹرجی کے ناول آنند ماٹھ سے لیا گیا تھا۔ اس میں ہندوازم اختیار کرنے کی بھی ترغیب تھی۔ اس گیت میں مسجدیں ڈھا کر ان کی جگہ مندر بنانے کے ترغیبی بول بھی تھے۔ مسلمانوں نے اس گیت کی سخت مخالفت کی۔ بابری مسجد کا انہدام اسی بندے ماترم تحریک کا ثمرہ ہے کہ ایک تاریخی مسجد ختم کر کے وہاں مندر کی تعمیر کی کوشش ہو رہی ہے۔

**اُردو مٹاؤ تحریک:** گاندھی جی اردو کے اس لئے خلاف تھا کہ اس کی تحریر قرآنی حرفوں کی طرح ہوتی تھی۔ جو اسے سخت ناپسند تھی۔ ہندوؤں نے اردو کی جگہ ہندی اور سنسکرت کے احیاء کی کوشش کی اور اس کی املا بدل کر ہندی رسم الخط میں لکھنے پر زور دیا۔ وہ اس وقت تو اس میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن تقسیم ملک کے بعد اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھا جانے لگا اور آج اردو کی املا تک بدل چکی ہے۔ صرف برائے نام کتب فارسی رسم الخط میں شائع ہو رہی ہیں۔ سرسید احمد خاں جیسے دھیمے مزاج کے بزرگ بھی ایسی ہی مخالفانہ روش کی وجہ سے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت پر زور دینے پر مجبور ہوئے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے سیاسی حالات کی وجہ سے یہ تحریک دم توڑ چکی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں بھی بعض عناصر اردو کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف ہیں۔

(اللہ ہدایت دے آمین)

**واردھا سکیم:** یہ سکولوں میں مخلوط طرز تعلیم رائج کرنے کی ہندوانہ چال تھی تاکہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا جا سکے اور ان میں ترقی پسندی کی آڑ میں رقص و سرود اور موسیقی وغیرہ کی تعلیم بھی عام کی جا سکے۔ موسیقی خصوصی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔ نیز پردے کی پابند خواتین کے لئے ماڈرن ازم کے مواقع بڑھانے کا پروگرام بھی تھا۔ مسلمانوں نے اس سکیم کی مخالفت کی، اور اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کا ایک خاص طبقہ جدت اور ترقی کی آڑ میں وہ حدیں پھلانگ گیا جسے روکنے کے لئے واردھا سکیم کو ناکام کرنے کی کوشش بڑی کامیابی سے مسلمانوں نے کی تھی، اور آج مخلوط تعلیم سے قطع نظر ایسا لگتا ہے کہ عملی طور پر واردھا سکیم سے بھی کوئی بڑی سکیم کامیاب ہو چکی ہے۔ اللہ ہمیں برائیوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ لینے کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے آمین۔

**وِدیا مندر سکیم:** مسجدوں میں تعلیمی سرگرمیوں کی دیکھا دیکھی مندروں میں بھی تعلیمی پروگرام کا اجرا کیا گیا۔ جہاں مسلمان بچے بھی تعلیم کے لئے داخل کئے جاتے تھے، اور ان کو بھی یہاں ہندوازم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہنود کی یہ چال ناکام بنانے کے

لئے اپنے بچوں کو مندروں سے اٹھالیا۔

ہندو مہاسبھا: یہ ہندوؤں کی خطرناک ترین سیاسی جماعت تھی جو قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی۔ یہ سفاکانہ اور ظالمانہ تحریک تھی جس کے کارکن ہاتھ میں خنجر رکھتے اور لب پر یہ نعرہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو ختم کر دو۔ مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دو۔ وہ اکھنڈ بھارت کے مدعی تھے اور بھارت کی سرزمین کی تقسیم کو گئوماتا کے ٹکڑے کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس تحریک کے غنڈوں کے ہاتھوں اگر دو مسلمان شہید ہوئے تو مسلمانوں نے جوابی کاروائی کرکے دس ہندو پار کر دیئے اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی مکار ذہنیت کے حامل مہاسبھائی اپنی دھن کے پکے ہیں۔ وہ روپ بدل بدل کر کبھی سکھوں کی جان کے دشمن ثابت ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوستان سے ختم کرنے کی کوشش میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ سب تحریکیں ہندوستان کے حوالے سے پنجاب سے بھی متعلق تھیں۔

حرف آخر: آج بھی ان معاندانہ تحریکوں کے اثرات سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان محفوظ نہیں۔ آئے دن مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ وہ اپنے مذہب پر بھی آزاد سے عمل نہیں کر سکتے۔ ان کی مسجدیں بھی ان انتہا پسندوں کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ ہندی مسلمان ایک لحاظ سے بس کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کے باسی آزادی مملکت بنانے میں اگر کامیاب ہوئے تھے تو اس میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی سعی و جہد کو دخل تھا اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت حکومت پاکستان کی قوت میں مضمر تھی، لیکن ہوا یہ کہ پاکستان میں سیاسی حالات کا اونٹ سیدھی کروٹ بیٹھنے سے عاری رہتا ہے، اور یہاں کے خودغرض اور مفاد پرست لوگ آزادی کی وہ قدر نہیں کر رہے جو کہ کرنی چاہیے۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان حکومت پاکستان اس قدر طاقتور ہو کہ ہندو کی مکارانہ چالیں ناکام ثابت ہوں۔ اللہ کرے وہ دن جلد آئے۔ آمین۔

## پنجاب اکالی دل اور پنجاب کانگرس کا کردار

سکھوں کی سیاسی پارٹی اکالی دل 1920ء میں قائم کی گئی۔ جلیانوالہ باغ کا المیہ بھی اس کی بنیاد بنا۔ اور دیگر عوامل بھی سکھوں کو سیاست میں کھینچ لائے۔ 1927ء تک اکالی دل نے زیادہ تر کانگرس کے ساتھ مل کر کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزی حکومت نے سکھوں کی قربانیوں کی کوئی قدر نہ کی تھی۔ راکب گنج دہلی کے سکھ گوردوارہ کی بیرونی دیوار گرانے کا واقعہ بھی سکھوں کی انگیخت کا باعث ہوا۔ نیز جنگ کے فوراً بعد سکھ فوجیوں کی کافی تعداد کو فوج سے نکال دیا گیا اور انہیں متبادل ملازمت بھی نہ دی گئی۔ اگرچہ 8 دسمبر 1919ء کو سنٹرل سکھ لیگ قائم ہوگئی

تھی لیکن اس کے باوجود مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر 1920ء میں اکالی دل کا قیام عمل میں آیا۔

تحریک عدم تعاون میں اکالی دل نے کانگرس کی ہمنوائی کی چنانچہ انگریزوں نے سکھوں کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ 1921ء میں پرنس آف ویلز نے خالصہ کالج امرتسر کو سکھ یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کرنا تھا۔ لیکن خالصہ کالج کے طلبا نے بائیکاٹ کر دیا اور قوم پرست سکھ نرنجن سنگھ کی قیادت میں اس کا راستہ روک دیا۔ چنانچہ سکھ یونیورسٹی قائم ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اکالی سکھوں نے گوردواروں کو مہنتوں سے آزاد کرانے کے لئے مورچے لگائے۔ یہ تحریک کئی سال تک جاری رہی مشہور مورچوں کے نام اس طرح ہیں۔

کیس مورچہ، گورو کا باغ مورچہ۔ بھائی پھیرو مورچہ جانتو مورچہ وغیرہ۔ ان مورچوں کی وجہ سے سکھوں کو پولیس کے تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کانگرس نے بھی اس موقع پر سکھوں کی حمایت جاری رکھی۔

اس گٹھ جوڑ نے حکومت کو کافی پریشان رکھا۔ سائمن کمیشن 1927ء میں مزید اصلاحات کی غرض سے قائم کیا گیا۔ اکالیوں اور کانگرس نے اس کا بھی بائیکاٹ کیا۔ 12 فروری 1928ء کو دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس میں بابا کھڑک سنگھ، مہتاب سنگھ، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی ذیل سنگھ، امر سنگھ اور منگل سنگھ نے سکھوں کی نمائندگی کی جس میں دستور ہند بنانے پر غور کیا گیا۔

1928ء کے بعد بھی اکالی دل نے کانگرس کے ساتھ مشروط تعاون جاری رکھا اور معمولی شکر رنجیاں تعلقات بگاڑنے کا باعث بن نہ سکیں البتہ پنجاب اور مرکز میں سکھوں کی نمائندگی کے مسئلہ پر اکالی دل اور کانگرس میں اختلاف پیدا ہو گیا کیونکہ سکھ صرف صوبہ پنجاب میں ہی آباد تھے جبکہ دیگر صوبوں میں ہندو اور مسلمان دو قومیں آباد تھیں۔ اور 1921ء کی مردم شماری کی رو سے پنجاب میں 35 فیصد ہندو اور 12 فیصد سکھ اور باقی مسلمان آباد تھے، لیکن کل مالگزاری میں سکھوں کا حصہ 25 فیصد اور سرکاری مالیہ میں آبیانہ سمیت وہ 40 فیصد ادائیگی کرتے تھے لیکن نہرو رپورٹ میں سکھوں کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ کھڑک سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ کانگرس سے ناراض ہو گئے۔ دسمبر 1927ء میں کلکتہ میں آل پارٹیز کانفرنس نے نہرو رپورٹ پر غور کیا۔ تمیں اہم سکھوں نے گاندھی سے ملاقات کی لیکن سکھ قوم کے حقوق کا تحفظ نہ ہو سکا۔ ادھر مسلم لیگ نے بھی نہرو رپورٹ کو نامنظور کر دیا لہٰذا سکھوں کی ناراضگی غیر اہم ہو کر رہ گئی۔ 6 مارچ 1930ء کی سول نافرمانی تحریک میں سکھوں نے پانچ ہزار اکالیوں کی خدمات پیش کیں اور ستیہ گرہ کی تحریک میں سزا پانے والے سات ہزار افراد میں سکھوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد حکومت برطانیہ کو کانگرس کی اہمیت کا احساس ہو چکا تھا۔ چنانچہ 5 مارچ 1931ء کو گاندھی اور لارڈ ارون کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے گاندھی کو کانگرس کا نمائندہ تسلیم کر لیا اور سکھوں

نے سترہ نکات پر مشتمل مطالبات پیش کیے جن کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی حامی گاندھی جی نے بھرلی، لیکن دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی نے فرقہ ورانہ مسئلہ کی وجہ سے کانفرنس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ آخر 16 اگست 1933ء کو کیمونل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ جس کی رو سے سکھوں کو 18.85 فیصد اور مسلمانوں کو 51.42 فیصد حق نمائندگی ملا۔ اس پر سکھوں نے اودھم مچادیا۔

لیکن کانگرس خاموش رہی۔ اس طرح جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ تاہم ان دونوں گروہوں نے تیسری گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کردیا۔

1935ء کے ایکٹ کے تحت انتخابات میں اکالی دل اور کانگرس متحد ہو کر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے مقابل آئے۔ اکالیوں نے 33 سیٹیں حاصل کیں، اور وہ سکندر حیات خاں کی حکومت میں مضبوط حزب اختلاف بن گئے۔ گویا اکالی دل اور کانگرس میں پھر سے مفاہمت ہو گئی۔

مارچ 1940ء میں پاکستان کے حصول کی قرار داد پاس ہوئی تو سکھوں کی آنکھیں کھلیں۔ قائداعظم نے تارا سنگھ کو تعاون کی پیشکش کی مگر اسے ٹھکرا دیا گیا۔ آخر برطانوی حکومت نے سکھوں کی ریاست کا مطالبہ نامنظور کر دیا۔ پاکستان کا بننا منظور ہوا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو کانگریس پر دل کا غبار نکالنے سے باز رکھنے کے لئے انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے تلوار لہرا کر مسلمانوں کے قتل عام کا اعلان کیا۔ چنانچہ تقسیم ملک کے موقع پر لاکھوں مسلمانوں کو قتل و غارتگری کا نشانہ بننا پڑا اور ان کے قاتل سکھ حضرات ہی تھے جنہیں ہندو نے سازش کے تحت اندھا کر دیا تھا، لیکن تقسیم کے بعد ہندوؤں نے سکھوں کو حروف غلط کی طرح مٹانے کی ٹھان لی۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دیکھیے یہ سلسلہ کہاں رکتا ہے۔

**(2) ہندی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی تحریکیں اور تنظیمیں:** 1857ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر ستم کے وہ پہاڑ توڑے کہ الامان! سرسید احمد خاں نے انگریزوں کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی حکمت عملی اپنائی اور "لائل محمڈنز آف انڈیا" لکھی۔ سرسید پہلے ہندو مسلم یکجہتی کے حامی تھے، لیکن 1867ء میں جب ہندوؤں نے اردو کے خلاف مہم چلائی تو ان کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ اِدھر انگریز اور اُدھر ہندو مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہوئے۔

**علی گڑھ کالج:** سرسید احمد خاں نے اپنے بہترین ساتھیوں کو ساتھ لیا اور 1875ء میں علی گڑھ میں مسلمانوں کے لئے سکول قائم کیا جسے 1877ء میں کالج کا درجہ مل گیا۔ جس کا افتتاح وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے کیا۔ سرسید نے علمی، ادبی، معاشرتی اور معاشی اور سیاسی گویا ہر سطح پر مسلمانوں کو تربیت دینے اور انہیں منظم کرنے کی کوشش کی۔ سر آغا خاں جیسے برسر آوردہ

رہنماؤں نے بھی بھرپور ساتھ دیا، اور جنوری 1921ء میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ علی گڑھ کی مادر علمی نے مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ قائداعظم اسے مسلمانوں کا "اسلحہ خانہ" کہا کرتے تھے۔ اس ادارے نے مسلمانوں کو جدید تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا اور اس کا ہر سطح کردار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

**دارالعلوم دیوبند:** چشتی بزرگ امداد اللہ مہاجر مکی کے عقیدت مند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دینی تعلیم کو عام کرنے کے لئے یہ مدرسہ 30 مئی 1867ء کو بروز جمعرات قائم کیا۔ آپ 15 اپریل 1880ء کو وفات پا گئے اس مدرسہ میں اعلیٰ دینی تعلیم کے علاوہ جدید علوم سے آشنائی کا بندوبست اس طرح کیا گیا کہ اس کے طلباء کو علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی گئی اور علی گڑھ کے طلباء کے لئے دیوبند سے اسلامی علوم میں دسترس حاصل کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح مدرسہ نے نہایت قیمتی خدمات انجام دیں، لیکن تحریک پاکستان کے معاملے میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع وغیرہ چند علماء ہی قائداعظم کے ہمنوا ہو سکے۔ اور حسین احمدؒ مدنی مرحوم جیسے بزرگوں نے پاکستان کی مخالفت پر کمر باندھے رکھی۔ آج بھی بعض علماء پاکستان میں رہنے، پاکستان کا کھانے اور پاکستان کی برکتوں سے متمتع ہونے کے باوجود پاکستان کے قیام کو ایک غلط فیصلہ قرار دیتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ اسلام کے نفاذ کے لئے ایک مملکت کا قیام اس کی اولین ضرورت ہوتی ہے۔

**ندوۃ العلماء لکھنؤ:** اس ادارہ کی بنیاد 1897ء میں مولوی سید محمد علی کانپوری نے رکھی۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق دہلوی (صاحب تفسیر حقانی) نے اس کے ضوابط و قواعد مرتب کئے۔ اس ادارے میں جدید علمی سطح پر بہت اہم کام کیا گیا اور دینی تعلیم کے قدیم اور جدید تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد کی۔ اس کی لائبریری بھی قیمتی اور نادر کتب سے مزین ہو گئی۔ 1904ء میں مولانا شبلی نے اس کا چارج سنبھالا 1908ء میں اس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کے اخراجات نواب بہاولپور نے برداشت کئے۔ 1913ء میں مولوی عبدالکریم ندوی نے جہاد پر مضمون لکھا جس سے علامہ شبلی متفق نہ تھے۔ اس طرح اختلافات بڑھے اور جولائی 1913ء میں علامہ شبلی کو ندوہ سے الگ ہونا پڑا۔ اس ادارہ نے سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، سید نجیب اللہ، ابو ظفر ندوی جیسی ہستیاں پیدا کیں، اور علمی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان بزرگوں کی خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، اس ادارہ نے تحقیق و تدقیق کی نئی راہیں کھولنے میں اہم کردار ادا کیا۔

**جامعہ رضویہ منظر الاسلام بریلی:** یہ ادارہ حنفیوں کے صوفیانہ مکتب کا ترجمان ہے۔ صوفیائے کرام نے برصغیر پاک و ہند اور وسطی ایشائی

ممالک وغیرہ میں اسلام کی تبلیغ بطریق احسن انجام دی۔ امامیہ فقہ کے لوگ تصوف کی مخالفت اس لئے کرتے تھے کہ اس طرح اثنا عشری ائمہ کی عقیدت میں کمی کا رجحان پیدا ہو سکتا تھا۔ بعض دیگر حضرات ابن جوزی کی تلبیس ابلیس کی وجہ سے تصوف کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ جب برصغیر میں "وہابی تحریک" نے زور پکڑا تو تصوف کی اعلیٰ تعلیمات اور اقدار اور شریعت مطہرہ کی ترویج و اشاعت کے لئے اس ادارہ نے اپنا کردار ادا کیا اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اہل سنت کے مسلک کی تائید و حمایت میں ہزار کے قریب تصانیف پیش کیں۔ ان کے ہم خیال دوسرے ہمعصر علماء نے بھی بھرپور کام کیا۔

مدرسہ بریلی کی ہمنوائی میں جامعہ نعیمیہ لاہور، حزب الاحناف لاہور، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، جامعہ نعیمیہ مراد آباد، دارالعلوم امجدیہ کراچی اور جامعہ رضویہ لائل پور (فیصل آباد) بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس مکتب فکر کے علماء اور مشائخ نے تحریک پاکستان کی بھرپور حمایت کی اور تحریر و تقریر کے علاوہ دامے درمے اور قدمے بھی مسلمانوں کے لئے خود مختار مملکت کے لئے اقدامات کیئے۔ 1946ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا چار روزہ اجلاس (27 تا 30 اپریل) بنارس میں منعقد ہوا جس میں متفقہ طور پر مطالبہ پاکستان کی حمایت کی گئی۔ پیر جماعت علی شاہ اور دوسرے مشائخ نے بھی قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ ترک موالات کی تحریک میں مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ہندو اور انگریز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے لہٰذا ان کے بھرے میں آنے سے بچنا چاہئے۔ کانگرسی علماء نے اس صوفیانہ فکر کے حامل سواد اعظم کی مخالفت کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کی راہ میں بھی روڑے اٹکائے، لیکن علامہ اقبال اور دیگر بزرگوں اور عام مسلمانوں اور قائداعظم کی مخلصانہ مساعی سے پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

**جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی:** پہلے یہ ادارہ علی گڑھ میں قائم ہوا۔ محمد علی جوہر اس ادارے میں شیخ الجامعہ مقرر کئے گئے۔ کافی عرصہ تک علی گڑھ میں قائم رہنے کے بعد 1925ء یہ ادارہ دہلی میں منتقل ہو گیا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اس کی شہرت کو چار چاند لگائے، تاہم مجموعی طور پر یہ ادارہ کانگرس کے زیر اثر بھی تھا۔

**انجمن حمایت اسلام لاہور:** یہ انجمن 24 ستمبر 1884ء کو اندرون موچی گیٹ لاہور کی مسجد بکتی خاں میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی ارکان میں منشی چراغ دین قاضی حمیدالدین، غلام اللہ قصوری، منشی پیر بخش اور منشی عبدالرحیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس ادارہ نے مسلمانوں کی تعلیم اور معاشرتی میدانوں میں بھرپور مدد کی۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت اسلامی اقدار کی حفاظت، یتیموں کی بہبود کے لئے ادارہ کا قیام، عیسائی مشنیروں کے جال سے مسلمانوں کو بچانا نیز آریہ سماج وغیرہ تحریکوں کا توڑ کرنا اور مسلمانوں کے لئے تعلیمی ادارے قائم کرنا اس کے

مقاصد تھے۔ اس کا پہلا دفتر حویلی سکندر خاں میں اڑھائی روپے ماہوار کے کمرہ میں قائم ہوا۔ انجمن کی سالانہ آمدنی 754 روپے اور خرچ 344 روپے تھا۔ 1886ء میں انجمن نے مدرستہ المسلمین قائم کیا۔ جسے مڈل اور پھر ہائی سکول کا درجہ ملا۔ 1905ء میں انجمن نے اسلامیہ کالج کے لئے پچاس کنال اراضی ریلوے روڈ پر خریدی اور کالج کے قیام نے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع مہیا کئے۔ اس کالج کے طلبا نے تحریک پاکستان کے لئے قائداعظم کی سرکردگی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس انجمن کے پلیٹ فارم سے سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک، سر محمد شفیع، شیخ عبدالقادر اور علامہ اقبال جیسے رہنما قوم کی رہبری کرتے رہے۔ اس انجمن کے تحت دار شفقت (مردانہ یتیم خانہ) دارالامان (زنانہ پناہ گاہ) اور بے شمار تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ 1939ء میں کوپر روڈ پر خواتین کے لئے ڈگری کالج قائم کیا گیا۔ ماہوار رسالہ حمایت اسلام جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس انجمن کی خدمات کا سلسلہ جاری اور وسعت پذیر ہے۔ پنجاب میں ایسی انجمنیں بعض دوسرے اضلاعی صدر مقامات پر بھی قائم کی گئیں۔

# سکندر جناح پیکٹ (1937ء)

سر فضل حسین کی اہل اسلام کے لئے خدمات کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ وہ بڑے قابل آدمی تھے اور اچھی حکمت عملی سے ساری صورت حال کو سنبھالا دیئے ہوئے تھے، پھر ان کے بعد یونینسٹ پارٹی کی قیادت سکندر حیات خاں کو ملی اپریل 1937ء میں وہ وزیراعلیٰ پنجاب بنے۔ عام مسلمان اب مسلم لیگ کے ہمنوا ہو رہے تھے۔ اس لئے سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ کی مخالفت نہ کرنے کا عزم کیا اور اس مقصد کے لئے قائداعظم سے بات چیت بھی کی۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ اور اتحاد پارٹی کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ جسے سکندر جناح پیکٹ کا نام دیا گیا اس میں درج ذیل امور طے پائے۔

1۔ پنجاب اسمبلی کے مسلمان آزاد یا غیر مسلم لیگی ارکان کو سکندر حیات مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے جو بعد از شمولیت مسلم لیگ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔

2۔ سمجھوتے کے بعد ضمنی انتخابات میں لیگی امیدواروں کی حمایت کی جائیگی۔

3۔ منتخب ہونے والے لیگی یا غیر لیگی (متفقہ) کامیاب ارکان پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگی ممبر شمار ہوں گے۔

4۔ ان انتخابات کے بعد مسلم لیگ کی جو پارٹی پیدا ہوگی وہ مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں کے مطابق مرکزی لیگ کی پالیسی کی بنیاد پر کسی دوسری پارٹی سے معاہدہ کرنے یا اس کی حمایت حاصل کرنے کی حقدار ہوگی۔

5۔ انتخاب کے بعد قائم شدہ اتحاد کا نام یونینسٹ پارٹی ہی ہوگا۔

6۔ نئے انتظام کے تحت صوبائی پارلیمانی بورڈ سے مرتب کیا جائے گا۔

اس سمجھوتے سے مسلمانوں کی دو پارٹیوں میں اتحاد اور وحدتِ کار میں اضافہ ہوا اور اتحاد پارٹی بھی قائم رہ گئی چنانچہ قائداعظم نے لیگ کی صوبائی تنظیم نو کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی جس کے ارکان میں زیادہ تعداد سر سکندر حیات کے لوگوں کی تھی اور وہی اس کمیٹی کے صدر رتھے۔

اس معاہدے سے مسلمانوں سے نفاق اور انتشار ختم کرنے میں مدد ملی اور وہ متحد ہو کر جدوجہد آزادی میں حصہ لینے لگے، اور مسلم لیگ واحد مسلمان سیاسی قوت کے طور پر ابھری۔ جس کو آئندہ انتخابات میں واضح کامیابی حاصل ہوئی۔ اتحاد پارٹی کے ہندو ارکان کانگرس میں شامل ہو گئے۔ نہرو اور گاندھی کی صفوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اب وہ مسلم لیگ کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور انہوں نے لیگی قائد قائداعظم محمد علی جناح کو خط و کتابت کے ذریعے دام فریب میں پھنسانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

## ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے مطالبات کا اجمالی جائزہ

قرارداد لاہور

1940ء سے پہلے بہت سے مسلمان دانشوروں نے ہندی مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے مطالبات وقتاً فوقتاً پیش کئے۔ خیری برادران کا نام سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ڈاکٹر عبدالستار خیری دہلوی کو 1905ء میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے 1917ء میں سٹاک ہام (ڈنمارک) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں قائم کر دی جائیں۔

مارچ 1920ء میں ہفت روزہ ذوالقرنین (بدایون) میں محمد عبدالقادر بلگرامی کا گاندھی کے نام ایک خط شائع ہوا۔ جس میں تقسیم ہند کی واضح تجویز پیش کی گئی تھی۔

سردار گل محمد خاں صدر انجمن اسلامیہ ڈی۔ آئی خاں نے 1923ء میں پشاور سے آگرہ تک کے علاقہ میں مسلمان مملکت قائم کرنے کی تجویز صوبہ سرحد کے تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش کی تھی۔ دسمبر 1928ء میں مرتضیٰ احمد خان میکش نے روزنامہ انقلاب میں تقسیم ہند کے بعد مسلم مملکت قائم کرنے کی تجویز پر سلسلہ مضامین شروع کیا۔ جس کی ہندو اخبارات نے بھرپور مخالفت کی۔ حالانکہ 1923ء میں آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے جیل یاترا کے دوران قرآن کریم کا مطالعہ کرنے کے بعد سی۔ آر داس کو ایک خط میں مسلمانوں کی الگ قومیت کی وکالت کی تھی اور 1924ء میں اس نے پنجاب، سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال کے علاقے مسلمانوں کو دے کر انہیں الگ کر دینے کی تجویز دی تھی، لیکن ہندو تقسیم ملک کے اس لئے مخالف تھے کہ اس طرح ان کی حکمرانی کا علاقہ محدود ہو جاتا تھا۔

1929ء میں فضل کریم خاں درانی (ایڈیٹر مسلم انڈیا) نے اپنی کتاب "دی فیوچر آف اسلام اِن انڈیا" میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو متضاد ثقافتوں کی حامل اقوام کے حوالے سے انہیں الگ قومیں قرار دیا تھا۔ جو دو قومی نظریہ کی صدائے بازگشت ہی تھی جسے اول اول مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے نعرہ کی شکل دی تھی۔ چوہدری رحمت علی نے پہلی گول میز کانفرنس کے دوران انگلینڈ میں اس سے مسلم زُعماء و شرکاء سے ملاقات کر کے اپنی "پاکستان" کی سکیم پیش کی تھی۔ جنوری 1933ء میں ایک چار صفحاتی پمفلٹ بعنوان "ابھی یا کبھی نہیں" (Now or Never) جاری کیا جس میں ایک مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ پھر حیدر آباد دکن اور میسور کے علاقوں پر مشتمل "عثمانستان" کی مسلم مملکت کی تجویز بھی پیش کی جبکہ بنگال اور آسام کے علاقوں پر مشتمل مسلم حکومت کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ جس کا نام "بانگ اسلام" تجویز کیا گیا تھا، اور وجہ یہ بتائی تھی کہ ہندوستان کبھی بھی ایک ملک کے طور پر نہیں رہا۔ بلکہ یہاں پر مختلف لوگوں نے مختلف

علاقوں میں بہت سی حکومتیں قائم کیے رکھیں۔

علامہ اقبال نے بھی الگ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ جس کو ایک عظیم دانشور کا مطالبہ خیال کرتے ہوئے مسلمانوں نے بڑی اہمیت دی، اور قیام مملکت کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ پھر سندھ کی صوبائی مسلم لیگ نے کراچی میں 1938ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے آزاد مسلم مملکت کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنی کتاب میں ہندوستان کو ثقافتی بنیادوں پر چار حصوں میں تقسیم کرکے ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی تجویز دی تھی، لیکن یہ مطالبات اس وقت تک مطالبات ہی رہے جب تک قائداعظم نے آگے بڑھ کر امت مسلمہ کی ناؤ کو منجھدھار سے نکال کر حصول پاکستان کی لیلیٰ سے ہم آغوش نہ کر دیا۔

**قرارداد لاہور (23 مارچ 1940ء):** علامہ اقبال نے الگ اسلامی مملکت کے قیام کا نظریہ دیا تھا۔ جسے مسلم لیگ کے منشور میں شامل کرکے اس کے حصول کی جدوجہد کی جا رہی تھی۔ چنانچہ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کرنے کا پروگرام بنایا اس پروگرام کو سبوتاژ کرنے کے لئے خاکساروں پر اندھا دھند فائرنگ کا واقعہ سامنے لایا گیا۔ جس نے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی، لیکن قائداعظم سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ قرارداد پاکستان سے باز رکھنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی اور دہلی سے پیغام دیا کہ مسلم لیگ اس واقعہ میں الجھنے سے باز رہے۔ چنانچہ مخالفین کی چالبازی ناکام رہی۔ 23 مارچ کو قائداعظم لاہور تشریف لائے اور حالات کا خود جائزہ لیا اور مسلمانوں کی بردباری کی تعریف کی اور جلسہ کے انتظامات کو آخری شکل دے دی گئی۔ ہندوستان بھر سے مندوبین آگئے تھے۔ 23 مارچ 1940ء کو یہ جلسہ مینار پاکستان کے مقام پر منعقد ہوا جسے منٹو پارک کہتے تھے۔ آجکل اس کا نام اقبال پارک ہے۔ اس جلسہ میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان شریک ہوئے اور مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل اہم رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔

1- بنگال سے مولوی اے۔ کے فضل الحق۔
2- یو۔پی سے مولانا عبدالحامد بدایونی اور بیگم مولانا محمد علی جوہر اور جناب خلیق الزمان۔
3- صوبہ سرحد سے سردار اورنگزیب۔
4- سندھ سے سر عبداللہ ہارون۔
5- مدارس سے عبدالحمید خاں۔
6- بمبئی سے ابراہیم اسماعیل چندریگر۔
7- سی۔پی سے سردار عبدالرؤف شاہ۔

8- بلوچستان سے قاضی محمد عیسیٰ۔
9- پنجاب سے ڈاکٹر محمد عالم اور مولانا ظفر علی خاں اور مجلہ ہمایوں کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد۔

یہ جلسہ قائداعظم کی صدارت میں شروع ہوا۔ لوگوں کا ذوق و شوق دیدنی تھا۔ وہ پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الااللہ کے نعرے لگا رہے تھے۔ آخر وہ قرارداد پیش کی گئی جو حصول پاکستان کی بنیاد بنی۔ شیر بنگال مولانا اے۔ کے فضل الحق نے قرارداد پیش کی جس میں پاکستان کا نام لیئے بغیر مسلمانوں کے لئے علیحدہ اور خود مختار مملکت کا مطالبہ کیا گیا۔ مسلم علاقوں کی نشاندہی کی گئی اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے پر زور دیا گیا۔

قرارداد کی منظوری کے بعد حصول پاکستان کی کوششیں تیز ہو گئیں۔ انگریزوں کو مسلمانوں کی قوت ماننا پڑی آخر 20 جون 1945ء کو شملہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کے رہنماؤں نے وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ کانگرس کی نمائندگی ابوالکلام آزاد اور ادھر قائداعظم نے کی۔ 27 جون کو بھی ایک اجلاس ہوا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ لارڈ ویول دونوں سیاسی جماعتوں کو کسی متفقہ لائحہ عمل اختیار کرانے میں ناکام رہے اور مسلم لیگ کی اہمیت تسلیم کر لی گئی۔ دسمبر 1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے واضح کامیابی حاصل کی مرکز میں 102 میں سے 30 اور 1946ء کے انتخابات میں صوبائی نشستوں میں 86 میں سے 75 کی واضح اکثریت حاصل ہوئی، اور یونینسٹ پارٹی نے وزارت بنائی، لیکن بعد میں انتشار کا شکار ہو گئی، اور آخر مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو گئی۔ اپریل 1946ء میں مسلم لیگی وزراء نے حلف اٹھاتے وقت بھی اپنی صلاحیتوں کو مسلم لیگ کے لئے وقف کیئے رکھنے کا اعادہ کیا۔ اس کے بعد بھی انگریزوں اور ہندوؤں نے قیام پاکستان کی راہ میں بہت روڑے اٹکائے، لیکن ان کی ہر چال اور کوشش ناکام ثابت ہوئی کیونکہ مسلم لیگ کے سربراہی قائداعظم کے پاس تھی جو بکنے اور جھکنے والے نہ تھے۔ کیبنٹ مشن نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کی جسے کافی ردوقدح کے بعد حتمی شکل ملی۔ 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن کے دور میں سرکاری سطح پر قائم کی گئی ایڈوائزری کورڈ نے ملکی تقسیم کے منصوبے کو حتمی شکل دی۔ جس کی رو سے گورداس پور، فیروزپور اور ضلع امرتسر کا بڑا حصہ پاکستان میں شامل دکھایا گیا تھا، لیکن لندن سے منظوری لیتے وقت یہ علاقے ہندوستان کا حصہ بنا دیئے گئے اور رہی سہی کسر ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے پوری کر دی گئی، اور پٹھانکوٹ اور بٹالہ کو بھارت میں شامل کر دیا۔ تاہم اللہ کی مہربانی سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

**کرپس مشن 1942ء:** 1942ء میں دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی اور برطانیہ کو جرمنی اور جاپان میں شکست کا سامنا تھا۔ ان دنوں مسٹر ونسٹن چرچل برطانیہ کا وزیراعظم تھا۔ وہ ہندوستان کے بارے میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ مسلمانوں کو نظرانداز

کرنا خطرناک ہوگا۔ چنانچہ اس نے وائسرائے ہند کو خطوط لکھے کہ وہ ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کانگرس اور مسلم لیگ کو آزادی کے لئے کسی متفقہ فارمولے کے لئے راضی کریں۔ اس مقصد کے لئے مسٹر ایٹلی کی سربراہی میں انڈیا کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس نے تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مشن ہندوستان بھیجا جائے۔ چنانچہ 11 مارچ 1942ء کو سر سٹیفورڈ کرپس (Sir Stafords Crips) کی قیادت میں ایک جائزہ کمیشن بھیجنے کا اعلان کیا گیا چنانچہ مسٹر کرپس 22 مارچ 1942ء کو ہندوستان پہنچ گیا اور آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

کانگرس کے مسلمان زعما کے ذریعے اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ صرف کانگرس ہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے، لیکن قائداعظم کی مخالفانہ وکالت رنگ لائی۔ تاہم مسٹر کرپس نے 29 مارچ 1942ء کو ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

1- برصغیر کی آئین ساز اسمبلی کامل اعلان آزادی کے ساتھ ہی شروع ہو سکتی ہے۔
2- اس کو آزادی ہوگی کہ وہ یو۔کے (برطانوی حکومت) کا حصہ رہے یا الگ اپنا تشخص قائم کرے۔
3- وہ برطانوی گورنر جنرل قبول کرنے یا اپنا مقامی گورنر جنرل مقرر کرنے کی مجاز ہوگی۔
4- ہندوستانی ریاستوں پر برطانیہ کا کنٹرول نہیں ہے لہٰذا ان کو کسی بھی نئے ملک میں شمولیت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔
5- محکمہ دفاع کو برصغیر کی عبوری حکومت کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔
6- عبوری حکومت میں نئے وزرا کو منتخب کرنے کی بجائے وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کو ہی کابینہ سمجھا جائے گا۔
7- ان تمام امور پر یا تو مکمل عمل درآمد ہوگا یا یکسر مسترد کر دیا جائے گا۔

مسٹر کرپس نے یہ تجویز بھی دی کہ:

دوسری عالمی جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستان کا نیا دستور بنا کر نافذ کیا جائے گا۔ اور جو صوبے اس نئے دستور کو منظور نہ کریں وہ برطانوی حکومت سے اپنا الحاق قائم رکھیں گے۔ نیز آزادی سے پہلے تمام نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت حکومت برطانیہ دے گی وغیرہ چنانچہ کرپس کی تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔

**گاندھی کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک:** مسلم لیگ اور کانگرس نے کرپس کے تجاویز کو مسترد کر دیا۔ قائداعظم مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم چھوڑنے کی کرپس تجاویز کے بڑے سخت ناقد بن کر سامنے آئے۔ گاندھی

نے بھی اسے جنگ کے بعد کیش کرایا جاسکنے والا چیک کہا۔ ان تجاویز کا یہ حشر دیکھا تو مسٹر کرپس فورا برطانیہ واپس چلے گئے اور کانگرس نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ان حالات میں برطانیہ برصغیر کی جان نہیں چھوڑے گا جس کے بعد ہندوستان چھوڑ دو تحریک چلائی گئی' اِدھر برطانوی حکومت کو پے در پے جنگ میں شکستوں کا سامنا تھا۔ کیونکہ جاپان اور جرمنی نے خوب ہاتھ دکھائے تھے، لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ تاہم کانگرسی غنڈوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی آڑ میں بلوے شروع کر کے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ 949 آدمی ہلاک اور ڈیڑھ کروڑ کی املاک کا نقصان ہوا۔ اس پروگرام میں تخریب کاری اور سول نافرمانی بھی شامل تھی۔ بنکوں کو لوٹا گیا۔ ریلوے سٹیشنوں کو آگ لگا دی گئی۔ تار اور ٹیلیفون کی تنصیبات کو نقصان پہنچایا گیا۔

اس احمقانہ کارکردگی کی خلاف قائداعظم نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آواز بلند کی' اور 31 جولائی 1942ء کو اعلان کیا کہ یہ سب کچھ گویا برطانوی حکومت کو بلیک میل کر کے اپنے مفادات حاصل کرنے کی بھونڈی کوشش ہے۔ جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں "ہندو راج" قائم کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔ تاکہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو غلام بنا کر رکھا جائے۔ قائداعظم کے بعد اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبید کر نے بھی مخالفت میں بیان دیا۔ اِدھر برطانوی حکومت نے بھی اس ہندوانہ تحریک کو سختی سے کچل دیا اور دو ماہ کے اندر تحریک ختم ہو کر رہ گئی۔

نیز حالات نے بھی برطانیہ کا ساتھ دیا اور جاپان اور جرمنی کے فتح کردہ علاقے دوبارہ آزاد کروا کر تاج برطانیہ کی برتری تسلیم کروالی گئی۔

کانگرس کی اس احمقانہ تحریک نے جنگ کے اختتام کے بعد بھی انگریزوں کو برصغیر میں پیر پسارے رکھنے کا حوصلہ دیا اور 1944ء یا 1945ء میں آزادی دینے کی بجائے یہ کام اگست 1947ء تک بھی بادل نخواستہ کرنے پر ہی رضامند ہوئے۔

**ٹوانہ کی مسلم لیگ میں شمولیت اور اخراج:** دسمبر 1942ء میں سر سکندر حیات کی جگہ خضر حیات ٹوانہ پنجاب کا وزیراعلیٰ بنا اور حالات کے مطابق چلنے کی بجائے پرانی ڈگر پر چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ سکندر جناح پیکٹ کے تحت مسلم یونینسٹ پارٹی کے ارکان اسمبلی مسلم لیگ کے ممبر بن چکے تھے۔ اگرچہ وزارت میں وہ یونینسٹ ہی تھے۔ خضر حیات جاگیردارانہ سوچ رکھتا تھا۔ اس نے سکندر جناح پیکٹ کی غلط تشریح و تاویل کی چنانچہ اسے مسلم لیگ کے لئے خطرناک عنصر سمجھتے ہوئے 1944ء میں مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ کیونکہ متحدہ پارٹی کی کوشش یہ تھی کہ آہستہ آہستہ مسلم لیگ کو نیچا دکھایا جائے۔ مارچ 1943ء میں خضر حیات کے عندیہ پر مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں غور کیا گیا اور قائداعظم نے پنجاب مسلم لیگ کی حالت کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اِدھر خضر حیات نے متحدہ پارٹی کی تنظیم نو

شروع کردی حالانکہ معاہدہ سکندر جناح کے تحت متحدہ پارٹی کو آہستہ آہستہ ختم کر کے مسلم لیگ میں ضم ہو جانا تھا، لیکن ٹوانہ کے اقدامات سے مسلم لیگ متحدہ پارٹی کی ذیلی جماعت بنتی نظر آ رہی تھی۔ ادھر پاکستان کی جنگ پنجاب میں لڑنا وقت کا تقاضا تھا کیونکہ پنجاب میں ہی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ خضر حیات نے "کہہ مکرنیوں" کا طرز عمل اختیار کیا اور قائداعظم کے مقابلہ میں خود سری کا مظاہرہ کیا اور مسلم لیگ کا ممبر ہونے کے ناطے مرکزی مسلم لیگ کے احکامات کی وصولی سے ہی انکار کر دیا۔ جن میں اس سے کچھ وضاحتیں کرنے کو کہا گیا تھا۔ چنانچہ خضر حیات کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد متحدہ پارٹی کے مسلم ارکان مثلاً راجہ غضنفر علی خاں اور صوفی عبدالحمید وغیرہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور صوفی عبدالحمید وغیرہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، جبکہ مسلم لیگ کے بیس 20 ارکان اسمبلی مخالف بنچوں پر براجمان ہو گئے۔

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے 84 میں سے 39 نشستیں حاصل کیں خضر حیات کا گروپ 9 سیٹیں لے سکا لیکن وزارت بنانے کی دعوت مسلم لیگ کی بجائے خضر حیات کو دی گئی اور مخلوط حکومت مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔

اس وزارت سازی سے خضر حیات کی وقعت مسلمانوں کی نظر صفر تک پہنچ گئی۔ جس نے جاگیردارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفادات کا سودا محض اپنے چند روزہ اقتدار کے لئے کر لیا تھا۔ چنانچہ احتجاج کی لہر چلی جس کے بہاؤ میں خضر حیات کی وزات بہہ گئی اور اسے مستعفی ہونا پڑا۔۔۔ راقم ان دنوں پہلی دوسر جماعت کا طالب علم تھا۔ لوگ عموماً یہ نعرہ بر سرعام لگایا کرتے تھے۔

کانگرس کا ٹٹو۔۔۔۔ خضر حیات۔۔۔۔ مردہ باد!

خدا کی شان ہے کہ بعض مسلمان اجتماعی مفادات کے مقابلے میں ذاتی مفادات کی خاطر دنیاداری کا پھندہ گلے میں ڈال کر۔۔۔ دین کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ خدا ان کے ساتھ جو سلوک بھی چاہے کرے، لیکن تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

**جناح گاندھی بات چیت:** قائداعظم محمد علی جناح کی سیاست بھی دیانت داری کا حسین مرقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو جنہوں نے 1936ء میں بطور وائسرائے ہند چارج سنبھالا تھا۔ ہندوستانی لیڈروں میں قائداعظم سے بہت متاثر تھے۔ کیونکہ کانگرسی اور مسلم لیگی رہنماؤں سے مسلسل بات چیت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ محمد علی جناح میں جو متانت، صداقت، ہمت اور خود اعتمادی ہے وہ کسی ہندو لیڈر میں نہیں۔ گاندھی اگرچہ ہندو اکثریت کے بل پر بڑی شہرت رکھتے تھے لیکن استدلال اور حقیقت بیانی کے میدان میں وہ بھی اکثر

مار کھا جاتے۔ لارڈ لنتھلگو کے ہی عہد میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ جس نے کانگرس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ گاندھی اور نہرو کی مکارانہ سیاست کی تان اکھنڈ بھارت پر ٹوٹتی تھی چاہے اس کے لئے انہیں کتنے ہی موقف بدلنے پڑیں۔ 20 اکتوبر 1942ء کو لارڈ لنتھلگو اپنا عہدہ چھوڑ کر واپس برطانیہ چلے گئے اور فوراً بعد اسی ماہ میں لارڈ ویول نے ان کی جگہ سنبھالی۔ انہوں نے آتے ہی ہندوستان کو ایک وحدت قرار دیا جس کا مطلب پاکستان کی نفی تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے جواب میں کہا کہ "لارڈ ویول کانگرس کے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں" اس طنزیہ بیان نے انگریزوں کے کان کھول دیئے مہاتما گاندھی نے 10 فروری 1943ء کو اکیس روزہ مرن برت کے ذریعے جیل سے رہا ہونے کی کوشش کی کیونکہ اس عرصے میں جبکہ کانگرسی رہنما زیادہ تر جیل میں تھے، مسلم لیگ نے منزل پاکستان کی طرف کافی فاصلہ طے کر لیا تھا۔ چنانچہ مدراس کی برطرف شدہ اسمبلی کے رکن راجگوپال اچاریہ نے جیل میں گاندھی جی سے ملاقات کر کے انہیں بدلے ہوئے حالات بتائے، اور قائداعظم کی طرف خط لکھنے کو کہا۔ گاندھی نے قائداعظم کو ملاقات کے لئے خط لکھا۔ جواب میں "ہاں" کا عندیہ تھا، لیکن ملاقات کے لئے تفصیلات طے نہ ہو سکیں۔ 6 مئی 1944ء کو گاندھی جی خراب صحت کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد اس نے لارڈ ویول کو خط لکھ کر دھمکانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ کانگرس نے ایک مفاہمتی فارمولا پیش کر کے مسلم لیگ کو چکر دینا چاہا۔ جس سے مسلم لیگ نے اتفاق نہ کیا 17 جولائی 1944ء کو گاندھی نے قائداعظم کو گجراتی زبان میں خط لکھا اور ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی بھجوایا یہ خط بھی منافقانہ چال تھی جس میں قائداعظم نہ آئے البتہ بالمشافہ گفتگو کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ 9 ستمبر 1944ء کو گاندھی جناح ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ملاقاتوں کے بعد 27 ستمبر 1944ء کو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان ملاقاتوں میں راجگوپال اچاریہ کے تیار کردہ فارمولے پر بحث ہوتی رہی، اور گاندھی جی تقسیم ہند کے لئے راضی ہو گئے، اور دنیا پر واضح ہو گیا کہ مسلم لیگ ہی ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے، اور قائداعظم ان کے رہنما ہیں۔ اب اس مفاہمت کو سامنے رکھ کر کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنے اپنے مطالبات منوانے کے لئے پورا زور لگانا شروع کر دیا۔ اور وہ آزادی کی خاطر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلنے کو تیار ہو گئیں۔

**شملہ کانفرنس 1945ء:** لارڈ ویول نے کانگرس کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں دوسرا بڑا فریق تسلیم کر لے۔ 14 جون 1945ء کو لارڈ ویول نے نشری تقریر کی جس میں 25 جون کو آزادئ ہند کے لئے شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کا تعین کیا اور کچھ تجاویز بھی پیش کیں کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو مرکز میں ایک نئی کونسل تشکیل دی جائے گی، اور جن صوبوں میں دفعہ 93 پر عمل ہو رہا ہے وہاں کی برخاست شدہ

وزارتیں بھی دوبارہ تشکیل کر دی جائیں گی اور حکومت کا حق ہندوستانی نمائندوں کو دے دیا جائے گا۔ ورنہ حکومت اپنی مرضی کا نظام جاری رکھے گی۔ یہ نشری تقریر کانگرس پر بجلی گرنے سے کم نہ تھی، کیونکہ اس میں مسلم لیگ کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ 24 جون کو لارڈ ویول نے قائداعظم، گاندھی اور ابوالکلام آزاد سے الگ الگ ملاقاتیں کیں جس میں قائداعظم نے اپنا موقف اور کانگرس کی شاطرانہ چالوں کو کھول کر بیان کیا۔

آخر 25 جون 1945ء کو صبح گیارہ بجے شملہ میں کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا جو وائسرائے کی تقریر کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ دوسرا اجلاس اڑھائی بجے شروع ہوا اور ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی قومی وحدت کے حوالے سے مسلم لیگ کی کوشش کو فرقہ واریت کے زمرہ کی چیز بتایا۔ اس کے بعد قائداعظم نے تقریر کی اور بتایا کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسلمانوں سے اس کا منافقانہ تعلق کے سوا کوئی علاقہ نہیں۔ 27 جون 1945ء کو بھی اس کا اجلاس ہوا جس میں دونوں سیاسی پارٹیوں کو سمجھوتہ کرنے کی مہلت دی گئی، لیکن قائداعظم اور پنڈت گووند وبھ پنتھ کے درمیان ہونے والی بات چیت ناکام ہو گئی جس کی اطلاع وائسرائے کو دے دی گئی۔ اس کا اگلا اجلاس 29 جون کو ہوا۔ 7 جولائی تک تمام جماعتوں کے مندوبین کی فہرستیں وائسرائے کو پہنچا دی گئیں، لیکن مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم نے وائسرائے کو خط لکھا اور پوچھا کہ آیا وہ مسلم ارکان کی تقرری کے بارے میں مسلم لیگ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں؟ نیز یہ کہ دوسری اقلیتوں کو جو نمائندگی دی جائے گی اس کی نوعیت کیا ہو گی؟

چنانچہ 9 جولائی کو وائسرائے نے لکھ کر بھیجا کہ تمام مسلمان ارکان مسلم لیگ سے لئے جانے ضروری نہیں ہیں۔ جس کے جواب نے قائداعظم نے کہا ایسی صورت میں مسلم لیگ اس کاروائی میں ہرگز شریک نہ ہو گی۔ پھر وائسرائے نے لکھا کہ پانچ مسلم ارکان میں سے چار مسلم لیگ سے لئے جا سکتے ہیں اور پانچواں رکن مسلمان تو ہو گا لیکن وہ مسلم لیگ سے نہیں لیا جائے گا۔ لیکن قائداعظم اس بات پر بضد رہے کہ پانچواں رکن بھی مسلم لیگ میں سے لیا جائے۔ نیز یہ کہ گورنر جنرل اپنے خصوصی اختیارات بروئے عمل لا کر کونسل کے اندر مسلمانوں کے لئے خاص تحفظ کو یقینی بنائیں، لیکن وائسرائے نے قائداعظم کی یہ شرائط نامنظور کر دیں اور 14 جولائی 1945ء کو شملہ کانفرنس کی ناکامی کا واضح اعلان کر دیا۔

یہ صرف قائداعظم کی مومنانہ فراست تھی جو آڑے آئی ورنہ غیر لیگی مسلمان لیڈر مروت میں اپنے مستقبل کی موت کے پروانہ پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جس کا مظاہرہ خضر حیات ٹوانہ اور ابوالکلام آزاد کر چکے تھے لیکن قائداعظم یہاں بھی اپنے سچائی پر مبنی اصولی مؤقف پر ڈٹے رہے۔

# عام انتخابات

(دسمبر 1945ء و جنوری 1946ء)

21 اگست 1945ء کو لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ آئندہ موسم سرما میں عام انتخابات ہوں گے جن کی بنیاد پر نئی مجلس قانون ساز اور ایگزیکٹو کونسل قائم کی جائے گی۔ کانگریسی میڈیا نے مسلم لیگ کے خلاف ہر گونہ جنگ چھیڑ دی' کیونکہ مسلم لیگ کی روز افزوں ترقی ان کے لئے سوہانِ روح سے کم نہ تھی۔ مسلم لیگ نے بھرپور کوشش کی کہ آئندہ انتخابات میں جیتے لیکن غریب قوم کے پاس روپے پیسے کی کمی تھی۔ چنانچہ قائداعظم کی اپیل پر مسلمانوں نے مسلم لیگ کے لئے چندہ مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

**مرکزی انتخابات:** دسمبر 1945ء میں مرکزی انتخابات منعقد ہوئے۔ جس میں مسلمانوں کے لئے تیس (30) نشستیں تھیں۔ جو سب کی سب مسلم لیگ نے جیت لیں۔ جبکہ کانگرس کو 72 میں سے 57 سیٹیں مل سکیں۔ 5 آزاد' 2 اکالی سکھوں اور 8 سیٹیں یورپین کو ملیں۔

**صوبائی انتخابات:** جنوری 1946ء میں صوبائی انتخابات ہوئے جس میں مسلم لیگ 90 فیصد نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے یہاں 82 میں سے 75 نشستیں مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ سرحد میں 38 میں سے 17' سندھ میں 35 میں سے 28' بنگال میں 119 میں سے 113' آسام میں 34 میں سے 31' یو۔پی 66 میں سے 55 جبکہ بمبئی کی ساری (30) سیٹیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ اسی طرح مدراس 29 میں سے 29' سی۔پی 14 میں سے 14' بہار 40 میں سے 34 اور اڑیسہ میں 4 میں سے 4 مسلم نشستیں مسلم لیگ کو مل گئیں اس طرح کل 494 سیٹوں میں سے 430 پر مسلم لیگ کامیاب ہوگئی۔

ان انتخابات کے نتیجے میں وزارتیں تشکیل پائیں۔

پنجاب میں کل سیٹیں 175 تھیں جن میں سے مسلم لیگ کو 75 ملیں۔ کانگرس نے 15' اکالی سکھوں نے 22' یونینسٹ پارٹی نے 20 اور آزاد امیدواروں نے 7 نشستیں حاصل کیں۔ یونینسٹ پارٹی کے چار اُمیدوار مسلم لیگ میں شامل ہوگئے جبکہ 6 آزاد ہوگئے۔ اس طرح خضر حیات کی یہ پارٹی 10 سیٹوں پر قابض رہ گئی۔ پنجاب کا گورنر مسٹر گلینسی مسلمانوں کا مخالف تھا۔ اس لئے اس نے اکثریتی پارٹی مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دینے کی بجائے ملک خضر حیات کو مخلوط حکومت بنانے کی دعوت دے ڈالی جس نے کانگرس وغیرہ سے گٹھ جوڑ کر کے وزارت تو بنائی

لیکن یہ وزارت اس ہیجان اور زوردار مخالفانہ لیگی تحریک کا مقابلہ نہ کر سکی جو عوامی مظاہروں کی شکل میں ملک بھر میں برپا تھی۔ چنانچہ خضر حیات نے ایک سال بعد ہی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1945ء۔1946ء کے عام انتخابات نے مسلم قومیت کی سیاسی قوت کو بھی تسلیم کروا لیا۔ جن سے حصول پاکستان کی منزل اور بھی قریب ہو گئی۔ چنانچہ اپریل 1946ء میں وزارتوں میں شامل مسلم لیگی ارکان نے وزارتی حلف اٹھانے کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کی تحریک کو تیز تر کرنے کا حلف بھی اٹھایا۔

## کیبنٹ مشن پلان 1946ء

انتخابات کے بعد مسلم لیگ کی کامیابیوں کے جھنڈے لہرانے لگے تو انگریزوں کو آزادی کا فیصلہ کرتے میں آئندہ ہندوستان کی صورت حال کی فکر ستانے لگی۔ جنگ عظیم دوم ختم ہو چکی تھی۔ فاضل فوج کو گھروں میں بھیجنے اور ان کے لئے روزگار کا فکر کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ ادھر برطانیہ میں لارڈ ایٹلی وزیراعظم بن چکے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے برطانوی مرکزی سطح پر وزرا کا ایک مشن قائم کیا جس کے تین ارکان تھے جس نے 24 مارچ 1946ء کو دہلی میں آکر وائسرائے ہند سے ملاقات کی، اور پھر دیگر اہم ہستیوں سے مذاکرات کر کے صورت حال کا جائزہ لیا اور جان لیا کہ مسلمانوں کو نظرانداز کر کے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ اور کانگرس کے ساتھ بات چیت کر کے مفاہمت کی کوشش شروع کر دی۔ 3 اپریل کو گاندھی سے ملاقات ہوئی اور 4 اپریل کو قائداعظم سے بات چیت کی جنہوں نے بتایا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے کیونکہ چندر گپت موریہ سے آج تک کبھی بھی ہندوستان ایک ملک نہیں رہا بلکہ یہاں مختلف وقتوں میں متعدد حکومتیں رہی ہیں۔ چنانچہ 16 اپریل کی ملاقات میں قائداعظم کا موقف پھر سے سن کر دو تجویزیں دیں کہ:

1- پاکستان ہندوستان کے ایک خاص علاقے میں قائم کر دیا جائے۔ یا

2- مسلم اکثریت کے صوبوں اور دیگر صوبوں کی دو الگ الگ فیڈریشنیں بنا دی جائیں اور پھر دونوں کو ایک مرکز کے تحت رکھا جائے۔ پھر شملہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے 5-6 مئی 1946ء کو بات چیت ہوئی، پھر 9 مئی کو بھی اجلاس ہوا اور مختلف تجاویز زیر بحث آئیں، لیکن مشن کے ارکان نے دونوں فریقوں کی تجاویز کو منظور نہ کیا بلکہ 16 مئی 1946ء کو اپنے تیار کردہ منصوبے کا اعلان کر دیا جسے کیبنٹ مشن پلان کہتے ہیں۔ اس میں پاکستان کی تشکیل کی نفی کی گئی تھی لہٰذا کانگرس نے اسے فوراً مان لیا لیکن قائداعظم نے ایک اعلامیہ میں اس پلان کو غیر منطقی اور غیر حقیقت پسندانہ اور جانب دارانہ قرار دے دیا۔ جس

کو 6 جون 1946ء کو مسلم لیگ کی کونسل نے قرارداد کی شکل میں منظور بھی کرلیا۔
مشن کی ناکامی کے بعد اس کے ممبران 29 جون 1946ء کو واپس برطانیہ چلے گئے۔ یہ مشن ان تین افراد پر مشتمل تھا۔

1- سر سٹیفورڈ کرپس — تجارت بورڈ کے صدر
2- اے۔وی الیگزینڈر — فرسٹ لارڈ آف نیوی
3- لارڈ پیتھک لارنس — وزیر ہند

کمشن نے اگرچہ مسلمانوں کی حکومت کی ضرورت تسلیم کرلی تھی، لیکن عملی طور پر اسے ناقابل عمل قرار دے کر اپنی ناکامی پر مہر بھی لگادی تھی۔

## براہ راست ایکشن اور عبوری حکومت

کیبنٹ مشن کی تجاویز سے کانگرس اور مسلم لیگی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی چنانچہ آزادی کا راستہ براہ راست ایکشن کے سوا کوئی نہ تھا۔ تاہم ایک فرق واضح تھا۔ کانگرس کی نظر میں پاکستان کا نظریہ مسترد کر دیا گیا تھا لیکن مسلم لیگ کے خیال میں قیام پاکستان کا مطالبہ مان لیا گیا تھا اگرچہ کچھ عرصہ کے لئے اسے التواء میں ڈال دیا گیا تھا۔ بہرحال دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں وزارتی مشن کی تجاویز کو ماننے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ قائداعظم نے عارضی حکومت کی تشکیل کے لئے لارڈ ویول سے مذاکرات کئے، اور برطانوی حکومت کی ہدایات کے تحت ہندوستان میں نئی عارضی حکومت بنانے کا عندیہ دیا۔

اس میں کانگرس کے پانچ نمائندے شامل کرنے تھے۔ مسلم لیگ کے بھی پانچ جبکہ اقلیتوں کے 2 نمائندے شامل کئے جانے تھے۔ ان تجاویز کو قائداعظم نے تسلیم کرلیا لیکن تحریری طور پر وائسرائے نے ان تجاویز کی رسید نہ دی۔ نہرو نے اس فیصلے کو بدلوانے کے لئے وائسرائے کو خط لکھا۔ جس کے جواب میں تجویز یہ طے پائی کہ کانگرس کو پانچ کی بجائے چھ سیٹوں پر نمائندگی دی جاسکتی ہے، لیکن کانگرس ناراض ہوگئی۔ چنانچہ اب چودہ نمائندے حکومت میں شامل کرنے کی تجویز دی گئی۔ جس کے نہ ماننے کی صورت میں وائسرائے نے خود ایک مخلوط حکومت تشکیل دینے کا اعلان کیا۔ جس میں اس تجویز سے اتفاق کرنے والی جماعتوں کے نمائندے ضرور شامل کئے جائیں گے۔ اس اعلان کو مسلم لیگ نے مان لیا لیکن کانگرس نے مخالفت کی، اور وائسرائے نے راہ فرار میں عافیت سمجھی جس کا مسلم لیگ نے برا مانا آخر لارڈ پیتھک لارنس نے وائسرائے کو ہدایت دی کہ عبوری کابینہ مسلم لیگ کے بغیر ہی بنالی جائے۔ اگر وہ اس میں شمولیت پر رضامند نہ ہو۔ چنانچہ 24 اگست 1946ء کو تاج برطانیہ کی منظوری سے 14 رکنی عبوری حکومت کے قیام کا فیصلہ ہوا جسے 2

ستمبر کو قائم ہونا تھا۔ مسلم لیگ نے اس اقدام کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے مورخہ 16 اگست کو "یوم راست اقدام" (Directaction day) منانے کا فیصلہ کیا اور نفرت کے اظہار کے طور پر انگریز کے عطا کردہ القابات واپس کر دینے کی مہم شروع ہوئی۔ بمبئی میں ڈائریکٹ ایکشن کا جلسہ ہندوؤں کی غنڈہ گردی کا شکار ہوا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے گھر جلا دیئے گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ کلکتہ میں چھ ہزار افراد لقمہ اجل بنائے دیئے گئے۔ پھر فسادات کی آگ دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی۔

عبوری حکومت بنانے کے لئے وزیراعظم برطانیہ زور دے رہے تھے، لیکن مسلم لیگ کو یکسر نظرانداز کرنا لارڈ ویول کے لئے بڑا مشکل تھا۔ تاہم وائسرائے نے 12 رکنی کانگرسی حکومت کا اعلان کر دیا، اور 2 ستمبر 1946ء کو عبوری ارکان نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ اس پر قائداعظم نے انگریزوں پر بھرپور تنقید کی اور برطانوی پریس نے بھی ان کی تائید کی کیونکہ مسلم لیگ کے بغیر عبوری حکومت نہیں چل سکتی تھی۔ چنانچہ وائسرائے نے مسلم لیگ کے پانچ نمائندوں کے نام طلب کئے تاکہ انہیں کابینہ میں شامل کیا جاسکے۔ چنانچہ خاں لیاقت علی خاں۔ آئی آئی چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی اور اچھوت لیڈر جوگندر ناتھ منڈل کو مرکزی وزارت میں شامل کر لیا گیا۔ جس کے بعد محکموں کی تقسیم کا اعلان ہوا جس میں وزارتِ خزانہ تجارت، مواصلات، صحت اور قانون مسلم لیگ کے حصہ میں آئی۔ لیاقت علی خاں نے چودھری محمد علی سیکرٹری وزاتِ خزانہ کے تعاون سے فروری 1947ء میں عوامی بجٹ پیش کیا۔ جس نے ہندوؤں کو حیرت زدہ کر دیا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو حساب کتاب میں صفر خیال کئے بیٹھے تھے۔

اس بجٹ نے مسلم لیگ کی یہ قابلیت منوانے میں بھی اہم رول ادا کیا کہ مسلمان قوم پاکستان کو قائم کرنے کے بعد اسے چلا بھی سکتی ہے۔

## ماؤنٹ بیٹن پلان 1947ء

وائسرائے لارڈ ویول کا ضمیر جاگ اٹھا تھا اور وہ مسلم لیگ کو اس کا جائز مقام دینے لگ گیا۔ یہ بات کانگرس کو ناگوار گزرتی تھی اس لئے وہ وائسرائے کے خلاف ہو گئی اور گاندھی کے اکسانے پر برطانوی کابینہ کے بعض ارکان کے کہنے پر لارڈ ویول کو واپس بلا کر ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مارچ 1947ء میں بھیجا گیا اور 22 مارچ 1947ء کو اس نے چارج سنبھالا جس سے استقبالی ملاقات اس کے محبوب رہنما پنڈت نہرو نے اپنی جواں سال خوبصورت بیٹی اندرا گاندھی کے ساتھ کی، اور حسن اور سلیقے نے لارڈ کو موہ لیا اور وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔

پھر مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح سے ملاقات کا پروگرام طے ہوا۔ یہ ملاقات 25 مارچ

1947ء دہلی میں ہوئی اور وہ قائداعظم کی بے لاگ اور مخلصانہ گفتگو سے یہ باور کرنے لگا کہ جناح صاحب کوئی کاسہ لیس قسم کے لیڈر نہیں ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن پہلے ہی تقسیم ہند کا فارمولا لے کر آیا تھا' لیکن اٹیلی کے اعلان کے مطابق آزادی کا پروانہ جون 1948ء تک جاری کیا جانا تھا جبکہ ماؤنٹ بیٹن اس کے برعکس تمام کام جلد جلدی نپٹا رہا تھا حتیٰ کہ 2 مئی 1947ء کو تقسیم ہند اور آزادی کے پروانے کی منظوری کے لئے وائسرائے کا مسٹراسمے انگلستان روانہ ہو گیا جسے 10 مئی تک واپس آجانا تھا۔

اب کانگرس نے یقین کرلیا کہ پاکستان قائم ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس نے کوشش یہ کی کہ کسی طرح پاکستان کو ملنے والے رقبہ میں کمی کروائی جائے چنانچہ کانگرسی لیڈر ولبھ بھائی پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کو لالچ اور دھمکی کے رویہ سے زیر کرنے کی کوشش کی' اور اسے بھارت کا گورنر جنرل بنانے کا عندیہ دیا' اور رشوت کی پیش کش بھی کی۔

17 مئی 1947ء سے پہلے لارڈ اسمے والا منصوبہ ذرا سی ترمیم کے ساتھ حکومت برطانیہ سے منظوری پاکر واپس موصول ہو گیا۔ جس کی مخالفت سے کانگرس ماؤنٹ بیٹن کو پہلے ہی ڈرا چکی تھی' چنانچہ اس نے اپنے مشیر مسٹر وی پی مینن سے کہا کہ کانگرس کے لئے قابل قبول منصوبہ تیار کروا کر لایا جائے۔ جسے وہ پہلے سے تیار کردہ پروگرام کے تحت چار گھنٹے کے اندر اندر لے آیا۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے سے منظور کردہ پلان کی بجائے ایک نیا پلان بنا کر اس کی منظوری انگلستان سے حاصل کرنے کا ٹیلیگرام حکومت برطانیہ کو بھجوا دیا۔ جس پر اسے لندن طلب کیا گیا۔ اور وہ 28 مئی کو مینن کے ہمراہ لندن پہنچ گیا۔ جہاں فوراً کابینہ کا اجلاس بلوایا گیا اور کانگرسی لیڈروں کا تیار کردہ منصوبہ پانچ منٹ کے اندر اندر منظور کروا خوشی خوشی واپس ہندوستان آگیا۔ اس کے تحت جون 1948ء کی بجائے ہندوستان کو اگست 1947ء تک آزاد کرنے کی منظوری حاصل کی گئی تھی لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کے اہم علاقے ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے جو اصولی طور پر پاکستان کا حصہ بننے والے تھے۔ کانگرس کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے اس نے ریڈ کلف ایوارڈ کا سہارا لیا۔

اس عجلت کا مقصد پاکستان کو بدانتظامی کا شکار کرنا تھا۔

## ہندوستان کی تقسیم کا اعلان

(3 جون 1947ء)

چنانچہ کانگرسی رہنماؤں کے ہتھے چڑھ کر ان کی مرضی کا منصوبہ منظور کروانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے ملکی تقسیم کا اعلان کیا اور بتایا کہ اس پر عمل

در آمد جون 1948ء کی بجائے دو اڑھائی ماہ تک کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد نہرو اور قائداعظم نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔

# آزادی ہند کا قانون

(جولائی 1947ء)

3 جون کے نشری منصوبے کو لیگی اور کانگرسی رہنماؤں کے بیانات کے ساتھ مسودۂ قانون کی شکل میں 4 جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ میں منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا جس کے مطابق 15 اگست 1947ء کو تقسیم ہند پر عملدرآمد کیا جانا تھا اور بھارت اور پاکستان نامی دو سلطنتیں قائم ہونا تھیں۔ جس کے بعد وہ خودمختار مملکت کے طور پر اپنا قانون بنا سکتی تھیں۔ جبکہ نئے آئین کی تشکیل تک 1935ء کا ایکٹ نافذ رہے گا۔ اس پر چودہ روز تک بحث ہوتی رہی۔ آخر 18 جولائی 1947ء کو یہ بل قانون کی شکل میں منظور کر لیا گیا۔ جس کی رو سے پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آگیا اور پاکستان کو آزادی اور انتقال اقتدار کی رسم 14 اگست کو کراچی میں ادا کی گئی۔ اور اس طرح قائداعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور وزیراعظم کا عہدہ خاں لیاقت علی خاں کو دیا گیا اور اگلے دن پندرہ اگست کو بھارت کو آزادی نصیب ہوئی۔ قائداعظم فخر سے کہا کرتے تھے ہم آزادی حاصل کرنے میں بھارت سے سینئر ہیں۔ بھارت کا پہلا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن مقرر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر پاکستان بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل بنانا منظور کر لیتا تو یہ بات اس کے حق میں بہتر ہوتی لیکن فروخت شدہ ماؤنٹ بیٹن کانگرس کی جھولی میں گر چکا تھا اس لئے اس سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ پاکستان کے مفادات کا بھی خیال رکھے گا۔ یہ بات قائداعظم کو معلوم ہو چکی تھی اس لئے انہوں نے ملک کی سربراہی کا بوجھ خود اٹھانا قبول کیا تھا۔ یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو قائداعظم کی بے مثال رہنمائی میں وجود میں آگیا۔ اگر تاخیر کی جاتی تو ہو سکتا ہے کہ ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے حصول پاکستان کی مقصدیت کو نقصان پہنچتا جیسا کہ دشمنوں نے بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ کاش آزادی تاخیر سے ملتی تاکہ خاکم بدہن پاکستان نہ بن سکتا۔

# پنجاب باؤنڈری کمیشن ایوارڈ

# یا ریڈکلف ایوارڈ 1947ء

لارڈ مونٹ بیٹن نے 2 جون 1947ء کے اپنے اعلان میں کہا تھا کہ پاکستان کی مجوزہ سرحدوں میں رد و بدل بھی ہو سکتا ہے۔ جس کے حتمی فیصلہ کے لئے ایک باؤنڈری کمیشن قائم کرنے کا اصول معین کیا گیا تھا۔ جس کے تحت مسلم آبادی کی اکثریت والے علاقوں کو پاکستان میں شامل کیا جانا لازم تھا۔ اسی اصول کے تحت 3 جون 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے ریڈیو پر تقریر کی جس میں مکمل آسام کے علاوہ پنجاب کے ضلع گورداسپور کو بھی مغربی پنجاب اور پاکستان کا جزو لاینفک بتایا گیا تھا۔

مغربی پنجاب اور بھارت کی مستقل سرحدوں کے تعین کے لئے برطانوی حکومت نے ایک انگریز جج ریڈ کلف کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ جس میں دو نمائندے پاکستان سے لئے اور دو ہندوستان سے۔ جس کے ذمہ سرحدوں کے تعین کا کام لگایا گیا۔ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی۔

چیئرمین — مسٹر سیرل ریڈ کلف (حکومت برطانیہ کا نمائندہ)

ارکان (پاکستان)
(1) جسٹس دین محمد
(2) جسٹس محمد منیر

ارکان (ہندوستان)
(1) جسٹس مہر چند مہاجن
(2) جسٹس تیجا سنگھ

سکھوں کی نمائندگی کے لئے سردار بلدیو سنگھ کو کمیشن میں شامل کیا گیا تھا۔ ریڈ کلف 8 جولائی 1947ء کو دہلی پہنچا۔ اور آتے ہی ماؤنٹ بیٹن سے ملا۔ جس سے اس نے متعلقہ بریفنگ لی لارڈ صاحب نے بتایا کہ کانگرس نے مجھے بھارت کا پہلا گورنر جنرل بنانا قبول کر لیا ہے لہٰذا انگریزوں کے مفادات پاکستان کی بہ نسبت بھارت کے ساتھ زیادہ وابستگی رکھتے ہیں۔ نیز کانگرس کی طرف سے پیش کردہ رشوت کی جھلک بھی دکھادی۔ نیز بتایا کہ پاکستانی نمائندے تو محض نام کے نمائندے ہیں۔ انہیں ہمارے فیصلہ پر اثر انداز ہونے کا قطعاً اختیار نہیں۔ لہٰذا ہم اپنی مرضی کا فیصلہ مسلط کرنے میں مختار ہیں۔ پنجاب باؤنڈری کمیشن نے 22 جولائی کو کام شروع کیا۔ ریڈ کلف نے جسٹس دین محمد کے ساتھ گورداسپور کے علاقہ کا فضائی جائزہ لینے کا پروگرام بنایا کیونکہ کانگرس کو نوازنے کا جواز بھی

چاہئے تھا۔ جسٹس دین محمد بیماری کا بہانہ کر کے ساتھ نہ گئے اور فوراً قائداعظم کو ہندو انگریز کے سازشی گٹھ جوڑ سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے معاملے کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ لے کر جانچا تو قبل از مرگ واویلا کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ ادھر ریڈ کلف نے جسٹس محمد منیر کو ہمراہ چلنے کو کہا لیکن اچانک موسم کی خرابی کی وجہ سے فضائی جائزہ کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا بعد میں پتہ چلا کہ کانگرسی لیڈروں نے خود ہی پنجاب کی سرحدوں کے تعین کے بارے میں ایک نقشہ ریڈ کلف کے حوالے کر دیا تھا جس میں گورداسپور کی بٹالہ اور پٹھانکوٹ تحصیلوں کو بھارت کا حصہ قرار دے دیا تھا۔ تاکہ ہندوستان کو آئندہ کے لئے کشمیر تک راستہ مل سکے۔ نیز فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور جالندھر کی تحصیل نکودر --- جو 3 جون 1947ء کے اعلان کے مطابق پاکستان کا حصہ تھیں، کو بھی بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ پاکستان کو قدرتی آبی گزرگاہوں کے راستوں سے یکسر محروم کر دیا جائے۔ پاکستانی نمائندوں نے جب ریڈ کلف کو پاکستان کے لئے اس کے نقصانات سے آگاہ کیا تو ریڈ کلف نے جھوٹ موٹ یہ وعدہ کر لیا کہ فائنل سرحدی تعین کے وقت یہ سارے علاقے پاکستان کا حصہ بنا دیئے جائیں گے۔ لہٰذا پاکستانی ارکان مطمئن ہو گئے سرحدی تعین کی حتمی رپورٹ 9 اگست کو وائسرائے کو پیش کر دی اور کئی روز تک اسے صیغہ راز میں رکھا گیا جبکہ تقسیم برصغیر کا اعلان 14 اگست کو عمل میں آ گیا لیکن سرحدوں کے تعین کے حتمی ایوارڈ کا اعلان 17 اگست کو کیا گیا۔ جس میں ریڈ کلف کی بددیانتی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ چنانچہ جب انتقال آبادی کا عمل شروع ہوا تو لاکھوں مسلمان ہندو مسلم فسادات کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ ریڈ کلف کی بددیانتی مسئلہ کشمیر کی شکل میں ایک ایسا ناسور چھوڑ گئی جس نے پاکستان اور بھارت کے امن کو گھن لگا کر رکھ دیا آدھی صدی گزارنے کے باوجود مسئلہ کشمیر کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کو ہر وقت حالت جنگ کا سامنا ہے۔ کانگرس کے سیاست کار رہنماؤں نے اگرچہ اپنی دانست میں مسئلہ کشمیر کو پیدا کر کے پاکستان کے استحکام کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن یہ مسئلہ بھارت کے گلے میں بھی ہڈی کی طرح پھنس گیا ہے۔ اب بھارت کی حالت اس سانپ کی سی ہے جس کے منہ میں چھچھوندر آ جائے۔ اگر اسے کھائے تو کوڑھی ہو کر مرے اگر چھوڑ دے تو دامن پر داغِ اہانت ضرور لگ کے رہے۔ بدنیتی کا پھل ہر ایک کاٹتا ہے۔ پاکستان پر مسئلہ کشمیر جبراً مسلط کیا گیا لیکن اصل نقصان تو بدنیت فریق کا مقدر ہے۔ پاکستان کو بھی اگرچہ مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد اہل حق کے ساتھ ہے انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب بھارت کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔

# 46-1945ء کے انتخابات اور بعد کے حالات پر تبصرہ

2 مئی 1945ء کو جنگ عظیم دوم کا فیصلہ فتح کی صورت میں اتحادیوں کے حق میں ہوا اور ہندوستان کے باشندوں نے وعدہ کے مطابق آزادئی ہند کا مطالبہ زور دار طریقے سے کیا۔ ادھر برطانیہ میں لیبر پارٹی بر سر اقتدار آ گئی تھی جس نے اہل ہند کو جمہوری اصولوں کے مطابق آزادی دینے کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ 21 اگست 1945ء کو لارڈ ویول نے 1946ء- 1945ء کے موسم سرما میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔

دسمبر 1945ء میں مرکزی انتخابات ہوئے کل مسلم نشستیں 30 تھیں جو سب کی سب مسلم لیگ نے جیت لیں جبکہ کانگرس کو 72 میں سے 57 سیٹیں مل سکیں۔ آزاد امیدوار 5 کامیاب ہوئے یورپین 8 اور اکالی دل نے 2 سیٹیں جیت لیں۔

جنوری 1946ء میں صوبائی انتخابات ہوئے سارے ہندوستان میں 495 مسلم نشستیں تھیں ان میں سے 430 مسلم لیگ نے جیت لیں۔ پنجاب میں 86 میں سے 75 مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ کانگرس نے 51 اکالیوں نے 22 یونینسٹ پارٹی نے 20 اور آزاد امیدواروں نے سات سیٹیں حاصل کیں۔ یونینسٹ پارٹی کے 4 ممبر مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور چھ نے آزاد رہنے کا عندیہ دیا۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے پاس صرف 10 سیٹیں رہ گئیں۔ جس کا سربراہ خضر حیات ٹوانہ تھا۔ پنجاب کا گورنر مسٹر گلینسی تھا جس نے اکثریتی پارٹی (مسلم لیگ) کی بجائے حکومت بنانے کی دعوت خضر حیات ٹوانہ کو دی۔ جس نے اکالیوں اور کانگرس سے گٹھ جوڑ کر کے گورنر کے اشارہ پر وزارت بنالی۔ جس کے خلاف پنجاب میں شور مچ گیا۔ خضر حیات کو اپنی وقعت کا پتہ چل گیا چنانچہ اس نے ایک سال کے بعد اچانک استعفیٰ دے دیا۔

**کیبنٹ کمیشن:** برطانوی وزیراعظم لارڈ اٹیلی نے کابینہ کمشن قائم کیا جس کے ارکان کی تعداد تین تھی۔ یہ کمیشن 24 مارچ 1946ء کو دہلی آیا اور لارڈ ویول سے ملاقات ہوئی۔ وزیراعظم اٹیلی نے مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں روڑے اٹکانے سے رکنے کی تنبیہہ کی اور انہیں بطور اقلیت ڈانٹا۔۔۔ کانگرس خوش ہو گئی۔ قائداعظم نے اگلے ہی روز بیان دیا اور کہا کہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت نہیں ہیں بلکہ جہاں جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں وہ اپنی حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ 3 اپریل کو قائداعظم سے کمیشن کی ملاقات ہوئی جس میں آپ نے قیام پاکستان

کی ضرورت اور اہمیت دلائل سے ثابت کی اور کہا کہ چندر گپت کے عہد سے لے کر آج تک ہندوستان میں مختلف ریاستیں قائم ہوتی رہی ہیں۔ کمیشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کو کسی سمجھوتے پر متفق ہونے کا موقع دیا لیکن کانگرس اکھنڈ بھارت کے خوابوں میں مگن رہی۔ 16 اپریل 1946ء کو قائداعظم نے کمیشن سے پھر ملاقات کی اور دو تجاویز پیش کیں۔

1- پاکستان قائم کر کے اسے خود مختاری دے دی جائے۔۔۔یا
2- مسلم اکثریتی صوبوں اور دیگر تمام صوبوں کی دو فیڈریشنیں بنادی جائیں۔ جن کو ایک ہی مرکز کے تحت رکھا جائے۔
3- مرکز کے پاس دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کا مشترکہ نظام ہو۔ اور ہر فیڈریشن مساوی حقوقِ نمائندگی کی حامل ہو۔

**شملہ بات چیت:** کانگرس اور مسلم لیگ کے چار چار نمائندوں کو کمیشن نے شملہ میں بات چیت کی دعوت دی۔ اس بات چیت میں کانگرس کی نمائندگی ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور خاں عبدالغفار خان عرف سرحدی گاندھی نے کی اور مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، نواب محمد اسماعیل خاں اور سرحد کے عبدالرب نشتر کو بھیجا۔ 5 مئی 1946ء کو بات چیت ہوئی۔ جس میں ثابت ہو گیا کہ ہندوستان میں صرف دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد ہیں، تاہم 9 مئی تک یہ بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔

**کیبنٹ مشن پلان:** 16 مئی 1946ء کو کابینہ کمیشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ جس کی رو سے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک وحدت قرار دیا۔ بنگال اور آسام کو دوسری وحدت اور باقی ماندہ سارے ہندوستان کو تیسری وحدت قرار دیا گیا اور ان سب کا انتظام مشترکہ طور پر اکھنڈ بھارت کی طرز پر کرنا منظور کیا گیا۔ یہ منصوبہ کانگرس نے فوراً منظور کر لیا کیونکہ پاکستان کا قیام ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے اسے ناپسند کیا اور 4 جون 1946ء کو مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ہوا جس میں کیبنٹ کمیشن کے منصوبے کو نامنظور کر دیا گیا اور کہا گیا کہ جب کمیشن چھ مسلم صوبوں کی گروہ بندی کو لازم جانتا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے تو پھر پاکستان بنانے کی راہ میں روڑے اٹکانے کا کیا مقصد ہے۔ آخر 29 جون کو یہ کمیشن ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے واپس برطانیہ چلا گیا۔

**ڈائریکٹ ایکشن اور عبوری حکومت:** کابینہ پلان کو کانگرس نے اکھنڈ بھارت اور مسلم لیگ نے قیام پاکستان کا نقیب سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ قائداعظم نے لارڈ ویول سے عارضی حکومت کی تشکیل کے لئے بات چیت کی۔ لارڈ ویول نے بتایا کہ عارضی حکومت 12 ارکان پر مشتمل ہوگی۔ جس میں پانچ پانچ کانگرس اور مسلم لیگ کے

نمائندے ہوں گے اور دو اقلیتوں کے، لیکن یہ زبانی بات چیت تھی جسے تحریر کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم قائداعظم نے یہ تجویز قبول کر لی۔ اِدھر نہرو نے اپنی تجویز پیش کی آخر لارڈ ویول نے کانگرس کے 6 نمائندے مان لئے۔

مسلم لیگ کے 5، سکھ 1، عیسائی 1، اور پارسی 1، کل 14 نمائندے۔

لیکن کانگرس نے اس اعلان کو بھی مسترد کر دیا اور لارڈ ویول نے گھٹنے ٹیک دیے۔ مسلم لیگ نے بائیکاٹ کر دیا۔ 24 اگست 1946ء کو تاج برطانیہ کی منظوری سے عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان کیا گیا جس میں درج ذیل ارکان شامل کیے گئے تھے۔

(1) پنڈت جواہر لال نہرو (2) سی راج گوپال اچاریہ (3) سردار ولبھ بھائی پٹیل (4) سرت چندر بوس (5) ڈاکٹر راجندر پرشاد (6) ڈاکٹر جان متھائی (7) آصف علی (8) سردار بلدیو سنگھ (9) سر شفاعت احمد (10) جگ جیون رام (11) سید علی ظہیر (12) کاؤس جی برزجی بھابا۔ (دو مسلم نمائندے بعد میں لینے تھے)۔

یہ حکومت 2 ستمبر 1946ء کو قائم کی جانا تھی۔ اس اقدام کے خلاف مسلم لیگ نے 16 اگست 1946ء کو "پرامن راست اقدام" کا فیصلہ کیا۔ اور "سر" وغیرہ خطابات واپس کر دینے کا اعلان بھی قائداعظم نے کیا۔ کانگرس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے لئے مسلمانوں اور ان کی املاک پر حملے شروع کر دیئے۔ کلکتہ میں زیادہ اندھیر نگری کر دی گئی۔ املاک کو جلا دیا گیا۔ اور کلکتہ میں چھ ہزار مسلمان تہ تیغ کیے گئے۔ دوسرے شہروں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ پنجاب میں بھی ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مجموعی طور پر لاکھوں مسلمان شہید کئے گئے۔ تب جا کر پاکستان کی تشکیل کا خواب پورا ہوا۔

**مسلم لیگ اور عبوری حکومت:** 6 ستمبر 1946ء کو عبوری حکومت نے حلف اٹھانا تھا۔ وائسرائے نے قائداعظم سے مسلم لیگ کے پانچ ارکان حکومت میں شامل کرنے کے لئے نام مانگے۔ چنانچہ لیاقت علی خان، آئی آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی اور اچھوت لیڈر جوگندر ناتھ منڈل کو مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا گیا اور نئی وزارت نے 26 اکتوبر 1946ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔ اس حکومت کے عہدیداروں میں محکموں کی تقسیم اس طرح تھی۔

1- پنڈت نہرو- امور خارجہ
2- ولبھ بھائی پٹیل- داخلہ اطلاعات و نشریات
3- راجندر پرشاد- خوراک وزارت
4- راج گوپال اچاریہ- تعلیم و آرٹ
5- آصف علی- ٹرانسپورٹ و ریلوے
6- جگ جیون رام- لیبر
7- لیاقت علی خاں- خزانہ
8- آئی آئی چندریگر- تجارت

9- عبدالرب نشتر- مواصلات
10- راجہ غضنفر علی خاں- صحت
11- جوگندر ناتھ منڈل- قانون
12- جان متھائی- صنع اور قدرت وسائل
13- سردار بلدیو سنگھ- دفاع

خاں لیاقت علی خاں نے فروری 1947ء میں نئے سال کا بجٹ پیش کیا- جو چوہدری محمد علی نے تیار کیا تھا جو وزارت خزانہ کے سیکرٹری تھے- یہ بجٹ عوامی بجٹ کہلایا- جس کی کانگرس سمیت سب نے تعریف کی، لیکن جب اس کی زد میں برلے اور ٹاٹے آئے تو کانگرس کی آنکھیں کھلیں- بہرحال بنیاؤں کو پتہ چل گیا کہ مسلمان جنہیں وہ حساب میں فیل سمجھتے تھے، بھی حساب کتاب خوب جانتے ہیں- آخر پٹیل نے برملا کہہ دیا کہ مسلمان وزرا کے ساتھ کام کرنے سے تقسیم ہند زیادہ بہتر ہے-

**ماؤنٹ بیٹن پلان 1947ء:** 22 مارچ 1947ء لارڈ ڈیول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے ہند کا چارج سنبھالا اور آزادی ہند کا پروانہ تیار کرنے میں مشغول ہو گیا- آخر اس نے 3 جون 1947ء کو آزادی ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کا اعلان بھی کر دیا- اور جولائی 1947ء میں برصغیر کی آزادی کا ایکٹ نافذ ہوا- جس کی رو سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آگیا-

## لارڈ ویول کا روزنامچہ

حال ہی میں "انگریز ہندو گٹھ جوڑ" کے عنوان سے وائسرائے ہند لارڈ ویول کی ڈائری (روزنامچہ) کی روشنی میں جناب کرامت علی خاں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے- یہ تحریر ان کی زیر طبع کتاب کا ایک باب ہے جسے وہ نوائے وقت کے ذریعے منظر عام پر لائے ہیں- چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں برطانوی وائسرائے کی تقرری کی مدت عام طور پر پانچ سال کے لئے ہوتی تھی- لارڈ ڈیول نے 20 اکتوبر 1943ء کو بطور وائسرائے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا- انہیں 22 مارچ 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کے بعد فارغ کر دیا گیا- وہ اپنے عہدے کی معیاد پوری نہ کر سکے- ان سے قبل ہندوستان کے دو وائسرائے اپنی معیاد پوری نہ کر سکے تھے- لارڈ میو کو انڈیمان میں ایک مسلمان شیر علی نے قتل کر دیا اور دوسرے اپنی صحت کی بناء پر مستعفی ہو گئے- ہندو نواز حلقوں کے طرف سے لارڈ ڈیول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی حکومت کانگرس کے حوالے کرنے کے خلاف تھے جس کے سبب کانگرس نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں اور برطانیہ کی حکمران لیبر پارٹی جس کا جھکاؤ کانگرس کی طرف تھا وہ ہندوستان کو

متحد رکھنے کی شدت سے حامی تھی- ویول کا خیال تھا کہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف ہندو کانگرس نے معاندانہ طرز عمل اختیار کیا ہے اور جس طرح عبوری حکومت پر مکمل قبضہ کر کے مسلم لیگ کو شریک اقتدار کرنے سے انحراف کر رہی ہے اس کے سبب ہندوستان کا اتحاد ناممکن ہو گا- کانگرس کو لارڈ ویول کی یہ اصول پسندی (کہ مسلم لیگ بھی عبوری حکومت میں شامل ہو) کچھ زیادہ پسند نہ تھی- برطانوی کابینہ میں چند وزراء اور خود وزیراعظم ایٹلی کا جھکاؤ کانگرس کی طرف تھا اس کے سبب اسے اس عہدہ سے پانچ برس کی مدت پوری کرنے سے قبل ہی فارغ کر دیا گیا- خود اس کے اپنے الفاظ میں "برطرف" کر دیا گیا-

وائسرائے مقرر ہونے سے قبل دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے فوجی کمانڈر کے اہم منصب پر کام کیا تھا- لارڈ ویول نے بطور وائسرائے تقرری کے بعد اپنی ملاقاتوں اور ان میں ہونے والی گفتگو کا روزنامچہ تحریر کیا تھا- اس روزنامچے کا مطالعہ برصغیر کی سیاست کو سمجھنے کے لئے انتہائی ضروری ہے- اس کے علاوہ اس روزنامچے میں ہر ملاقاتی کے بارے میں اس نے بڑی بے باکی سے تجزیہ کیا ہے- یہاں تک کہ 1946ء میں کیبنٹ مشن کے ارکان کے رویہ اور کردار پر بھی نکتہ چینی کی ہے- اگرچہ لارڈ ویول کی تقرری کا حکم نامہ وزیراعظم ونسٹن چرچل نے بہت پہلے جاری کر دیا تھا لیکن برطانوی وزارت خارجہ' وزارت امور ہند' دیگر وزراء اور وزیراعظم چرچل سے ملاقاتوں اور ہدایات کے لئے اسے پانچ چھ ماہ تک برطانیہ میں رکنا پڑا- اس کا کہنا ہے کہ اسے اس تقرری کے بارے میں قطعاً علم نہیں تھا بلکہ وزیراعظم کے عمومی رویہ کے پیش نظر اسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ اسے کیوں کر وائسرائے مقرر کیا گیا ہے- لارڈ ویول نے تقرری کے بعد ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ونسٹن چرچل نے اس کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا- میری تقرری کے احکامات کے بعد ہو سکتا ہے کہ ونسٹن چرچل کو اس بات کا افسوس ہو کہ اس نے کیوں میری تقرری کی- دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانوی انتخابات میں ناکامی پر چرچل کو ویول نے جو خط لکھا اس میں چرچل کی تعریف کے بعد اپنے روزنامچے میں پھر اس نے اس بات کو دہرایا کہ شاید چرچل کو میری تقرری کا افسوس ہو- روزنامچے میں جس بے باکی سے لارڈ ویول نے مختلف معاملات کے بارے میں فوجی انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے 3 جولائی 1943ء کو برطانوی کابینہ کے اجلاس میں فلسطین کے مسئلے پر بحث کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "مجھے معلوم تھا کہ ونسٹن چرچل مصدقہ طور پر صیہونی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کابینہ میں کس حد تک یہودیوں کی حمایت میں جائے گا- کابینہ کے اجلاس میں کوئی بھی عربوں کے حق میں کچھ کہنے کو تیار نہیں تھا- بالآخر مجھے کہنا پڑا کہ اعلان بالفور کے دوسرے حصہ میں عربوں سے کئے گئے مواعید کے بارے میں کسی کو کچھ بھی یاد نہیں- ہر ایک نے یہودیوں کی حفاظت

کا ذکر کیا ہے لیکن اگر عربوں اور یہودیوں میں جنگ ہوئی اور بیرونی مداخلت نہ ہوئی تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہودی کامیاب ہوں گے۔ اس لئے درحقیقت یہ عرب ہیں جن کی حفاظت کی ضرورت ہے نہ کہ یہودیوں کی۔ وزیراعظم نے عربوں کی خاطر کی جانے والی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے بہت کچھ یہودیوں کے لئے کیا ہے اور پانچ لاکھ یہودیوں کو اس علاقے میں بھیجا ہے۔ جہاں کے لوگ نہیں چاہتے کہ وہ وہاں آکر آباد ہوں۔ وزیراعظم نے کہا عربوں نے جنگ میں ہماری مدد کے لئے کچھ نہیں کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن سعود کی دوستی ہمارے لئے انمول تھی۔ اس کی دشمنی سے ہمیں بہت نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پھر یہودیوں کی نسل نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔"

اسی طرح اس نے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں چرچل کے خیالات کا ذکر بھی کیا۔ وہ لکھتا ہے (صفحہ 23)

"میں جس قدر زیادہ سیاست دانوں سے ملتا ہوں میرے دل میں ان کی عزت میں اتنی ہی کمی ہوتی جاتی ہے..... میرا خیال ہے کہ وہ (چرچل) اس مسئلے (ہندوستان کی آزادی) کے بارے میں اپنی قدامت پسند پارٹی میں پھوٹ پڑنے سے خوف زدہ ہے اور ہندوستان میں نئے سرے سے کوئی قدم بڑھانے سے پارلیمنٹ میں متوقع جھگڑے سے بھی ڈرتا ہے اس لئے وہ جس وقت تک اقتدار میں ہے وہ اسے روکے رکھنا چاہتا ہے..... بہ حیثیت مجموعی مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ مسئلہ اٹھا کر درست کام کیا تھا۔ لیکن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہندوستان کے مسئلے پر کوئی بھی قدم بڑھانے کے معاملے میں مخلص نہیں اور یہ کہ ان میں سے بہت کم لوگوں میں دور اندیشی یا سیاسی جرأت مندی ہے۔"

جس زمانے میں لارڈ ویول کو وائسرائے مقرر کیا گیا دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ بنگال شدید قسم کے قحط کی لپیٹ میں تھا، گاندھی اور کانگرس نے انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے اثرات باقی تھے اور گاندھی زیر حراست تھا۔ دوسری جانب مسلمانوں کی جانب سے پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ان مسائل کے حل کے لئے اسے تمام سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور سرکاری افسروں سے باقاعدگی سے رابطہ کرنا پڑتا تھا جیسا کہ اس کے روزنامچے سے عیاں ہے۔ اس نے ہر ملاقاتی کے بارے میں اپنی رائے اور ان کی جانب سے دیئے جانے والے مشوروں پر تبصرہ اپنے روزنامچے میں تحریر کیا ہے۔ یہاں ہم اس کی سیاسی لیڈروں کے بارے میں رائے کے علاوہ برطانوی کابینہ کے وفد کے ارکان کی سوچ کے بارے میں خیالات کا ذکر کریں گے تاکہ قارئین کو انگریز حکومت کے میلان طبع کا اندازہ ہو سکے اور ہندوؤں اور ان کے ایجنٹوں کے اس الزام کی تردید ہو سکے کہ پاکستان انگریز نے بنایا تھا یا یہ کہ

قائداعظم نے انگریز کے ایماء پر پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ وائسرائے جرنل جو لارڈ ویول کی یادداشتوں کی ڈائری ہے انگریز حکمرانوں کی سوچ، ہندو کانگرس اور اس کے نام نہاد سیکولر اور عدم تشدد کے پجاریوں کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس سے انگریزی اور ہندو ذہن کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

ویول قائداعظم کے بارے میں ہمیشہ شاکی رہا۔ ویول نے جنگ کے خاتمے کے بعد 9 ماہ کی کوشش کے بعد برطانوی حکومت کو راضی کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دینے یا آزادی دینے کے سلسلے میں سیاسی مذاکرات کا سلسلہ شروع کرے لیکن برطانوی حکومت ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ ویول کو مارچ 1945ء کے آخری ہفتہ میں لندن طلب کیا گیا۔ نئے وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان سے ملاقات کے بعد وہ براستہ قاہرہ سعودی عرب کے شاہ سے ملاقات (3 اور 4 جون) کے بعد برصغیر واپس آیا۔ واپسی پر اس نے 14 جون 1945ء کو بعض سیاسی اصلاحات کا اعلان کرتے ہوئے تجویز کیا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے مذاکرات کرے گا اور نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے لئے ان سے مشورہ کرے گا۔ نیز یہ کہ نو تشکیل شدہ کونسل جو موجودہ آئین کے تحت کام کرے گی اس میں ماسوائے وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے تمام محکمے ہندوستان کے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ پہلی مرتبہ وزارت داخلہ، فنانس اور خارجہ کے محکمے ہندوستان کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ مذاکرات کے لئے خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لئے 1942ء میں کانگرس کی توڑ پھوڑ کی تحریک میں گرفتار ہونے والے کانگرس کی مجلس عاملہ کے ارکان کی رہائی کا اعلان بھی کیا گیا۔ وائسرائے اس کام کے لئے برطانوی حکومت کو آمادہ کرنے کو اپنی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا تھا۔ سیاسی لیڈروں سے ملاقاتوں کے لئے وہ جون کے آخری ہفتہ میں شملہ پہنچ گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس کی سب سے پہلے ملاقات 23 جون کو خضر حیات ٹوانہ سے ہوئی۔ (دیکھئے وائسرائے جرنل صفحہ 144) بقول وائسرائے "حکومت کے اس اعلان سے خضر حیات بہت پریشان تھا۔ اس نے پنجاب کی (برطانیہ سے) وفاؤں کا ذکر کیا اور کہا کہ 1919ء سے لے کر آج تک پنجاب سے ایک مسلمان وائسرائے کونسل میں شامل رہا ہے اور یہ کہ میری طرف سے کانگرس اور مسلم لیگ کو دعوت دینا ان تمام تعاون کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا میں اقتدار دشمن کے حوالہ کر رہا ہوں اور یہ کہ میرا ویٹو کا اختیار مردہ گوشت کی طرح ہو گا۔ اس نے ہر طرف بدامنی اور تباہی کی پیش گوئی کی، لیکن اس کے پاس مسئلے کا کوئی متبادل حل بھی نہ تھا جس طرح میرے دوسرے معترضین کے پاس کوئی حل نہیں۔ ایک نہ ایک دن اس مسئلہ کا سامنا کرنا ہو گا۔ خاموش رہنا اور کچھ نہ کرنا اس کا حل نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خضر حیات دل سے یہ چاہتا ہے کہ حکومت برطانیہ ہندوستان پر دیر تک قابض رہے۔ اس کی تجویز تھی کہ کانفرنس عبوری حکومت

کی بجائے طویل مدت کے لئے حل تلاش کرے۔"

اس سے اگلے روز یعنی 24 جون کو لارڈ ویول نے آزاد (ابوالکلام) گاندھی اور جناح (قائداعظمؒ) سے ملاقاتیں کیں۔ گاندھی نے بڑی طویل اور گول مول بات کی جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ گاندھی کے بارے میں اس کے تاثرات بڑے معنی خیز ہیں۔ ویول کے الفاظ میں "میرا عمومی تصور اس کے (گاندھی) بارے میں یہ ہے کہ وہ بہ بظاہر وقتی طور پر بہت دوستانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ لیکن وہ کسی بھی مرحلہ پر اس سب سے منکر ہو سکتا ہے جو اس نے کہا ہے۔" گاندھی کے بعد ویول نے ڈیڑھ گھنٹہ تک قائداعظمؒ سے ملاقات کی۔ ان کے بارے میں اس نے لکھا "اس کا انداز مقابلتاً سیدھا اور صاف تھا لیکن اس کا طرز عمل بہت برا تھا۔ جناح نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ بھی کیا جائے گا اس میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔ میں نے کہا کہ آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ اقلیتی فرقے کے لوگ آپ کے خلاف ووٹ دیں گے۔ پھر یہ کہ وائسرائے کا ویٹو کا اختیار بھی موجود ہوگا۔ اس نے کہا کہ اقلیتیں مثلاً سکھ اور شیڈول کاسٹ بھی ہندوؤں کے حق میں ووٹ دیں گے اور وائسرائے کے لئے ویٹو استعمال کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں اس سے متفق نہیں۔ اس پر اس نے (قائداعظمؒ) کہا کہ اگر کسی مسئلہ پر مسلمانوں کی اکثریت کسی بات کی مخالف ہو تو اس پر وونٹگ نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے کہا یہ ناقابل قبول ہے اور حکومت کے اصول کے خلاف ہے..... اس کے بعد اس نے ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی نامزدگی کا ذکر چھیڑ دیا اور دعویٰ کیا کہ تمام مسلمان ارکان کی نامزدگی کا اختیار مسلم لیگ کو ہوگا۔ میں نے کہا میں اس تجوزی کو بھی نہیں مان سکتا۔ پھر اس نے ضمنی انتخابات کی طویل تاریخ کا ذکر چھیڑ دیا کہ سارے ہندوستان میں پچھلے دو برس میں جتنے بھی ضمنی انتخابات ہوئے اس میں مسلم لیگ کامیاب رہی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ میں شاید کانگرس کی مرضی سے مسلمان ممبر نامزد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میرے ذہن میں یونینسٹ پارٹی سے مسلمانوں کی نامزدگی کا مسئلہ ہے=اس پر لمبی گفتگو ہوئی اور اس نے کہا یونینسٹ پارٹی مسلمانوں کے مفادات سے غداری کر رہی ہے...... میں نے صرف یہ کہا کہ میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ ایگزیکٹو کونسل کے تمام مسلمان ارکان کی نامزدگی کا اختیار مسلم لیگ کا ہوگا۔"

شملہ کانفرنس کا باقاعدہ اجلاس 25 جون 1945ء کو شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں کے علاوہ مرکزی اسمبلی میں یورپین ارکان بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً سبھی صوبوں کے وزیراعظم (بعض سابق بھی) اس میں مدعو تھے۔ کانفرنس میں شامل ارکان کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے ویول نے لکھا کہ مجموعی حیثیت سے پہلا اجلاس ٹھیک ہی رہا۔ البتہ جناح نے قدرے "مشکل" ہونے کی کوشش کی۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ جناح ایک اعلیٰ قانونی ذہن رکھتا

ہے۔ راج گوپال اچاریہ بھی اس جیسا ہے۔ کانگرس کے کھیرے اور مسلم لیگ کے سعد اللہ بہت اچھے تھے، لیکن یہ درجہ دوم میں شمار ہو سکتے ہیں۔ باقی لوگ "گھٹیا مال" ہیں، لیکن بعد میں اپنے روزنامچے میں ویول نے بعض ایسے لوگوں کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کی جنہیں وہ پہلے اچھا سمجھتے تھے۔ کانفرنس کے خاتمے پر قائداعظمؒ نے لارڈ ویول سے تقریباً پونے دو گھنٹے ملاقات کی۔ ویول نے ان سے کہا کہ مجھے آپ کی مشکلات کا احساس ہے لیکن مجھے پارٹیوں کے علاوہ صوبوں کا بھی خیال رکھنا ہے اور یہ کہ وہ پنجاب کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ قائداعظمؒ نے اسے بتایا کہ پنجاب کے مسلمان یونینسٹ بھی مسلم لیگ کی حمایت کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے اس موقع پر ویول کو تجویز کیا کہ ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد 14 ہو جس میں پانچ مسلم لیگ، پانچ کانگریس، ایک شیڈولڈ کاسٹ اور ایک سکھ شامل ہو باقی دو رکن خود وائسرائے اور کمانڈرانچیف ہوں۔ اس طرح تشکیل شدہ کونسل میں مسلمانوں کو انصاف مل سکے گا ورنہ نہیں، لیکن وائسرائے نے قائداعظمؒ کا یہ مطالبہ کہ تمام ارکان مسلم لیگی ہوں اور انہیں نامزد کرنے کا اختیار مسلم لیگ کو ہو ماننے سے انکار کر دیا۔"

29 جون تک کانفرنس میں واضح ہو گیا تھا کہ دونوں بڑی جماعتوں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ چنانچہ وائسرائے نے اپنا فارمولا متعارف کرایا اور تمام جماعتوں سے کہا کہ وہ کونسل کے ممبران کے لئے اپنی اپنی فہرستیں اسے دیں۔ قائداعظمؒ اور شیڈولڈ کاسٹ نمائندہ سیوا راج نے کہا کہ وہ اپنی جماعتوں کی مجالس عاملہ سے مشورہ کئے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔ ویول کے الفاظ میں "جناح نے بہت بحث کی اور بڑا مشکل ثابت ہوا۔ وکیلوں کی طرح مجھے کونے میں لگانے (کارنر کرنے) کی کوشش کی اور کوئی سیدھا جواب نہیں دیا۔ آخر کار مجھے کہنا پڑا کہ میں مناظرہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی بحث میں پڑنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ آپ مجھے فہرست دینا چاہتے ہیں یا نہیں جس پر انہوں نے کہا کہ تجویز مجھے تحریراً بھیجی جائے جو میں نے بھجوا دی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا وہ اس کانفرنس کو ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا طرز عمل سخت تر ہوتا جا رہا ہے۔" 14 جولائی کو کانفرنس کا آخری اجلاس ہوا۔ اس میں راج گوپال اچاریہ نے زور دیا کہ مسلم لیگ کے بغیر ہی کونسل بنالی جائے۔ قائداعظمؒ نے اس موقع پر مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بیان کیا اور قیام پاکستان کے مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے کانگرس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ ویول نے روزنامچے میں لکھا کہ "ایک موقع پر یوں لگا کہ جناح پوری کونسل میں دیگر ارکان کے مساوی ارکان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر فی الواقع اس کا یہی مدعا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا کسی مرحلہ پر میری پیشکش قبول کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ جاننا مشکل ہے کہ وہ شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے کیوں آیا۔ یہ ممکن ہے کہ دوران مذاکرات اس کے طرز عمل میں سختی آئی ہو۔" آگے چل کر اس نے اپنے تاثرات اس طرح

بیان کئے ہیں۔

"پارٹیوں کے درمیان افہام و تفہیم کو بہتر بنانے کے لئے میری کوشش ناکام ہو گئی ہے اور یہ پتہ چل گیا ہے کہ (اختلاف کی) ان کے درمیان خلیج کس قدر وسیع ہے۔ اس کوشش سے میں نے کوئی اچھا کام انجام دیا ہے یا اس سے نقصان ہوا ہے یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ملک کے اندر اور باہر کانگرس کی شہرت بڑھی ہے جبکہ جناح کا گراف نیچے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کانگرس یہ دعوٰی کرے گی کہ وہ معقولیت پر تھی، لیکن حقیقت میں ان کی فہرست سے کونسل پر ان کو مکمل برتری ہو گی اور مجھے اس میں شک ہے کہ وہ میری عبوری حکومت کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جناح نے بہت بڑی غلط حکمت عملی اختیار کی اور معاملے کو مسئلہ بنا کر پیش نہیں کیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا آیا اس طرح مسلمانوں میں اس کی پوزیشن مضبوط ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی پوزیشن مضبوط ہو گی، لیکن کانگرس کی کوشش یہ ہو گی کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ سے الگ کر کے جیتنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرے گی اور اگر انتخابات ہوئے تو بڑی تلخی کے ساتھ لڑے جائیں گے۔"

کانگرس اور خود وائسرائے کی طرف سے اس کانفرنس کی ناکامی کا سبب قائداعظمؒ کی ضد، ہٹ دھرمی اور غیر مصالحانہ رویہ بتایا گیا لیکن کانفرنس کی ناکامی کی اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ اصل سبب مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں، کانگرس کی جانب سے مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوٰی اور وائسرائے کا اصرار کہ وہ پنجاب سے اپنی مرضی کے مطابق مسلمان نمائندے کونسل میں نامزد کرے گا تاکہ انگریزوں کے ازلی جوتے چاٹنے والوں کی تشفی ہو سکے اس کانفرنس کی ناکامی کی وجہ تھی۔ اگر قائداعظمؒ کانگرس یا وائسرائے کا یہ استدلال مان لیتے پھر ان کی اصابت رائے مشکوک ہو جاتی اور مخالفین وہ طوفان سر پر اٹھاتے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کرنے کے لئے وائسرائے سے انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ 1945ء کے اواخر میں مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کی سو فیصد کامیابی اور اوائل 1946ء میں سارے ہندوستان کے صوبوں میں تقریباً نوے (90) فیصد نشستوں پر کامیابی نے قائداعظمؒ کے دعوے کو سچ کر دکھایا۔ کانگرس نے زر خرید مسلمانوں کو کامیاب بنانے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہایا مگر کامیاب نہ ہوئی۔ کم و بیش بیس نام نہاد سیاسی جماعتوں نے کانگرس کی مدد سے مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ یہاں ہم وائسرائے جنرل کے مرتب پینڈرل مون کے الفاظ دہراتے ہیں۔

" The root course of the failure was a course Jinnah's intransigence and obstinacy, but Wavell recognized that this

intransigence represents a real fear on the part of the Muslims including those who do not support Jinnah' of Congress domination which they regard as equivalent to a Hindu raj."

کتنا عجیب طرز استدلال ہے ایک جانب تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے جو خوف ہے وہ حقیقی ہے اور دوسری جانب وہ قائداعظمؒ سے توقع رکھتے ہیں کہ ایسی شرائط مان لیں جو مسلمانوں کے مفاد میں نہیں تاکہ کانفرنس ناکام ہو۔ اس لئے ناکامی کا سبب قائداعظمؒ نہیں بلکہ ہندو اور انگریز ہے جو مسلمانوں کا حقیقی خوف دور کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

انتخابات کے بعد جب مرکز اور صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو کانگرس نے مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے 90 فیصد کے قریب مسلم نشستیں جیت لی تھیں لیکن انگریز گورنر نے اکثریتی پارٹی (مسلم لیگ) کو وزارت سازی کی دعوت دینے کی بجائے آٹھ یا نو مسلم یونینسٹوں کے سربراہ خضر حیات ٹوانہ کو وزارت سازی کی دعوت دی۔ خضر حیات جس نے ویول کے سامنے کانگرس اور مسلم لیگ (وائسرائے جرنل) دونوں سے بیزاری کا اظہار کیا تھا کانگرسی ہندوؤں اور اکالی سکھوں سے مل کر صوبائی وزارت بنائی۔ کانگرس نے اس مقصد کے لئے اوائل مارچ 1946ء کو اپنے صدر ابوالکلام کو اس کام پر مامور کیا کہ مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر رکھنے کی "ہر قیمت" پر کوشش کی جائے۔ (ابوالکلام آزاد لاہور آئے اور فلیٹیز ہوٹل میں کئی دن جوڑ توڑ میں مصروف رہے) اس بات نے ثابت کر دیا کہ انگریز گورنر اس سازش میں شریک تھا اور دوسرے یہ کہ ویول سے قائداعظمؒ نے جو یہ کہا تھا کہ غیر مسلم اقلیتوں کے ووٹ بھی کانگرس کو جائیں گے حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔

جب مرکز میں حکومت کے قیام اور نئے دستور بنانے کا مرحلہ آیا تو کانگرس نے حیلے بہانے سے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شمولیت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی اس کوشش میں برطانوی کابینہ کے مشن (وزارتی مشن) نے جو ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں "پلان" تیار کیا اور جو راز و نیاز کانگرس کے ساتھ ہوتے رہے وائسرائے ویول نے اپنے روزنامچے میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ویول نے وزارتی مشن کی ہندوستان آمد کی خبر سننے کے بعد 12 فروری 1946ء کو لکھا "سیکرٹری آف سٹیٹ نے مجھے ان وزراء کے نام بتائے ہیں جو یہاں آئیں گے۔ ان میں کرپس، الیگزینڈر اور وہ خود شامل ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ ان میں کرپس ہی قوت متحرکہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کانگرس کے ہاتھ بکا ہوا ہے اور ان کے نکتہ نظر کا ہمنوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے طریق کار میں راست بازی بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ تینوں "دانایان مشرق" کامیاب ہو سکیں گے۔ ابھی تک مجھے ہز مجیسٹی حکومت سے بھی پالیسی کے بارے میں ہدایات

موصول نہیں ہوئیں۔" بعدازاں ویول کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

آگے چل کر 13 اپریل 1946ء کو اس نے وزارتی مشن کی کانگرسی لیڈروں سے مرعوبیت کا ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے "مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ میں مشن کے ارکان کے گاندھی سے حد سے بڑھتے ہوئے احترام کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ گاندھی نے (دوران ملاقات) پانی کا گلاس طلب کیا۔ جس پر سیکرٹری کی سطح کے ایک شخص سے پانی لانے کو کہا گیا جبکہ یہ کام چپراسی بھی کر سکتا تھا۔ پھر جب وہ فوری پانی نہ لایا تو کرپس خود اٹھ کر باہر گیا کہ اب تک پانی کیوں نہیں آیا۔ وقار کے منافی ہونے کے علاوہ ایسی باتیں کسی طرح سود مند نہیں ہوتیں۔ اس طرح وائسرائے اور اس کے اہلکاروں میں ایک ناخوشگوار روایت قائم ہو سکتی ہے۔ گاندھی غیر معمولی شخصیت والا معمر شخص ہے۔ وہ دور حاضر کے ہمعصروں کے (زاغلول اور ڈی ویلرا جنہوں نے برطانوی سلطنت کا کچھ حصہ الگ کرنے میں کامیابی حاصل کی) مقابلہ میں زیادہ خوفناک ہے۔ یہ بہت سخت جان سیاست دان ہے اور درویش یا روحانی ہرگز نہیں۔"

مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت کو روکنے کے ضمن میں اور گاندھی کے نام نہاد عدم تشدد کے بارے میں منافقت کا ذکر کرتے ہوئے 26 ستمبر کو لکھا "کوئی پیش رفت نہیں ہوئی (نہرو اور گاندھی سے ملاقات میں) یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ وہ جناح اور مسلم لیگ کی شمولیت نہیں چاہتے۔ (وہ عبوری حکومت کی طرف اشارہ کر رہا تھا) گاندھی نے تو اس موقع پر کانگرس کی مکمل تسلط حاصل کرنے کی پالیسی کا پہلے سے زیادہ عریاں انداز میں پول کھول دیا۔ میں جتنا اس بوڑھے سے ملتا ہوں میں سمجھنے لگ گیا ہوں کہ یہ بوڑھا بے ایمان بگلا بھگت ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کو پس پشت ڈال کر خون ریزی سے گریز نہیں کرے گا لیکن ایسا کرتے وقت فریب کاری سے کام لیتے ہوئے جھوٹی نرمی اور دوستی کا اظہار کرے گا۔"

وزارتی مشن کے تین میں سے دو ارکان (وزراء) سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ کرپس کے طرز عمل کی شکایت کرتے ہوئے جس کے سبب مذاکرات میں دشواری پیش آ رہی تھی، وائسرائے نے یکم جون 1946ء کو اپنی ڈائری میں لکھا "مجھے پوری طرح یقین ہے کہ سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس اور کرپس نے کسی نہ کسی انداز سے کانگرس کو کوئی یقین دہانی کرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمیں ان مشکلات کا سامنا ہے۔" یہ اقتباس اور دوسرے بہت سے تاثرات جو وائسرائے جرنل میں جگہ جگہ ملتے ہیں اس بات کا مستند ثبوت ہیں کہ برطانوی حکومت اور کابینہ کے بااثر ارکان کی تمام تر ہمدردیاں مسلم لیگ کی مخالف آل انڈیا کانگرس کے ساتھ تھیں جو کسی قیمت پر قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔ وائسرائے ویول جس کے ذمہ ہندوستان کا نظم و نسق چلانا تھا اس کا طرز عمل زیادہ تر ایک انتظامیہ کے عہدیدار جیسا تھا۔ وہ اگرچہ

اپنے ملک کی پولیٹکل اتھارٹی کی ہدایت پر عمل درآمد کو پیش نظر رکھتا تھا لیکن ہندوستان میں اس کی کوشش یہی نظر آتی ہے کہ وہ تمام مقامی سیاسی جماعتوں کے ساتھ یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرے۔اس لئے وہ اپنے روزنامچے میں ہرایک شخص اور ہرایک جماعت پر تنقید کرتا نظر آتا ہے۔

اسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ پرامن طریق سے ہندوستان کی حکومت مقامی لوگوں کے ہاتھ دے کر باعزت طریق سے انگریز اپنے وطن کو لوٹ جائیں۔ اس لئے اسے پاکستان قائم کرنے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ 2 جون 1946ء کو کانگرس اور مسلم لیگ کے ساتھ برطانوی وزارتی مشن کے مذاکرات میں تعطل یا ان کے منقطع ہونے کے بارے میں وہ لکھتا ہے "ہماری جانب سے دی گئی تجاویز پر مذاکرات کا سلسلہ ٹوٹ جانے اور ہماری طرف سے امکانی اقدام پر میں نے دوبارہ غور کیا ہے لیکن میں کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ جب تک یہ پتہ نہ ہو کہ یہ بحران کس طرح پیدا ہوا کوئی لائحہ عمل تجویز کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ تعطل مسلم لیگ کی جانب سے عبوری حکومت میں شرکت یا دستور ساز اسمبلی سے انکار کے سبب پیدا ہوا یا انہوں نے ناممکن نوعیت کی شرائط پیش کیں تو کانگرس ہم سے توقع رکھے گی کہ ہم ان کے بغیر (مسلم لیگ کے بغیر) قدم اٹھائیں۔ اگر ہم ان کی توقع پوری نہیں کرتے تو وہ ہم پر الزام دیں گے کہ ہم قابل اعتبار نہیں۔ اس صورت میں ہمیں کوئی بحران کی توقع کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ تمام لیڈروں کو اکٹھے بلائیں اور آخری کوشش کریں کہ وہ عقل کے ناخن لیں۔ ہمیں مسلم لیگ کو بتا دینا چاہئے کہ ہم نے ان کی ضد کے باوجود ہندوستان کو آزاد کرنا ہے اور جب ہم نہیں چاہتے ہم کانگرس کی مدد کریں کہ وہ ہندو تسلط قائم کرے (حالانکہ مشن کے ارکان اس کام میں مصروف تھے اور خود وائسرائے کے مطابق برطانوی حکومت بھی کانگرس کی ہمنوا تھی) اسی طرح ہمارا یہ ارادہ بھی نہیں کہ ہم مسلم لیگ کے مکمل پاکستان کو اس کے حوالے کرنے میں مدد کریں....."

برطانوی حکومت کی کانگرس کے حق میں پالیسی کو موضوع بحث بناتے ہوئے ویول نے 29 جولائی کو اپنے روزنامچے میں لکھا "آج صبح وزیراعظم کا خط ملا ہے جس میں زور دے کر کہا گیا ہے کہ میں موریس گوائر کو سیاسی مشیر مقرر کروں۔ ظاہراً اسے بتا دیا گیا ہے کہ میں سرکاری معاملات میں صرف آئی سی ایس ملازمین سے مشاورت کرتا ہوں اور اس وجہ سے میرے فیصلے زیادہ تر کانگرس کے حق میں نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے میری اصابت رائے ہز مجسٹی گورنمنٹ سے بہتر ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں بلکہ میں اسے (موریس کو) کہوں گا کہ اگر ہز میجسٹی گورنمنٹ کو میرا کام پسند نہیں تو یہ ان کا فرض ہے کہ کوئی اور وائسرائے تلاش کریں میں برائے نام سربراہ رہنے کو تیار نہیں....."

پنجاب ہی میں نہیں بلکہ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبے بنگال میں بھی مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنے میں وزارتی مشن کے ارکان بڑے سرگرم تھے۔ وزارتی مشن کو زونل سکیم کے مطابق آسام اور بنگال زون "سی" میں شامل تھے۔ ان دونوں صوبوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کے ارکان کی متوقع تعداد تقریباً برابر تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں 36 مسلمان اور 34 غیر مسلم تھے۔ اس وجہ سے یورپین ارکان کے ووٹوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ یورپین ارکان ووٹ دیں جبکہ کانگرس اس کے خلاف تھی۔ ویسے یورپین ارکان ووٹ دینے سے گھبراتے تھے لیکن انکار اس سبب سے نہیں کر رہے تھے کہ کہیں زونل سکیم ماننے سے مسلم لیگ منحرف نہ ہو جائے۔ اس موقع پر (23 مئی 1946ء) ویول نے لکھا "سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس بنگال میں یورپین ووٹوں کے مسئلہ پر بہت پریشان تھے جو ان کے خیال میں بڑا پیچیدہ معاملہ تھا۔ مجھے اس بات کا شبہ ہے کہ اسی نے اور کرپس نے گاندھی سے حد سے بڑھ کر عہد و پیمان کر لیا ہے اور جس کا وہ اقرار بھی کرتے ہیں۔" اس سے اگلے روز کے روزنامچے یعنی 24 مئی میں اس نے لکھا "میرے ذہن میں یہ باور کرنے میں معمولی شبہ تک نہیں کہ سیکرٹری آف سٹیٹ اور کرپس نے حقیقتاً بہت گہری حد تک گاندھی کو اپنی گفتگو میں یورپین حضرات (کی حمایت) کے بارے میں یقین دہانی کرا دی۔" اس یقین کا پس منظر یہ تھا کہ ان دونوں حضرات نے گاندھی کے ساتھ جو سات گھنٹے صرف کئے تھے اس عرصے میں انہوں نے گاندھی کو تسلی کرا دی تھی کہ یورپین ارکان کانگرس کا ساتھ دیں گے۔ اسی وجہ سے کانگرس نے ان کے ووٹ دینے کی مخالفت ترک کر دی تھی۔

برطانوی حکومت میں شامل وزراء کی کانگرسی لیڈروں سے ذاتی دوستی اور برطانوی حکومت کی جانب سے کانگرس کی حمایت کے ضمن میں کئی جگہوں پر اپنے تاثرات لارڈ ویول نے رقم کئے ہیں بلکہ وزارتی مشن اور زونل سکیم کی ناکامی کا سبب ان وزراء اور برطانوی حکومت کو ٹھہرایا ہے۔ کرپس کے نہرو سے تعلقات کے بارے میں اس نے لکھا (21 نومبر 1946ء) لیڈی کرپس نے چین سے تار دیا کہ برطانیہ جاتے ہوئے وہ دہلی ٹھہرے گی اور ہمارے پاس ٹھہرنے کے بجائے نہرو کے ہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کرپس جس کھلم کھلا طریق سے اپنے رجحان کا اشتہار دیتا ہے اس سے میرے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔" اس سے اگلے روز 22 نومبر 1946ء کو ویول نے نہرو اور جناح کی جانب سے ویول کے طرز عمل پر نکتہ چینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "اس کا مطلب ہے کہ میں درمیانی راستہ پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جو تھیوری کے طور پر دو متحارب فریقوں میں اختیار کرنا درست نہیں تھا لیکن دکھائی یہ دیتا ہے کہ درمیانی راستہ اختیار کر کے کامیابی کی امید بہت کم یا بالکل ہی نہیں خاص طور پر اس صورت میں جب ہز مجیسٹی کی حکومت اس کھلے طریقے سے کانگرس کے ساتھ ہے۔"

وزارتی مشن کی زونل سکیم کو مسلم لیگ نے طوعاً و کرہاً تسلیم کیا تھا، لیکن قائداعظمؒ نے بار بار یہ کہا کہ کانگرس نے دل سے اسے تسلیم نہیں کیا۔ آخر کار مسلم لیگ کو بھی اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا اور ویول کانگرس کی چالاکی کو بے نقاب کر دیا۔ ویول کے روزنامچے کے مرتب پنڈرل مون نے اس کا پس منظر یوں بیان کیا ہے "29 جولائی 1946ء کو مسلم لیگ کی کونسل نے ممبئی میں اپنے اجلاس میں مئی کے مہینہ میں وزارتی مشن کی جانب سے دی گئی تجاویز کی منظوری کے فیصلے کو واپس لے لیا اور پاکستان کے حصول کے لئے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ بنیادی طور پر مسلم لیگ پنڈت نہرو کے تند و تیز بیانات کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ نہرو نے کھلم کھلا کہا تھا کہ کانگرس صرف اس وجہ سے تجویز سے متفق ہوئی تھی کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں جائے گی۔ اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا اور یہ کہ ان کے خیال میں کوئی گروپنگ نہیں ہوگی (حالانکہ مسلم لیگ گروپنگ کو بہت اہمیت دے رہی تھی) اور جو وزارتی مشن نے سوچا یا جس پر وہ عمل کرنا چاہتا ہے وہ اس کی خاطر شامل نہیں ہوئے تھے۔ جناح نے اس سارے عرصے میں مسلسل یہ کہا کہ کانگرس نے وزارتی مشن کی تجویز دیانتداری سے قبول نہیں کی۔ نہرو کے بیان سے جناح اور مسلم لیگ کے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔

انہوں نے (مسلم لیگ نے) اعلان کیا کہ کانگرس نے اس تجویز کو درحقیقت تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ لیگ کی کونسل نے اس بات کی شکایت کی کہ وائسرائے اور وزارتی مشن نے عجیب و غریب اور بد دیانتی پر مبنی پیراگراف 8 کو 16 جون کے اعلان میں شامل کیا ہے۔" پنڈرل مون کے اس تفصیلی پس منظر کے بعد لارڈ ویول کی 29 جولائی کی یادداشت کے الفاظ بڑے بامعنی نظر آتے ہیں "مسلم لیگ آخر کار دوڑ لگا گئی۔"

اس کا سہرا مشن کے سر ہے کہ وہ جب سے یہاں آئے ہیں کانگرس کی جیب میں پڑے رہے۔ پھر کرپس کی بد دیانتی، میری حماقت اور کمزوری کہ میں اس کی بے ایمانی پہلے نہ بھانپ سکا اور اسے برداشت کرتا رہا اور سب سے آخر میں مشن کے جانے کے بعد نہرو کے غیر ذمہ دارانہ بیانات تھے۔ میں پیراگراف 8 کے سبب اپنے آپ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ میں نے اس تشریح کو ہمیشہ درست سمجھا جو ہم نے کی تھی، لیکن میں اس حد تک قصوروار ضرور ہوں کہ میں کرپس کی چالوں کا ادراک نہ کر سکا اور کانگرس کی جانب سے 16 مئی کی منافقانہ قبولیت کو رد نہ کر سکا۔ کرپس اور پیتھک لارنس نے جس بے ایمانی سے کانگرس کو بیان قبول کرنے پر اکسایا اسے نہ جان سکا۔ یہ ایک واحد اہم نقطہ تھا۔ جس پر سارے مذاکرات کے دوران الیگزینڈر (مشن کا تیسرا رکن) نے میرا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا۔ مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی جانب سے اس پس منظر میں زونل فارمولا تسلیم کرنے کا مطلب ماسوائے اتمام حجت کے اور کچھ نہ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بالآخر کانگرس کی منافقت

کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ متذکرہ بالا شہادتوں کے باوجود اگر کوئی اصرار کرتا ہے کہ مسلم لیگ یا قائداعظمؒ کا فیصلہ غلط تھا تو سوائے اس کی عقل کے ماتم کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے محققین بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم قیام پاکستان کے بارے میں مخلص نہیں تھے۔ جس کا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ زونل سکیم قائداعظم نے منظور کر لی تھی اور پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیا تھا لارڈ ویول اور اس کے روزنامچے کے مرتب پنڈرل مون نے یہ بات کھل کر کہی ہے کہ قائداعظم شروع سے ہی کہہ رہے تھے کہ کانگریس نے زونل فامولا دل سے تسلیم نہیں کیا۔

مضمون ختم کرنے سے قبل دو تین اقتباسات کا ترجمہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔

"وزارتی مشن کے قیام کے دوران اور بعدازاں عبوری حکومت بنانے کے ضمن میں لارڈ ویول نے اپنے تاثرات ایک "سمری" کی صورت میں قلمبند کیے۔ "مشن کی اپنے مقصد میں ناکامی اس تباہ کن کمزور طرز عمل کی وجہ سے تھی جو اس نے کانگرس کے حق میں اختیار کیا۔ مزید وجہ کرپس کا دوغلاپن تھا۔ جو روایتاً ان لوگوں نے قائم کی ان کے جانے کے بعد یہ میرے قبضہ اختیار سے باہر تھی کہ میں کوئی جوابی اقدام کر سکوں۔ کانگرس نے محسوس کیا کہ ہزمیجسٹی کی حکومت ان سے خوف زدہ ہے اور کبھی بھی ان کے سامنے کھڑی نہ رہ سکے گی..... دوسری جانب جناح اور مسلم لیگ نے یہ خیال کیا کہ انہیں "دریابرد" کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے انہیں بہت سے شکوک تھے۔ میں نے مشن کے آخری مرحلے میں سخت رویہ اختیار نہ کر کے اور کرپس کے ہاتھوں ڈبل کراس ہو کر بڑی بھاری قیمت ادا کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی بھی ضابطے کے مطابق اپنے آپ کو بے ایمانی کا مرتکب خیال نہیں کرتا تھا۔ اس نے محض اپنے آپ کو چالاک ثابت کرنے کی کوشش کی..... مجھے اس بات میں شبہ ہے کہ مخلوط حکومت زیادہ دیر چل سکے۔ بہت وقت پہلے ضائع ہو چکا ہے اور حالات بڑی سرعت سے بدل رہے ہیں۔

کانگرس ہندوستان میں برطانیہ کے ہوتے ہوئے ملک کا دستور بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ وہ اپنے آپ کو مضبوط بنانے میں لگی ہوئی ہے۔ مشن نے ہماری کمزور پوزیشن ظاہر کر دی ہے اور ہماری بھبکی (گیدڑ بھبکی) کسی کام کی نہیں رہی۔ ہندوستان میں اب ہمارا وقت مختصر ہے اور حالات کو قابو میں رکھنے کی ہماری قوت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت صرف ہماری ساکھ سابقہ قوت متحرکہ ہی رہ گئی ہے جس کی بناء پر ہم سودا بازی کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی اب زیادہ مدت نہیں چلے گی۔ میرا کام اب یہ ہو گا کہ محفوظ ترین اور باوقار طریقہ سے واپسی ممکن بناؤں۔"

متذکرہ اقتباس کے اہم نکات یہ ہیں کہ مشن کے طرز عمل سے مذاکرات میں ناکامی ہوئی۔ برطانوی حکومت کی کمزور پوزیشن سامنے آئی، کانگرس دلیر ہو گئی کیونکہ مشن کا طرز عمل کانگرس کے

حق میں تھا۔ مزید یہ کہ کانگرس انگریزوں کے جانے کے بعد دستور بنانا چاہتی تھی تاکہ مسلمان، مسلم لیگ اور قائداعظمؒ ان کے سامنے دم نہ مار سکیں۔ پھر عبوری حکومت میں ہوتے ہوئے کانگرس نے حکومت ذرائع کو اپنے استحکام کے لئے استعمال کرنا شروع کر رکھا تھا۔ متذکرہ سمری کا آخری پیرا مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں ہے۔ اس نے لکھا "مسلمانوں کے بارے میں مجھے افسوس ہے کہ ان میں ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ دیانتداری، دلیری اور وقار ہے۔ مگر وہ روپے کی طاقت کے سامنے، ہندوؤں کی اعلیٰ تعلیم اور کانگرس کی بے ایمانی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ ایک حد تک جناح نے اچھی طرح اپنے پتے استعمال کئے۔ وہ کسی طرح دبنے کو تیار نہ تھا۔"

وائسرائے ویول 22 مارچ 1947ء کو اپنے عہدہ کا چارج ماؤنٹ بیٹن کو دے کر برطانیہ چلا گیا۔ تین چار برس زندہ رہا۔ اسے قائداعظمؒ کی وفات کی خبر 15 اکتوبر 1948ء کو ملی (غالباً اس وقت وہ ساؤتھ افریقہ میں تھا) اس نے اپنے تاثرات ڈائری میں یوں رقم کئے۔ "میں نے جناح کو کبھی پسند نہیں کیا تھا، لیکن میرے دل میں اس کے لئے ایک بے دلانہ تعریف کا جذبہ موجود تھا۔ کانگرس اور اس کے لیڈروں پر اعتماد نہ کرنے میں وہ یقیناً حق بجانب تھا اور اس کا جواز بالکل درست تھا۔" یہ الفاظ ایسے شخص کے ہیں جو کانگرس کی عیاری اور ریشہ دوانیوں سے پوری طرح باخبر تھا۔ وہ لوگ جو قائداعظمؒ کی بصیرت پر شبہ کرتے ہیں نہ تو ان کا مقام و حیثیت وہ تھی اور نہ ہی ان کے ذرائع معلومات وہ تھے جو وائسرائے ویول کو حاصل تھے۔ اس لئے قائداعظمؒ کی عظمت کو تسلیم نہ کرنے والے سجدہ سہو ادا کریں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مہاتما گاندھی عدم تشدد (اہنسا یا اہمسا) پر یقین رکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر برابری کی سطح پر ہندوستان میں رہیں۔ گاندھی کے بارے میں وائسرائے لارڈ ویول کے خیالات کا ذکر مختصراً اوپر آ چکا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے عدم تشدد کے تصور کے بارے میں ویول کی یادداشتوں کے اقتباس پیش کریں گے جن سے اس کے اندر چھپی ہوئی خونخواری کے علاوہ مسلمانوں سے کسی نوعیت کی افہام و تفہیم نہ کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ ویول نے 27 اگست 1946ء کو نہرو اور گاندھی سے ملاقات میں زونل سکیم اور دستور ساز اسمبلی کے بارے میں کی جانے والی گفتگو کا اس طرح اندراج کیا "کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ نہرو جوش میں آ گیا۔ گاندھی نے کہا عدم تشدد (جس کا وہ پرچار کرتے تھے) کے باوجود اگر خون کی ندیاں (گاندھی نے لفظ "بلڈ باتھ" استعمال کیا تھا) بہانا ضروری ہیں تو ایسا کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ ان کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا ہے۔"

پینڈرل مون نے اس ضمن میں وضاحتی نوٹ میں لکھا ہے کہ لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ یہ کہتے وقت گاندھی نے زور زور سے میز پر ہاتھ مارے تھے اور اس نے کہا تھا کہ اگر ہندوستان اپنے خون

میں نہانا چاہتا ہے تو پھر یہی کیا جائے گا۔

اس سے اگلے روز گاندھی نے ویول کو بڑا سخت خط لکھا۔ ویول نے ڈائری میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے "صبح کے وقت مجھے گاندھی کا گالیاں بھرا انتقامی خط ملا۔ اس نے کہا کہ میں یہ خط بذریعہ تار برطانیہ بھیج دوں۔ بظاہر یہ خون کی ندیاں کے الفاظ استعمال کرنے پر میری جانب سے سرزنش کا اثر تھا۔ اس سے میں نے جو رائے گاندھی کے بارے میں قائم کی تھی اس کی تصدیق ہو گئی۔ میرا یہ ہمیشہ خیال تھا کہ گاندھی کا عدم تشدد پر اعتقاد اور روحانی لوگوں جیسا بہروپ اس کے اصل کردار کا روپ نہیں بلکہ انگریز کے خلاف ایک سیاسی ہتھیار ہے....." گاندھی کے بارے میں ویول کا آخری تبصرہ یکم فروری 1948ء کو اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ اس وقت ویول جوھانسبرگ میں تھا۔ "اس کی غیر متوقع موت سے ایک غیر معمولی شخص کی زندگی اختتام کو پہنچی۔ میں نے کبھی اسے ایک روحانی شخص (درویش) کے طور پر قبول نہیں کیا۔ مگر وہ انتہائی ہوشیار سیاست دان تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی ذات سے ہندوستان کو فائدہ ہوا یا نقصان، لیکن ہندوستانیوں کو اس بارے میں شک نہیں ہو گا کہ اس نے انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے عمل کو تیز کیا اور یہ اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس نے وزارتی مشن کے پلان کو تباہ کر دیا۔ اگر پلان تباہ نہ ہوتا تو امکان تھا کہ ہندوستان متحد رہتا اور اتنی قتل و غارت گری نہ ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے بھی مسلمانوں کے ساتھ افہام تفہیم کے لئے کام نہیں کیا جبکہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے یہ کام کر سکتا تھا۔ اس کا طرز عمل ہمیشہ ایک وکیل یا بنیئے جیسا تھا جو بھاؤ تاؤ اور سودا بازی میں بہت سخت ہوتا ہے اور پھر کسی قانونی سقم کا بہانہ بنا کر اپنے مخالف کو اس سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جو اس نے حاصل کیا ہوتا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ کینہ پرور ہی پایا ہے۔ رحمدلی یا مہربانی کا جذبہ اس میں نہیں تھا۔ مگر مجھ ایسے انگریز کو ہندو کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کا کیا حق ہے؟ ہم انگریزوں کے اور ہندوؤں کے معیار میں قطبیں کا بعد ہے۔ ہندوؤں کے معیار سے ہو سکتا ہے کہ وہ درویش ہو، لیکن وہ ہر اعتبار سے قابل ذکر شخص تھا۔"

مہاتما گاندھی جی کے خون کی ندیاں بہانے سے کیا مراد لی جائے۔ وہ کس کے خون کی ندیاں بہانا چاہتے تھے۔ کیا ہندوؤں کا خون بہانا چاہتے تھے؟ کیا سکھوں کا خون بہانا چاہتے تھے یا وہ مسلمانوں کے خون سے نہانا چاہتے تھے؟ قیام پاکستان سے پہلے بہار میں ایسا کیا گیا۔ پھر قیام پاکستان کے وقت پندرہ بیس لاکھ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور اب آئے روز ہندوستان کے مسلمان اور کشمیری مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

آباد کرکے شہر خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغ ستم گر لگی ہوئی

جس زمانے میں وزارتی مشن سے مذاکرات ہو رہے تھے اور کانگرس اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ صوبوں کو دستور سازی کا اختیار نہ دیا جائے' وائسرائے ویول نے 26 مئی 1946ء کو اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ کانگرس چاہتی ہے کہ ہم زمام اقتدار ایک پارٹی (کانگریس) کے ہاتھ دے دیں' جبکہ تمام مسلمانوں' ریاستی حکمرانوں اور دیگر بہت سے لوگوں کو اس پارٹی پر کوئی اعتماد نہیں۔ اس نے مزید لکھا

" We are bound to have some suspicion that the objective of Congress is to secure control of the centre entirely eliminate British influence and then deal with the Muslims and State with a high hand. We are asked to Guarantee indepenence and to hand over complete control to a Government responsible to a Central Legislature which has a Hindu majority."

ہمارے ملک کے بعض جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے سیاست دانوں کا خیال ہے کہ اگر تشکیل پاکستان کے وقت ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا جاتا تو اس کی انا کی تسکین ہو جاتی اور پاکستان کے ساتھ وہ ناانصافی اور بدسلوکی نہ ہوتی جو بعد میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے روا رکھی۔ وائسرائے ویول کے مطابق ہندو نے مسلم لیگ اور ریاستوں کے حکمرانوں سے بڑی سختی سے نپٹنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ آزادی کے بعد ماؤنٹ بیٹن کی کیا مجال تھی کہ وہ کانگرس کے پروگرام سے سرتابی کرتا۔

اب تو ریڈ کلف ایوارڈ کے ضمن میں ناقابل تردید حقائق سامنے آچکے ہیں کہ اس میں تبدیلی ماؤنٹ بیٹن نے کی۔ مزید یہ کہ آخری وائسرائے جو ہدایات لے کر آیا تھا اس میں واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ ہندوستان کو متحدہ رکھتے ہوئے آزادی دی جائے۔ پھر خود بیٹن کا یہ ارشاد کہ اگر اسے قائداعظمؒ کی بیماری کا علم ہو جاتا تو وہ اعلان آزادی کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیتا اب تو عام کتابوں میں موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ جانتا تھا کہ قائداعظمؒ کے بعد کوئی مائی کا لال پاکستان نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اگر قائداعظمؒ پاکستان کے وزیراعظم کا عہدہ حاصل کر لیتے تو کیا ان کے سانحہ ارتحال کے بعد ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان کو الگ ملک رہنے دیتے؟

اس کی وضاحت کرتے ہوئے کرامت علی خاں لکھتے ہیں:

اس مضمون کے مندرجات لارڈ ویول کے روزنامچے کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں

اس لئے اس میں قائداعظمؒ کے بیانات یا مسلم لیگ کے اعلانات کے حوالے نہیں دیئے گئے۔ برطانوی حکومت نے نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کیوقت جو ہدایات جاری کیں ان سے بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کو ایک ملک کے طور پر قائم رکھنے کے سلسلے میں برطانوی حکومت کس قدر دلچسپی رکھتی تھی۔ اسی طرح وزارتی مشن نے دونوں سیاسی جماعتوں سے مذاکرات میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے کے بعد اپنی جانب سے زونل سکیم کا جو فارمولا دیا تھا اور جسے ابتداء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے تسلیم کر لیا تھا وہ پنڈت نہرو کے بیان کے سبب مسلم لیگ نے مسترد کر دیا۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام نے اپنی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" میں واشگاف الفاظ میں پنڈت نہرو کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا پنڈت نہرو کے بیان پر تبصرہ (صفحہ 170)

"This was one of the greatest tragedies of Indian history and I have to say with deepest regret that a lage part of the responsibility for this development rests with Jawahar Lal."

کانگرس (پنڈت نہرو) کی بددیانتی اور فریب کاری پر قائداعظمؒ کا بیان۔

"That of Congress can go back on its promise while the British are still here what guarantee is there that the Congress will honour their commitments after the British are gone."

مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں وزارتی مشن کے پلان کو رد کرتے ہوئے قائداعظمؒ کی تقریر

"What we have done today is the most historic act in our history. This day we bid good by to constitutional methods throughout. The British and the Congress held a pistol in their hands. The one of authority and arms and the other of mass struggle and non-cooperation. Today we have also forged a pistol and we are in a position to use it."

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کانگرس کے لئے غیر متوقع تھی۔ وہ مسلم لیگ کو کوئی اہم وزارتی منصب دینے پر تیار نہیں تھی۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب میں تبصرہ یوں ہے۔

"Lord Wavell suggested that the Home Ministry should be

given to Muslim League. But Sardar Patel refused to vacate the Home Ministry of which he was the home Minister. He said that he would rather Leave the Govt. than give up the Home Ministry.

Rafi Ahmad Kidvai suggested that we should offer the finance portfolio to the Muslim League. It was not doubt one of the most important but it was highly technical subject and League had no member who can handle it effectively. If League accepted the offer the League nominee should soon made a fool of himself!

Sardar Patel jumped at the proposal and gave it his strongest support. Soon it was realized by the congress that they cannot appoint a "chaprasi" without the approval of the Finance Ministry of which Liaquat Ali Khan was the Minister."

حکومت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو حسب ذیل ہدایت کی گئی۔

"It is the definite objective of His Majesty's Govt. for British Indian and the Indian States if possible within the British Common Wealth through the Medium of a constituent Assembly - and you should do the atmost in your power to persuade all parties to work together to his end".

ان ہدایات کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں فروری 1947ء سے لے کر قیام پاکستان کے اعلان تک جو تقاریر ہوئیں ان میں بڑے دکھ کا اظہار کیا گیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو متحد رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی یہ تقاریر Liquidation of British Empire کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

(کرامت علی خاں۔ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 25، 26، 27 اور 29 اپریل 1995ء)

## ریڈ کلف ایوارڈ 1947ء اور قیام پاکستان

بین الاقوامی سرحدوں کی حتمی حد بندی کے لئے ریڈ کلف کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ جس میں جسٹس دین محمدؒ اور جسٹس محمد منیر پاکستانی ارکان کے طور پر شامل کئے گئے جبکہ ہندوستان کی نمائندگی کے لئے جسٹس مہرچند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ 8 ۔ اگ

1947ء کو ریڈ کلف دہلی پہنچا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے مسلم لیگ کے خلاف اور کانگرس کے حق میں بریف کیا اور کشمیر کی مسلم اکثریت کی ریاست کو بھارت میں شامل کرنے کے بارے میں بھی کہا اور اپنی قائم کردہ حدبندی کو کانگرس کی خواہشات کے مطابق عملی جامہ پہنانے کی ترغیب دی۔

ریڈ کلف کو کانگرسی رہنماؤں نے ایک نقشہ خفیہ طور پر دے دیا جس میں حدبندی انہوں نے خود ہی کر دی تھی۔ 3 جون کے اعلان کے مطابق ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر اور فیروزپور کی تحصیل زیرہ پاکستان میں شامل کر دی گئی تھی، لیکن کانگرس کی نئی حدبندی میں نہ صرف یہ علاقے بھی پاکستان سے چھین لئے گئے بلکہ کشمیر تک راستہ کے لئے پٹھانکوٹ اور گورداسپور کو بھی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ جو کسی بھی لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ لیکن انگریز ہندو گٹھ جوڑ نے مسلمانوں کو محض جغرافیائی لحاظ سے ہی نقصان نہ پہنچایا بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مستقل طور پر ایسے جھگڑے کی بنیاد رکھ دی جو مسئلہ کشمیر بن کر ابھرا اور آج بھی وہاں کی مسلم آبادی اپنے جمہوری حق کے لئے پانچ لاکھ سے زیادہ بھارتی فوج کے خلاف آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔

14 اگست کو پاکستان بن گیا۔ اس کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح مقرر ہوئے جبکہ ہندوستان کا پہلا گورنر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا۔ قائداعظم نے پاکستان کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے رات دن محنت کی۔ کانگرس نے سکھوں اور ہندو غنڈوں کے ذریعے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کروایا۔ مسلمان خواتین کی آبروئیں لوٹی گئیں۔ بہت سی خواتین کو ہندوؤں اور سکھوں نے زبردستی اپنے گھروں میں ڈال لیا۔ بچوں کو نیزوں پر چڑھا کر تماشا دیکھا گیا۔ غرض خون کا دریا پار کرنے کے بعد پاکستان کی آزاد مملکت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن قائداعظم کی وفات (11 ستمبر 1948ء) اور لیاقت علی خاں کی شہادت 16 اکتوبر 1951ء کے بعد پاکستان پر ایسے لوگ قابض ہوگئے جن کا اخلاقی اقدار سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہرحال کچھ مخلص ہستیوں کی موجودگی ابر رحمت بن کر برستی رہی اور پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگا مگر غیرذمہ دار عناصر نے "پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ" کے مقصد کو بھلا کر لوٹ کھسوٹ کا راستہ اپنایا اور عوام کی فلاح و بہبود کی آڑ میں خوب ہاتھ رنگتے رہے۔ کاش قائداعظمؒ چند سال اور زندہ رہتے اور پاکستان کو چیلوں اور کوّوں سے محفوظ کر جاتے!

**تشکیل پاکستان کے بعد کے مسائل:** 14 اگست 1947ء کو قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدہ کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد کراچی میں مثالی جلوس نکالا گیا جس میں قائداعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی شرکت کی۔ وہ چھ گھوڑوں کی بگھی میں سوار تھے۔ ریڈیو پر بھی "یہ ریڈیو پاکستان ہے" کا جب پہلا اعلان نشر ہوا تو برصغیر کے سارے مسلمانوں نے خوشی سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔

تشکیل پاکستان کے بعد بھی ہندو انگریز گٹھ جوڑ اپنا کام کرتا رہا اور نئی مملکت خداداد پاکستان کو بہت سے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا جن کا مختصر ذکر درج ذیل ہے۔

**اقتصادی مسئلہ:** اس مملکت کو چلانے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت تھی، مگر اس کا کوئی خزانہ نہ تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد حبیب بینک نے ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی کی پھر امریکی صدر مسٹر ٹرومین نے ذاتی دلچسپی لی اور سیاسی اقتصادی میدان میں پاکستان کی اعانت کی۔ پھر آہستہ آہستہ اقتصادی حالات سنبھلنے لگے۔

مسلمان تاجروں نے پاکستان کی تجارت کو سنبھالا اور ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

**انتظامی مسئلہ:** انڈین سول سروس کی صرف آٹھ اعلیٰ افسر پاکستان کے حصے میں آئے تھے۔ قائداعظم اور ان کے مخلص رفقاء اور مخلص اعلیٰ افسروں کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور انتظامی طور پر پاکستان کو سنبھالا دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں جو ملازمین تھے ان کو اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان کی شہریت اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار اعلیٰ ملازمین پاکستان کے حق میں تحریری بیان دے کر پاکستان آگئے اور انتظامی امور نپٹانے لگے۔

**افواج کی تقسیم:** مسلمان فوجیوں نے جو اس وقت ہندوستان کے اطراف و جوانب میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ پاکستان پہنچ کر دفاعی کام سنبھالا۔ راولپنڈی میں فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کیا گیا اور افواج پاکستان کی باقاعدہ تشکیل و ترقی پر کام شروع ہوا۔

**مہاجرین کا مسئلہ:** پنجاب کے اضلاع سے مسلمان مہاجرین کو فوری طور پر پاکستان آنا پڑا کیونکہ ریڈ کلف نے بہت سے پاکستانی علاقے ظلماً بھارت میں شامل کر دیئے تھے، پھر ہندو تنظیموں نے سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمان مہاجرین کا قتل عام شروع کر دیا۔ قافلوں کے قافلے لوٹ کر مردوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا اور عورتیں اغوا کر لی جاتیں۔ ان کی آبرو سے کھیلا جاتا اور ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے، تاہم پاکستان کے انصار نے مہاجرین کی بڑی مدد کی۔ حکومت پاکستان نے بھی ان کو آباد کرنے میں بڑی ہمت سے کام لیا۔

**مسئلہ کشمیر:** بھارت نے بڑی مکاری سے حیدر آباد دکن، جونا گڑھ وغیرہ ریاستوں کو زبردستی ہندوستان میں ضم کر لیا اور ساتھ ہی کشمیر کو بھی سکھ راجہ کے ساتھ سازش کر کے بھارت سے ملحق کر لیا۔ اس کا پاکستان میں شدید رد عمل ہوا۔ لیاقت علی خاں کے دور میں کشمیر پر پاکستان نے یلغار کر دی اور بہت سا علاقہ لے بھی لیا لیکن بعد ازاں لیاقت علی خاں نہرو کی باتوں میں آگئے اور پاکستانی افواج کی کشمیر میں پیش قدمی روک دی۔ نہرو نے کشمیر میں رائے شماری کا وعدہ کیا۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنے وعدہ سے مکر گیا۔ پاکستان نے اقوام متحدہ" میں مقدمہ پیش کیا چنانچہ استصواب رائے پر کشمیر کا فیصلہ ہونا قرار پایا۔ مگر بھارتی حکومت نے لیت و لعل اور جابرانہ مکاری

سے کام لیتے ہوئے اس وعدے کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ کاش لیاقت علی خاں مرحوم نہرو کے بھرے آتے اور مسلمان فوجوں کو کشمیر میں پیش قدمی سے نہ روکتے۔ آخر جن علاقوں پر پاکستان کا قبضہ ہو چکا تھا وہ علاقے آزاد کشمیر کے نام سے پاکستان کے ساتھ شامل ہیں اور باقی علاقے مقبوضہ کشمیر کی حیثیت سے بھارت کے قبضہ میں ہیں۔ پاکستان کی تشکیل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کے عہد سے اس پر کام شروع ہوا، اور صوفیاء کرام اور مسلمان مفکرین نے ہر ہر دور میں "پاکستان" کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسلامی تشخص کو برقرار رکھا اور اپنی روایات کو زندگی بخشی۔ جہاد اہل اسلام کا زیور ہے۔ جو انہیں غازی بن کر یا شہادت پا کر جینے مرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ دنیا کا مال و دولت محض آزمائش کے لئے ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جانچ سکے کہ کون ان میں اللہ کا عاشق ہے اور کون اللہ کے مقابلے میں دنیا کی عیش و عشرت کو ترجیح دیتا ہے۔ جب بھی مسلمانوں نے اللہ کی بجائے عیش و عشرت کو اختیار کیا وہ قعر مذلت میں گر گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ خود غرضی نے مسلمانوں کو ہمیشہ ذلت و نکبت کے توشے دیئے۔ آج بھی مسلمانوں کو ان کے دشمن مکارانہ چالوں سے دام دنیا میں پھنسا رہے ہیں اور عقبیٰ کی اہمیت کو اُن کی نظروں سے اوجھل کیا جا رہا ہے۔ اللہ کرے وہ آنکھیں کھول کر دشمنوں کے حملوں کو ناکام کرنے کے لئے جاگ جائیں۔ تاکہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں، آمین۔

## پاکستان اور بھارت کے لئے مشترکہ انگریز گورنر جنرل کا مسئلہ

بعض لیڈروں کا خیال ہے کہ اگر قائداعظم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانا قبول کر لیتے تو مسلمان اس قدر کشت و خون اور تباہی سے دو چار نہ ہوتے جس سے کہ وہ ہوئے۔ حالانکہ قائداعظم سمجھتے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن کانگرس کے ہاتھ بک چکا ہے۔ لہٰذا وہ پاکستان کو مہلک نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس بارے میں جناب ڈاکٹر محمد عارف (بحوالہ نوائے وقت لاہور) لکھتے ہیں کہ:

پاکستان میں ایک مرتبہ پھر یہ بحث چل نکلی ہے کہ اگر قائداعظم" لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کا گورنر جنرل بنانے پر رضامند ہو جاتے تو پاکستان اس نقصان سے بچ جاتا جو ماؤنٹ بیٹن نے فی الحقیقت اس کو پہنچایا۔

اس موضوع پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس مفروضے کی تائید میں اب تک کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی البتہ اس کی تردید میں بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اب مضمون میں

بنیادی طور پر اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ تقسیم ہند کے اعلان کے کافی عرصہ بعد اٹھا تھا جبکہ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو حقیقی اور بنیادی نقصان تقسیم ہند کے اعلان سے قبل ہی پہنچا چکا تھا بلکہ یہ اعلان ہی اس سازش کی پیداوار تھا جو مئی میں شملہ میں تیار کی گئی تھی حتیٰ کہ "کرم خوردہ اور سربریدہ" پاکستان کے تصور نے تو نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی پہلی ملاقات (24 مارچ 1947ء) میں ہی جنم لے لیا تھا بعد میں تو محض اس منصوبے پر عمل درآمد ہوتا رہا جو بڑی حد تک اگست کے آغاز میں پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ذیل میں اس سارے ڈرامے کے اہم واقعات مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔ جو حضرات مندرجہ بالا مفروضے پر یقین رکھتے ہیں کو بقیہ مسائل سے قطع نظر کم از کم مندرجہ ذیل باتوں کا جواب تو ضرور دینا چاہئے۔

ا..... جب قائداعظمؒ نے اس تجویز کو رد کیا اس وقت تک وائسرائے نے مسلمانوں اور پاکستان کے مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

ب..... اگر مندرجہ بالا کا جواب اثبات میں ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی) تو اس تجویز کو قبول کرنے کی صورت میں ماؤنٹ بیٹن اس نقصان کی تلافی کس طریقے سے کرتا؟ اب سازش کے اہم نکات ملاحظہ فرمائیں۔

وائسرائے نے 24 مارچ کو دہلی میں اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے سپرد یہ فریضہ تھا کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کے تحت پورے ملک کے لئے واحد قانون ساز اسمبلی کے قیام کے لئے تمام سیاسی جماعتوں کی رضامندی حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرے لیکن اگر اکتوبر 1947ء تک وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ اس کوشش میں کامیابی کا امکان نہیں تو وہ پھر اپنی تجاویز پیش کرے تاکہ انتقال اقتدار جون 1948ء تک عمل میں آسکے۔ اس کے بعد اس نے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

31 مارچ اور 14 اپریل کے دوران گاندھی نے نئے وائسرائے سے جو ملاقاتیں کیں ان میں گاندھی نے ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے آخری کوشش کے طور پر ایک اہم تجویز پیش کی۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ موجودہ کابینہ کو برخاست کر دیا جائے اور جناح کو کلیتاً اپنی پسند کی کابینہ بنانے کی دعوت دی جائے خواہ یہ ساری کابینہ مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ کانگرس اس وقت تک ان سے پورا پورا تعاون کرے گی جب تک وہ پورے ہندوستان کے لوگوں کے مفاد میں کام کریں گے اور معاملے میں واحد ثالث ماؤنٹ بیٹن اپنی ذاتی حیثیت میں ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جناح مکمل طور پر آزاد ہوں گے مثلاً یہ کہ وہ پاکستان کے لئے منصوبہ سازی کر سکتے تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ اپنے منصوبے کو اقتدار کی منتقلی سے پہلے روبہ عمل بھی لا سکتے تھے بشرطیکہ وہ لوگوں کو عقل اور استدلال سے قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور طاقت استعمال نہ کریں۔ اگر جناح یہ پیش

کش قبول نہ کریں تو یہی پیشکش مناسب تبدیلیوں کے ساتھ کانگرس کو کی جائے۔ گاندھی کی یہ تجویز سن کر ماؤنٹ بیٹن مبہوت رہ گیا۔

تاہم اس نے مناسب خیال کیا کہ اس تجویز کے بارے میں قائداعظمؒ سے گفتگو کرنے سے پہلے نہرو سے مشورہ کرے۔ نہرو کی زبردست مخالفت کی بناء پر اس نے گاندھی سے اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اکتوبر کا انتظار کیئے بغیر ہی ہز میجسٹی کی حکومت کے فروری کے بیان میں مذکورہ متبادل حل کی بنیاد پر اپنی تجاویز وضع کرنا شروع کر دیں۔ اس نے جو پلان بنایا اس میں صوبوں اور ریاستوں کو خود مختاری دینے کی تجویز سرفہرست تھی۔ (بنیادی طور پر یہ وہی سکیم تھی جو کرپس نے 1942ء میں پیش کی تھی) ماؤنٹ بیٹن نے اس کے بارے میں 15 اور 16 اپریل کو صوبائی گورنروں سے مشورہ کیا اور اسے اور ایبل کو (جو بالترتیب اس کے چیف آف شاف اور پرائیوٹ سیکرٹری تھے) 2 مئی کو یہ تجاویز دے کر اس درخواست کے ساتھ لندن بھیج دیا کہ حکومت برطانیہ 10 مئی تک ان کی منظوری دیدے) گورنروں کے ساتھ اپنے اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ خاص بات کہی کہ "کوئی بھی امر جس کے نتیجہ میں پاکستان بنانے کی تجویز ختم ہوتی ہو وہ سود مند ہوگا۔ چونکہ اس طرح مسئلے کا ایک ایسا حل نکل آئے گا جو عام فہمی پر مبنی ہوگا۔"

اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن اپنے شاف کے ساتھ شملہ چلا گیا جو حکومت ہند کا موسم گرما کا صدر مقام تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس نے شملہ میں نہرو اور اس کی بیٹی اندرا کو اپنے ہاں ذاتی مہمان کے طور پر مدعو کیئے رکھا۔ مینن (جو سول سروس کا ایک سینئر ہندو افسر تھا) نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ (مینن) شملہ میں اپنے سرکاری آقا یعنی وائسرائے اور سیاسی مرشد یعنی نہرو کے مابین مسلسل رابطے کے ذریعہ بنا رہا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریسی قیادت کے ساتھ مینن کے قریبی تعلقات کے پیش نظر اسے یہ انتہائی حساس کام سونپا تھا۔ اس سے پہلے ویول نے بھی مینن کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ وہ مکمل طور پر "پٹیل کی جیب میں تھا اور عملاً اس کا ترجمان بن چکا تھا۔"

ماؤنٹ بیٹن نے جو تجاویز لندن بھجوائیں مینن ان سے بہت پریشان ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں جنوبی علاقے کے ہندو صوبے (جہاں نچلی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت تھی) شمالی علاقے سے علیحدگی کے حق میں فیصلہ نہ کرلیں اور دوسری طرف مسلم اکثریت والے صوبوں کے لوگوں کی کثیر تعداد بلاشبہ ایک واحد مسلم ریاست کے ساتھ ہونا چاہے گی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا کہ کانگرس کا اقتدار ایک مختصر سے علاقے تک محدود ہو جاتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مسلم لیگ نے جن چھ صوبوں کے مطالبہ کیا تھا وہ سب مجوزہ سکیم میں جوں کے توں سالم رہتے تھے۔ اس لئے مینن نے یہ مہم شروع کی کہ ماؤنٹ بیٹن کو قائل کیا جائے کہ وہ ان تجاویز کو واپس لے لے اور ان کی بجائے

کانگرس کے نقطہ نظر کو قبول کرلے- اس مقصد کے لیئے اس نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک ایسی پرکشش پیشکش کی جسے مسترد کرنا اس کے لئے محال تھا- اس نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ فوری طور پر مکمل آزادی پر اصرار کرنے کی بجائے کانگرس اس بات پر رضامند ہو جائیگی کہ آزاد ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کا رکن بن جائے (جس کے انگریز ایک مدت سے آرزومند تھے اور جس پر ابھی تک کانگرس کسی صورت راضی نہیں ہوئی تھی، لیکن شرط یہ تھی کہ اقتدار فوراً منتقل کردیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ صوبوں اور ریاستوں کو علیحدہ علیحدہ اقتدار دینے کی بجائے یہ صرف ایک یا دو ملکوں کو منتقل کیا جائے- یہ وہ تجویز تھی جس کی مینن نے پہلے ہی (دسمبر 1946ء یا جنوری 1947ء) میں پٹیل سے منظور حاصل کرلی تھی- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس اور اس کے ہمنوا سرکاری افسران کیسی کیسی پیش بندیاں کررہے تھے-

مینن کی جانب سے یہ یقین دہانی ماؤنٹ بیٹن کے لئے بڑی خوشی کا موجب بنی- ہندوستان آنے سے قبل لندن ہی میں اس نے نہرو کے ایک قریبی دوست کرشنا مینن کے ذریعہ بھی اس مقصد کے حصول کے لئے پرزور کوشش کی تھی- یہاں تک کہ اس نے کرشنا مینن کو متنبہ کیا تھا کہ "اگر ہندوستان دولت مشترکہ میں شامل نہ ہوا تو پاکستان جو اس میں شرکت کے لئے بہت بیتاب تھا، بہت جلد اپنی مسلح افواج کو ہندوستان سے کئی گنا بڑھالے گا اور میرا اندازہ ہے کہ کراچی جیسے مقامات بڑے بحری اور فضائی اڈے بن جائیں گے-"

مینن کی پیشکش سے ماؤنٹ بیٹن پھولا نہ سمایا اور اس نے 8 مئی کو تار کے ذریعہ لارڈ اسمے کو یہ پیغام بھجوایا کہ اسے "اس نعمت کی توقع نہیں تھی جو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آگرا ہے- نہرو اور پٹیل نے از خود یہ تجویز پیش کرکے صورتِ حال کو یکسر تبدیل کردیا ہے-"

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ وی پی مینن کی تیار کردہ سکیم حکومت برطانیہ کے فروری کے بیان کے بالکل برعکس تھی- لہٰذا وہ تجاویز جو ماؤنٹ بیٹن نے لندن بھجوائی تھیں اب بے معنی ہو گئی تھیں- کیونکہ اب ماؤنٹ بیٹن بھی مینن اور نہرو کے اس بنیادی خیال سے اتفاق کرنے لگا تھا کہ نوآبادی کے درجہ پر اقتدار کی بلا تاخیر منتقلی بہت احسن صورت ہوتی، لیکن ایک قباحت یہ پیدا ہوئی کہ کانگرس یہ چاہتی تھی کہ اقلیتوں کے مسئلہ کو ایک طرف رکھ کر اقتدار فی الفور اسے منتقل کردیا جائے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس سے اتفاق کرنا ماؤنٹ بیٹن کے لئے مشکل ہو رہا تھا- چنانچہ اس بناء پر اس نے اپنا یہ خدشہ ظاہر کیا کہ "انڈین یونین کو نوآبادی کے درجہ پر جلد اقتدار منتقل کرنا تو ایک بہت آسان کام ہوگا- لیکن آئندہ کچھ عرصہ تک پاکستان میں کوئی ایسا بااختیار ادارہ نہیں ہوگا جسے اقتدار منتقل کیا جاسکے" لیکن مینن آسانی سے ہار ماننے والا انسان نہیں تھا-

چنانچہ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے ماؤنٹ بیٹن کو یقین دلایا کہ جو مسئلہ اس کے ذہن میں ہے وہ ایسا نہیں کہ اسے حل کرنا ناممکن ہو۔ بڑی عجیب بات ہے کہ اس سرسری سے جواب نے ایک ایسے تجربہ کار وائسرائے کو اتنی آسانی سے مطمئن کر دیا!

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مئی 1947ء کے دوران شملہ میں وائسرائے کی قیام گاہ پر جو مندرجہ بالا اہم واقعات اور مذاکرات ہوئے مسلم لیگ کو ان سے بالکل بے خبر رکھا گیا۔

شملہ میں ابھی یہ کھچڑی پک ہی رہی تھی کہ حکومت برطانیہ نے ماؤنٹ بیٹن کے ارسال کردہ اصل پلان کی (معمولی ردوبدل کے ساتھ) منظوری دیدی۔ ہز میجسٹی کی حکومت نے اس بات سے اتفاق کیا کہ چونکہ کیبنٹ مشن پلان کو ترک کر دیا گیا تھا اس لئے اب منطقی لائحہ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ کرپس کی 1942ء میں پیش کردہ تجاویز کی طرف سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ اس منظور شدہ سکیم کے تحت تمام صوبوں کو یہ اختیار دیا جانا تھا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ آیا وہ موجودہ قانون ساز اسمبلی میں رہنا چاہتے ہیں یا ایک نیا گروپ بنانا چاہتے ہیں یا آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ ابھی تک وائسرائے کھلے دل سے پوری طرح کانگرس کے نقطۂ نظر پر ایمان نہیں لایا تھا۔ چنانچہ اس نے مینن کی نئی تجاویز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس منظور شدہ سکیم کے اعلان کے لئے 17 مئی کو دہلی میں کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کا اجلاس طلب کر لیا۔

ماؤنٹ بیٹن کا مکرو فریب۔

اس فیصلہ نے مینن اور نہرو کا کھیل بگاڑ دیا۔ چنانچہ اب انہوں نے اپنی کوششیں دو چند کر دیں۔ دس مئی کی رات کو ماؤنٹ بیٹن نے اس اعتماد پر ایک اور ضرب لگائی جو برطانوی حکومت اور مسلم لیگ نے اس پر کیا تھا۔ مینن کا کہنا ہے کہ وائسرائے نے اپنے مہمان نہرو کو وہ خفیہ مراسلہ دکھایا جو لندن سے آیا تھا اور نہرو نے اسے بڑی شدت سے ٹھکرا دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بڑی عاجزی سے مینن سے مدد طلب کی کہ وہ نہرو کا غصہ ٹھنڈا کرے، اور پھر اس نے بتدریج کانگرس کی اس سکیم کی حمایت شروع کر دی کہ اگر انتقال اقتدار نوآبادی کی سطح پر ہونا ہے تو انڈین یونین کو فی الفور اقتدار منتقل کر دیا جائے اور اسی بنیاد پر پاکستان کا قیام بھی عمل میں آئے مگر بعد میں اس دوران ماؤنٹ بیٹن لندن میں اسے کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا جو وائسرائے کی سوچ میں اس یک لخت انقلابی تبدیلی پر چونک اٹھا تھا۔ چنانچہ 12 مئی کو اسے نے اپنے افسر اعلیٰ یعنی وائسرائے کو یہ رائے دی کہ نوآبادی کا درجہ اس وقت خارج ازامکان ہے جب تک کہ تقسیم کی بنیاد دونوں اعتبار سے طے نہ پا جائے یعنی ڈومینین کی علاقائی حدود اور مرکزی حکومت کے محکمہ جات کا تعین۔ اس نے وائسرائے کو اس بات کی یاد دہانی بھی کرائی کہ اس کی نئی تجاویز پر عمل کرنا درحقیقت ان یقین دہانیوں کے خلاف ہوگا جو ہز میجسٹی کی حکومت نے اقلیتوں کو ہمیشہ کرائی ہیں، لیکن مینن چونکہ ایک

تجربہ کار سرکاری افسر تھا لہٰذا اس نے اس اثناء میں ہر قسم کے اعتراض کے تدارک کے لئے اپنی سکیم میں نمایاں تبدیلیاں کرلی تھیں۔ اس نے اب جو نئی تجاویز پیش کیں ان میں انتقال اقتدار سے پہلے پاکستان کی تخلیق کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ لیکن یہ ایک کرم خوردہ پاکستان تھا! شملہ میں ان دنوں جو فیصلہ کن مذاکرات ہوئے اور ان میں طاقت کا جو کھیل کھیلا گیا اور جس سے مسلم لیگ کے نمائندوں کو مکمل طور پر بے خبر رکھا گیا تھا، اس کی جھلک ہمیں مینن کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ملتی ہے۔

"میں ابھی نہرو کے پاس ہی تھا کہ مجھے ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے پیغام ملا کہ میں فی الفور اس کے پاس پہنچوں اور میں فوراً اسے ملنے چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے لندن سے موصول شدہ پلان کا مسودہ نہرو کو دکھایا تھا اور اسے ایسا کرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر اس نے اپنے پروگرام کے مطابق پارٹی لیڈروں کی کانفرنس بلالی ہوتی تو اس کے نتائج تباہ کن ہوتے۔ ایسا کرکے وہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو مکمل طور پر گمراہ کر دیتا کیونکہ اس وقت تک اس کا خیال یہ تھا کہ نہرو اس پلان کو تسلیم کرلے گا۔ اب تو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس صورتحال کا کس طرح احسن طور پر ازالہ کیا جائے۔ میں نے وائسرائے و نہرو سے اپنی بعد کی ملاقاتوں کے جملہ حالات کے بارے میں بتایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ میری تجویز پر عمل سے ہی سب سے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔ یعنی دو مرکزی حکومتوں کو نوآبادی کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی ایک ایسی تجویز تھی جس کے بارے میں امکان تھا کہ کانگرس اسے قبول کرلے گی کیونکہ اس سے اقتدار کی منتقلی یقینی ہو جائے گی۔ اب سوال صرف اتنا تھا کہ کیا جناح ایک سربریدہ پاکستان قبول کرلے گا۔ لیکن جناح کو معلوم تھا کہ گاندھی ملک کی تقسیم کی ہر شکل کے مخالف تھے اور کانگرس مسلم لیگ کو ایسے علاقے دینے پر رضامند نہیں ہوگی۔ جہاں غیر مسلم لیگ اکثریت میں ہیں۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن کو یاد دلایا کہ اس نے خود یہ تاثر لیا تھا کہ جناح پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے خیال سے ذہنی طور پر مصالحت کر چکے ہیں جبکہ ہز میجسٹی کی حکومت نے جس پلان کی منظوری دی تھی اس سے ملک کئی ٹکڑوں میں بٹ جائے گا اس کے برعکس شملہ میں طے پانے والے پلان سے ہندوستان کی وحدت بنیادی طور پر برقرار رہے گی۔ البتہ وہ علاقے جو اس کا حصہ بن کر رہنا نہیں چاہتے وہ ملک سے علیحدہ ہونے سے آزاد ہوں گے۔

افسوسناک بات یہ تھی کہ اب کانگرس اپنے مکمل خودمختاری کے مطالبے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوگئی تھی بشرطیکہ اس کے نتیجے میں پاکستان کی ہیئت کو بگاڑا جاسکے۔ پہلے تو وہ پورے ملک کی وحدت پر شدومد سے اصرار کیا کرتی تھی اور اب صوبوں کو بھی تقسیم کرنے پر زور دے رہی تھی۔

مینن کو اس بات کا کریڈٹ ضرور دینا چاہیے کہ اس نے اپنی ان تمام سرگرمیوں سے اپنی حقیقی مرشد کو ہر لمحہ باخبر رکھا۔ اس کے ثبوت کے طور پر اس کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:..... "میں شملہ میں ہونے والی سرگرمیوں سے ولبھ بھائی پٹیل کو مسلسل مطلع کرتا رہا اور وہ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خوش تھے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ کانگرس سے آزاد ہندوستان کی نو آبادیاتی حیثیت تسلیم کروانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پٹیل پہلے ہی 9 مئی کو ایک بیان دے چکے تھے جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ حکومت ہند کو اقتدار کی منتقلی نو آبادی حیثیت میں ہو۔"

یوں مینن نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ وہ کانگریس قیادت سے اس بات کا وعدہ حاصل کر لے کہ اس نے وائسرائے سے شملہ میں جو سودا طے کیا تھا اس کی قیمت وہ ضرور ادا کرے گا۔ عین اس وقت جب مینن یہ کوشش کر رہا تھا کہ وائسرائے کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے نظریہ قبول کرنے پر آمادہ کرے، نہرو بھی وائسرائے پر دباؤ ڈالنے کے لئے اپنے حربے استعمال کر رہا تھا۔ اس نے وائسرائے کو ایک مراسلے میں متنبہ کیا کہ "برطانوی حکومت نے جو تجاویز منظور کی ہیں وہ نہ صرف ہندوستان کے لئے نقصان دہ ہیں بلکہ برطانیہ اور ہندوستان کے آئندہ کے تعلقات کے لئے خطرے کے مؤجب ہیں۔" اس نے یہ کہہ کر انگریزوں کی دکھتی رگ کو چھیڑا کہ "وہ تجاویز خاص طور پر عسکری اہمیت کے حامل مقامات کو خطرہ میں ڈال دیں گی۔"

اب وائسرائے نے وی پی مینن سے کہا کہ وہ ان خطوط پر جو اس نے خود تجویز کئے تھے ایک باقاعدہ پلان کا مسودہ تیار کرے اور اس میں نہرو کی خواہشات کو بھی پیش نظر رکھے۔ مینن نے ایک بار پھر بڑی ہوشیاری سے کانگرس کے اہم مطالبات کو اپنی سکیم میں شامل کر دیا اور یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اس وقت کی عبوری حکومت (جس پر کانگرس کا غلبہ تھا) اس وقت تک پورے ملک کے لئے نو آبادیاتی حکومت کے طور پر کام کرتی رہے گی جب تک کہ دونوں حکومتوں کو نو آبادیاتی حیثیت میں اقتدار منتقل کرنے کا قانون پاس نہیں ہو جاتا۔ اقلیتوں کے تحفظ کے لئے صرف اس جملے پر اکتفا کیا گیا کہ اس عرصہ میں اقلیتوں کے جائز مطالبات کے تحفظ کا ذمہ دار گورنر جنرل ہو گا۔ گورنر جنرل کے اس فریضے کا ذکر پہلی مرتبہ کیا گیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے سکیم میں ان بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور نہرو کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد اسے منظوری کے لئے لندن بھیج دیا۔ 17 مئی کو وائسرائے نے سیاسی لیڈروں کی جو کانفرنس دہلی میں بلائی تھی وہ اصل وجہ بتائے بغیر 2 جون تک ملتوی کر دی گئی۔ لیاقت علی خاں کا خیال تھا کہ کانفرنس اس وجہ سے ملتوی کی گئی ہے کہ وائسرائے لندن کا دورہ کر سکے جبکہ وائسرائے نے قائداعظم کو یہ بتایا کہ اس کا التوا برطانوی پارلیمنٹ کی تعطیلات کی بناء پر ضروری ہو گیا ہے۔ حالانکہ اصل وجہ مندرجہ

بالا محلاتی سازش تھی۔ برطانوی حکومت مینن کی سکیم کو من و عن قبول کرنا نہیں چاہتی تھی خصوصاً اقلیتوں کے مسئلہ کو انتقال اقتدار کے بعد تک اٹھا رکھنے سے متفق نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کو مشورہ کے لئے لندن طلب کر لیا۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ کو نہ تو اس پلان کا پتہ تھا جو لندن سے پہلے منظور ہو کر آچکا تھا اور نہ اسے اس سکیم کی کچھ خبر تھی جو بعد میں بھجوائی گئی تھی۔ اگر وہ پہلا پلان جو برٹش گورنمنٹ نے دس مئی کو منظور کیا تھا، نہرو کی طرح قائداعظمؒ کو کسی صورت بھی پنجاب اور بنگال کی تقسیم قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لاعلمی کے باوجود قائداعظمؒ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی زبردست مزاحمت کی۔ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کو اس تقسیم کے سنگین نتائج کے بارے میں متنبہ کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی سرتوڑ کوشش کی کہ مطالبہ پاکستان کے بنیادی اصول کو بہانہ بنا کر ہندوستان بھر کے صوبوں کے ٹکڑے کرنا غلط ہو گا۔

## تقسیم ہند اور مسلمانوں کے ساتھ سنگین ناانصافی:

برطانوی حکومت نے اس بات کو تو قبول نہ کیا کہ اقتدار ایک ہی قانون ساز اسمبلی کو منتقل کر کے اقلیتوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن کیبنٹ مشن کی گروپ بندی کی سکیم اور کرپس مشن کی تجویز کردہ اختیاری شق کو حذف کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف یہ نہیں بلکہ لیبر پارٹی کی حکومت نے وائسرائے اور کانگرس کی یہ بات بھی مان لی کہ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا جائے۔ مزید برآں آسام کا قریباً پورا صوبہ لیگ کو دینے سے انکار کر دیا گیا۔

کانگرسی قیادت کی خواہش کے احترام میں ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کا وقت بھی جون 1948ء کی بجائے اگست 1947ء کر دیا۔ حالانکہ پنجاب کے گورنر نے اسے خبردار کیا تھا کہ یہ کام اتنا بڑا اور مشکل ہے کہ صرف پنجاب کی تقسیم کے لئے آرمی کے کم از کم چار آپریشنل ڈویژن اور ایک علیحدہ آرمی ہیڈ کوارٹر درکار ہو گا۔ (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن چاہتا تھا کہ اقتدار کی منتقلی اس وقت ہو جب جاپان کی شکست کی دوسری سالگرہ منائی جائے۔) اس سے پہلے پنجاب اور بنگال دونوں بڑے صوبوں کے گورنروں نے انگریزوں کی ہندوستان سے واپسی کے لئے سرے سے کوئی مدت معین کرنے ہی کی مخالفت کی تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ بات فرقہ وارانہ صورتحال کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی اور دو اہم فریق اس پر کسی طرح متفق نہیں ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کے تقرر کے وقت چرچل نے بھی اس وقت کے تعین کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ تو اس قسم کی سولی ہے جو اس صورتحال سے وابستہ بڑے پیچیدہ مسائل پر بھرپور، منصفانہ اور مدلل انداز میں بحث کو روک دے گی۔" لیکن ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت تک اپنی تقرری قبول نہیں کرے گا

جب تک کہ تقرری کے اعلان میں ہندوستان سے انگریزوں کی واپسی کے وقت کا تعین نہ کر دیا جائے۔

مئی 1947ء میں لندن میں مذاکرات کے دوران ماؤنٹ بیٹن ایک مرتبہ پھر اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ حالانکہ اس سے قبل 4 مارچ کو سیکرٹری آف سٹیٹ برائے انڈیا بھی کیبنٹ کے نام اپنی یادداشت میں یہ لکھا تھا کہ صرف ہندوستان کی فوج کو تقسیم کرنے کے لئے کم از کم نو ماہ کا عرصہ درکار ہو گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے اس نے انتقال اقتدار کے بارے میں اپنا ذہن جو 1948ء کی بجائے اگست 1947ء کے حق میں بدل دیا حالانکہ اپنی تقرری کے وقت اس نے خود جون 1948ء کی تاریخ کے تعین پر اصرار کیا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ جب 24 مارچ 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن بطور وائسرائے حلف اٹھانے کے فوراً بعد نہرو سے ملا تو اس نے وائسرائے کو تجویز پیش کی کہ "جناح کو انتقال اقتدار کے لئے وقت کی قلت کا خوف دلا کر تعاون کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔" اس وقت غالباً نہرو کے ذہن میں انتقال اقتدار کی مجوزہ تاریخ یعنی جون 1948ء تھی، لیکن ماؤنٹ بیٹن کے شاطر ذہن نے قائداعظم اور لیگ کو مزید جکڑنے کے لئے قلیل مدت کے اس حربے کی افادیت کو فوراً سمجھ لیا۔ چنانچہ نہرو کے ساتھ اس ملاقات کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنے عملہ کو بتایا کہ جناح کی "ابتر ذہنی حالت" جو وقت کے بارے میں اس دباؤ کی وجہ سے ہوئی تھی، ایک اچھا شگون تھی، اور جب ایک بار "پاکستان کی تشکیل کا پورا خوف" اس کے دل میں اتر جائے گا تو وہ اس منظر سے شدید کرب محسوس کرے گا جو اس کے سامنے آئے گا، اور پھر ایک ایسا نفسیاتی لمحہ آئے گا جس سے فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔" ماؤنٹ بیٹن کی جناح اور مسلم دشمنی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا؟

لندن سے واپس آنے کے بعد وائسرائے نے 2 جون کو دہلی میں ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد کی اور اس میں تقسیم ہند کے اس پلان کی تفصیلات کا انکشاف کیا جو حتمی طور پر منظور ہوا تھا۔ یہ پلان دراصل اس سکیم کی بنیاد پر بنایا گیا تھا جسے وی پی مینن نے نہرو کی تائید سے تیار کیا تھا۔ 3 جون کو تقسیم ہند کے اس پلان کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور مورخہ 18 اور 30 اپریل 1995ء)

ڈاکٹر محمد عارف اپنے خیالات کے تسلسل میں رقمطراز ہیں: 3 جون کے اس پلان میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ بنگال اور پنجاب کے صوبوں کو ابتدائی طور پر 1941ء کی مردم شماری کے مطابق مسلم/غیر مسلم اکثریت رکھنے والے ملحقہ اضلاع کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا۔ جہاں تک علاقوں کی حتمی حدبندی کا تعلق تھا تو "وہ ہر صوبے کے باؤنڈری کمیشن نے ملحقہ مسلم / غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کی

تصدیق کے بعد کرنی تھی۔ اس (باؤنڈری کمیشن) کو یہ ہدایت بھی کی جائے گی کہ وہ دیگر عوامل کو بھی پیش نظر رکھے"۔ دونوں صوبوں کے باؤنڈری کمیشنوں کا تقرر جون کے آخر میں کیا گیا۔

باؤنڈری کمیشنوں کے قیام کے بارے میں رہنماؤں کی کانفرنس میں فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ سرحدوں کی حد بندی کا کام اقوام متحدہ کو سونپا جائے، لیکن نہرو نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ قائداعظمؒ چاہتے تھے کہ برطانیہ کے تین لاء لارڈز کو ان کمیشنوں کا رکن بنایا جائے، لیکن ماؤنٹ بیٹن اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظمؒ سے یہ بات منوانے کی کوشش کی کہ سر سائیرل ریڈ کلف (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) نامی ایک انگریز وکیل کو دونوں کمیشنوں کا چیئرمین مقرر کیا جائے۔ چونکہ دونوں کمیشنوں میں شامل لیگ اور کانگرس کے نمائندوں کا کسی بنیادی مسئلے پر متفق ہونا قریباً ناممکن تھا اس لئے سر سائرل کو تن تنہا عملاً کروڑوں پنجابیوں اور بنگالیوں کی تقدیر کا ثالث بننا تھا۔ اس عظیم اور انتہائی مشکل کام کے لئے جس کے لئے کئی سال نہیں تو کئی مہینے یقیناً درکار تھے، ریڈ کلف کو صرف 32 روز دیئے گئے۔

باؤنڈری کمیشنوں نے جو ایوارڈ (فیصلے) دیئے وہ پاکستان کے مفادات کے سراسر خلاف تھے۔ بالخصوص دو فیصلے، ایک مشرق میں اور دوسرا مغرب میں، ایسے تھے جن میں عقل اور عدل و انصاف کے تمام اصولوں کو پامال کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ اور ان سے پیدا ہونے والے المناک نتائج آج تک جنوبی ایشیاء میں ابتری پھیلانے کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی بنیاد بھی 2 جون تک رکھی جا چکی تھی۔

(الف).. تقسیم بنگال اور کلکتہ کی ہندوستان میں شمولیت کے مسئلے مشرقی بنگال
پاکستان کے

مغربی حصہ سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا اور ان دو حصوں کے مابین ہندوستان کا علاقہ تھا۔ مشرقی بنگال کی معیشت کا تمام تر انحصار کلکتہ کی بندرگاہ پر تھا۔ کلکتہ پاکستان کو نہ دینے کا مقصد واضح طور پر یہی تھا کہ اس نئے ملک کی معیشت کو نہ صرف خود کفیل نہ ہونے دیا جائے بلکہ اسے ہندوستان کے رحم و کرم کا محتاج رکھا جائے۔ "کلکتہ نے سارے دیہی علاقوں کی دولت سمیٹ کر اپنی جھولی میں ڈالی ہوئی تھی۔ دو سال سے یہی ہو رہا تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کسان محنت کرتے اور ان کی محنت کا سارا پھل کلکتہ چلا جاتا۔"

ٹائی سن، جو بنگال کے گورنر کا سیکرٹری تھا، کا بھی یہی خیال تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی بنگال "ایک پسماندہ دیہی علاقہ" بن کر رہ جائے گا۔ اس شہر کی آبادی میں اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن اس نام نہاد ہندو آبادی کا ایک بڑا حصہ نچلی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھا جو ہمیشہ کانگرس سے الگ تھلگ رہے تھے۔ ان کے لیڈر جوگندر ناتھ منڈل کو اکتوبر 1946ء میں مسلم لیگ نے اپنے

نمائندے کے طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لئے نامزد کیا تھا اور وہ عبوری حکومت میں بھی لیگ کی طرف سے شامل ہوئے تھے۔ اس بنا پر زیر بحث مقصد کے لئے کلکتہ کے ان نیچ ذات ہندوؤں کا شمار باقی ہندوؤں کے ساتھ کرنا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں تھا۔

ان حالات کے پیش نظر قائداعظمؒ نے کلکتہ کے شہریوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ریفرنڈم کرانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن وائسرائے نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ کیمبل جانسن نے اس انکار کی وجہ ماؤنٹ بیٹن کے اپنے الفاظ میں بیان کی ہے۔ "کیمبل جانسن کا کہنا ہے کہ 25 اپریل 1947ء کو اپنے سٹاف کے سامنے کلکتہ کے مستقبل کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ مسلمان یہاں استصواب رائے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوں گے، اور اس شہر کا مستقبل ایک عظیم مسئلہ بن جائے گا لیکن یہاں خود اختیاری کا عمل اختیار کرنا قرین مصلحت نہیں ہو گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا جواب غلط نکلے۔"

وی پی مینن نے اس بارے میں زیادہ کھل کر حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ 2 جون کو ہندوستان کے لیڈروں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں ماؤنٹ بیٹن نے یہ اعتراف کیا کہ "یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کا ووٹ اس بات کے حق میں ہو کہ کلکتہ کو مشرقی بنگال کے گورنر سے مشورہ کیا تھا اور اسے اس بات کا اطمینان ہو چکا ہے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ نچلی ذات کے ہندو مسلمانوں کی حکومت کو ہندوؤں کی حکومت پر ترجیح دیں گے۔ اگرچہ وائسرائے نے گورنر کا مندرجہ بالا قیاس تو قبول کر لیا لیکن اس کا یہ مشورہ مسترد کر دیا کہ کلکتہ کو فری پورٹ (آزاد بندرگاہ) بنا دیا جائے جس کی سہولت مشرقی اور مغربی بنگال دونوں کو یکساں حاصل ہو۔ کلکتہ کے بارے میں گورنر بنگال کا سازشی ذہن ایک طویل عرصے سے انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ 17 دسمبر 1944ء کو بھی گورنر کیسی نے لارڈ ویول کو لکھا تھا کہ "اگر مسلمانوں کو احساس دلایا جائے کہ انہیں کلکتہ ملنا ناممکن ہے تو پاکستان کے مطالبے کو زبردست دھچکا لگے گا۔"

**لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مشترکہ گورنر جنرل بننے کا مسئلہ:** کی آخری قسط میں جو نوائے وقت لاہور میں 5 مئی 1995ء کو شائع ہوئی --- جناب ڈاکٹر عارف صاحب نے فرمایا:

"کچھ دیر سے ہی سہی، لیکن کلکتہ کے بارے میں پوری سازش آشکار کرنے کا کریڈٹ سردار پٹیل کو جاتا ہے۔ کلکتہ دراصل کانگرس کو تلافی میں دی گئی بندرگاہ تھی جس کا وعدہ کانگرس نے تقسیم ہند کا سودا طے کرتے وقت مئی 1947ء میں بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ آزادی کے بعد 15 جنوری 1950ء کو ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے پٹیل نے اعلان کیا کہ "ہم نے یہ شرط رکھی تھی کہ ہم تقسیم ہند کو صرف اس صورت میں تسلیم کریں گے کہ کلکتہ ہمیں ملے۔ اگر

کلکتہ ہمارے ہاتھ نہ آیا تو گویا پورا ہندوستان جاتا رہا۔" بعد کے واقعات سے بھی اس سازش کی تصدیق ہو گئی۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ 2 جولائی کو (یعنی ریڈ کلف کے ہندوستان پہنچنے سے چھ دن پہلے) ہی ماؤنٹ بیٹن نے برٹش گورنمنٹ کو مطلع کر دیا تھا کہ اس نے تقسیم ہند کی جو سکیم بنائی ہے اس میں کلکتہ ہندوستان کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ (ریڈ کلف نے نہ صرف ماؤنٹ بیٹن کے اس وعدے کو پورا کیا جو اس نے بقول پٹیل کانگرس کے ساتھ کیا تھا بلکہ اس میں اپنا کچھ حصہ بھی اس طرح شامل کیا کہ "اس نے بنگال میں واقع "نادیا" کا پورا ضلع جو مسلم اکثریت والا علاقہ تھا ہندوستان کو دیدیا۔"

چھ ہزار مربع میل کا یہ علاقہ جس میں تین لاکھ پچاس ہزار مسلمان آباد تھے 14 اگست 1947ء کو تو پاکستان کا حصہ تھا لیکن دو روز بعد اسے ہندوستان کو دے دیا گیا۔

(ب)۔۔ ضلع گورداس پور کی ہندوستان میں شمولیت اور مسئلہ کشمیر: کلکتہ میں آبادی کے تناسب اور اس کی متنازعہ سیاسی وابستگی کے برعکس گورداسپور کے ضلع کی پوزیشن میں قطعاً کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس ضلع کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور یہ دوسرے مسلم علاقوں سے متصل تھا۔ اس لئے یہ قدرتی طور پر پاکستان کا حصہ بنتا تھا۔ شروع میں یہ ضلع پاکستان کو دیا گیا لیکن آزادی کے دو روز بعد یعنی 16 اگست 1947ء کو واپس لے لیا گیا۔ اس ضلع کو پاکستان سے اس طرح جدا کرنا ایک ایسی سوچی سمجھی سازش کا حصہ تھا جو 3 جون کے تقسیم ہند کے پلان کے اعلان سے بھی پہلے تیار کر لی گئی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کی سکیم کا اعلان کرنے کے بعد اگلے روز اس کی تفصیلات بتانے کے لئے ایک پریس کانفرنس کی۔ اس میں اخباری نمائندوں نے اس سے سوال کیا کہ گذشتہ رات اس کو جو تقریر ریڈیو سے نشر کی گئی تھی اس میں اس نے قطعی انداز میں یہ بات کیوں کہی تھی کہ دونوں ملکوں کی سرحدوں کا حتمی فیصلہ باؤنڈری کمیشن کرے گا اور ضروری نہیں کہ یہ فیصلہ ان سرحدوں کے مطابق ہو جو عارضی طور پر اختیار کی گئی ہیں۔ اس کا جواب خاصا معنی خیز تھا جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان دنوں اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ان اقدامات، بلکہ جزئیات تک میں مگن رہتا تھا جن سے وہ مسلمانوں کو آخری بار کچوکے لگا سکتا تھا۔ مندرجہ بالا سوال کے جواب میں اس نے صرف گورداسپور ضلع کی مثال دی اور کہا.... "میں نے یہ بیان محض اس لئے دیا تھا کہ پنجاب کے ضلع گورداسپور میں مسلمانوں کی آبادی 5 50 فیصد ہے۔ (اگرچہ ایک اور ذریعہ کے مطابق یہ 51.4 فیصد ہے۔ اس طرح غیر مسلموں کی تعداد 49.6 فیصد ہے۔ آبادی میں صرف 0.8 فیصد کے اس فرق کی وجہ سے اس بات کا امکان کم ہے کہ باؤنڈری

کمیشن اس پورے ضلع کو مسلم اکثریت والے علاقے کے حوالے کردے گا۔"

یوں سرحدوں کے تعین کا معیار ضلع سے تحصیل (بلکہ سب تحصیل کی سطح) پر آگیا اور پھر جب حتمی فیصلے کا اعلان ہوا تو اس معیار کو بھی بری طرح نظرانداز کر دیا گیا۔ اس ضلع کی تحصیلوں میں صرف پٹھانکوٹ میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، لیکن ماؤنٹ بیٹن کے پیش نظر جو اصل مقصد تھا وہ صرف پٹھانکوٹ کو ہندوستان کے حوالے کرنے سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ اصل مدعا یہ تھا کہ ہندوستان کو کشمیر سے ملانے کے لئے زمینی راستہ بنایا جائے۔ چونکہ پٹھانکوٹ کی تحصیل کشمیر سے ملحقہ نہیں تھی اس لئے 16 اگست کو پٹھانکوٹ کے علاوہ مسلم اکثریت کی حامل دو اور تحصیلیں (گورداسپور اور بٹالہ) بھی ہندوستان کو دے دی گئیں۔

ماؤنٹ بیٹن نے ایک اور پیش بندی یہ بھی کی کہ مہاراجہ کشمیر کے دل میں ہندوستان میں شمولیت کے سلسلے میں جو شکوک تھے وہ دور کئے اور اسے ضروری یقین دہانی کرائی کیونکہ اس وقت بظاہر یہ بات بالکل یقینی تھی کہ ریاست کی نئی انڈین یونین کے ساتھ ملحق سرحد نہیں ہوگی۔ تقسیم ہند کے پلان کے اعلان کے بعد ماؤنٹ بیٹن خصوصی طور پر وقت نکال کر 10 جون کو کشمیر چلا گیا اور بقول نین، مہاراجہ کو یہ یقین دلایا کہ "وہ اگر 15 اگست سے قبل دو میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے متعلق فیصلہ کر لے تو کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی کیونکہ وہ جس ملک کے ساتھ بھی الحاق کرے گا وہ اس کی ریاست کو اپنے علاقے کے طور پر اپنی حفاظت میں لے لے گا۔"

ظاہر ہے 10 جون کو ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ کشمیر اور ہندوستان کی سرحد مشترکہ ہوگی۔ صرف ظاہر ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے ذہن میں اس وقت تک اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ سوچ لیا تھا جو بعد میں 1947ء میں آشکار ہوا۔

ایک طرف مندرجہ بالا ٹھوس حقائق ہیں اور دوسری جانب محض ایک مفروضہ۔ کیا قائداعظمؒ کی جگہ کوئی اور شخص بھی مختلف فیصلہ کرکے قوم کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لے سکتا تھا؟

## مسئلہ کشمیر ایک ناسور

### (ریڈ کلف ایوارڈ کا شاخسانہ)

انگریز ہندو گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں ضلع گورداسپور اور پٹھانکوٹ کو ظالمانہ طور پر ہندوستان کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ تاکہ کشمیر تک راستہ مل سکے۔ چنانچہ تقسیم ہند کے فوراً بعد کشمیر کا الحاق زبردستی طور پر بھارت کے ساتھ کرلیا گیا جسے پاکستان اور اہل کشمیر نے قبول نہ کیا۔ معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں گیا اور کشمیر میں رائے شماری کا وعدہ کرکے عارضی جنگ بندی قبول کروائی

گئی، لیکن 1947ء سے آج 1995ء تک بھارت کی ہٹ دھرمی اور زور آوری کے باعث یہ مسئلہ لٹکتا چلا آ رہا ہے۔ اقوام متحدہ بھی وہاں فعال ہوتی ہے جہاں مسلمانوں کو "سزا" دینا مطلوب ہو۔ کشمیر میں ظلم کسی کو نظر نہیں آتا۔ کشمیر کا بھارتی حکومت سے زبردستی کا الحاق بدنیتی پر مبنی تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر غلام محمدؐ اونتو اپنے آرٹیکل "(کشمیر) کا توسیعی الحاق غیر قانونی ہے" کی آخری قسط میں رقمطراز ہیں:

"مغلیہ حکمران کمزور پڑنے سے 1750ء میں احمد شاہ ابدالی نے اس پر قبضہ کیا اور 1819ء تک کشمیر پر پٹھانوں کی حکومت رہی۔ اس غیر ملکی تسلط نے کشمیری عوام کی کمر توڑ دی اور عوام پر بے انتہا ظلم کئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1819ء میں برصغیر کے شمال مغربی علاقوں کو فتح کر کے ایک وسیع تر سکھ ریاست کے قیام کے منصوبے کی تحت کشمیر پر حملہ کیا مقامی آبادی نے پٹھانوں کا ساتھ نہیں دیا اور رنجیت سنگھ آسانی سے ریاست پر قابض ہوا اگر افغان حکمرانوں نے ریاستی عوام کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا تو رنجیت سنگھ اپنے عزائم میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ سکھوں نے تقریباً 29 سال کشمیر پر حکومت کی۔ یہ دور ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کا بدترین اور تاریک دور تھا۔ اس دور کی متعلق لارڈ برڈ وڈ نے اپنی کتاب "ٹو نیشنز اینڈ کشمیر" میں لکھا ہے کہ پوری سکھ حکومت مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ انتقام میں بھڑک رہی تھی اور اسی طرح سے ولیم صور کرانٹ نے رقم کیا کہ وہ "سکھ کشمیریوں کو جانوروں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی سکھ کسی مقامی کو قتل کرتا تھا تو حکومت اس وقت اس پر 16 سے 20 روپیہ تک جرمانہ عائد کرتی تھی اور اس جرمانے میں سے اگر مقتول ہندو ہے تو اس کے خاندان کو چار روپے اور اگر مسلمان ہے تو اس کے خاندان کو دو روپے ادا کئے جاتے تھے۔ کشمیریوں کے خلاف دوسری بڑی سازش اس وقت ہوئی جب انگریزوں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان معاہدہ امرتسر طے پایا اور کشمیریوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ 1846ء میں ہی بدنام زمانہ معاہدہ جسے معاہدہ امرتسر کہا جاتا تھا۔ معاہدہ امرتسر انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی اور تاریخ انسانی میں اس جیسا بدترین اور کوئی معاہدہ نہیں ملتا۔ اس معاہدے کے مطابق کشمیریوں کو سات روپیہ ٹانک سکھ شاہی میں گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا گیا تھا۔ اسی معاہدہ کی بنا پر آج بھی بھارت کی برہمنی حکومت کشمیر کو اپنا حصہ سمجھ کر حاکمیت کا دعویٰ کرتی ہے جو سراسر غلط ہے اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ یہاں بھارت کے دعویٰ کی کوئی اخلاقی اور سیاسی جوازیت نہیں ہے۔

1931ء میں کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی تحریک میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جموں میں تاریخی خطبہ عید پر بندش، قرآن پاک کی بے حرمتی اور 13 جولائی کے واقعات اسی سال میں ہوئے۔ کشمیری مسلمانوں کی زندگی مہاراجہ کے مظالم کی وجہ سے تنگ ہو چکی تھی، لیکن اس

کے باجود مسلمانوں نے ہر قسم کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا۔ اس جدوجہد کو دیکھ کر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے کشمیریوں کی مدد کے لئے دو تحریکوں کا آغاز کیا۔ ایک تحریک مجلس احرار نے شروع کی تھی۔ انہوں نے 1931ء میں مجلس عاملہ میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو جائز حقوق دلوانے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مولانا مظہر علی اظہر کی قیادت میں وزیراعظم کشمیر کے پاس ایک وفد بھی بھیجا لیکن وفد نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد مجلس احرار نے امتناعی احکامات کے باوجود رضاکاروں کو ریاست کی طرف روانہ کیا۔ جو رضاکار ریاست میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں کشمیر حکومت گرفتار کرکے جیل میں ڈالتی تھی۔ آخر میں حکومت پنجاب نے مہاراجہ کی درخواست پر رضاکاروں کو سرحد پر ہی روکنا شروع کیا۔

25 جولائی 1931ء میں شمالی ہند کے مسلمانوں نے شملہ میں "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کے نام سے دوسری تحریک شروع کی۔ اس تحریک کی نوعیت دستوری اور آئینی تھی اس کمیٹی پر قادیانیوں کا غلبہ تھا۔

اس کمیٹی کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ کمیٹی کشمیریوں کی آزادی کی بجائے قادیانیت کی تبلیغ کے لئے بنی تھی۔ جب مسلمانوں نے مرزا بشیر پر دستور بنانے کے لئے زور دیا۔ انہوں نے فوراً استعفیٰ دیا اور دوسرے قادیانیوں نے کمیٹی سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا اور کمیٹی کا بائیکاٹ کردیا اور جو قادیانی وکلاء ریاست میں مسلمانوں کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے انہوں نے پیروی کرنا چھوڑ دی۔ اگرچہ مرزا بشیر کے بعد حضرت علامہ اقبال کمیٹی کے صدر بنے لیکن انہوں نے قادیانیوں کا رویہ اور عزائم دیکھ کر تھوڑے عرصے کے بعد کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور ڈاکٹر اقبال قادیانی تحریک کے سخت مخالف بن گئے۔ ان کا خیال تھا کہ قادیانی اپنے عقائد کی نشرواشاعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے استعفیٰ دیا۔ قادیانیوں کی یہ ایک بہت بڑی سازش تھی کہ وہ اسلامیان کشمیر کو قادیانیت میں تبدیل کرکے ہندوستان کے اندر قادیانی اسٹیٹ قائم کریں، لیکن ان کے عزائم خاک میں مل گئے قادیانی وکلاء کی مقدمات کی پیروی نہ کرنا بھی ایک سازش تھی۔ حضرت علامہ اقبال اور دوسرے مسلمانوں کے سیاسی تدبر نے قادیانیوں کی اس سازش کو ننگا کرکے اسلامیان کشمیر کو ایک بہت بڑے عذاب سے بچایا۔

جولائی 1951ء کی تحریک کو اگرچہ مہاراجہ نے طاقت کے بل بوتے پر کچل دیا لیکن اس تحریک کے دوررس نتائج کشمیر کی سیاست پر پڑے۔ اس تحریک سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ حکمران خاندانوں کے علاوہ عوامی قیادت بھی کشمیر کی سیاست میں ابھری۔ برطانوی سرکار نے ریاست کے اندرونی معاملات کی تحقیقات کے لئے گلانسی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے بعد کشمیری مسلمان رہنماؤں کو احساس ہوا کہ ریاست کی مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے

اور آزادی کی تحریک کو مضبوط بنیادوں پر منظم کرنے کے لئے باقاعدہ ایک تنظیم کی تشکیل بے حد ضروری ہے۔ اس لئے چودھری غلام عباس مرحوم اور شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ 1938ء تک یہ تنظیم کام کرتی رہی اور اس دوران اس کے چھ سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ 1939ء تک کشمیر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور انہیں اپنے حقوق کا احساس دینے کے لئے مسلم کانفرنس نے کامیاب جدوجہد کی۔ ہر کمال را زوال، مسلمانوں کا یہ اتحاد و یگانگت جلد ہی ٹوٹ گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی کانگرسی سوچ مسلم کانفرنس پر غالب آئی اور شیخ صاحب کے ایماء پر مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے 1938ء میں ایک قرارداد منظور کر کے مسلم کانفرنس ختم کر کے شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ قرارداد کا متن یہ ہے۔

"ورکنگ کمیٹی کی رائے میں اب وقت آ گیا ہے جب ملک کی تمام ترقی پسند قوتوں کو ایک پرچم تلے جمع ہو کر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی جنرل کونسل کے سامنے یہ سفارش کرتی ہے کہ کانفرنس کے اگلے اجلاس میں اس تنظیم کا نام اور دستور اس طرح تبدیل کیا جائے کہ وہ تمام لوگ جو سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کے خواہاں ہوں بلا تفریق ذات، عقیدہ اور مذہب کانفرنس کے ممبر بن سکیں۔"

مسلم کانفرنس کو نیشنل میں تبدیل کرنا اسلامیان کشمیر کے لئے ایک خطرناک سازش تھی۔ شیخ عبداللہ کو یہ یہ خوش فہمی تھی کہ ہندو اور سکھ اس کا ساتھ دیں گے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کسی غیر مسلم نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس سازش کے کڑوے پھل آج بھی کشمیر کے عوام کو کھانے پڑتے ہیں۔ اگرچہ مسلم کانفرنس کا احیا دوبارہ ہوا لیکن نیشنل کانفرنس بدستور قائم رہی اور 1988ء تک اپنی سیکولر فکر کشمیری عوام پر مسلط کرتی رہی۔ شیخ عبداللہ غلام محمد بخشی، شمس الدین، جی ایم صادق (وزیراعظم) اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ (وزیراعلیٰ) نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہی ریاست کے اقتدار پر قابض رہے۔ اب نیشنل کانفرنس صرف ایک نام ہے۔ ریاست میں اب اس کا کام مجاہدین نے ختم کیا۔ اس کے تمام رہنما کشمیر چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں اور بھارتی آقاؤں سے مل کر موجودہ تحریک آزادی کو کچلنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپنے گرتے ہوئے وقار کو قائم رکھنے کے لئے 1946ء میں کانگرس کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کے طرز پر "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو ریاست پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لہٰذا اسے اقتدار عوام کو منتقل کرنا چاہئے۔ شیخ عبداللہ کی یہ تحریک زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ جب شیخ عبداللہ پر بغاوت کا مقدمہ چلا کہ انہیں جیل بھیج دیا گیا تو یہ تحریک بھی ختم ہوئی۔ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس عوام میں اپنا اعتماد کھو چکی تھی اس کا واضح ثبوت

1947ء کے اسمبلی انتخابات ہیں جن میں مسلمانوں نے 21 نشستوں میں سے 15 نشستیں حاصل کر لیں۔ مسلم کانفرنس کے باقی ماندہ چھ نشستوں پر امیدواروں کا کاغذات نامزدگی کی مسترد کی جانے کی بناء پر انتخابات منعقد نہ ہو سکے۔

14 اگست 1947ء کو برصغیر میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ کشمیری مسلمانوں نے پاکستان بننے اور الحاق کے حق میں جلسے جلوس کئے۔ مسلم کانفرنس کے رہنما چودھری غلام عباس جیل میں تھے۔ شیخ محمد عبداللہ بھی بغاوت کے الزام میں جیل میں تھے جس کی وجہ سے نیشنل کانفرنس کا موقف تقسیم کے وقت غیر واضح رہا اور اس کے لیڈر کنفیوژن کے شکار رہے، لیکن 1974ء میں شیخ اندارا معاہدہ میں شیخ عبداللہ کا موقف بالکل واضح ہو گیا۔ اصول تقسیم ہند کے مطابق کشمیر کو پاکستان کی ساتھ الحاق کرنا تھا مگر مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ عارضی الاالحاق کر کے کشمیری عوام کے خلاف سازش کر دی۔ اس خطرناک سازش کی وجہ سے کشمیر بھارت غلامی میں چلا گیا۔ اس سازش کو کامیاب کرنے میں پنڈت نہرو گاندھی مینن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خاص کردار رہا۔ اس میں انہوں نے شیخ عبداللہ کو بھی استعمال کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 18 تا 23 جون 1947ء کشمیر کا دورہ کیا۔ کشمیر جانے سے قبل پنڈت نہرو نے اسے کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کی سازش کو کامیاب کرنے کے لئے ایک تحریری نوٹ دیا۔

ماؤنٹ بیٹن کی بھارت دوستی کا اندازہ اس کے پولیٹیکل ایڈوائزر سر کوانراڈ کور فیلڈ کی تحریر سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "جب اس (لارڈ) نے کشمیر کا دورہ کیا مجھے ساتھ نہیں لیا (جو معمول کے خلاف تھا) میں نے اسے کشمیر کے متعلق جو کچھ بتایا اس نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ نہرو کشمیر کو بھارت کے ساتھ الحاق کروانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔"

پنجاب باؤنڈری کمیشن میں مداخلت کر کے بھارت کو کشمیر میں جانے کے لئے ایک زمینی راستہ مہیا کرنا بھی ایک بہت بڑی سازش تھی۔ وائس رائے کی چھیانویں (96) سٹاف میٹنگ 9 اگست 1947ء کی کاروائی سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ وائسرائے نے باؤنڈری ایوارڈ کو 15 اگست کے بعد ملتوی کیا گیا اور ریڈ کلف کو اپنا ایوارڈ تبدیل کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا اور ماؤنٹ بیٹن کے اشارے پر باؤنڈری ایوارڈ میں تبدیلی کی گئی۔ اس تبدیلی کے بعد وہ مسلم علاقے (جو پاکستان کے حصے میں آتے تھے) بھارت کو دیئے گئے۔ چودھری محمد علی اپنی کتاب "دی ایمرجنسی آف پاکستان" میں رقم طراز ہیں کہ تحصیل بٹالہ اور گورداسپور بھارت کو دینے سے ریڈ کلف نے اسے ریاست جموں و کشمیر تک راستہ مہیا کیا اور پاک بھارت کے درمیان تلخ ترین مسئلہ پیدا کیا۔ بقول محمد علی ریڈ کلف نے فیروز پور اور زیرہ کو پاکستانی علاقے میں شامل کیا تھا لیکن بعد میں اسے تبدیل کر کے بھارت کو دے دیا۔ باؤنڈری کمیشن میں تبدیلی سے بھارت کو فائدہ ہوا اور اس نے آسانی سے کشمیر

پر قبضہ کا منصوبہ بنایا۔ بھارت نے ریاست کی حدود مکھن پور تک ریل اور گاڑوں کے لئے سڑک بنائی بعد میں اس میں جون تک توسیع کی۔

کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے کانگرس ماؤنٹ بیٹن گٹھ جوڑ کے باوجود پاکستان اور بھارت کو 12 اگست 1947ء کو معاہدہ قائم کی پیشکش کی۔ پاکستان نے اسے قبول کیا اور بھارت نے اسے دستاویز الحاق کے ساتھ رکھنے کی شرط لگائی۔ چونکہ مہاراجہ نے بھارت کے ظہور پذیر ہونے سے تین روز قبل پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائم کیا تھا۔ لہٰذا 15 اگست کے بعد ریاست کو پاکستان کے معاملات میں بھارت کی مداخلت ایک جرم سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ بھارت کا یہ دعویٰ ہے کہ ہری سنگھ نے اس کے ساتھ الحاق کیا لیکن بعد کی تحقیقات یہ بھی بتاتی ہیں کہ الحاق ہوا ہی نہیں۔ بلکہ بھارت نے ہری سنگھ کے جعلی دستخطوں سے دستاویز الحاق تیار کی۔ اس سلسلے میں برطانوی مسٹر لیمپ نے اپنی کتاب میں تحریری کیا ہے کہ "بھارت جس نام نہاد مسودہ الحاق کو پیش کرتا ہے وہ جعلی ہے اور اس پر مہاراجہ کے اصل دستخط موجود نہیں ہیں۔"

مہاراجہ نے مسلمانوں کی آبادی کو ختم کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ بقول ہیرووڈ جولائی 1947ء کے آخر میں مہاراجہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا اسلحہ جمع کرائیں اور اگست میں آر ایس ایس اور سکھوں نے قتل و غارت شروع کی۔ اس سازش کے تحت جموں میں 5 لاکھ مسلمان قتل اور اغوا کئے گئے۔ کلکتہ کے اسٹیشن کے ایڈیٹر مسٹر آئین اسٹیفن نے اپنی کتاب "دی ہارنڈ مون" میں جموں کے مسلمانوں کے اس وحشیانہ قتل عام کو اس طرح بیان کیا۔ "1947ء کی خزاں تک تقریباً 5 لاکھ مسلمانوں کی یہ آبادی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ان میں سے تین لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا مکمل طور پر نام و نشان مٹ چکا تھا جبکہ باقی ماندہ لوگ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔"

بھارت نے اپنی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے 5 مارچ 1948ء کو شیخ عبداللہ کو ریاست کا وزیراعظم بنایا۔ پٹیل اور وی پی مَن نے نہ چاہتے ہوئی بھی شیخ صاحب کے وزیراعظم بننے کے ساتھ اتفاق کیا۔ وہ ایک طرف مظلوم مسلمانوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف شیخ عبداللہ سے مزید کام لینا چاہتے تھے۔ شیخ عبداللہ چھ سال تک ریاست کا وزیراعظم رہا۔ نہرو نے شیخ کے ساتھ اپنی لمبی دوستی اور رفاقت کو نظرانداز کر کے اپنے دوست اور ہمنوا شیخ عبداللہ کو اگست 1953ء میں اقتدار سے معزول کر کے جیل میں بند کیا اور کشمیر میں غیر قانونی انتظامی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی۔ پنڈت نہرو نے شیخ عبداللہ کو پہلی بار سیکولرازم کی کڑوی گولی کھلا دی۔ شیخ صاحب کو معزول کر کے بخشی کو وزیراعظم بنایا گیا۔ 1951ء میں نام نہاد انتخابات کے ذریعے کشمیر اسمبلی وجود میں آئی۔ جس کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے صرف ایک حصے کی اسمبلی قرار دیا اور ایسے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا۔ 1956ء میں جب بھارت نے اس اسمبلی کے ذریعے

مہاراجہ کے مشکوک یا عارضی الحاق کی توسیع کروائی تو اس سلسلے میں جنوری 1957ء میں سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد نمبر 122/57 منظور کی اور واضح کیا کہ اس اسمبلی کو ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ ریاست کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے ہوگا۔ بھارت نے مقبوضہ ریاست میں کئی نام نہاد انتخابات کروائے لیکن اقوام متحدہ کی نظر میں ان انتخابات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بھارت نے کامراج پلان کے تحت بخشی کو معزول کر کے شمس الدین کو ریاست کا وزیراعظم بنایا۔ شمس الدین کے دور میں ایک سازش کے تحت 1962ء میں درگاہ حضرت بل سے موئے مقدس چرایا گیا۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے اور بھرپور احتجاج کو دیکھ کر اس وقت کے بھارتی وزیراعظم نے کہا تھا کہ ”کشمیر بھارت کے ہاتھ سے چلا گیا۔“

1964ء میں غلام محمد صادق ریاست کے وزیراعظم تھے۔ بھارت نے ایک سازش کے تحت ریاست کے آئین میں غیر قانونی طور پر ریاستی اسمبلی سے ترمیم کروائی۔ ریاستی آئین میں با اختیار صدر ریاست اور وزیراعظم کے عہدوں کو ختم کر کے گورنر اور وزیراعلیٰ کے عہدے تعارف کرائے۔ بھارتی سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار وسیع کر کے کشمیر تک بڑھایا مرکزی انتخابی کمیشن اور سول سروسز کے قوانین کو ریاست میں لاگو کیے گئے اور ریاست کی خودمختاری کو ختم کر کے اسے بھارت کا ایک صوبہ بنایا۔

بھارت نے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تنظیموں کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ 1947ء میں مسلم کانفرنس پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو ان نظریات سے دور رکھنا تھا جن کا پرچار مسلم کانفرنس کرتی تھی۔ دوسرا مقصد نیشنل کانفرنس اور دیگر بھارت نواز سیاسی تنظیموں کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ ستر کی دہائی میں جماعت اسلامی، اسلامک سٹڈی سرکل اور دیگر تنظیموں نے منظم طریقے سے مسلمانوں کی فکری لام بندی شروع کی اور جگہ جگہ کتب خانے اور تبلیغی سنٹر قائم کیے تو بھارتی سپریم کورٹ نے حکومت کے شہ پر 16 دسمبر 1971ء کو آل کو آل جموں اینڈ کشمیر اسلامک سٹڈی سرکل کو اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے پر پابندی لگائی۔

جس کی وجہ سے سرکل کے ہزاروں کتب خانے بند پڑے ہیں جماعت اسلامی پر بارہا پابندی لگائی گئی۔

بھارت نے کشمیری مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لئے نت نئی سازشیں اور منصوبے بنائے اور کشمیریوں کی ثقافت، ادب اور معاشرتی زندگی کو ہندوانہ رنگ میں ڈھالنے کی تحت کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں سرکاری تعلیمی اداروں کا نصاب سیکولرازم کی بنیاد پر بنایا گیا۔

نامور حریت پسند شہید محمد مقبول بٹ کو گرفتار کیا گیا اور ایک طویل عرصہ تک نظر بند

رکھنے کے بعد ان پر غیر قانونی طور پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا اور آخر انہیں 11 فروری 1984ء کو تہاڑ جیل میں پھانسی دی گئی ان کا جسد خاکی تک کشمیریوں کے حوالے نہیں کیا گیا۔

1987ء کے انتخابات میں ریاست کی بہت ساری سیاسی اور مذہبی تنظیموں نے حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ان نئے رجحانات نے مسلم متحد محاذ کو جنم دیا۔ لیکن بھارت نے ایک گھمبیر سازش کے تحت محاذ کے امیدواروں کو ہرادیا۔ جس کی پاداش میں 1989ء کے انتخابات میں محاذ نے بائیکاٹ کر دیا اور صرف دو فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ یہ بھارتی قبضے کے خلاف احتجاج تھا اور کشمیری قوم نے بھارت کے خلاف عسکری جدوجہد کا اعلان کیا۔ یہ جدوجہد ساتویں سال میں داخل ہو چکی ہے۔ کشمیری قوم نے کیا پایا اور کیا کھویا اس کو دنیا نے ٹھیک طرح سے دیکھ لیا۔ بھارت کشمیریوں کی اس تحریک آزادی کو دبانے میں کشمیریوں پر ہر قسم کے مظالم آزما رہا ہے اور سازشیں کر رہا ہے۔ اس دوران بنائے گئے کالے قوانین، متحد آپریشنز، کرفیو، کریک ڈاؤن اور نسل کشی کشمیری قوم کو ختم کرنے کی سازش کے چند پہلو ہیں۔ اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر جہاد کشمیر کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری کشمیر قوم اتحاد اور اتفاق کو اپنے دامن سے جانے نہ دے۔ اس سے ہر بھارتی سازش ناکام ہو جائے گی اور ہم اپنی منزل ضرور پائیں۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور مورخہ 13 فروری 1995ء)

# تحریک پاکستان میں پریس کا حصہ

تحریک کو نشوونما دینے کے لئے پریس نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کے مقاصد اور مطالبات کی ترجمانی کے لئے پنجاب میں جن اخبارات نے حصہ لیا ان میں پیسہ اخبار، زمیندار، احسان، انقلاب اور نوائے وقت بڑے نمایاں ہیں۔

<u>پیسہ اخبار:</u> یہ اخبار منشی محبوب عالم نے 1887ء میں فیروز والا ضلع گوجرانوالہ سے جاری کیا۔ جسے بعد میں لاہور منتقل کر دیا گیا۔ لاہور آنے کے بعد اس اخبار نے مسلمانوں کی ترجمانی کو اپنا شعار بنایا۔ پہلے یہ ہفتہ وار آٹھ صفحات پر نکلتا تھا جس کا سالانہ چندہ بارہ آنے (پچہتر پیسے) تھا۔ بعد میں اسے روزنامہ کر دیا گیا۔ پیسہ اخبار کی قیمت ایک پیسہ مقرر کی گئی۔ یہ اسلامی نظریات کا حامل اخبار تھا۔ اور مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار تھا۔ اسلامی تحریکوں کو اجاگر کرنے میں پیش پیش رہتا۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے میں اس اخبار نے بہت اچھا کردار ادا کیا۔ اس اخبار کو شروع میں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ منشی محبوب عالم اس کی کتابت اور سنگ سازی تک خود کرتے تھے۔ خود اس کا مواد لکھتے اور چھاپ کر پیش کرتے۔ صحافت کے میدان میں اسے مسلمانوں

کے مقاصد کا اولین علمبردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ منشی محبوب عالم بڑے عالم فاضل اور سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے اردو میں اسلامی انسائیکلوپیڈیا دو جلدوں میں تحریر کر کے شائع کیا تھا۔ جو ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جبکہ آج کے دور میں ایسا کام بڑے بڑے ادارے انجام دیتے ہیں۔ منشی محبوب عالم 1856ء میں بمقام فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے 1886ء میں انہوں نے زمیندار نامی ماہنامہ بھی نکالا لیکن وہ جاری نہ رہ سکا۔ آپ نے 1933ء میں اڑسٹھ (68) برس کی عمر میں وفات پائی۔

پیسہ اخبار متنوع خبروں، علمی اور ادبی کاوشوں سے مزین اخبار تھا۔ ادب کی بجائے اخباریت اس پر غالب تھی۔ اس کے اداریئے عام موضوعات پر ہوتے۔ اسی اخبار کے زیر سایہ آئندہ چل کر بہترین صحافتی لوہا منوانے والوں نے تربیت حاصل کی۔ جن میں حکیم غلام نبی (مدیر الحکماء) لالہ دینا ناتھ (مدیر ہندوستان) منشی احمد دین (مدیر۔ غمخوار عالم) محمد دین فوق مدیر (کشمیری میگزین) اور مولوی شجاعت الدین (مدیر۔ ملت) کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ اخبار اخبار تجارتی اصول پر چلایا گیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اور اخبارات نے بھی سر نکالا۔ یہ اخبار تقریباً نصف صدی تک منصۂ عالم پر جلوہ گر رہا۔ پیسہ اخبار سٹریٹ انار کلی لاہور میں آج بھی اس کی یاد دلاتی ہے۔

**زمیندار:** مولانا ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین احمد نے یہ ہفت روزہ جون 1903ء کو جاری کیا۔ جو محکمۂ ڈاک کے ریٹائرڈ پوسٹماسٹر تھے۔ 1909ء میں مولانا سراج الدین انتقال کر گئے اور ان کی وصیت کے مطابق مولانا ظفر علی خاں نے اس کی ادارت نبھانے اور اسے جاری رکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مولانا ظفر علی خاں کرم آباد تحصیل وزیر آباد میں پیدا ہوئے 1894ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کر کے مختلف جگہ کام کرتے رہے، اور دکن ریویو سے بھی وابستہ رہے۔ جس کی بناء پر حاسدین نے آپ کو پریشان کیا۔ آخر انہیں ستمبر 1909ء میں حیدر آباد سے نکلنا پڑا جہاں وہ نظام حیدر آباد کی ملازمت میں بہترین خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ سیدھے اپنے آبائی گاؤں آئے۔ بیمار والد نے 9 نومبر 1909ء کو انتقال کیا تو ظفر علی خاں نے زمیندار کی ادارت سنبھال لی۔

مولانا اسے ایک اسلامی نظریاتی اخبار کے طور پر پیش کیا اور جلدی ہی اس کا لوہا سب ماننے لگے۔ ظفر علی خاں بیک وقت شعلہ نوا، مقرر، بے باک صحافی، صاحب طرز اور زود نویس ادیب اور شعلہ بیان شاعر تھے، اور حسب موقع فی البدیہہ شعر کہنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ زمیندار ایک مصلح، مبلغ اور نقاد قسم کا اخبار تھا۔ حکومت سے ٹکر لینا اسے معیوب نہ تھا۔ بارہا اس کی ضمانت ضبط ہوگئی، لیکن حق گوئی اور بیباکی کے جو ریکارڈ زمیندار نے قائم کئے اسے دشمنوں نے بھی تسلیم کیا۔ خدمت اسلام اور خدمت اہل اسلام اس کا شیوہ رہا۔ اس اخبار نے مسلم لیگ کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلافت کی تحریک کو زوردار طریقے سے رپورٹ کیا، اور مغربی طاقتوں پر تابڑ توڑ حملے کرتا

رہا- حتیٰ کہ انگریزی تہذیب و تمدن اور بے حیائی اور عریانی کو بھی زمیندار میں جگہ دے کر مذمت کی جاتی رہی- جس کے نتیجہ میں چھاپہ خانہ اور ضمانت تک ضبط ہو گئی' لیکن مولانا کی تحریروں نے لوگوں کے دلوں سے انگریز کا خوف نکال دیا تھا- اور وہ بزدلی کی بجائے شیر دلی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے- ضمانت ضبط ہوتی تو لوگ چندہ جمع کر کے ضمانت پھر جمع کروا دیتے اور اخبار نکلنے لگتا- اس اخبار نے مسلم لیگ کے حق میں اداریئے لکھے مسلمان رہنماؤں کو اجاگر کر کے ان کی اہمیت بڑھائی' اور پاکستان کی ضرورت' اور تشکیل کے لئے مدلل مضامین لکھتے رہے- انگریزوں کی جڑ کاٹنے اور تحریک خلافت کو آگے بڑھانے میں بھی اس اخبار نے بہت کردار ادا کیا- اس کے ایڈیٹروں میں ظفر علی کے علاوہ عبدالمجید سالک' غلام رسول مہر' مولانا مرتضیٰ احمد میکش کے نام بھی آتے ہیں- پاکستان بننے کے بعد بھی کافی عرصہ یہ اخبار نکلتا رہا اور آخر دم توڑ گیا-

**انقلاب:** مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار اخبار انقلاب مولانا عبدالمجید سالک کی ادارت میں 4 اپریل 1927ء سے شائع ہونا شروع ہوا- ان کے معاون غلام رسول مہر تھے- یہ دونوں بزرگ صحافی 21 مارچ 1927ء کو زمیندار سے الگ ہو کر علامہ اقبال کے مشورہ سے "انقلاب" نکالنے میں کامیاب ہو گئے- یہ اخبار بھی ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور انگریزوں کی ظالمانہ روش کے پرخچے اڑاتا رہا دو قومی نظریہ کی بھرپور حمایت کی گئی- نہرو رپورٹ آئی تو اس کی مخالفت میں زور قلم صرف کیا اور مسلمانوں کو اس کے نقصانات سے آگاہ کیا- سائمن کمیشن ہندوستان میں وارد ہوا تو اس اخبار نے ہندوستان میں اسے دو بڑی قوموں کے وجود کا احساس دلایا-

جب انڈین مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی- ایک طرف علامہ اقبال اور سر محمد شفیع کی لیگ تھی اور دوسری طرف قائداعظم اور سیف الدین کچلو تھے- ان کو اتحاد کی طرف بلانے کے لئے انقلاب نے انقلابی مضامین لکھ کر اتحاد کی اہمیت واضح کی اور آخر سر محمد شفیع صدارت سے الگ ہو گئے اور قائداعظم کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر تسلیم کر لیا گیا-

انقلاب نے مسلمانوں کے سرکاری ملازمت میں کم کوٹے کو اُجاگر کر کے ان کی حق تلفی کی نشاندہی کی اور مسلمانوں کا ملازمتوں میں کوٹا بڑھوایا- یونینسٹ پارٹی سے مسلم لیگ کے تعاون سے جو ثمرات مسلمانوں کو حاصل ہو سکتے تھے- انقلاب نے اس سلسلے میں بھی بہتر کردار ادا کیا- چنانچہ جناح سکندر پیکٹ طے پایا- انقلاب نے تشکیل پاکستان میں بھی بہت مدد دی- آخر یہ اخبار 1949ء میں بند ہو گیا-

**احسان:** علامہ اقبال کی سرپرستی میں ملک نورالٰہی نے یہ اخبار 1924ء میں جاری کیا- معاونین میں مولانا مرتضیٰ خاں میکش' مولانا چراغ حسن حسرت' وقار انبالوی کے نام قابل ذکر ہیں- یہ پہلا اخبار تھا کہ خبریں حاصل کرنے کے لئے اس کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر کا انتظام کیا گیا تھا-

اس نے احرار کی اینٹی قادیانی تحریک کی بھرپور حمایت کی۔ مسجد شہید گنج کی واگزاری کے لئے رائے عامہ کو منظم کیا اور مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کو اجاگر کر کے پاکستان کی تشکیل کی طرف قدم بڑھانے میں مدد کی۔ مسلم لیگ کے پروپیگنڈہ آرگن کے طور پر اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ علامہ اقبال اس میں اپنی نظمیں اشاعت کے لئے بھیجتے تھے۔ مشہور ادیب باری مرحوم اس میں "گرد و پیش" لکھتے تھے، اور چراغ حسن حسرت "سند باد جہازی" کا کالم تحریر کرتے تھے۔

**نوائے وقت:** 23 مارچ 1940ء کو حمید نظامی کی ادارت میں پندرہ روزہ نوائے وقت کا اجراء ہوا۔ ساتھیوں میں ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر جمال بھٹہ اور ڈاکٹر شبیر حسن کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اس میں حمید نظامی کے کالم "غریب شہر اور جانی کیا سوچتی ہے" عوام میں بہت مقبول تھے۔ اس اخبار کو بھی دراصل مسلم لیگ کے کاز کے لئے کام کرنا تھا۔ اس کا طریقہ کار ایسا تھا کہ ہندوؤں کے خیالات جو وہ مسلمانوں کے خلاف ظاہر کرتے تھے۔ اس میں اقتباساً درج کئے جاتے۔ جس سے وہ ناراضگی کی حد تک سیخ پا ہو جاتے۔

15 نومبر 1942ء سے نوائے وقت ہفت روزہ بن گیا اور پھر 22 جولائی 1944ء سے اسے روزنامہ کر دیا گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ اپنے عروج پر تھی۔ پابندیاں تھیں۔ ہر طرف بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ کیونکہ حکومت نے اخراجات میں کٹوتی کو ہر سطح پر نافذ کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں ایک نئے روزنامہ اخبار کا چل جانا بڑی بات تھی۔ روزنامہ کے مالک حامد محمود اور حمید نظامی دو حضرات تھے۔ اس کا نظریہ بھی پاکستان کا قیام اور مسلم لیگ اور مسلمانوں کی بھرپور حمایت کرنا تھا۔ جس میں یہ اخبار کامیاب رہا۔ حق گوئی اور بیباکی کے میدان میں بھی اس اخبار نے جھنڈے گاڑ دیئے اور صحتمند انداز میں اپنی بات کہنا اس کا طرۂ امتیاز تھا اور سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنا اس کے مدیران کا شیوہ تھا۔

یونینسٹ پارٹی کی حمایت روزنامہ شہباز کرتا تھا لیکن نوائے وقت نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور حکومت کی ناراضگی کو کوئی اہمیت نہ دی 1946ء کو سول نافرمانی کی تحریک میں نوائے وقت نے مسلمانوں کی حمایت کی اور انگریزوں پر تنقید کی، اور حق کی آواز بلند کرنے میں کسی اندیشہ کو دل میں جگہ نہ دی آج نوائے وقت۔ پاکستان میں یہ اخبار کراچی، ملتان، لاہور، راولپنڈی اسلام آباد سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس ادارہ کا انگریزی روزنامہ نیشن بھی چند سالوں سے منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

## انگریز ہندو گٹھ جوڑ کا نیا رُوپ

پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال ہونے کو ہیں، لیکن انگریز ہندو گٹھ جوڑ نت نئے روپ

بدل کر سامنے آتا رہتا ہے۔ کبھی انگلستان ہمیں نیچا دکھانے کی فکر میں تھا۔ کبھی امریکہ ہمارا بہترین دوست تھا۔ جب کام نکل گیا تو وہی ہمارا بدترین مخالف بن کر اُبھرا اور ہمارے بدترین دشمن سے گٹھ جوڑ کرنے کا ذریعہ بھی بنا۔ یہود بھی پاکستان کے دشمن نمبرایک بن کر اُبھر رہے ہیں کیونکہ اسلامی ممالک میں دم خم والا ملک صرف پاکستان ہی رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد عالمگیر خاں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے حالیہ آرٹیکل بعنوان "پاکستان یہود ہنود کے شکنجے میں" میں فرماتے ہیں:

"بنظر غائر دیکھا جائے تو اس وقت پاکستان کے اردگرد یہود و ہنود کا آہنی شکنجہ بری طرح کسا جارہا ہے، اور ہم ہیں کہ خواب خرگوش میں مدہوش پڑے ہوئے ہیں۔ نوشتۂ دیوار ابھرتا چلا آرہا ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آرہا ہے یا پھر ہم تجاہل عارفانہ سے کام لے کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو محفوظ تصور کر رہے ہیں۔ حالات حاضرہ کھلے طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ نیو ورلڈ آرڈ کا اصلی ہدف انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلے ہوئے اسلامی ممالک کی یکجہتی کی ہر کوشش کو سبوتاژ کرنا ہے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھنا ہے، اور جو اسلامی ملک ذرا سر اونچا کرنے کی جسارت کرے اسے کھلی جنگ یا یخ بستہ خفیہ ڈپلومیسی بہ الفاظ دیگر دہشت گردی کے ذریعے کچلنا ہے۔ لیبیا اور عراق کا جو حشر ہوا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ امریکی سفیر نے پہلے خود ہی صدر صدام کو کویت پر حملے کے لئے اکسایا تاکہ مغربی ممالک کو گلف وار کا جواز مل سکے جس کا اہم نصب العین عراق کا سر کچلنا اور عرب تیل کے ذخیروں کے نزدیک اپنے پاؤں جمانا تھا۔ کیونکہ تیل امریکہ اور یورپ میں نایاب ہے اور تیل کے بغیر تمام یورپی اور امریکی صنعت و ریسرچ مکمل طور پر ٹھپ ہو سکتی ہیں۔ عرب تیل پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے مغربی ممالک عرصہ دراز سے کوشاں تھے اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی سریع الحرکت فوجیں گلف سے 2500 میل دور بحر ہند میں ایک چھوٹے سے جزیرے ڈیگو گارشیا جس کا رقبہ 15 مربع میل ہے اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع جبوتی اور اومان میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے دور مار بمبار بی 52 پرواز کے لئے تیار کھڑے رہتے ہیں۔ گلف وار میں منافق بھارت نے ان کو پٹرول مہیا کرنے کی سہولت بھی دی تھی۔ بحر ہند میں امریکہ کے 23۔ فرانس کے 20 (اور ایک بحری سرنگیں صاف کرنے والا جہاز) انگلینڈ اور آسٹریلیا کے چار چار بحری جنگی جہاز ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ امریکہ نے اپنے میکڈل کے ہوائی اڈے میں سریع الحرکت جوائنٹس ٹاسک فورس (آر ڈی جے ٹی ایف) گلف پر حملہ آور ہونے کے لئے پابہ رکاب تیار رکھی ہوئی ہے۔ اس خلیجی جنگ کے تمام اخراجات سعودی عرب اور کویت کو برداشت کرنے پڑے۔ الجیریا اور مصر میں "بنیاد پرستی" کی بالکل غلط مغربی اصطلاح کے بہانے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے سر تہ تیغ کئے جا رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اسلام کے بنیادی

ارکان توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر ستار نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ سخت حیرت ہے کہ بعض مسلمان حکمران بھی اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اسلامی بنیاد پرستی کو دہشت گردی کا نام دے رہے ہیں۔ بنیاد پرستی اور دہشت گردی دو بالکل مختلف اصطلاحیں ہیں۔ ان کا آپس میں دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ اسلام دہشت گردی کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ صلح و آشتی اور سلامتی کا پیامبر ہے۔

مشرق وسطٰی کے اسلامی ممالک کو زیردست کرنے کے بعد امریکہ اور مغربی ممالک کی پوری توجہ پاکستان۔ ایران اور چین کی طرف ہے۔ اب مندرجہ بالا تمام اقدامات اور ہتھکنڈے ان ممالک کی سرکوبی کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے خردمند لوگ بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ فی زمانہ امریکہ یو۔ این۔ او تقریباً تمام مغربی ممالک میں خفیہ حکومت یہودیوں کی ہے اور اس کرۂ ارض کے اہم فیصلے ان کے اشاروں پر ہو رہے ہیں۔ بیچارہ کلنٹن بھی ان کے ہاتھوں مجبور بے بس ہے۔

گو اس نے حال ہی میں کھلم کھلا تسلیم کیا ہے کہ پاکستان کے ساتھ متعدد بے انصافیاں ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں جھوٹی تسلیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دے سکا ہے۔ اس کی کیبنٹ کے 14 ممبروں میں سے 7 یا 8 یہودی ہیں۔ امریکی کانگرس میں بھی یہودیوں کا سکہ چل رہا ہے۔ امریکہ کے تمام ذرائع ابلاغ پر صیہونی قبضہ ہے۔ امریکی معیشت یہودیوں کی مٹھی میں ہے۔ اگر آپ یہودی پروٹوکالز جو کہ 1896ء میں 300 سرکردہ یہودیوں نے خفیہ طور پر باسل (سوئٹزرلینڈ) میں مرتب کئے تھے ایک نظر دیکھ لیں تو آپ کو موجودہ صیہونی لائحہ عمل کی سمجھ آ جائے گی، اور ان ذلیل ترین حرکات کا بھی انکشاف ہو جائے گا جن کی اجازت یہودیوں کو مقصد برآری کے لئے دی ہوئی ہے۔ ان پروٹوکالز کی تفصیل ایک کتابچہ میں دی ہوئی ہے جو کہ بہت عرصہ ہوا کویت میں شائع ہوا تھا اور اس کا اردو ترجمہ پاکستان کے پرانے بک سٹالوں میں مل جاتا ہے۔ یہودی وہ مذہب و قوم ہے جس کا کوئی ممبر نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ وہ یہودی کی اولاد نہ ہو۔ اس خودپرست قوم کی بہت سی بظاہر بے ضرر تحریکیں دنیا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ شکر ہے کہ پاکستان میں سے ان کی فری میسن نامی شیطانی تنظیم تو بالکل ناپید ہو چکی ہے، لیکن باقی کافی عروج میں ہیں۔ ان کتابوں کا خفیہ مقصد وقت آنے پر صیہونی اثر و رسوخ کو فروغ دینا ہے۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اسرائیل کتنی بڑی ایٹمی طاقت بن چکا ہے۔ جریدہ جینز کی ایک مصدقہ سراغرسانی رپورٹ کے مطابق اس وقت اسرائیل کے پاس سات ایٹمی ری ایکٹر ہیں اور تقریباً دو سو خوفناک ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ملک نے این پی ٹی پر دستخط نہیں کیئے ہیں۔ اس پر کوئی ایٹمی پابندی عائد نہیں ہے نہ پریسلر ترمیم جبکہ پاکستان پر پریسلر ترمیم سے پہلے

سمنگٹن (سیکشن 669) 1961ء میں گلین (سیکشن 670) 1979ء میں جاری شدہ ترمیمیں لاگو تھیں۔

چنانچہ امریکہ نہ تو ہمیں ہمارے خریدے ہوئے ایف 16 طیارے دے رہا ہے اور نہ ان کی ادا کی ہوئی قیمت واپس کر رہا ہے۔ اب تو امریکہ اپنے وعدے کے خلاف ہمارے مرمت کے لئے گئے ہوئے پرزوں کو بغیر مرمت کے واپس کر رہا ہے یہ بین الاقوامی اندھیر نگری نہیں ہے تو کیا ہے؟ اسرائیل کو نیٹو میں شامل کرنے سے مغربی عزائم بالکل واضح ہو گئے ہیں۔ وہ اسرائیل کو اسلامی ممالک کے خلاف ایک طاقتور پولیس مین بنا رہا ہے۔ ہم ان سب صیہونی چیرہ دستویوں سے لاتعلق امریکی لبادے میں ملبوس یہودیوں کے اہداف کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اب تو شنید ہے کہ پاکستان اپنے نہایت حساس ادارے ٹیلی کمیونیکیشن امریکی یہودی کمپنی گولڈمین سینکلس جس کا کہ اسرائیل کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کی دسترس میں دے رہا ہے۔ اس وقت ہندو و اسرائیل دہشت گرد ہمارے بالکل غیر اسلامی فرقہ وارانہ فسادوں کی اوٹ میں ہمارا تیا پانچہ کر رہے ہیں۔ ہماری تمام سرحدیں ان کی زد میں ہیں۔ اومان کو ہم نے گوادر میں رقبہ دے رکھا ہے، اور اومان نے اسرائیلی طیاروں کو اپنے علاقے پر پرواز کرنے اور انہیں فضائی راستہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ نتیجتاً گوادر سیدھا ان کی زد میں آگیا ہے۔ جہاں سے وہ بلا روک ٹوک پاکستان اور ایران کے کسی بھی حصے کو اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا پہلا نشانہ ایٹمی تنصیبات ہوگا۔ ہندوستان ٹائمز کی ایک حالیہ خبر (بحوالہ دی نیوز (95-4-10) کے مطابق اسرائیل نے اپنے ائرفورس چیف میجر جنرل بوڈنگز کے ذریعے بھارت کو ایک نہایت پرکشش دفاعی معاہدے کی پیشکش کی ہے جو کہ اویکس اور آرپی وی جیسے جدید ترین فضائی نگرانی اور وارننگ سسٹم اور اسرائیل سراغرسانی سیٹلائٹ کے استعمال کے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دے دے۔ یاد رہے کہ جودھ پور بھارت کے جنوب مغرب میں ائرکمانڈ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس سے پیشتر 1962ء میں جب بھارت کو چین کے ساتھ جنگ میں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اسرائیل نے بھارت کو ایک لاکھ خطرناک بم بہت سے 80 ملی میٹر کے مارٹر 120 ملی میٹر کی توپیں امداد میں دی تھیں۔

اس کے بعد بھی اسرائیل نے بھارت کو بہت سا جنگی الیکٹرونک اسلحہ ہیلی کاپٹر وغیرہ بھی نذر کیے تھے۔ بھارت کے فوجی افسروں کو اسرائیل میں ٹریننگ کی سہولت بھی دی گئی۔ بھوج پاکستان کی سرحد سے صرف 80 کلومیٹر ہے اور جودھ پور 150 کلو میٹر۔ تقریباً دو ماہ قبل امریکی ڈیفنس سیکرٹری ولیم پیری بھی جودھ پور کا دورہ کر چکا ہے!

مقام فکر ہے کہ یہ شطل کس کے لئے ترتیب دیئے جا رہے ہیں؟ جواب اظہر من الشمس

ہے- پاکستان اور ایران کے لئے پاکستان یہودیوں کی ہٹ لسٹ پر سرفہرست ہے کیونکہ یہ واحد اسلامی ملک ہے جس کے پاس ایٹمی ٹیکنیک ہے اور جس کی بری، بحری، اور فضائی افواج کی دلیری شجاعت اور بری فوج تیسرے نمبر، پر ائرفورس چوتھے نمبراور بحری فوج دسویں نمبر پر ہے۔ پاکستان کی افواج مجموعی طور پر بھارتی افواج کے نصف کے برابر ہیں، لیکن پاکستان کا ہر مسلمان مجاہد ہے جس کے دل میں جذبہ جہاد اور شوق شہادت ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

اب امریکہ نے بھارت کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرلیا ہے- دوسری طرف اس نے کشمیر کو متنازعہ علاقہ بھی قرار دے دیا ہے- یہ دونوں اقدامات بھی نیوورلڈ آرڈر کی اہم کڑیاں ہیں- دوربین مفکر اس نکتے کو سمجھ رہے ہیں کہ ان کا مقصد کشمیر کو اپنی خفیہ ڈپلومیسی سے خودمختار کروانا ہے جسے تیسری آپشن کہا جارہا ہے- اس کے بعد وہاں امریکی دولت کی چکاچوند پیدا کرکے مفلس و بے کس کشمیریوں کو جوکہ 6 لاکھ بھارتی فوجیوں کی دہشت گردی کے ہاتھوں لہولہان ہو رہے ہیں اپنے سیاسی چنگل میں پھنسا کر یا زبردستی کشمیر میں امریکی فوجی اڈے بنائے جائیں گے- یہاں سے پاکستان اور چین کے سینے چھلنی کرنا بہت آسان ہو جائے گا- خدا کرے ہمارے رہنماؤں کو جلد سمجھ آجائے کہ ان تمام بیانات اور سیاسی بھول بھلیوں کا ہدف کا پاکستان ایران اور چین کے گرد یہود و ہنود کے فوجی اڈوں کا جال بچھانا ہے۔

مجاہدین اسلام کے خون پسینے سے حاصل کیا ہوا کابل اب ایک گہری سازش کے تحت خانہ جنگی کا شکار ہے- یہاں بھی بھارت تیزی سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے- بھارت کے بیس بمبار طیارے برہان الدین ربانی کے مخالفوں پر بمباری کر رہے ہیں اور اعلیٰ بھارت افسر مسلسل کابل کے دورے کر رہے ہیں- بھارتی و افغانی انٹیلی جنس سروس کے سربراہ و شوریٰ نظام کے نائب صدر جنرل محمد فہیم امسال بھارت کی دو دورے کرچکے ہیں- ان دوروں کے دوران "را" کے حکام نے انہیں نہ صرف افغان خفیہ ادارے کے اہلکاروں کے لئے تربیت کی سہولت دی ہے بلکہ ایک کروڑ روپے کی امداد کی بھی یقین دہانی کرائی ہے- (نوائے وقت 95-4-14) یہ نیا بھارت کابل گٹھ جوڑ ہماری و ایران کی شمالی سرحدوں کے لئے انتہائی تشویشناک خطرے کا سگنل ہے- ایسا ہی ایک سگنل 1970ء میں لاہور ائرپورٹ پر اغوا شدہ بھارتی طیارے گنگا کے اترنے پر ملا تھا- اس بھارتی چال کو شاید ہم سمجھ نہ پائے تھے- چنانچہ عیار بھارت نے اس کے بعد پاکستانی طیاروں کا بھارت کی فضا میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا جو کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا پیش خیمہ تھا- ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اس المناک سانحہ سے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے اور ایک بار پھر ہم ہندو و یہود کی شاطرانہ چالوں میں بدھو بن کر پھنسے جارہے ہیں- مسلمانوں کے لئے بھارت کے اندرونی حالت بھی نہایت پریشان کن ہیں- اسلام دشمن تنظیمیں شیو سینا اور بھارت جنتا پارٹی دن بدن طاقت پکڑ رہی ہیں- یہ دونوں سیاسی

جماعتیں دراصل کٹر مذہبی جماعتیں ہیں جو کہ مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ان کی نسل کشی کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ شیو سینا کے صدر بال ٹھاکرے نے تو بمبئی میں مسلمانوں کے قتل عام کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ ویسے بھی بھارت اور کشمیر کے گوشے گوشے میں مسلمان شہید کئے جا رہے ہیں۔ حکمران اور عوام چانکیہ کی شاطرانہ اور منافقانہ چالوں سے کام لے کر اپنے اولین دشمن پاکستان کے سب سے بڑے دشمن اسرائیل سے تعاون اور دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور ہمارے آزمودہ دوست چین اور ایران کو کمال کامیابی سے ہم سے پیچھے ہٹا کر اپنے نزدیک لا رہے ہیں اور ہم اپنے آپ میں مست بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعینہ 1971ء کی طرح!

امریکی ایماء پر تنصیب ہونے والا چکوال کا سیسمک مانیٹرنگ سنٹر پاکستان کے سینے میں زہر آلود نشتر ہے۔ اس سے ہمارے علاوہ ایران اور چین کے ایٹمی پروگراموں کا سدباب کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔

صد حیف! ہم کشکول گداگری تھامے امریکہ سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ جبکہ وہ ہمیں بالکل گھاس نہیں ڈال رہا ہے اور صرف لپ سروس کر کے ہم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تو اتنی دور رس حکمت عملی سے بھارت سے دفاعی، سرمایہ کاری و دیگر معاہدے کر کے اس کی ناز برداریاں کر رہا ہے۔ ہمارے پرانے و گہرے دوست چین اور ایران بھی ہم سے مایوس ہو کر بھارت سے عہد و پیمان کر رہے ہیں۔ ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے تو اب علاقے میں مغربی بالادستی کے خلاف ایران، بھارت و چین اتحاد کی تجویز پیش کر دی ہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ متعصب بھارت جنتا پارٹی نے بھی ایران کو بھارت کا قدرتی حلیف قرار دے دیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اب پاکستان کا علاقے میں کون سا ملک دوست رہ گیا ہے۔ ہم ہر جہت تنہا رہ گئے ہیں۔ ہمارے اندرونی و بیرونی حالات کی کرنا کی ہمیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا ہے۔

ابھی بھی وقت ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے اپنی حارجہ حکمت عملی کا از سر نو جائزہ لیں۔ اشد ضروری ہے کہ ہم اپنے روٹھے ہوئے دوستوں کو ہر قیمت پر منائیں۔ جیسے کہ شیکسپیئر نے کہا تھا ان کو فولادی زنجیروں سے اپنے ساتھ جکڑ لیں۔ دعا ہے کہ ہمارے اولوالابصار اولوالالباب اور اولوالامر اس دعوت فکر کو سنجیدگی سے قبول کریں تاکہ ہم صراط مستقیم پر گامزن ہو سکیں۔ ہمارے عظیم ترین رہنما، رہبر اللہ عزوجل کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ اتنی بصیرت اور دور اندیشی سے کام لیتے تھے کہ وہ دشمنان اسلام کی سازشوں جو کہ ابھی مہد میں ہی ہوتی تھیں کو بھانپ لیتے تھے اور ان کا تدارک اس حیران کن مہارت سے کرتے تھے کہ دشمن سنبھل بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی سیرت ہمارے لئے دائمی و ابدی مشعل راہ ہے۔

قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ یہود نصاریٰ (اور مشرک یعنی بت پرست)

ہمارے کبھی بھی دوست نہیں بن سکتے۔ جو ان کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں پھنس جائے گا وہ بے نیل و مرام رہے گا اور تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہمارے احزاب موافق و اختلاف کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ حکم ایزدی پکار پکار کر فرما رہا ہے کہ جو کوئی بھی اپنے معاملات اندرونی ہوں یا خارجی میں قرآنی حکیم کی نفی کا مرتکب ہو گا وہ اللہ سے جنگ مول لے گا اور وہ اپنا' عوام کا اور اسلام کا بدترین دشمن ہے۔ وہ یقیناً دین' دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار ہو گا۔ قہرالٰہی ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے کہ ہم توبہ و استغفار سے کام لے کر راہ راست پر چلنے کی کوشش کریں۔ کاسہ لیسی سے باز آئیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ خداوند کریم نے ہمیں معدنیات' تیل' گیس' کوئلے' نمک بلکہ یورینیم تک کے خذینے عطا کیئے ہوئے ہیں۔ ہماری اپنی لا انتہا صلاحیتوں کو منجمد کر رکھا ہے۔ آئیں! انہیں گرمئی ایمان سے ترو تازہ اور ولولہ انگیز بنائیں۔ باور کریں کہ ہماری شمع ایمان کو خدا نے روشن کیا ہے یہ کبھی بھی بجھ نہیں سکتی۔ ہم اگر کوشش اور محنت کریں تو ہماری زمینیں سونا اگل سکتی ہیں۔ ہمارے دریاؤں کی طغیانیاں باعث زحمت ہونے کی بجائے باعث رحمت بن سکتی ہیں۔ ہم زندہ و تابندہ اقوام عالم کی کہکشاں میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اتنے اپاہج ہو چکے ہیں کہ بیرونی بیساکھیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تو مسلم ممالک کا کامن مارکیٹ اور اسلامی بنک کی سکیمیں جو کہ طاق نسیاں میں ڈال رکھی ہیں ان کی از سر نو تجدید کریں۔ دنیا کی غیر اسلامی سپرپاوروں کے کاندھوں پر آہ و زاری و اشک فشانی کرنے کی بجائے خداوند کریم کے حضور گڑگڑائیں اور ہر ممکن راسخ اقدام لے کر توکل کریں۔ طوق ذہنی و عملی غلامی کو پارہ پارہ کرکے ہمیشہ کے لئے اس سے نجات حاصل کریں۔ روکھی مسی کھالیں لیکن اغیار کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ اگر ہمارے ارادے سچے اور پاک ہیں تو اللہ عزوجل ہمیں کبھی بھی مایوس نہیں کرے گا اور ہمیں عزت کی زندگی عطا فرمائے گا۔ انشاء اللہ۔

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 26 اپریل 1995ء)